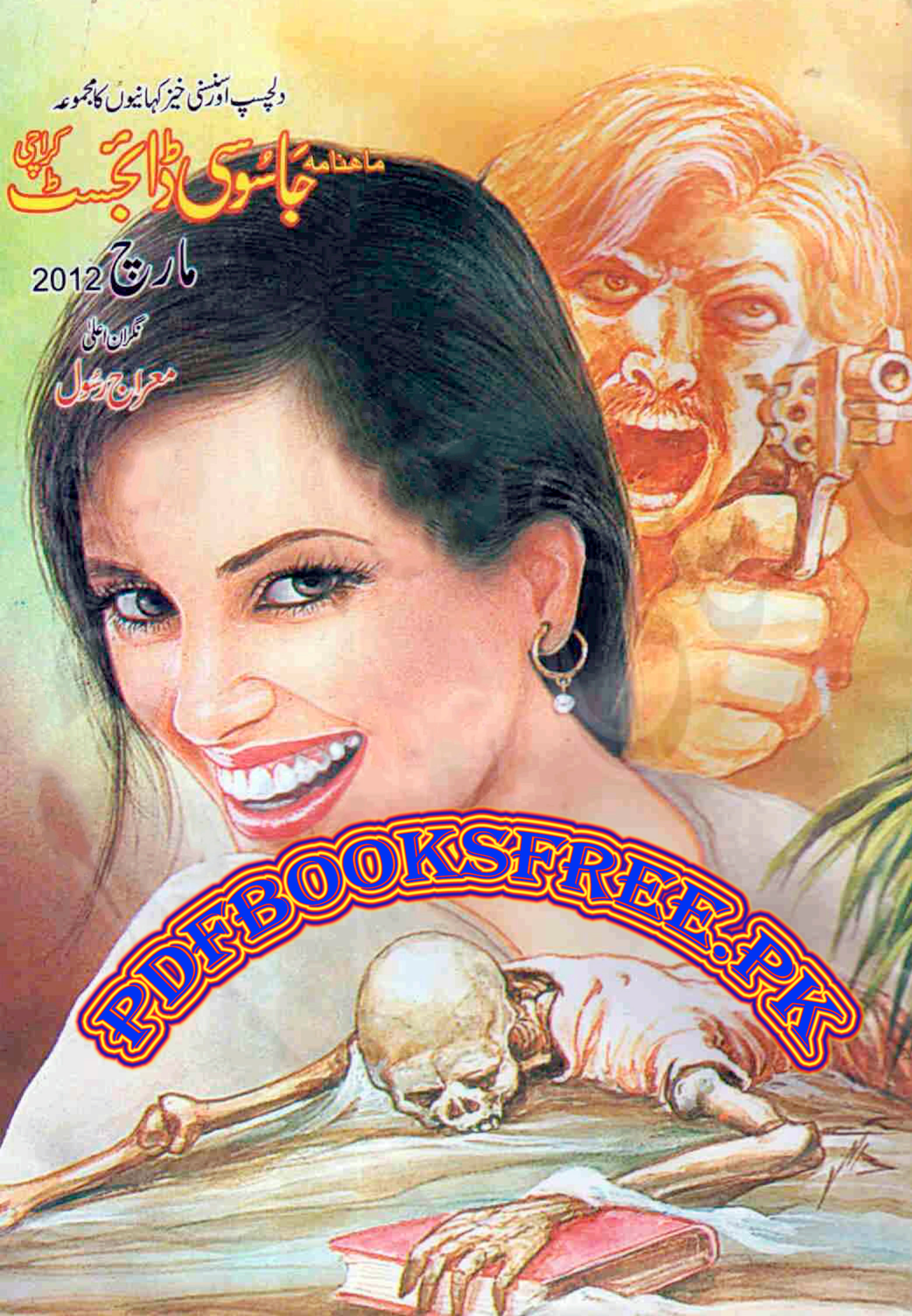
دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماهنامه
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
مارچ 2012
نگران اعلیٰ
معراج رسول
PDFBOOKSFREE.PK

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

11 — **چینی نکتہ چینی** — [illegible]
قارئین کی گرما فرمائیاں، تیکھی لڑائیاں
نامہ پیام، محبتیں عنایتیں اور شکایتیں

18 — **آخر کار** — ایم اے راحت
قربتوں کے باوجود دوریوں کے سفر
پر گامزن دو کرداروں کی پراسرار کتھا

59 — **سنپولیا** — جمال دستی
سیپیوں اور موتیوں کی ہم نوائی میں زندگی
تیاگ دینے والے ہیرے کی وقعت

71 — **عزت نفس** — مریم کے خان
ثابت قدمی اور عزم و حوصلے سے ہر
رکاوٹ عبور کر لینے والے فاتح کا قصہ

83 — **فریبی** — تنویر ریاض
اندھیروں سے نکل کر اجالوں کا
رخ کرنے والوں کی خواہش ناتمام

94 — **للکار** — طاہر جاوید مغل
محبت کے محاذ پر [illegible]
[illegible] کی جنگ کا سامنا تھا

137 — **نظر باز** — سلیم انور
سنسنی... تجسس اور مکر و فریب کے جال
میں الجھے مجرم اور قانون کی آنکھ مچولی

143 — **شکست منطق** — [illegible]
اس کیس کی روداد جس کے انجام کی
ڈور خیال کی کشش سے بندھی تھی

159 — **چلتر** — بابر نعیم
اس ماہر کھلاڑی کا ماجرا جس کی شاطری بل
مات میں بدل گئی... چونکا دینے والا اختصاریہ

162 — **گرداب** — اسما قادری
تقدیر کی سوئی کی قسمت کی چالبازی کا منفرد
کا کھیل ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

195 — **چھٹی کا دن** — دانش اظہار
اس قاتل کی تلاش کا قضیہ جسے
واردات کے لیے چھٹی کا دن ملا تھا

204 — **تین مقتول** — مختار آزاد
محبت کی مثلث...... جس کا ہر
زاویہ اپنے ہدف سے ہٹتا چلا گیا

219 — **فون کال** — ڈاکٹر [illegible]
ایک ہی نشست میں کامیابی اور ناکامی
کا سامنا کرنے والے کا مختصر احوال

223 — **اکھاڑا** — کاشف زبیر
سرورق کا تحفہ خاص...... اس قلم کا جادو
جو ہر ایک کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے

257 — **آثار جنوں** — سلیم فاروقی
دشت حیات میں جذبات و جنوں کا نہ تھمنے
والا طوفان، بلاخیز سرورق کی دلچسپ داستان

000 — **تراش خراش** — ادارہ / قارئین
اقتباسات، گدگدیاں، مسکراہٹیں اور قہقہے، سب
کچھ آپ کی تفریح طبع اور تواضع کے لیے

جلد 41 • شمارہ 03 • مارچ 2012 • زر سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 فیکس (021) 35802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مدیر اعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

مارچ 2012ء کا شمارہ آپ کے ذوق کی نذر ہے... موسمِ بہار کی آمد آمد ہے۔ سب ہم وطن گلوں کے رنگِ بہاراں کے استقبال کے منتظر ہیں۔ ایسے میں روح کو لرزا دینے والی کوئی خبر سامنے آجائے تو کیا ہو... ایک مؤقر جریدے میں شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق سپریم کورٹ میں جج کے عہدے پر فائز ہونے سے پہلے لاہور ہائی کورٹ کے جج، جسٹس میاں ثاقب نثار نے ایک مقدمے کی سماعت کے دوران پاکستان اسٹینڈرڈز اینڈ کوالٹی اتھارٹی کے چیئرمین کے اس اعتراف پر شدید تشویش کا اظہار کیا تھا کہ بند کاغذی ڈبوں میں فروخت ہونے والے دودھ میں میلامین کے علاوہ برتنوں اور کپڑوں کی صفائی کے لیے استعمال ہونے والے ڈیٹر جنٹس بھی شامل ہوتے ہیں۔ فاضل عدالت نے مشیرِ عدالت کو یہ ذمے داری سونپی کہ دودھ کے نمونے جمع کریں تاکہ ان کا لندن کی لیبارٹری میں ٹیسٹ کرایا جاسکے... رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ 30 فیصد نمونوں میں یوریا یا میلامین، 70 فیصد نمونوں میں غیر معیاری خوردنی تیل، 40 فیصد میں سنگھاڑے کا سفوف، 35 فیصد میں آلودہ پانی، 47 فیصد میں پنسلین، 29 فیصد میں بال صفا پوڈر، 27 فیصد میں مویشیوں میں پائے جانے والے جراثیم اور بعض دیگر عناصر پائے گئے... یہ کون لوگ ہیں جو چند ٹکوں کے لیے ہماری جانوں سے کھیل رہے ہیں۔ دلکش تشہیر کے سہارے عوام کو گوالوں سے بدظن کر کے ڈبا بند دودھ کی طرف راغب کرنے والے خود قوم کو زہر پلا رہے ہیں... ان انکشافات سے اب تک کروڑوں پاکستانی بڑے اور بچے اربوں لیٹر ملاوٹ زدہ دودھ پی کر بیماریاں پال چکے ہوں گے۔ کیا قوم کو ان ملعون کمپنیوں اور برانڈز کے نام جاننے کا حق نہیں ہے... جن کے دودھ میں مذکورہ بالا ملاوٹیں پائی گئی ہیں۔ خدا کے لیے ہمیں بتاؤ کہ کون لوگ یہ گھناؤنا بیوپار کر رہے ہیں تاکہ ہم ان پر لعنت بھیج کر نیک نام کمپنیوں اور برانڈز کی مصنوعات پر انحصار کرسکیں... یہ لرزتے اور کانپتے ہوئے دکھی دل کی آواز ہے... ہے کوئی جو اس صدا کا جواب دے...

آیئے اپنی محفل کا رخ کرتے ہیں... کم از کم جہاں خالص محبت اور خلوص ضرور نظر آتا ہے...

بنوں سے ہمایوں سعید راج کی باتیں ”فروری کا سرورق نہایت دلکشی کا حامل ہوتا اگر حسینہ کی آنکھیں آپس میں ملتی ہوتیں۔ (آپ سے ملانی بھی تو ضروری تھیں) اور کونے میں کرخت نقوش والا بندہ نہایت بے ڈھنگے انداز میں منہ کھولے دستیاب نہ ہوتا۔ انکل بھی ہماری طرح سپر جینئس ارفع کریم کی وفات پر افسردہ نظر آئے۔ ساتھ ہی معصوم زندگیوں سے کھیلنے والے دوا سازوں سے شاکی بھی، جنہوں نے پاکستان کو بین الاقوامی سطح پر بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ احسان میاں اگر فقط تصویر دیکھ کے تمہارے دل کے زنگ آلود تاروں کا یہ حال ہے تو کسی حقیقی پری چہرہ کو دیکھ کے تو یہ اکھڑ ہی جائیں گے... اشفاق بیٹا چونکہ ابھی تم کمسن ہو اس لیے تمہیں لگتا ہے کہ ماہا کم کم نظر آتی ہے جبکہ تلخ سچائی یہ ہے کہ وہ بالکل نظر نہیں آرہی۔ تفسیر صاحب! آپ کی معلومات بے حد ناقص ہے۔ عورت وفا کا پیکر ہے۔ نوے فیصد مرد حضرات دل توڑتے ہیں جبکہ نوے فیصد صنف نازک وفا کو عبادت کا درجہ دیتی ہے۔ آغا صاحب! اچھا تو وہ آپ تھے جو کئی دن تک مسلسل جھڈو کے گلی کوچوں میں مشکوک انداز میں پائے گئے تھے۔ شکر ہے ثمامہ جی کے شوہر نامدار کے ہتھے نہیں چڑھے ورنہ لگ پتا جاتا۔ بلقیس صاحبہ! واقعی اب آپ جیسا حسن کہاں۔ قیامِ پاکستان سے پہلے کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ گاڑھا سیال سوری پریشے سیال وہ تمہاری ہمت بچکاں والی بات نے بڑا ہنسایا، قسم سے۔ ہاشمی برادر! ہمارے ہاں زمین پر تنکے کی مدد سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے والے کو یار لوگ پاگل کہتے ہیں۔ جاوید بلوچ صاحب، تفسیر صاحب سے بے تحاشا متاثر نظر آئے۔ مقصود برادر! تمہارا تعریف کرنے کا انداز بڑا پیارا لگا۔ مہر اے ڈی سیال صاحب! خیریت ہے تم نے جاسوسی کے بنا دو سال کیسے گزار دیے؟ اور ہاں، قدرت اللہ کے ہوتے ہوئے اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ حسینہ تمہاری طرف دیکھے گی۔ کہانیوں کے جھرمٹ میں سب سے پہلے گرداب کو تلاشا۔ نواز چانڈیو کی جان بخشی کرا کے ماہ بانو نے اپنے مثبت کردار کا حق ادا کیا۔ اسلم کی دیوانگی اور چاہت کی شدت دیکھ کے بے اختیار رستم سیال کی یاد آگئی۔ اے سی صاحب بھی ایکشن میں نظر آئے۔ میجر ذیشان جیسے مخلص لوگوں کی ٹیم سے وہ بالآخر چودھری کے گریبان تک بھی پہنچ جائے گا۔ ویسے ماہ بانو کا یوں شہریار سے مدد مانگنا کچھ اچھا نہ لگا۔ ابتدائی صفحات پر ایچ اقبال کا نام اور کہانی کے ٹائٹل سے ہم یہ فرض کر بیٹھے کہ ایک ناقابلِ فراموش قسم کی لو اسٹوری ہماری منتظر ہوگی مگر افسوس، کہانی ذرا بھی متاثر کن نہیں تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے زبردستی کھینچا جا رہا ہو کہانی کو۔ کاشف زبیر کی قتل مسلسل زبردست رہی۔ مارشا نے جس اذیت سے اپنا بچپن گزارا تھا اس کے نتائج کچھ ایسے ہی متوقع تھے۔ قاتل کون کے تھیم سے بہرحال مجھے اتفاق نہیں۔ انسان کو اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار رکھنے چاہئیں۔ چھٹکارا میں ایک بے وفا بیوی نے بڑی ہی خوب صورتی سے اپنے شوہر کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ نہ جانے یہ مغربی جوڑے اپنی ساری ذہنی صلاحیتیں ایک دوسرے کو ختم کرنے کے لیے ہی کیوں استعمال کرتے ہیں۔ ایم اے راحت اعتراف نامی کہانی لیے حاضر تھے جو زیادہ متاثر کن ثابت نہ ہوئی۔ طاہر جاوید مغل للکار میں بالآخر ایک بڑا ٹوئسٹ لانے میں کامیاب ہوئے۔ تقریباً بیس ماہ بعد بھانڈیل اسٹیٹ کے حبس زدہ ماحول سے لاہور کی کھلی فضا میں آنے کا موقع ملا۔ امید واثق ہے کہ اب پاکستان میں بھی نت نئے ہنگامے ان دو جانبازوں کے منتظر ہوں گے۔ سرورق کی دوسری کہانی لاجواب رہی۔ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ عمران حقیقتاً وہ نہیں ہے جو ظاہر کر رہا ہے۔ ایسی ہی کہانی ایک انگلش فلم کی بھی ہے۔“

اوکاڑہ سے جوشیلے انجینئر عمیر شہزاد کی خفگی ”اس دفعہ جاسوسی نے بڑا طویل انتظار کرایا اور بڑی تگ و دو کے بعد جاسوسی کا دیدار نصیب ہوا۔ سب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے پہلے جاسوسی کے ٹائٹل پر نظر ڈالی۔ تو حسینہ مجھ سے منہ موڑی نظر آرہی تھی۔ (آپ نے اسے دیکھنے میں اتنی دیر جو لگادی) میں نے تو ماتھے پر 12 بجے سنا تھا لیکن آج ان کے خوب صورت رخسار پر سوا گیارہ بجتے دیکھا۔ اس کے نیچے گنجا گبر سنگھ چیخ رہا تھا کہ ٹھاکر! یہ سگریٹ مجھے دے دو۔ اس کے بعد میں دروازہ توڑتے ہوئے دوستوں کی محفل میں داخل ہو گیا اور اپنے آپ کو بلیک لسٹ میں پایا جہاں عمیر کے بجائے عمر لکھا ہوا تھا۔ (غلطی کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں) آخر ہمارے خط میں کیا غلطی ہے جو اشاعت کے قابل نہیں۔ بس یہ آخری خط لکھ رہا ہوں اگر یہ بھی بلیک لسٹ میں آ گیا تو مجھے بھی اتنا شوق نہیں بلیک لسٹ میں آنے کا۔ (جناب من، اتنا غصہ اچھا نہیں گو کہ بجا ہے۔ جسے آپ بلیک لسٹ کہہ رہے ہیں وہ کوئی ایسی فہرست نہیں کہ جس میں مسترد شدہ خطوط بھیجنے والوں کے نام شائع کیے جاتے ہیں بلکہ اس میں ان قارئین کے نام ہوتے ہیں جن کے خطوط جگہ کے نہ ہونے کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکتے) اس کے بعد اکیسویں صدی کی کہانیوں کے مہاراجہ طاہر جاوید مغل صاحب کی محفل میں تشریف لے گئے۔ اف! کیا لکھتے ہیں۔ ان کا قلم تو آگ برساتا ہے۔ میرے پاس تو لفظ بھی نہیں ہیں تعریف کے لیے۔ اس کے بعد ایک تھارا جا میں آ گیا۔ مجھے تو پہلے ہی سے شکیل پر شک تھا لیکن آخر میں یقین میں بدل گیا۔ حق دار میں شیرف واقعی ہی قتل کا حق دار تھا۔“

صبا گل مالاکنڈ ایجنسی سے حاضر ہوتی ہیں ”خیر خیریت گئی بھاڑ میں۔ سب سے پہلے میں آپ لوگوں سے اپنے خط کا مطالبہ کرتی ہوں۔ آخر مجھ سے کونسی غلطی ہوئی ہے؟ آپ لوگوں کو مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ یہ دوسری بار ہے۔ آخر کس خوشی میں میرا خط شائع نہیں ہوتا؟ میں تو بالکل وقت پر خط پوسٹ کرتی ہوں بلکہ باقاعدہ رجسٹرڈ کرتی ہوں تاکہ لیٹ ہونے کا کوئی اندیشہ نہ ہو اور پھر بھی خط ٹوکری میں جاتا ہے اور پھر میرا دل جلانے اور غصہ دلانے کے لیے خط کو بلیک لسٹ میں سجا کر رکھتے ہیں تاکہ میں مزید صدمے سے دوچار ہو جاؤں۔ ایسے میں خط لکھنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اب آپ یہ کہیں گے کہ خط ہمیں وقت پر نہیں ملا تھا تو کیا ہر بار ایسا ہوتا ہے؟ یہ صرف ڈاک والوں کی غیر معمولی کارکردگی نہیں بلکہ آپ لوگوں کا بھی کمال ہے۔ ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں۔ دوسری بار آپ کے ایسا کرنے پر یقین کرو میں روئی ہوں۔ آپ لوگوں نے اگر اس دفعہ ہیٹ ٹرک کی تو میرا اگلا خط صرف خدا حافظ پر مشتمل ہوگا۔“ (جی نہیں ہمیں اپنی مات ہر دلعزیز ہے۔۔۔ ہیٹ ٹرک کا کوئی ارادہ نہیں۔۔۔ اور نہ ہی آپ کی طرف سے ہونی چاہیے۔۔۔ اب آپ خوش ہو جائیں اور یہ بھی دیکھیں کہ اس میں کام کی کتنی باتیں ہیں) آخر میں پیاری آمنہ کو سلام اور نادیہ خان کو شادی کی مبارک باد اور بہت ساری دعائیں۔ ویسے ڈیئر نادیہ! ماضی قریب میں میری بھی منگنی ہو گئی ہے۔“ (اس پر اتنا جلال!)

اوکاڑہ سٹی سے تصویر العین کی تصویر کہانی ”اس دفعہ جاسوسی کے ٹائٹل پر مجھے کوئی چیز متاثر نہیں کر سکی، سوائے ٹائٹل گرل کی نیلی آنکھوں کے۔ اس لیے تبصرے سے معذرت۔ اس دفعہ آپ کے دلنشین الفاظ نے دل پر بہت اثر کیا۔ جعفر حسین! صدارت کی کرسی مبارک ہو۔ واقعی آپ کا تبصرہ اس لائق تھا کہ پہلے نمبر پر آتا۔ اعجاز احمد آپ کو دوبارہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ تفسیر عباس کی انٹری ہمیشہ کی طرح بہت اچھی تھی۔ آغا فرید خان! یہ آپ کی سوچ کہ آپ کو میری تعریف جھوٹی لگتی ہے۔ مجھے پتا ہے کہ جب انسان اسکیچز بناتا ہے تو کتنی محنت کرنی پڑتی ہے اور ہر دفعہ مختلف اسکیچز بنانے کے لیے ہر دفعہ سوچنا پڑتا ہے۔ (آپ کے بنائے ہوئے خاکے واقعی اچھے ہوتے ہیں، اگر کوئی اچھا سا خیالی خاکہ بنا کر بھیجیں تو ہم شائع کرنے میں خوشی محسوس کریں گے) نادیہ خان شادی کی بہت بہت مبارک باد، یار مٹھائی کھلاؤ اور اپنے مسٹر کا نام بھی تو لکھ کر بتاؤ۔ ایم اے ہاشمی، میرا خیال ہے کہ آپ کا نام جل ککڑ ہونا چاہیے تھا۔ ہمایوں سعید راج پتا نہیں کہ یہ ہوائی کس دشمن نے اڑائی ہے کہ آپ سدھر گئے جبکہ ہمارا خیال ہے کہ آپ اور بگڑ چکے ہیں۔ میں کہانیوں پر اس لیے تفصیلی تبصرہ نہیں کرتی کہ کہانیوں پر سارے ہی تبصرہ کرتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔ (لیکن خط لکھنے کی وجہ تو کہانیاں ہی ہوتی ہیں) للکار کی قسط اس دفعہ بس ڈائیلاگ پر مشتمل تھی اور اس نے کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔ شکر ہے کہ گرداب میں ماہ بانو نے شہریار کو دو چار سنا دیں، دلی اطمینان حاصل ہوا مجھے تو۔ اور اسماجی! شہریار اتنا بے وقوف کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ پولیس والے تو بہت چہرہ شناس ہوتے ہیں۔ وہ اب تک اپنی بیوی کو نہیں جان پایا۔ آپ خدارا اس کا پول بھی کھول دیں۔ سلیم فاروقی کی دوسری کہانی میں عمران نے افشین کو حاصل کرنے کی کوشش تو بہت کی لیکن آخرکار سجاد اور افشین کی محبت جیت گئی اور عمران کو شکست ہوئی۔ لیکن بہرحال، اس کا جذبۂ محبت بہت طاقتور تھا لیکن طریقہ کار مجرمانہ تھا۔ ایچ اقبال کی ایک تھارا جا میں شروع سے شک تھا کہ شکیل ہی مجرم ہوگا اور آخرکار وہی نکلا، زین کا کردار بہت پسند آیا۔ باقی جاسوسی ابھی زیر مطالعہ ہے۔“

ٹھٹھہ سے محمد نعمان پیارے کی باتیں دل لگا کے ”دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ جاسوسی اپنی سالگرہ کے دوسرے دن، 2 فروری کو ملا۔ اپنی پیاری محفل میں اپنا تبصرہ نہ پا کر ہم روئے، نہ لب ہلائے، نہ ہی جھجکی، بس پتھر کے ہو گئے کی عملی تفسیر بن گئے۔ آہو جی۔ اجی اب کیا کریں؟ خوشبو لگا کے! (افسوس تو ہمیں بھی بہت ہوا تھا خط تاخیر سے ملنے پر اور رہ گئے تھے ہم دل بہلا کے) اس مرتبہ کا سرورق کافی ایڈوانچر ٹائپ تھا۔ ٹائٹل گرل تو بس ایویں تھی مگر ذاکر انکل کا اس کے رخسار پر بنایا گیا کلاک کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ حسینہ کی اوپری تصویروں میں ایک شخص سگریٹ سلگاتے ہوئے نظر آیا اور نیچے والا آدمی منہ پھاڑے دوسری جانب دیکھ رہا تھا۔ فہرست پر نظریں دوڑانے کے بعد چینی، نکتہ چینی میں آ کر بریک لگائے۔ (زور لگا کے) محفل کی جانب آئے۔ جعفر حسین صاحب کو نمبر ون تبصرے پر مبارک۔ اعجاز احمد صاحب! موسٹ ویلکم۔ آپ کا گلہ بجانب حق ہے مگر آپ کی غیر موجودگی کے بارے میں بندہ ناچیز لکھ چکا ہے۔ اگر آپ کی یادداشت تیز ہے تو آپ کو ضرور یاد آئے گا۔۔۔ دماغ لگا کے۔۔۔! ایچ اقبال کی ایک تھارا جا چاہتوں اور نفرتوں کے موضوع پر سلیقے سے لکھی گئی ایک بے مثال کہانی تھی۔ کاش کہ شکیل، زیبا کو دھوکا دینے کے بجائے اس سے پیسے مانگ لیتا۔ آخر وہ اس کو اپنا دوست مانتی تھی۔ آصف ملک کی حق دار ایک عمدہ کاوش تھی۔ کہانی نے اختتام پر دلچسپ موڑ لیا۔ امید نہیں تھی کہ اصلی راجر پان کب کا مر چکا ہے اور جان اس کے نام پر وارداتیں کر رہا ہے۔ جی واہ۔۔۔! محمد عفان آزاد کی رشتوں کا خون ایک اچھی کاوش تھی جس میں خونی رشتوں کی اہمیت کو نہایت عمدگی سے اجاگر کیا گیا تھا۔ تنویر ریاض کی ہار جیت ایک زبردست داستان تھی، یقیناً ہر بار ایک ہی چال کامیاب نہیں ہوتی۔ مجرم ایک غیر تحریر شدہ قانون کو توڑ کر خود ہی پھنس گئے، ہے نا دلچسپ بات۔۔۔ خوشبو لگا کے۔ للکار میں مصنف صاحب نے عجب خوش گوار حیرت میں ڈال دیا ہے۔ کیا واقعی عمران اور تابی پاکستان پہنچ چکے ہیں؟ اب اگلی قسط کا مہینا بھر سے انتظار رہے گا۔ دل لگا کے۔ مختار آزاد کی گمشدہ سر

مغرب سے درآمد شدہ بہترین سوغات تھی جس میں ڈراما نگاری پر عمدگی سے لکھا گیا تھا۔ فلیرٹی کی موت کا دکھ ہوا۔ جمال دستی کی خونی کتاب اقتدار کی ہوس پر لکھی گئی ایک عبرت انگیز داستان تھی۔ بابر نعیم کی قاتل کون، ایک پیچیدہ مگر لاجواب اسٹوری تھی۔ بندوقیں لوگوں کو ہلاک نہیں کرتیں۔۔۔ لوگ، لوگوں کو ہلاک کرتے ہیں۔ نہایت ہی سبق آموز بات ہے۔ سلیم انور کی پھلکار مختصر مگر سنسنی خیز کہانی تھی۔ کاشف زبیر صاحب کی قتلِ مسلسل انسانی ذہن کی الجھنوں اور نفسیاتی پہلوؤں کو اجاگر کرتی ایک یادگار تحریر تھی۔ مارشا نے اپنے کیے کی سزا بھگتی۔ اگر وہ بوبی کو قتل نہ کرتی تو شاید مائیک کی توجہ اس کی جانب نہ ہوتی۔“

مظفر حسین [illegible] ”فروری کا شمارہ لینے کے لیے ہمیں بہت دور کا سفر کرنا پڑا۔ ٹائٹل بہت ہی اچھا تھا۔ خاص کر اس لڑکی کی معصوم سی شکل بہت [illegible] آ گئے۔ یہاں تو چینی ہی چینی تھی، میں بھی کہوں چینی مہنگی کیوں ہے۔ پھر گرداب پڑھی۔ ماسٹر آفتاب صاحب تو گم ہو گئے ہیں۔ اسما باجی [illegible] تھوڑا اسای کر دیں۔ سلیم فاروقی کی بات بھی اچھی تھی۔ سارہ باجی اور نادیہ خان کے تبصرے اچھے تھے۔ نادیہ باجی، آپ کو شادی بہت بہت مبارک ہو [illegible] سال اور پریشے سیال تو بہت ہی ناراض تھیں۔ انہوں نے جو آگ لگانے کی بات کی، دکھ ہوا کیونکہ جاسوسی ہمیں نئے دوست دے رہا ہے اس کے لیے ہم سب کو ل کر دعا کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ترقی دے۔ (آمین) باقی ایم اے ہاشمی کی تجویز اور تنقید بھی اچھی تھی۔ مدیرِ اعلیٰ صاحب! میرا خط ضرور ضرور شامل کرنا۔ دوستوں کے ساتھ شرط لگی ہوئی ہے، وہ مجھے چیلنج کر رہے ہیں۔ عزت رکھ دینا پلیز۔۔۔“

صفدر آباد سے احتشام احسان کا اعتراض ”فروری کا شمارہ 4 تاریخ کو مل گیا۔ اگرچہ میں آپ سے سخت ناراض تھا۔ میں نے خط نہ لکھنے کا بھرپور ارادہ کیا ہوا تھا مگر اس بار قلم اٹھا ہی لیا کہ تھوڑا شکوہ کرنا تو ہمارا فرض ہے کیونکہ آپ تنقیدی محبت نامے شامل نہیں کرتے۔ اگر ایسا ہے تو میں آئندہ تعریفی خطوط ہی لکھوں گا۔ (یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔۔۔ غور سے خطوط پڑھیں، تنقیدی خطوط بھی نظر آئیں گے) گزرتے سال کے دسمبر نے ایک گہری چوٹ سے نوازا۔ 25 دسمبر کی شب ہمارے ساتھ ڈکیتی کی واردات ہوئی اور فائر بھی لگا۔ لاہور میو اسپتال میں آپریشن ہوا اور تین دن بعد شفٹ ہو کر گھر آ گئے۔ حادثے میں دائیں بازو میں تھوڑا فریکچر ہوا ہے قارئین، بہن، بھائیوں اور آپ سے دعا کی اپیل ہے۔ (اللہ آپ کو جلد صحت یاب فرمائے اور ہمیشہ ہم سب کو اپنی امان میں رکھے، آمین) گزرے سال کے اس تحفے کو ہنس کر قبول کیا اور جاسوسی کو نہیں بھولے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے طاہر جاوید صاحب کی للکار کی جانب متوجہ ہوئے۔ خدا کا شکر ہے کسی طرح ہی سہی عمران اور تابش لاہور تو پہنچے۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں رہتے ہوئے میں تو بور ہو گیا تھا۔ اسما قادری کی گرداب حسبِ معمول اپنی منزل کی جانب گامزن ہے مگر کہیں بھی بوریت محسوس نہیں ہوتی۔ ابتدائی صفحات میں ایچ اقبال کی تحریر نے روشنیاں بکھیریں، ہمارا شک شروع سے ہی شکیل پر تھا اور آستین کا سانپ بھی وہی نکلا جبکہ آخری صفحات پر سلیم فاروقی کی مات نے دل موہ لیا۔ عمران پر بھی ہمیں آخر تک شک رہا اور وہ بھی فراڈ نکلا اور افشین جیسی معصوم لڑکی اس کے جال میں پھنس گئی۔ ایم اے راحت کی اعتراف میں ہمارا شک ڈانواں ڈول ہوتا رہا۔ کبھی شیراز گل مجرم نظر آتا، کبھی راحیلہ عرف صدف اور کبھی یہ ساری چال عینی کی لگتی مگر۔۔۔ مغربی کہانیاں بہت کم پڑھتا ہوں۔ ان پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔ (پڑھا کیجیے کیونکہ علم کسی بھی طرح بیکار نہیں جاتا) انفال مرزا کیا ٹائٹل گرل کی تعریف کرنا بُرا لگتا ہے آپ کو؟ اعجاز احمد ساہیوال آپ کا فرانٹے سے کیا تبصرہ پسند آیا۔ اور بھئی یہ ہاتھ دھو کر بھی ذاکر انکل اور ٹائٹل کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ نادیہ باجی! میری طرف سے شادی مبارک، ڈھیروں دعائیں آپ کے لیے۔“ (ہم تو آپ کے خط میں تنقید ڈھونڈتے ہی رہ گئے۔۔۔ شاید آپ کرنا بھول گئے اگلی دفعہ یاد رہے)

محمد قدرت اللہ نیازی حکیم ٹاؤن خانیوال سے لکھتے ہیں ”بے شمار چکروں کے بعد جاسوسی 4 تاریخ کو ہاتھ لگا۔ ٹائٹل گرل بہت پُرکشش تھی۔ سفیان ہاشمی سگریٹ سلگانے میں مصروف نظر آئے جبکہ نیچے کونے پر ہمایوں سعید گزرے وقت کو یاد کر کے رو رہے تھے کہ کاش زندگی میں کچھ تو اچھا کر لیا ہوتا۔ چینی دان میں جعفر حسین اپنے دلکش تبصرے کے ساتھ اول نمبر پر موجود تھے، مبارک ہو جناب۔ مہر اے ڈی سیال اس مچھلی منڈی میں آپ کو بھی خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ خانیوال سے تعلق ہونے کی بنا پر، بہت خوشی ہوئی، آپ کی واپسی کی۔ بھئی احسان سحر! دو تین نام ہی رہ گئے تھے، وہ بھی ”خاص کر“ میں شامل کر لیتے۔ اعجاز احمد ساہیوال! بہت اچھی لفاظی کر لیتے ہیں جناب اور آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا محاورہ تو سنا ہی ہوگا؟ بس تو پھر یاد نہ کرنے کا شکوہ نہ کریں۔۔۔ آغا فرید سکھر دوستوں کے لتے لینے میں مصروف نظر آئے۔ بلقیس خان واہ کینٹ! آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا تاہم ظالم پر ترس آنے والی بات کچھ جچی نہیں۔ ظالم پر تو کسی ظالم کو ہی ترس آ سکتا ہے۔ نادیہ خان! شادی کی بہت بہت مبارک ہو لیکن یہ پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا کہ شادی ہونے پر بھی ہیپی برتھ ڈے کہا جاتا ہے۔۔۔ ویسے پکی بات ہے نا؟ سارہ راجپوت پنڈی کزن کو ٹینشن لگا رہی تھیں کہ کہیں اگلے ماہ جاسوسی لانے سے انکار ہی نہ کر دے۔ خانیوال سے محمد بلال! بھئی خوش آمدید اور خانیوال کی محفل میں نمائندگی بڑھانے پر تھینک یو۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ گرداب میں ڈاکٹر ماریا مشکوک انداز میں سامنے آ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ٹائی پن میں حساس ڈیوائس لگی ہوئی ہو۔ ماہ بانو کا کردار دیوی کے مرکزی کردار شانی بی بی سے بہت مشابہت اختیار کر گیا ہے۔ جانی دشمنوں کو معاف کر دینے کا انداز دونوں کرداروں میں مشابہت کا سبب ہے۔ طاہر جاوید مغل اور اسما قادری سے گزارش ہے کہ ماہ بانو کو مینارِ پاکستان پہنچا دیں جہاں عمران موجود ہے، وہ بھی دشمنوں کو [illegible] کر رہا۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ (اچھا آئیڈیا ہے) خیر یہ تو ایک مذاق تھا۔ للکار میں کئی مشکلات سامنے آنے [illegible] پاکستان پہنچ گئے ہیں تاہم جس انداز سے ان کو پاکستان لایا گیا ہے، اس پر ہم ضرور متجسس ہیں۔ ایچ اقبال کی ایک تھارا جا بہت [illegible] لکھی گئی تھی [illegible] گزارش ہے کہ تھوڑا اپنے اذہان پر بھی بوجھ ڈالیں اور نئے آئیڈیاز کے ساتھ کہانیاں لکھیں تاکہ معیاری کہانیاں قارئین کو پڑھنے کے لیے دستیاب ہوں۔ پہلا رنگ اعتراف ایم اے راحت کی تصنیف تھی۔ ایم اے راحت کافی پرانے اور اچھے رائٹر ہیں تاہم اس کہانی میں انہوں نے پرائیویٹ سراغ رساں کے کردار کو کاپی کر کے دیسی قالب میں ڈھالا ہے اور کئی غیر ضروری کرداروں کو زبردستی کہانی میں گھسایا ہے۔ دوسرا رنگ مات قدرے بہتر رہا۔ عمران کے کردار پر بہت دیر بعد شک ہوا جب سجاد کو شادی میں گولی لگی۔ عجیب محبت تھی اس کی کہ جس سے محبت کرتا تھا اسی کو در بدر کر دیا۔ تابوت فیکٹری میں سلیری آخرکار بروبیل سے انتقام لینے میں کامیاب ہو ہی گیا، اچھی تحریر تھی۔ آصف ملک کی حق دار بھی انتقام کے جذبے پر لکھی گئی تحریر تھی۔ ہار جیت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور گمشدہ سر یورنگ رہیں۔ محمد عفان آزاد کی رشتوں کا خون میں خود کو پاکباز اور نیک سمجھنے والی ویلا قاتل نکلی اور ایک بُرے کردار کی مالک جینٹ ممتا کے جذبات سے بھرپور ایک ماں کی حیثیت اختیار کرگئی۔ سچ ہے کہ ظاہر پر بھروسا کرنے کے بجائے باطن کی اچھائی پر نظر رکھی جائے۔ چھنکارا شادی شدہ مغربی جوڑوں کی بدکرداری کی عکاس کہانی تھی۔ کترنیں بھی کافی اچھی تھیں۔ خاص طور پر انداز ہمدردی اور سبحان اللہ کے عنوان سے شمارے میں موجود کترنیں بہت اچھی لگیں۔''

جھنڈو سے ام ثمامہ کی شمولیت ''فروری کا آغاز ہے۔ درختوں کی شاخوں پر برف کے ننھے ننھے سفید شگوفے کھلے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے سارے ملک میں سردی کی ایک شدید لہر آئی ہوئی ہے۔ ایسے میں جب دن چھوٹے اور شامیں طویل ہیں، کمبل میں مونگ پھلیاں کھاتے ہوئے جاسوسی پڑھنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ (یقیناً) اس دفعہ بھی سرورق یکسانیت لیے ہوئے تھا۔ وہی لمبوتری شکل کی ایک لڑکی (لوگوں کے منہ پر بارہ بجتے ہیں محترمہ کے منہ پر پورا گھڑیال بج رہا تھا) نیچے انتہائی خوفناک شکل کا ایک مرد ویسے یہ بھائی لوگوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اوپر والے صاحب قابلِ قبول تھے ان کے بارے میں میرے چار سالہ بیٹے نے بڑا اچھا تبصرہ کیا، ملاحظہ فرمائیے۔ (عماد یکھو، آدھے منہ والے انکل کو عقل نہیں ہے۔ سگریٹ جلالی ہے مگر پھر بھی لائٹر نہیں بجھا رہے) میرے ننھے شہزادے کا تبصرہ ضرور شامل کیجیے گا۔ (بیٹے جی... یہ آپ کی پھونک کا منتظر تھا) جعفر حسین صاحب کو کرسیِ صدارت کی مبارک باد۔ مقصود الحسن کی پہلی کاوش کافی اچھی تھی۔ مرزا سسٹرز، سمعیہ عباسی، بلقیس خان کے خط بھی اچھے تھے۔ تفسیر عباس صاحب سب سے دو دو ہاتھ کرتے نظر آئے۔ شکر ہے ہمیں کوئی کمنٹ نہیں ملا یا چھپا نہیں۔ ویسے موصوف جس طرح صفحۂ قرطاس پر لفظوں کی چالیس چلتے ہیں یا تو ڈکشنری کا کمال ہے یا پھر ان کے شاعر ہونے کا۔ فرید بھائی، یاد کرنے اور تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ نادیہ خان کو پیا دیس سدھارنے کی مبارک باد، سدا سہاگن رہو دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو... مہر اسیال اور پریشے سیال کو امتحان پاس کرنے اور سالگرہ کی ڈھیروں مبارک باد۔ ہمارے خط کے بارے میں کیوٹ کی تشبیہ نے ہونٹوں پر ایک چھوٹی سی مسکراہٹ بکھیر دی۔ اور ہمایوں، ہماری ناقص عقل آپ جیسے ادبی بندے کی چالیس کہاں سمجھ سکتی ہے۔ ویسے آپ اس دفعہ خالصتاً جمالو اسٹائل میں ہر کسی کو کسی نہ کسی کے ساتھ جوڑنے میں لگے ہوئے تھے۔ آپ نے تو اپنے بھائی لوگوں کو بھی نہیں بخشا، ان کی بھی خوب ٹانگیں کھینچیں۔ تصویر انعمین، دلنشین بلوچ، صبا گل اور حسنین عباس کے خط بھی شاملِ اشاعت ہوتے تو اچھا ہوتا... اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے سطر سطر دل کی دھڑکن تیز کرنے والی کہانی للکار۔ اس قسط میں تجسس، تحیر، تھرل اپنے عروج پر تھا۔ عمران جیسے کردار کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انسان اپنی ول پاور سے مشکل سے مشکل حالات کا بھی ہنس کر مقابلہ کرسکتا ہے۔ لاہور آنے کی سب قارئین کو مبارک مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ موہل جیسے جلاد سے عاصمہ کا پیچھا چھڑا کر وہ اسے ساتھ ہی لے آتا۔ اب کے بار گرداب کی قسط بھی نہایت موزوں تھی۔ اسماجی نے جن ملکی حالات پر قلم اٹھانے کا بیڑا اٹھایا ہے، وہ کاوش دادطلب ہے۔ ویسے آفتاب اور کشور کیا چھٹیوں پر ہیں؟ مختار آزاد کی گمشدہ سرا اچھی کاوش تھی مگر پڑھنے کے دوران ہی پتا چل گیا تھا کہ فلیرٹی نے ہی اپنا بدلہ کیرن سے لیا ہے۔ ویسے مریخ لائبریری میں گھوم کر مزہ آیا۔ سلیم انور کی چھنکارا جاسوسی کے معیار کے عین مطابق تھی مختصر مگر جامع تحریر۔ سلیم فاروقی کی مات وہی ازلی اور نایاب محبتوں کی کہانی تمران کی کہانی میں اتفاقات کی بھرمار ہوتی ہے۔ ہر سائز ہر وقت اور ہر طرح کا اتفاق ان کی کہانیوں میں بہ آسانی مل جاتا ہے۔ کہانی بس ناٹ بیڈ تھی...'' (شکر الحمدللہ)

بہاول پور سے سعید عباسی کا طریقہ ''اس بار دوست 4 تاریخ کو ملا۔ اس دفعہ جو قابلِ غور چیز تھی، ٹائٹل پر وہ حسینہ ماہ جبیں تھی۔ براؤن بال، ناگن جیسی نیلی اور چمکیلی آنکھیں، شربتی ہونٹ، ظلم اس پر یہ ہوا کہ اس کے گورے اور نرم گال پر ٹائم پیس کی سوئیاں چبھو دی گئیں۔ ٹائٹل کو خیر باد کہا، سیدھا اپنے گلشن میں گئے جہاں کرسیِ صدارت پر جعفر حسین قابض تھے۔ خیر ساڈی طرفوں وی مبارک ہووے۔ انفال مرزا اینڈ صبا مرزا! اتنی اداسی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ ہنستے ہوئے چہرے بہت خوب صورت لگتے ہیں۔ مہرا ے ڈی جناب! آپ نے پیاری سی محفل کو مچھلی منڈی کہا، آپ کو سب قاری حسبِ توفیق نوازیں گے۔ احسان سحر کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ مقصود الحسن طاہر خوش آمدید جناب۔ آغا فرید خان! اگر وہ لڑکی ڈھلتی ہوئی عمر کی تھی تو پھر آپ کو عینک لگوا لینی چاہیے۔ برادران مشورہ ہے آمنہ پٹھانی! جب آپ جیسی قاری غیر حاضر رہیں گی تو ٹائٹل بھی اسی قسم کا آئے گا۔ بلقیس خان اپنے منہ آپ میاں مٹھو بن رہی تھیں۔ نادیہ خان! شادی مبارک ہو۔ مہر اسیال اینڈ پریشے سیال! ایسا ہی ہوتا ہے محفل میں حاضری دیتے رہیں تو سب یاد کرتے ہیں جونہی محفل سے غیر حاضر ہو جائیں تو کوئی بھی بھولے سے یاد نہیں کرتا۔ جاوید بلوچ! قسمت کی دیوی بھی کبھی کبھی مہربان ہوتی ہے۔ ہمایوں سعید راج! یہ کیا آتے ہی روہیلی گاں کی طرح سب کو [illegible] او۔ نئے آنے والے تمام دوستوں کو ویلکم کہتے ہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے کاشف زبیر کی قتلِ مسلسل پڑھی۔ مارشا چالاک تھی لیکن مالک اس سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ کہانی اچھی تھی۔ سلیم انور کی چھنکارا بھی اچھی کہانی تھی۔ مختصر اور اچھی۔ سلیم فاروقی کی مات اچھی تھی۔ جب تک حالات خود نہ جان لیں، کسی پر بھروسا نہ کریں۔ رشتوں کا خون عفان آزاد کی ایک لازوال داستان تھی۔ ویلا تو چھپی رستم نکلی اور انجام پھر بھی اس کا برا ہوا۔ گرداب اور للکار دونوں کہانیاں مقابلے پر چل رہی ہیں اور دونوں ہی خوب طریقے سے اپنی منزل کی طرف گامزن ہیں۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ ایک اور کہانی قسط وار جاسوسی میں ہونی چاہیے۔''

راولپنڈی سے سارہ راجپوت کا الٹی میٹم ''جاسوسی اس بار 4 فروری کو دن 2 بجے ملا۔ سرورق کافی اچھا اور پرفیکٹ تھا۔ اشتہارات پھلانگ کر چینی، نکتہ چینی میں پہنچے۔ اداریہ بہت زبردست تھا اور ارفع کریم واقعی بہت عظیم اور ہمارے لیے باعثِ فخر ہے۔ جعفر حسین کو کرسیِ صدارت مبارک۔ احسان سحر، تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ تفسیر عباس بابر، آپ کا بہت شکریہ اتنی اچھی دعا دینے پر۔ کہانیوں میں ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے للکار پڑھی۔ اس دفعہ قسط خاصی ڈرامائی انداز میں آگے چلی ہے۔ سب کچھ پراسرار اور معما ہے ابھی تک۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ گرداب میں ماریا کا کردار کچھ مشکوک لگ رہا ہے۔ شک تو مجھے نانی پن سے ہی ہوگیا تھا اور آخر میں یقین ہوگیا جب میجر ذیشان کو شہریار کی شرٹ پر کچھ چپکا ہوا ملا۔ سرورق کے رنگ اس دفعہ اتنے عمدہ نہیں تھے جتنا کہ سرورق تھا۔ بہرحال، ایم اے راحت کا اعتراف پسند آیا۔ دوسرے رنگ میں افشین کے گھر والے بہت اچھے تھے یا اس کی قسمت بہت اچھی تھی کہ وہ اتنے مصائب سے گزر کر بھی آخر کار اپنے گھر پہنچ گئی۔ ابتدائی صفحات کا خاص الخاص تحفہ ایچ اقبال کے قلم سے ایک تھارا جا بہترین کہانی تھی۔ گو کہ ہمیں شروع سے شکیل پر شک ہو رہا تھا لیکن مصنف نے بعض جگہ بڑی مہارت سے شک کا رخ مینائی بابا کی طرف بھی کرنے کی کوشش کی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ مختصر کہانیوں میں کاشف زبیر کی قتلِ مسلسل سب سے پہلے پڑھی۔ کہانی نے بہت متاثر کیا۔ رشتوں کا خون، حق دار اور تابوت فیکٹری بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ حسنین بلوچ تو بلیک لسٹ تھے تاہم ماہا

ایمان قمر تقی اور دلنشین بلوچ بدستور غائب۔'' (آپ تینوں فوراً حاضر ہوں ورنہ ہمیں تلاشِ گمشدہ کا اشتہار شائع کرنا پڑے گا)

راجن پور سے ماہ تاب گل کی تعریفیں ''جاسوسی چار تاریخ کو ملا۔ سرورق حسینہ اتنی رات گئے پتا نہیں کس کی راہ تک رہی تھی۔ بقول شاعر

لے اب تو دشتِ شب کی سب وسعتیں بھی سو گئیں
اب ہمیں جاگنا ہے کب تک بتا آوارگی؟

اس کی آنکھوں میں تیرتے گلابی ڈورے اس کے طویل رت جگوں کے غماز تھے۔ نیچے ایک صاحب شعلہ بار نگاہوں سے چینی، نکتہ چینی کے دروازے کو تک رہے تھے کیونکہ کوئی تبصرہ نگار اس کی مونچھوں کو ایک طرف سے مروڑ کے اندر داخل ہو گیا تھا اور اوپر گستاخی معاف، انکل جی اس سارے قصے سے بے نیاز اپنے لائٹر سے سگریٹ... (خبردار... لڑکی!) انکل جی! اگر بُرا لگا تو یہ گستاخ لڑکی معذرت چاہتی ہے۔ ایک طویل عرصے کے بعد محفل میں اعجاز احمد کی واپسی اچھی لگی۔ آپ نے مجھے یاد رکھا اس کے لیے تہِ دل سے آپ کی مشکور ہوں۔ ڈیئر نادیہ! شادی کی تھوڑی لیٹ مبارک باد قبول ہو۔ سب سے زبردست تبصرہ تفسیر عباس بابر کا رہا۔ للکار کو ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے کھولا اور ہمیشہ کی طرح زبردست رہی۔ لو جی، میں تو سوچ رہی تھی کہ ہیرو بھائی اور میڈم صفورا کی جوڑی زبردست رہے گی اور مغل انکل نے نئے انکشافات کے بعد ڈرامائی انداز میں تابش اور عمران کو لاہور بھی پہنچا دیا۔ گرداب میں شکر ہے کہ اسلم کو کچھ نہیں ہوا ورنہ اس کا پورا ماہ ہولتی رہی تھی۔ (کیوں اور کوئی معقول کام نہیں تھا؟) آصف ملک کی حق دار زبردست رہی۔ محمد عفان آزاد کی رشتوں کا خون بھی اچھی کاوش تھی۔ آخر تک ویلا پر تو شک ہی نہیں گزرا۔ ہار جیت بھی اچھے آئیڈیا پر مشتمل تھی اور چھوٹی کہانیوں میں سب سے نمبر ون گمشدہ سر رہی۔ کافی عرصے کے بعد کوئی اس طرح کی تحریر پڑھی۔ سلیم انور کی چھنکارا پڑھ کے خوف سا محسوس ہوا۔''

سردار اللہ دتہ، سردار ظفر اقبال وڑائچ کی خانیوال سے تشریف آوری ''جاسوسی ملتے ہی خط لکھ رہے ہیں۔ محفل میں پہنچے... جہاں جعفر حسین صاحب اول سیٹ ملنے پر مبارک باد کا ٹوکرا قبول فرمائیں۔ ہم سب کی طرف سے۔ دوسرے نمبر پر ہنستی مسکراتی انفال اور صبا مرزا ملیں تو ہم نے ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ آخر اب دعائیں ہی تو دے سکتے ہیں۔ اے ڈی سیال صاحب آپ اپنی حاضری کو پکی بنائیں۔ احسان سحر اور سید محی الدین اشفاق، دونوں نے مزہ لے لے کر اس ماہ کا رسالہ پڑھا۔ مقصود الحسن طاہر آپ قصور میں رہتے ہیں اس لیے آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ گاہے بگاہے تشریف لائیے گا، میں ویلکم کروں گا۔ اعجاز بھائی! کیا بات کرتے ہو، دو دن کے بعد لوگ بھول جاتے ہیں ہم تو پھر ایک ماہ کے بعد ملتے ہیں۔ میرے سینئر دوست تفسیر عباس بابر آف اوکاڑہ جناب! کیسے ہو آج کل؟ کیا مصروفیت چل رہی ہے؟ میں سب سے پہلے آپ کا تبصرہ پڑھتا ہوں۔ آغا فرید خان صاحب کیسے ہو؟ بہت اچھا لکھتے ہو، لکھتے رہنا مستقل۔ محمد جاوید بلوچ اور قدرت اللہ نیازی اور سارہ راجپوت نے بھی اس مرتبہ اچھا لکھا ہے۔ حوالدار آصف ملک آپ اٹک میں کس سینٹر میں ڈیوٹی دے رہے ہیں؟ کہانیوں میں ایک تھا راجا زبردست لگی۔ بعض اوقات دوست بھی دولت دیکھ کر بے وفا ہو جاتے ہیں۔ للکار میں مرکزی کردار پاکستان پہنچ چکے ہیں۔ گرداب اب سائنسی طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اعتراف کہانی بہت اچھی لگی۔ آج کل فراڈ اتنے ہو رہے ہیں کہ پتا بھی نہیں چلتا۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔''

ثمیرا اقبال کی لاہور سے آمدِ بہار ''فروری کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ پہلی کہانی ایک تھا راجا سسپنس سے بھرپور تھی۔ سرورق کا پہلا رنگ بھی اچھا تھا مگر اس میں غیر ضروری طوالت بہت تھی۔ جہاں تک بات ہے مات کی تو اس کا اینڈ چونکا دینے والا تھا۔ لیکن عمران کی موت رلا گئی مجھے۔ بے شک وہ قصوروار تھا لیکن اس کی سچی محبت بے مثال تھی۔ للکار میں دونوں ہیروز لاہور پہنچ گئے۔ ویلکم ٹو آور سٹی۔ گرداب بھی اچھی تھی۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔

پھر کسی پیاس کے صحرا میں مجھے نیند آجائے
اور میں خواب میں مانگوں تجھے پانی کی طرح

22 مارچ کو ہماری برتھ ڈے ہے، دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔'' (تمام ساتھیوں کی جانب سے بہت بہت مبارک، اللہ آپ کو عمرِ خضر عطا کرے، آمین)

ملتان سے عائشہ رانی کی مصروفیت ''ٹائٹل پر تبصرہ کرنے کا کام ہم نے اہلِ محفل پر چھوڑ دیا ہے۔ تبصرے سب کے پڑھے۔ ایویں... ہی لگے سب تبصرے۔ مطلب کے بس نارمل... کوئی اتنے وی چنگے نی... (چلیں اس دفعہ شکایت نہیں ہوگی... آپ نے جو تبصرہ بھیج دیا ہے) سب سے پہلے للکار پڑھی۔ پتا نی اسٹوری کدھر جا رہی ہے؟ ویسے اینڈ پر ہیرو پا جی لاہور پہنچ ہی گئے ہیں۔ گرداب میں ماہا نو کی انکل شہریار کے ساتھ میٹنگ خاصی ڈرامائی لگی... اور نائلی والا میں ان کا سرچ آپریشن بھی خاصا شاندار رہا۔ آخری وقت میں وہ ہم رنگ [illegible] کوئی ڈیوائس ہوگی... چودھری گوروں کے سامنے بھیگا بلا نظر آیا۔ پہلی کہانی ایک تھا راجا نہایت زبردست کہانی رہی لیکن شکیل کو مرنا نہیں چاہیے تھا... کاشف زبیر کی قتلِ مسلسل قتل در قتل واردات پر مبنی کہانی تھی۔ دونوں رنگ بھی ٹھیک تھے۔ چونکہ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔ باقی [illegible] اور تبصرہ اگلے ماہ تک کے لیے... ہمارے امتحان ہونے والے ہیں۔ انکل جی ذرا پلیز دل سے دعا کیجیے گا۔'' (اللہ آپ کو بہت اچھے نمبروں سے کامیابی عطا فرمائے، آمین)

منڈی بہاؤالدین سے عثمان اینڈ فوزان کی رائے ''فروری کا شمارہ بھی حسبِ معمول لیٹ ملا۔ ٹائٹل کا ولن آدھے سر کٹے ہیرو کی اسموکنگ کے خلاف [illegible] بنا ہوا تھا۔ اشتہارات کا بطور جائزہ لینے کے بعد محفل ہاؤ ہو میں قدم رکھا۔ دکٹری اسٹینڈ پر جعفر حسین کا دلفریب تبصرہ ملاحظہ کیا۔ جعفر صاحب بوم بانگ تبصرہ لکھنے پر مبارک باد قبول کیجیے۔ انفال مرزا اینڈ صبا مرزا، آپ کے سوال کو داد دینے کو جی کر رہا ہے۔ بالکل ایسا ہی ہے۔ مہرا ے ڈی سیال! مچھلی منڈی تو نہیں کہیں۔ صنفِ نازک نادانوں ناتواں، برا مان جائیں گی۔ احسان سحر جی! شکر کریں کہ جاسوسی 2 تاریخ کو ہی مل گیا، مٹھائی کب کھلا رہے ہو... ویسے آپ کی یہ بات ہم اپنے ہاکر کو ضرور بتائیں گے۔ شاید اس کے دل میں آپ کی یہ بات اتر جائے۔ محی الدین اشفاق صاحب، قربان جائیں آپ پر کہ اس مہنگائی کے دور میں بھی آپ کو اپنی اور پوتوں کی تعلیم کا کتنا خیال ہے۔ مقصود الحسن طاہر، مبشر حسن اور سمعیہ عباسی کو ہم محفلِ یاراں میں ویلکم کرتے ہیں۔ اعجاز احمد صاحب آپ کے تبصرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی پہلی 4 لائنیں سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ اور ہمیں بھی اپنے شہر کی دو بہنوں کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ بلقیس خان! جس انداز سے آپ نے موجودہ حسن کی تعریف کی، لگتا ہے یا تو آپ کی رہائش سبزی منڈی میں ہے یا پھر آپ نے تبصرہ لکھنے سے پہلے آئینے کا بغور مشاہدہ کر رکھا تھا۔ نادیہ خان آپ کی شادی ہو گئی، اب تو صنفِ لنگور کہنا چھوڑ دیں... پرنس کشمیری، بابا موج سمندر خان اور مس جاسوسی کو ڈھیروں آداب اگر وہ یہ تحریر پڑھ رہے ہیں تو۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ ایچ اقبال کی ایک تھا راجا کی کوئی سمجھ نہیں آئی۔ للکار میں عمران نے عجیب کنڈیشن پیدا کر دی ہے۔ اب دیکھتے ہیں ان کا کیا بنتا ہے۔ گرداب کی اگلی قسط کی شاید ہمیں سمجھ آ گئی ہے۔ شہریار کے کندھے پر لگی چپ ماریا نے لگائی ہو گی اور اس طرح اسلم اور ماہ بانو کی شادی قرار پانا مشکوک ہو گئی ہے۔ کاشف زبیر کی قتلِ مسلسل اچھی تحریر تھی۔ البتہ اس دفعہ رنگ کچھ خاص نہیں لگے۔ مختصر کہانیاں بھی اچھی تھیں۔''

حافظ آباد سے ماہا ایمان کی واپسی ''چند خوب صورت سی نجی مصروفیات کے باعث چند ماہ جاسوسی کی محفل سے دور رہنا پڑا۔ یاد رہے جاسوسی کی محفل سے جاسوسی سے نہیں، جاسوسی تو ظالم وقت سے چند لمحے چھین کے میں پڑھ ہی لیا کرتی تھی۔ اب جبکہ وہ خوب صورت مصروفیت ہمیں دوبارہ سے انتظار اور تنہائی کا تحفہ دے کے دور دیس کے سفر پر روانہ ہو چکی ہے اور اداسی بال کھولے ہمارے ارد گرد رقص کر رہی ہے تو ہم دل بہلانے اپنی پیاری محفل میں دوبارہ سے وارد ہو رہے ہیں۔ (خوب صورت سی مصروفیت بہت بہت مبارک ہو... اپنی خوشی کو خفیہ رکھا اور ہمیں یاد نہ رکھا؟) سرورق پر جھیل سی گہری آنکھیں اور چاند سا جس کا چہرہ نما حسینہ کے رخِ روشن پر پونے گیارہ بجاتی گھڑی کے کانٹے اور تفسیر عباس بابر نما انکل چلاتے ہوئے کیا خوب الفیکٹ پیش کر رہے ہیں۔ اے ون ٹائٹل ہے۔ اداریہ حسبِ معمول مدیرِ اعلیٰ کی حساسیت کا آئینہ دار ہے۔ دکھ جتنے بھی ہیں، رب کا شکر ہے کہ امید زندہ ہے اور انسان کو ہمیشہ اچھے کی امید رکھنی چاہیے۔ آپ کے امید بھرے الفاظ ہمارے لیے روشنی کی کرن سا کام کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا قول ہے ''جس طرح شبنم کے قطرے مرجھائے ہوئے پھول کو تازگی دیتے ہیں، اسی طرح اچھے الفاظ مایوس دلوں کو روشنی دیتے ہیں۔'' محترم جعفر حسین صاحب! آپ نے تو خود ہی اپنی کمزوری دوسروں کو تھما دی اور آ بیل مجھے مار کی تفسیر بن گئے۔ خانیوال سے مہر اللہ دتہ سیال صاحب، اے ڈی کے پردے میں چھپنے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنے اصل پر فخر کرنا ہمارا طرۂ امتیاز ہونا چاہیے۔ احسان سحر کی گلابی باتیں پڑھ کے مردوں کا اصل سامنے آ گیا جو کہ چند ایک کو چھوڑ کے نظر باز ہی ہوتے ہیں۔ محی الدین اشفاق! واضح رہے کہ میں نے آپ کو ایسے مردوں میں شمار نہیں کیا۔ مقصود الحسن طاہر! اناڑیوں سے کیا پوچھ رہے ہو، اچھا تبصرہ لکھنے کا گر ہمارے انکل تفسیر عباس بابر سے پوچھیے نا۔ سمعیہ عباسی! میری ہمسائی اس محفل میں تمہیں ویلکم۔ نادیہ خان وسیر کو شادی کی ڈھیروں مبارک باد۔ بلقیس خان کا کرارہ تبصرہ اور آمنہ پٹھانی کا خود شناس تبصرہ مخالفوں کے منہ پر گوبھی کے پھول کی طرح لگا ہو گا۔ مبرا اور پریشے اصل نام ہے یا نمرہ احمد کے ناول سے چرایا ہے؟ ایم اے ہاشمی صاحب! کسی سیانے کا کہنا ہے کہ مردوں کی دوسری شادی کی خواہش کمر کی خارش کی طرح ہوتی ہے۔ جتنی جلدی اٹھتی ہے، اتنی ہی جلدی ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ آزمائش شرط ہے۔ تجربے کے نتائج سے ہمیں بھی مستفید کیجیے گا۔ (واہ جی کیا کہنے...) محمد بلال حیدر آپ کی افسردگی ہمیں اچھی نہیں لگی۔ کچھ ہم سے سبق لے لو بھائی۔ سارہ راجپوت! ڈیئر آپ کی یاد آوری کا شکریہ۔ ورنہ چند جل ککڑوں کا کہنا تھا کہ جلد ہماری داستاں تک نہ ہو گی داستانوں میں۔ ہمایوں سعید چھوڑو تمہارے تبصرے پر اب کیا تبصرہ کرنا۔ بہت لیٹ ڈائجسٹ ملنے کی وجہ سے ابھی تک صرف تین کہانیاں پڑھ پائی ہوں۔ گرداب میں اب ایک نیا بھنور اٹھنے کو ہے۔ ماریا بے نقاب ہونے کو ہے کہ وہ سو فیصد گڑبڑ ہے۔ ماہ بانو اور شہریار کی ملاقات بہت ماٹھی رہی، مزہ نہیں آیا۔ للکار اپنی ماہ بہ ماہ ترقی کا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ خصوصاً پچھلے ماہ کی تحریر بہت ہی ایکسائٹنگ تھی۔ کسی نئے چکر میں پھنستے ہوئے تابی اینڈ عمران پاکستان تشریف لا چکے ہیں۔ چشم ماروشن دلِ ماشاد۔ کتنا انتظار تھا مجھے اس پل کا۔ کاشف زبیر کی ترجمہ تحریر قتلِ مسلسل بہت تھرلنگ رہی۔ دو صفحے پڑھتے ہی میں مارشا کو سیریل کلر کے طور پر شناخت کر چکی تھی۔ داد دیجیے جناب ہماری ذہانت کی۔ باقی باتوں پر اگلے ماہ آپ سے داد لینے کی کوشش کریں گے۔''

چنیوٹ سے جعفر حسین کی تحریر ''ٹائٹل پر نوعمر لڑکی کو دیکھ کر محسوس ہوا کہ بے چاری شاید آشوبِ چشم کی بیماری میں مبتلا ہے۔ سو اس دفعہ عفو و درگزر سے کام لیا۔ (مہربانی) دنیا کی کم عمر ترین ایم سی پی ایس ارفع کریم جس نے نو، دس سال کی عمر میں پاکستان کے سارے اعزاز حاصل کر لیے، کے حوالے سے اداریہ دکھی کر گیا۔ جو قومیں اپنا اثاثہ، اپنا دماغ نہیں بچا سکتیں ان قوموں کو قوم کہلانے کا حق نہیں ہوتا۔ مشہور فرانسیسی دانشور کامیو نے کہا تھا ''اگر امید نہ ہو تو ایک امید ایجاد کر لیں'' پاکستان کے موجودہ دگرگوں حالات اور مایوسی کی لمبی اندھیری رات کو امید چاہیے، وہ امید جو یقین دلائے کہ صبح قریب ہے۔ مہر اے ڈی سیال صاحب! ہم نے ڈینگیں ماریں، آپ اس دفعہ ڈینگی ہی مار کر اہلِ پنجاب پر احسان کر دیں۔ سید محی الدین صاحب، کہانی لکھنا کون سا مشکل کام ہے۔ کسی انگلش فلم کا پلاٹ چرایا، دو چار پرانے ڈائجسٹوں سے موزوں فقرے اڑائے، لو جی دھانسو قسم کی کہانی تیار۔ مگر اس میں ایک قباحت ہے۔ ہم اس طرح ادب کا نوبل پرائز حاصل کر کے نہ کسی مستحق کی حق تلفی چاہتے ہیں اور نہ اس بالی عمر میں اتنی شہرت کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ اعجاز بھائی! آپ ہر وقت اتنے دکھی کیوں رہتے ہیں؟ کہیں باقاعدگی سے ماہنامہ عاشقانہ ڈائجسٹوں کا دکھی نمبر تو نہیں پڑھتے؟ آمنہ پٹھانی صاحبہ! آپ کی معیاری، منتخب اور جامع تحریروں کو پڑھ کر امید واثق ہے کہ اس دفعہ اینگرو ایکسیلنس ایوارڈ آپ کو ہی ملے گا۔ کہانیوں میں وقت سب سے بڑا منصف ہوتا ہے کی عکاس حق دار بہترین رہی۔ انسانی خمیر خیر اور شر کی متحارب قوتوں کی ہمہ وقت کشمکش سے اٹھا ہے۔ اسی تناظر میں ناآسودہ نفسانی خواہشوں کی تکمیل کا فسانہ لیے رشتوں کا خون معیاری انتخاب تھا۔ فنونِ لطیفہ میں حد سے بڑھی دلچسپی کی آئینہ دار گمشدہ سر ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے کی ہو بہو تصویر تھی۔ ہار جیت نے مایوس کیا۔ طاقت اور اختیارات کے لالچ میں اخلاقیات کو روندنے والے مجرموں کی دلچسپ کتھا خونی کتاب پسند آئی۔ چھنکارا مختصر ہونے کے باوجود زبردست رہی۔ جرم اور فن کا حسین امتزاج تابوت فیکٹری نے کافی محظوظ کیا۔ انسانی زندگی میں فکر کی بنیاد مفروضے پر رکھی گئی ہے، فکر جو تاثر اور اظہار کے پیرائے میں ہر صورت اپنا ابلاغ چاہتی ہے بالکل اسی طرح محبت کا جذبہ بھی منہ زور ہوتا ہے۔ جہاں پابندیاں ہوتی ہیں وہیں پے در بنا تا ہے۔ محبت کے اسی آفاقی جذبے کو تمام تر مصورانہ جزئیات نگاری کے ساتھ ساتھ ذہن کو شعوری ادراک دے کر جمالیاتی حسوں کو تسکین پہنچاتی، ایک تھا راجا مسحور کر گئی۔ نثر لکھتے وقت تخلیقی ذہانت سے پورا پورا کام لینا پڑتا ہے۔ وجدان سے خیال

اور الفاظ تک ایک تخلیقی ذہن کو بہت سے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، تب کہیں جا کر للکار کی صورت شاہکار بنتا ہے۔ مغل صاحب کی تحریر میں جہاں خیالات کی سنجیدگی اور حقائق کی معروضیت پائی جاتی ہے وہیں پر واضح اور برمحل ظرافت کی آمیزش قاری کو کسی لمحے بور نہیں ہونے دیتی۔ گرداب اس دفعہ کافی بہتر رہی۔ سرورق کی پہلی کہانی اعتراف پڑھ کر یقین نہیں آیا کہ یہ اسی مصنف کی کاوش ہے جن کی ماورائی اور ڈراؤنی کہانیاں پڑھ پڑھ کر ہم جوان ہوئے۔ مات پڑھ کر سلیم فاروقی صاحب سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ بلاشبہ فاروقی صاحب ایک اچھے رائٹر ہیں مگر جس طرح وہ خود سے شرط لگا کر کہانی کو ایک نشست میں لکھتے ہیں، اس سے ہمیں شدید اختلاف ہے۔ مجموعی طور پر جاسوسی پسند آیا۔''

قمر ستی کھوٹہ راولپنڈی سے لکھتے ہیں ''فروری کا شمارہ 6 تاریخ کو موصول ہوا۔ ٹائٹل قدرے بہتر تھا جہاں اوپری حصے میں ہمایوں سعید سگریٹ نوشی فرما رہے تھے اور نیچے تفسیر عباس بابر صاحب چیخیں مار رہے تھے۔ محفل میں پہنچے تو جعفر حسین صدارت کی کرسی پر نظر آئے۔ مبارک ہو جعفر صاحب۔ اعجاز احمد نے شکوہ کیا کہ انہیں کسی نے یاد نہیں کیا۔ اعجاز بھائی! اس محفل میں کوئی کسی کو یاد نہیں کرتا بلکہ خود ہی یاد کروانا پڑتا ہے۔ (ایسا بھی نہیں ہے) تفسیر عباس بابر! تمہاری بونگیاں سن سن کر لگتا ہے کہ تم بھی ہمایوں سعید راج کی طرح اپنا تبصرہ بابر عباس کے پاس بیٹھ کر لکھتے ہو کیونکہ اب تمہارے تبصروں میں بھی احمقانہ رنگ جھلکنے لگا ہے۔ مہربانی کر کے تبصرہ لکھنے سے گریز کرو۔ (پھر کیا لکھیں؟) آمنہ پٹھانی! آپ دوسروں کے سامنے اپنی صفائیاں نہ پیش کریں۔ اور کیا کہا آپ نے کہ آپ کو بونگیاں مارنی نہیں آتیں؟ میرے نزدیک تفسیر عباس بابر کے بعد دوسرا نمبر آپ کا ہی ہے بونگیاں مارنے میں۔ اور جہاں تک بات ہے خمیرہ گاؤزبان اور دماغی ٹانک کی تو یہ چیزیں وہ لوگ استعمال کرتے ہیں جن کے پاس دماغ ہو اور آپ تو ماشاء اللہ؟ نادیہ خان وسیر! آپ کو بہت بہت مبارک باد اور آپ کے شوہر نامدار کے لیے پیغام... بھائی! ابھی خوش ہو جاؤ اور بعد میں جب بھی رونا ہو تو میرا کندھا حاضر ہے۔'' (آپ کے نصیب میں کس کا کندھا ہے؟) کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی جہاں کہانی آہستہ آہستہ سمٹ رہی ہے۔ کہانی کے اختتام پر لگا کہ بہت جلد ثروت بھی کہانی میں آنے والی ہے۔ ایک تھا راجا ایچ اقبال کی کہانی پسند نہیں آئی۔ سرورق کا پہلا رنگ اعتراف بہت زبردست تھا۔ ایم اے راحت صاحب! دیر آید درست آید۔ دوسرا رنگ اتنا خاص نہیں تھا۔ سلیم فاروقی صاحب! آپ کہانی کو گھما پھرا کر آخری صفحے پر سلجھا دیتے ہیں۔ مجھے ایک اور بات شیئر کرنا تھی کہ 07 مارچ کو میری 18 ویں سالگرہ ہے۔'' (ہماری طرف سے بہت بہت مبارک باد اور کیک بھی کھلائیں!)

کبیر عباسی عرف شہزادہ کوہسار مری سے حاضر ہیں ''کافی عرصے سے قسط وار کہانیوں کے علاوہ ڈائجسٹ پڑھنے کی فرصت نہیں مل رہی تھی مگر اس دفعہ اعجاز احمد نے یاد کیا تو سوچا کہ اس سے پہلے آپ سب کے ذہن کے نہاں خانوں سے بھی میرا نام محو ہو جائے، آپ کو اپنی یاد کرا ہی دوں۔ اب پتا نہیں آپ میں سے کون کون مجھے پہچانتا ہے۔ ٹائٹل کافی عرصے بعد پسند آیا۔ ٹائٹل گرل، خونی گھڑی، سگریٹ سلگاتا آدمی اور بیک گراؤنڈ کلر سرورق کے یہ چار افراد تو پسند آئے تاہم نیچے بنا بھوت نما آدمی ایک آنکھ کیا دونوں آنکھیں نہیں بھایا۔ اویں اس پر ذاکر انکل نے اتنی محنت کی۔ فہرست کا سادہ سا ڈیزائن پسند آیا۔ محفل میں اداریہ، مدیر کے دلچسپ جوابات اور ایک صفحے کا اضافہ... واہ جی میرے جانے کے بعد تو محفل والوں کے مزے ہو گئے۔ جعفر حسین کون سا تعویذ آپ نے انکل کو گھول کر پلایا ہے کہ اکثر و بیشتر ہی کرسیٔ صدارت پر فائز نظر آتے ہو۔ (اچھا، ہمیں یاد نہیں... لیکن اس میں ان کی قابلیت کا دخل ہے... اندازِ تحریر واقعی میں عمدہ ہے) ازراہِ کرم ہمیں بھی اس عامل کا پتا عنایت فرما دیجیے، عین نوازش ہو گی۔ محی الدین اشفاق پہلے میٹرک تو کر لیتے، ماسٹرز کرنے کے لیے تو ابھی پوری عمر پڑی ہے۔ مقصود الحسن! اچھا تبصرہ سیکھنا چاہتے ہیں تو ہمارے پاس تشریف لے آئیں۔ آپ دوست ہیں، ہمارے آپ کے ساتھ خصوصی رعایت کی جائے گی۔ اعجاز احمد! آپ کو ہم بھی مس کرتے رہے۔ سمعیہ عباسی! ایک عورت کو دوسری عورت اچھی لگ سکتی ہے؟ اگر لگے بھی تو وہ اس کا اظہار کر سکتی ہے؟ اور اگر اظہار کر دے تو وہ عورت ہو سکتی ہے؟ نہ جی نہ، ایسے نہیں ہو سکتا۔ تفسیر عباس! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں کہ اپنی ماہا ایمان اولڈ پیپلز ہاؤس میں چوکیداری کے فرائض سرانجام دے رہی ہیں؟ آمنہ پٹھانی! مختصر تو آپ لکھتی ہیں مگر یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ جامع بھی لکھتی ہیں۔ ہائے رے خوش فہمی۔ گرداب کی بہت خوب صورت قسط پڑھنے کو ملی۔ موساد کی ایجنٹ ماریا اب پتا نہیں پکڑی جاتی ہے یا شہریار سیڑھیوں پر ٹکرانے والے آدمی پر شک کرتا ہے؟ خیر، ادھر ماریا کا چیپٹر تو کلوز ہوتا نظر آ رہا ہے۔ تاہم دیکھتے ہیں کہ اسلم ابھی پکڑا جاتا ہے یا شادی کے بعد۔ گرداب پر اکثر لوگ تنقید کرتے نظر آتے ہیں مگر ہمیں اس کی واحد خامی اس کے طویل مکالمے لگتے ہیں اور دوسرا اس کے صفحات بہت کم ہوتے ہیں۔ للکار کی یہ قسط بھی زبردست رہی۔ سجاد کا کردار بڑا چونکا دینے والا تھا۔ زبردست کردار نگاری، تجسس سے بھرپور واقعات، خوب صورت فقرے اور مزاح کی وجہ سے یہ تحریر بھی ہماری پسندیدہ تحریروں میں شمار ہوتی ہے۔ ایچ اقبال کی ایک تھا راجا عام سے واقعات اور پلاٹ کے ساتھ عام تحریر ہی ثابت ہوئی۔ گو کہ آپ نے اسے بے مثال کا درجہ دیا تھا۔ البتہ اس کے ساتھ شاہد صاحب کا بنایا گیا اسکیچ بہت زبردست تھا۔ سرورق کی پہلی کہانی، ایم اے راحت سے لکھوائی گئی۔ کہانی میں سسپنس کی وجہ سے آخر تک دلچسپی برقرار رہی مگر نادر ہمدانی کی کامیابی میں اتفاقات اور خوش قسمتی کا زیادہ دخل تھا۔ اسی وجہ سے ہم اس تحریر کو سراغ رسی کا کوئی شاہکار قرار نہیں دے سکتے۔ سلیم فاروقی کی تحریر پڑھی تو نہیں تاہم جب پڑھیں گے تو پڑھی ہوئی ہی لگے گی۔ مختصر تحریروں میں تابوت فیکٹری ایک مختلف طرح کے نام کے ساتھ مختلف طرح کی تحریر ہی ثابت ہوئی۔ جھوٹ اور سچ کے بین بین سفر کرتی یہ تحریر آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھنے میں کامیاب رہی۔ سلیم انور کی چھنکارا کی جانب بڑھ گئے جہاں قتل کرنے کا نیا آئیڈیا پڑھنے کو ملا۔ مختار آزاد کی تحریر کے تعارفی کمنٹس پڑھ کے ناول اچھا ہوا اول۔ بڑے شوق سے تحریر شروع کی مگر خلافِ توقع یہ اوسط درجے کی تحریر ثابت ہوئی۔ عدیل شاد کے روشن الفاظ بہت خوب صورت تھے۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

ماسٹر محمد ضیاء الرحمان خان، بادی، خانیوال۔ ایم ایم عمران خان دستی، رحیم یار خان۔ حکیم سید محمد رضا شاہ بخاری، میانوالی۔ ایم دانش عزیز اینڈ آمنہ نور، پشاور۔ سرفراز رشید، پاکپتن شریف۔ تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ۔ احسان سحر، میانوالی۔ سید محی الدین اشفاق، ضلع لیہ۔ انجم فاروق ساحلی، لاہور۔ ایم اے ہاشمی، بونیر۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور۔ مہر اے ڈی سیال، خانیوال۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

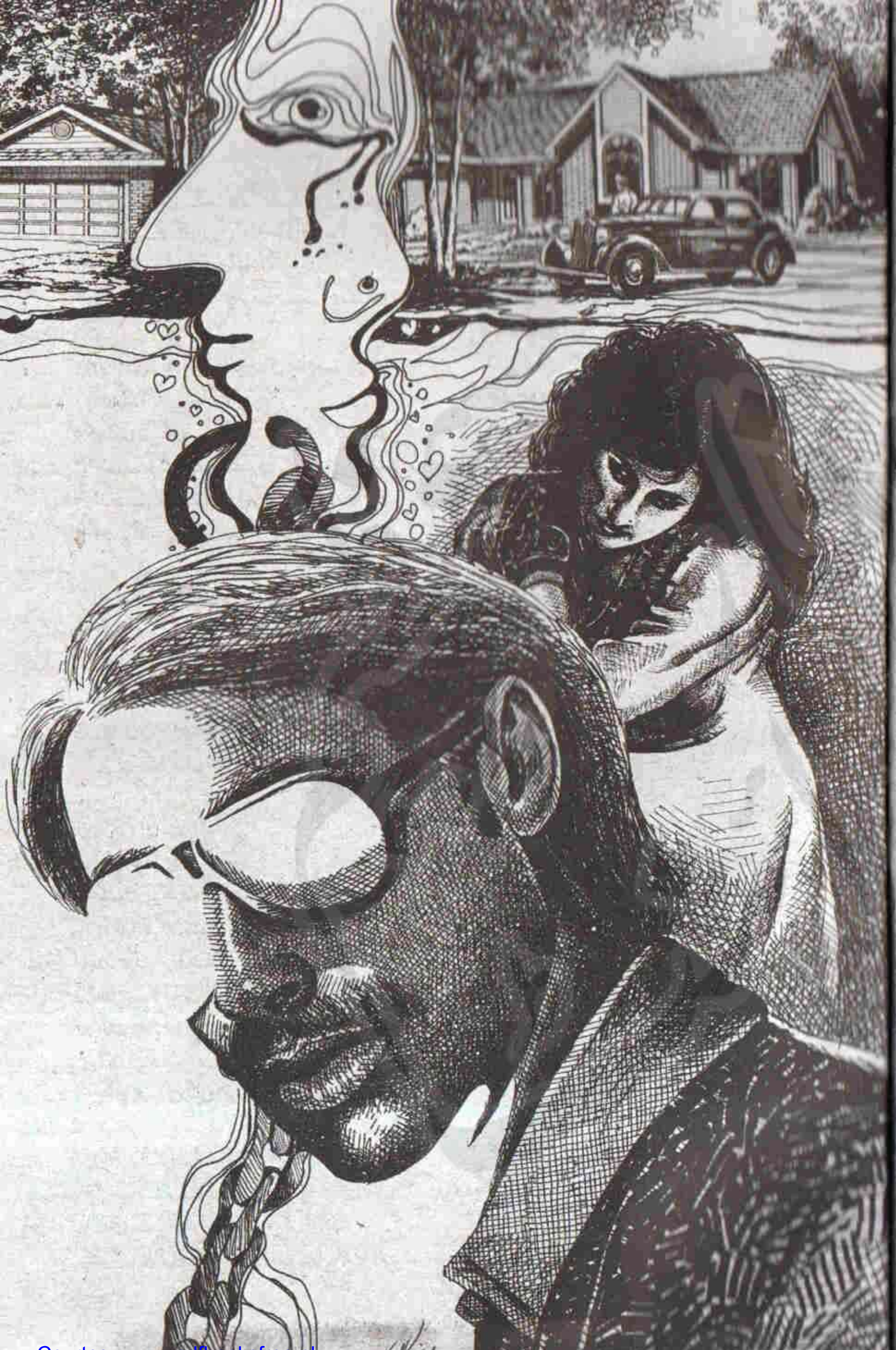

آخر کار

ایم اے راحت

چاہتوں... تمناؤں اور جذبات کے سیلِ رواں میں حساسیت... محبت... اپنائیت اور انسیت کی چاشنی کے بجائے لالچ و طمع... دھوکا... فریب... جیسی... کڑواہٹ شامل ہو جائے تو پھر تبدیلیوں کا عمل نہایت خاموشی سے شروع ہو جاتا ہے...اور غیر محسوس طور پر ان لوگوں کے درمیان جو ایک دوسرے کے خوشی و غم کے ساتھی ہوتے ہیں...ان کے دلوں میں ہمہ وقت فرقت کا موسم طاری رہتا ہے...وہ محبت کی اتھاہ گہرائیوں کے بجائے... اندیشوں اور وسوسوں کی پستیوں کے مکیں بن جاتے ہیں... پیچ در پیچ پہیلی ایک ایسی ہی کہانی... جہاں ہر قدم پر ایک نیا امتحان منتظر تھا...

قربتوں کے باوجود دوریوں کے سفر پر گامزن دو کرداروں کی پراسرار کتھا

اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتا کر آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ بس یہ سمجھیں کہ جس وقت سے اس کہانی کا آغاز ہوتا ہے، اس وقت میں رشتوں سے محروم ایک تن تنہا نوجوان تھا۔ میں امپورٹ ایکسپورٹ کی ایک فرم میں مقبول احمد صاحب کے اسٹینو اور پرسنل سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ کرائے کے ایک ڈھائی کمرے والے فلیٹ میں رہتا تھا۔ مناسب گزر بسر ہو رہی تھی۔

خیال یہ تھا کہ کچھ رقم جمع ہو جائے تو کسی اللہ کی بندی کا ہاتھ پکڑ لوں اور دنیا گزارنے والوں میں شامل ہو جاؤں مگر یہ نہ ہو سکا۔ اس سے قبل کہ میں کسی کا ہاتھ پکڑتا، قانون نے میری کلائی میں کنگنا باندھ دیا۔ مقبول صاحب نے اپنی فرم کے ذریعے بہت بڑا فراڈ کیا تھا۔ وہ خود تو فرار ہو گئے تھے لیکن مجھے پھنسا گئے تھے۔ ایک ناتجربہ کار وفادار ملازم ہونے کی وجہ سے میں نے ہمیشہ بند آنکھوں سے ان کے احکامات کی تکمیل کی تھی۔

چنانچہ اب اس کا جو نتیجہ ظاہر ہوا تھا، اس سے آنکھیں کھل گئی تھیں مگر ذرا دیر سے۔ انسپکٹر حیدر علی، مجھ سے ہمدردی رکھتے تھے مگر قانون، قانون ہے۔ میرے پاس کچھ نہیں تھا جس کا انہیں یقین تھا لیکن ان کے پاس میرے خلاف بہت سے ثبوت موجود تھے پھر بھی رعایت ہوئی اور مجھے صرف چار سال کی سزا ہوئی..... یہ بھی اچھا تھا کہ میں جیل جاتے ہوئے اپنے پیچھے کوئی کہانی نہیں چھوڑ گیا تھا۔ ورنہ خوامخواہ کہانیوں میں اضافہ ہوتا۔ میری ادھوری کہانی جیل میں جاری ہو گئی تھی۔ زندگی ہمیشہ گندگی سے پاک رکھتے ہوئے گزری تھی مگر وقت اپنا الگ مزاج رکھتا ہے۔ اسے آپ کے مزاج سے کیا دلچسپی۔ ہاں، جیل کے بارے میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے شاندار تربیت گاہ اور کہیں نہیں ہو سکتی۔ انسان کو جو کچھ نہ آتا ہو، وہاں سے بہ آسانی سیکھ لیتا ہے اور جو تجربہ پوری عمر نہ دے، وہاں چند سالوں میں حاصل ہو جاتا ہے۔

وہاں سے واپس آ کر جرم کرنا کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ استاد دین چاچا نے مجھے نقب زنی کے ایسے ایسے گُر بتائے تھے کہ گھر والے سوتے رہیں اور گھر کی صفائی ہو جائے۔ کلن خان دلی کے پرانے جیب کترے تھے۔ مجھے فرزندی میں لے لیا اور سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والے فن کو میرے سینے میں منتقل کر کے کہا۔ ”بیٹا! استاد کے نام کو بٹا نہ لگائیو۔“ اس کے علاوہ نہ جانے کیا کیا فارمولے لایا تھا میں۔ جیل میں رہ کر نقلی موبائل بنانا آ گیا تھا۔ اصلی بیٹری، سیل، غرض ہر فن مولا بن گیا تھا۔ ہو سکتا ہے انہی فنون سے کسی فن کو مستقبل بنا لیتا مگر زندگی کے چار سال کھو کر جیل سے نکلا تو پہلی شکل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انسپکٹر حیدر علی کی نظر آئی۔
”کوئی نیا جرم ہو گیا مجھ سے انسپکٹر صاحب؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”کون ہو تم؟“
”کوئی نہیں۔“ میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ پیچھے سے مجھے ان کی آواز سنائی دی۔
”سنو... رکو... کیا نام ہے تمہارا؟“
”تھوڑی سی کسر رہ گئی انسپکٹر صاحب... ورنہ شاہ ہندوستان ہوتا۔“
”بہادر شاہ... یاد آ گیا۔“ حیدر علی صاحب مسکرا کر بولے۔ ”رہا ہو گئے؟“
”ابھی نہیں۔“ میں نے آہستہ سے کہا تو ان کے چہرے پر تاسف کے آثار پھیل گئے۔ وہ پہلے بھی میری بے گناہی کا اقرار کر کے مجھ سے ہمدردی کر چکے تھے مگر قانون کے ہاتھوں مجبور تھے۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے کہا۔
”دنیا بہت بڑی امتحان گاہ ہے۔ بہادر شاہ، مشیت کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ تم یوں کیوں نہیں سوچتے ’ یہ جو تمہیں ایک فراڈ کے سلسلے میں چار سال کی سزا ہوئی، ہو سکتا ہے ان چار سالوں میں تمہارے ہاتھوں کوئی قتل ہو جاتا۔ اس طرح اللہ نے تمہیں پھانسی کی سزا سے بچا لیا۔“
”ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔
”ان امتحانوں سے بچنا۔“
”جاہل رہ جاؤں گا۔“
”یہ ٹھیک نہیں۔ خدا کا شکر ادا کرو۔“
”ہاں، خدا کا شکر ہے کہ میں قتل کے جھوٹے الزام سے بچ گیا اور صرف فراڈ کے جھوٹے الزام میں مجھے سزا ہوئی۔ مقبول صاحب کا کیا بنا؟“
”وہ ملک چھوڑ کر بھاگ گیا۔ سنو... میں مصروف ہوں۔ یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ اگر کسی مشکل میں گرفتار ہو جاؤ تو میرے پاس آ جانا۔ اس میں میرے گھر کا پتا بھی درج ہے۔“
”جی بہتر۔“ میں نے کہا۔ میں فلیٹ پر پہنچا۔ وہاں ایک بیگ صاحب رہتے تھے۔ ان سے پتا چلا کہ تین سال پانچ ماہ قبل انہوں نے یہ فلیٹ کرائے پر حاصل کیا تھا۔
”پہلے میں یہاں رہتا تھا اور یہاں میرا کچھ سامان تھا۔“ میں نے کہا۔
”ہمیں کیا معلوم جی۔“ بیگ صاحب نے دروازہ بند کر لیا۔ یہ پہلا دروازہ بند ہوا تھا۔ فلیٹ کے مالک کے گھر پہنچا تو ایک معمر خاتون سے ملاقات ہوئی۔
”مجھے مدثر صاحب سے ملنا ہے۔“
”کون مدثر صاحب؟“
”جو اس گھر میں رہتے تھے۔“
”اچھا... مگر میاں وہ اب یہاں نہیں رہتے۔ کوئی دو سال پہلے ہم نے یہ مکان ان سے خرید لیا تھا۔“
”اب وہ کہاں ہیں؟“
”بھئی اتنا نہیں معلوم ہمیں۔“ دروازہ بند ہو گیا۔
دو عدد صندوق، کپڑے، جوتے، تھوڑا سا فرنیچر، ضروریاتِ زندگی کی دوسری چیزیں چار سالہ امتحان کی نذر ہو گئیں۔ اچھا ہے۔ رہا کھٹکا نہ چوری کا۔ پھر دروازے بند ہوتے رہے۔ بے کسی اور بے بسی کے در البتہ کھلے ہوئے تھے۔ جرم کی مہر پیشانی پر نمایاں تھی۔ پاؤں جمانے کے لیے کوئی نگر نہیں مل رہی تھی۔ سارے استاد یاد آنے لگے۔ کسی کا بھی فن کام آ سکتا تھا لیکن پھر نہ جانے کیوں انسپکٹر حیدر علی یاد آ گئے۔ اس وقت ہر تنکے کا سہارا درکار تھا جو بھی کام آ جائے۔ آزمانے میں کیا حرج ہے۔ کارڈ موجود تھا۔ پتا معلوم کرتا ہوا پہنچ گیا۔ چھوٹا سا خوب صورت گھر تھا۔ حیدر علی صاحب نے خلافِ توقع پُر جوش خیر مقدم کیا تھا۔
”کیا کر رہے ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔
”فیصلہ۔“ میں نے جواب دیا۔
”کیسا؟“
”یہی کہ ایک سادہ لوح انسان کو اگر جرم کی دنیا میں لے آیا جائے تو اس کا مستقبل کیا ہونا چاہیے۔ برائیوں کے راستے کھلے ہوئے ہیں اور نیکیوں کے دروازے بند۔ جیل میں استادوں نے بہت سی استادیاں سکھا دی ہیں۔ آزمانا نہیں چاہتا لیکن اب حالات مجبور کر رہے ہیں کہ کچھ کیا جائے۔“
”کوئی نوکری نہیں ملی؟“
”نہیں۔“
”کس قسم کی ملازمت پسند کرو گے؟“
”محکمۂ پولیس میں بھرتی کرا دیجیے۔“ میں نے ہنس کر کہا تو وہ بھی ہنس پڑے، بولے۔
”تم ذہین آدمی ہو، پڑھے لکھے بھی ہو۔ محکمۂ پولیس ہی سے متعلق کوئی کام تمہارے سپرد کیا جائے تو کرو گے؟ غور کر کے جواب دو۔ کام دلچسپ لیکن ذہانت کا ہے اور میرا دل

چاہتا ہے کہ تم پر اعتماد کر لوں، ایک تجربہ ہی سہی۔ عارضی ملازمت ہے۔ تنخواہ پانچ ہزار۔ معاہدہ پانچ ماہ... پوری تنخواہ ایڈوانس۔“
”لائیے۔“ میں نے ہاتھ پھیلا دیا۔
”میں نے مذاق نہیں کیا۔ یوں لگتا ہے جیسے مجھے تمہاری تلاش تھی، کچھ الجھا ہوا تھا۔ ایک منٹ بیٹھو، میں ابھی آیا۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ میں انتظار کرتا رہا۔ پھر واپس آ کر حیدر علی صاحب نے پچیس ہزار روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ میں حیران نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا تو وہ بولے۔
”تمہیں سنجیدہ ہونا ہے۔“
”مجھے کیا کرنا ہو گا؟“ میں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کوئی غیر قانونی کام؟“
”سو فیصد قانونی۔ خطرات سے محفوظ، بشرطیکہ تم خود خطرہ مول لینا پسند نہ کرو۔ دیکھو بہادر شاہ! ایک ایسا کیس میرے پاس ہے جو ابھی پولیس کیس نہیں بن سکا ہے لیکن کچھ ہدایات کے تحت مجھے اس پر کام کرنا ہے۔ میں الجھن میں تھا کہ کیا کروں۔ اچانک مجھے تم سے کام لینے کا خیال آیا۔ معاملہ دلچسپ ہے اور تمہیں اس کام میں لطف آئے گا لیکن دیکھو، جرم کے راستوں پر نہ نکل جانا۔ قانون فولاد سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ وہ تمہیں نہیں چھوڑے گا اور پھر میری نصیحت ہے کہ برائی کے راستے خوب صورت ضرور ہوتے ہیں لیکن ان کا اختتام دردناک ہوتا ہے۔“
”میں جانتا ہوں۔“
”خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہو کہ کسی بھی حالت میں یہ ظاہر نہ کرو گے کہ میں نے تمہیں اس کام پر مامور کیا تھا اور جو کام تمہارے سپرد کیا جائے گا، اسے دیانت داری سے سرانجام دو گے۔“
”ایک گنجائش دیں گے؟“ میں نے کہا۔
”کیا؟“
”کام کی نوعیت معلوم کرنے کے بعد میں اگر اسے کرنا پسند نہ کروں تو یہ پچیس ہزار آپ کو واپس کر کے خود کو آزاد کرا سکتا ہوں۔“
”ہاں... لیکن ان معاملات کو میری امانت تصور کرو گے اور اس گفتگو کو اپنی ذات سے آگے نہیں بڑھنے دو گے۔“
میں نے وعدہ کیا اور پھر وہ الفاظ دہرا دیے جو حیدر علی نے کہے تھے۔ انہوں نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی تو میں نے کہا۔ ”کیا آپ کو مجھ پر یقین ہے کہ میں یہ کام کر لوں گا؟“
”سو فیصدی۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔
”کیوں؟“
”پتا نہیں۔“ انہوں نے میرے ہی انداز میں کہا تو مجھے ہنسی آ گئی پھر ہم سنجیدہ ہو گئے۔ حیدر علی نے کہا۔
”اس کا نام راؤ ریاست ہے۔ نیو اسٹریٹ میں کوٹھی نمبر سات سو نو میں رہتا ہے۔ اس کا دفتر اعظم پلازا میں دوسری منزل پر ہے۔ کمرا نمبر نو ہے۔ گیارہ بجے سے دو بجے تک وہاں رہتا ہے۔ تم اس کے دفتر جاؤ گے۔ اوہ... ہاں، کیا تم ڈرائیونگ جانتے ہو؟“
”اچھی طرح۔“
”لائسنس ہے؟“
”تھا... میرے سامان کے ساتھ گم ہو گیا۔“
”کیا مطلب؟“ وہ چونک کر بولے تو میں نے انہیں پوری کہانی سنا دی جس پر انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔
”تمہارا یہ نقصان بھی پورا کیا جائے گا۔“
”اس کی بات نہ کریں حیدر علی صاحب! میرے نقصانات تو بہت زیادہ ہیں۔ آزاد زندگی کے چار سال مجھ سے چھینے گئے ہیں جبکہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ میری شخصیت کا وقار چھن چکا ہے۔ میری حیثیت مسخ ہو گئی ہے۔ اب میں ایک سزا یافتہ آدمی ہوں۔“
”مجھے اس کا رنج ہے۔ کاش، میں یہ سب کچھ تمہیں واپس دے سکتا لیکن خیر چھوڑو، لائسنس کا مسئلہ بھی حل کر دیا جائے گا۔ میں کر دوں گا۔ تو میں تمہیں راؤ ریاست علی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ تمہیں کل بارہ بجے اس کے پاس جانا ہے۔ اسے ایک ڈرائیور کی ضرورت ہے، تم اس کے ہاں نوکری کرو گے۔“
”ڈرائیور کی؟“
”ہاں، اس میں ہتک محسوس نہ کرنا۔ یہ ایک سرکاری کام ہے۔ تم اس سے کہو گے کہ تمہیں مرزا منیر بیگ نے بھیجا ہے۔ بس اتنا کہہ دینا کافی ہے۔“
”وہ مجھ سے منیر بیگ کے بارے میں پوچھے گا؟“
”بالکل نہیں، بس یہ نام کافی ہو گا۔“
”پھر کیا کرنا ہے؟“
”وہ تمہیں اپنی کوٹھی پر ہی رکھے گا۔ اس کوٹھی کے حالات پر گہری نگاہ رکھنا ضروری ہے۔ راؤ ریاست تم پر اعتماد کرے گا مگر تم اس پر اعتماد نہیں کرو گے۔ وہ جو کہے گا، اس پر غور کرو گے پھر عمل کرو گے۔ کوئی غیر قانونی کام نہیں کرو گے اور اس کی اطلاع مجھے دو گے۔ مزید تفصیلات میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“

”وہاں کوئی جرم ہورہا ہے؟“

”بظاہر نہیں لیکن ہوسکتا ہے۔ تم پر اسے روکنے کی ذمّے داری عائد نہیں ہوتی۔ ہاں... اگر صورتِ حال علم میں آجائے تو مجھے آگاہ کرنا ضروری ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ کام دلچسپ ہے لیکن بعد میں اس جرم کا ذمّے دار مجھے قرار نہ دیا جائے۔“

”میں نے پہلے بھی ایسا نہیں کیا تھا۔ تم ناتجربہ کاری میں گرفتار ہوئے مگر اب تم ناتجربہ کار نہیں ہو۔“

میں گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ جو ہونا تھا، وہ ہوچکا تھا اور میری کسی کوشش سے وہ لمحات واپس نہیں آسکتے تھے جن میں، میں نے ایک سنہرے دور کے خواب دیکھے تھے۔ اب تو ان حسین محلات کے سلگتے کھنڈر میرے سامنے تھے اور میں جینا چاہتا تھا۔ ایک بے قصور نوجوان تھا میں جس پر جرم مسلط کردیا گیا تھا۔ میں موت کی آرزو کیوں کروں؟ چنانچہ میں تیار ہوگیا۔

”ڈرائیور کو تنخواہ بھی ملے گی؟“ میں نے کہا۔

”ظاہر ہے۔“ انسپکٹر حیدر علی نے جواب دیا۔

”اور یہ نوکری یقیناً مجھے مل جائے گی۔“

”یقیناً۔“

”تب پھر یہ تنخواہ تو میرا حق نہیں تھی۔ اب یہ رقم واپس لے لیں۔“ میں نے پچیس ہزار روپے حیدر علی کے سامنے ڈال دیے اور وہ مسکرانے لگے۔ پھر بولے۔

”نہیں مسٹر بہادر شاہ! درحقیقت تم ڈرائیور نہیں ہو۔ تمہارا اصل کام وہ ہے جو ایک پولیس آفیسر کی طرف سے تمہیں دیا گیا ہے اور اس کی تمہیں پیشگی تنخواہ دی جارہی ہے۔ ڈرائیور کی تنخواہ تم کام کے دوران ہونے والی آمدنی تصور کرسکتے ہو۔“

”تب میں اس میں سے پانچ ہزار رکھے لیتا ہوں۔ باقی بیس ہزار آپ کے پاس میری امانت۔ ویسے بھی ڈرائیور کی نوکری کے لیے جانے والے کے پاس یہ خطیر رقم نہیں ہونی چاہیے۔“

☆☆☆

اعظم پلازا کی دوسری منزل کے کمرا نمبر 9 میں داخل ہوکر میں نے حیرت بھری نظروں سے وہاں کا ماحول دیکھا۔ بڑا سا ہال نما کمرا تھا۔ دیواروں پر نفیس ووڈن ورک کرایا گیا تھا۔ بہترین میزیں اور کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ سامنے ہی ایک گلاس کیبن بنا ہوا تھا جس میں ایک کرسی پر کوئی نظر آرہا تھا لیکن پورا ہال خالی تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سارا اسٹاف چھٹی کرگیا ہو۔

میں جھجکتے قدموں سے گلاس کیبن کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھولا۔ دبلے پتلے بدن کا ایک ادھیڑ عمر شخص قیمتی کرسی پر نیم مردہ کیفیت میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہرے سانس لے رہا تھا۔ عجیب گھپلا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ چند لمحوں کھڑے رہنے کے بعد میں زور سے کھنکھارا تو نیم مردہ شخص اچھل پڑا۔

اس نے آنکھیں کھول کر خوف زدہ سی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کا سانس دمے کے مریضوں کی طرح چل رہا تھا اور حلق سے ایک باریک سی آواز نکل رہی تھی۔

میں ہمدردانہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ بولنے کی کوشش کررہا ہو لیکن بول نہیں پارہا ہو۔ پھر اس کی نگاہوں کا زاویہ تبدیل ہوا اور وہ ایک طرف دیکھنے لگا۔ میری نگاہیں بھی غیر ارادی طور پر اٹھ گئیں۔ وہاں پانی کا کولر اور گلاس رکھا ہوا تھا۔

میں اس طرف بڑھا۔ میں نے کولر سے پانی بھر کر اسے پیش کیا تو اس نے کانپتے ہاتھوں سے پانی لیا۔ پانی پینے کے بعد اس کا سانس اعتدال پر آسکا۔ اس نے مجھے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”آپ بیمار ہیں جناب؟“ میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”ہاں... ہاں۔“ اس نے پھر گہری سانس لی اور پھر بہتر نظر آنے لگا۔ ”شکریہ، تم کون ہو؟“

”میرا نام بہادر شاہ ہے اور مجھے مرزا منیر بیگ نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔“

”اوہ... مگر مجھے تو ڈرائیور درکار ہے۔“

”میں اسی ملازمت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔“

”تنخواہ چھ ہزار روپے ہوگی۔ رہائش اور کھانا، چوبیس گھنٹے ساتھ رہنا ہوگا۔ کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟“

”نہیں۔“

”یہ چابی۔ بلیک ایکارڈ، نیچے پارکنگ میں کھڑی ہے۔ مجھے دو بجے گھر واپس جانا ہوگا۔“

”جی سر!“

”سر نہیں، راؤ صاحب۔“

”بہتر۔“ میں نے چابی سنبھالی نوکری قبول کرنے کے بعد مجھے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا حق نہیں تھا۔ ”اور

کوئی حکم راؤ صاحب؟“

”نہیں۔“ انہوں نے کہا تو میں نیچے اتر آیا۔

سب کچھ حیرت انگیز تھا۔ اس نے مجھ سے میرے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ انسپکٹر حیدر علی نے بھی یہی کہا تھا مگر یہ سب کچھ پُراسرار تھا۔ ایکارڈ نئے ماڈل کی اور شان دار تھی۔ میں نے اس کا جائزہ لیا اور پھر کپڑا نکال کے اسے جھاڑنے لگا۔ کافی گندی ہورہی تھی جیسے اسے عرصے سے صاف نہ کیا گیا ہو۔ اس میں ٹیلی فون بھی موجود تھا۔ اپنے کام سے فارغ ہوکر میں اندر بیٹھ گیا۔ دماغ الجھنوں کا شکار تھا اور تو کوئی پریشانی نہیں تھی۔ انسپکٹر حیدر علی نے مکمل تحفظ کا یقین دلایا تھا۔

اس کے علاوہ اب میں خود بھی اتنا احمق نہیں تھا کہ صورتِ حال سے مغلوب ہوجاتا لیکن یہ ساری چیزیں کس قدر حیرانی کا باعث تھیں۔ آخر اس فرم کا اسٹاف کہاں گیا؟ وہ بیمار شخص تنہا وہاں کیوں بیٹھا ہوا ہے؟ بس یہی الجھن تھی۔ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ انسپکٹر حیدر علی کو اس شخص کے گھر میں کس قسم کے جرم کا خدشہ تھا؟ پھر یہ سوچ کر اپنے آپ کو مطمئن کرلیا کہ چند لمحوں میں ہر بات سمجھ میں تو نہیں آجاتی، رفتہ رفتہ ہی صورتِ حال کا اندازہ ہوسکے گا۔ غالباً دو بجنے میں دس منٹ رہ گئے تھے۔ جب مجھے ٹیلی فون پر اشارہ موصول ہوا اور میں نے جلدی سے ٹیلی فون ریسیو کیا۔ اسی کی آواز تھی۔

”اوپر آجاؤ، دفتر بند ہونے کا وقت ہوگیا ہے۔“ کار کا دروازہ لاک کرکے میں پھرتی سے اوپری منزل پر پہنچ گیا۔ وہ دروازے کے باہر ہی کھڑا ہوا تھا۔ چابی میرے ہاتھ میں دے کر بولا۔

”تالا لگا دو۔“ میں نے برق رفتاری سے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور دفتر کا تالا بند کرکے واپس مڑا تو اس نے چابی وصول کرنے کے لیے ہاتھ پھیلا دیا۔ پہلے کی نسبت اب وہ بہت بہتر نظر آرہا تھا۔ نیچے اترا تو میں اس سے تیزی سے آگے بڑھا اور میں نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ وہ خاموشی سے کار کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”نیو اسٹریٹ۔“ انسپکٹر حیدر علی مجھے اس کی رہائش گاہ کے بارے میں بتا چکے تھے۔ نیو اسٹریٹ کا راستہ جانتا تھا اور اس سے پہلے بھی ایک دو بار اس جگہ سے گزرا تھا۔ اس علاقے سے کوئی واسطہ نہیں تھا میرا... لیکن علاقے کے بارے میں یہ اندازہ تھا کہ وہ شان دار لوگوں کی رہائش گاہ ہے۔

بہرطور جب میں وہاں پہنچا تو اس نے مجھے کوٹھی نمبر سات سو نو کے بارے میں بتایا۔ یہ ایک عالی شان کوٹھی تھی۔ میں نے کار کھلے دروازے میں داخل کردی اور اندر لے جاکر کھڑی کردی۔ وہ دوسری طرف کا دروازہ کھول کے خود ہی نیچے اتر آیا۔ میں بھی پھرتی سے باہر نکل آیا۔

”تم نے کیا نام بتایا تھا اپنا؟“ اس نے انگلی اٹھا کر مجھ سے پوچھا۔

”بہادر شاہ۔“

”ہاں، ٹھیک ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے کہا تو میں اس کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ کوٹھی کے صدر دروازے کے سامنے چار سیڑھیاں تھیں اور ان سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس کے قدم کئی بار کانپے۔ میں نے آگے بڑھ کے دروازہ کھولا اور اس کے پیچھے چلتا ہوا ایک ہال میں داخل ہوگیا۔ سامنے دیوار پر ایک بہت ہی خوب صورت اور بہت بڑی گھڑی لگی ہوئی تھی۔ اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

”میری بیوی اس وقت آرام کررہی ہوگی۔ آؤ میں تمہیں تمہاری رہائش گاہ دکھاؤں۔ سامان وغیرہ کچھ ہے تمہارے پاس؟“

”نہ ہونے کے برابر۔“

”جب بھی فرصت ہو لے آنا۔ دیکھو اس طرف سے، آؤ۔ راہداری کے آخری سرے پر جو کمرا ہے، وہ تمہارے لیے ہے۔“ میں کمرے میں داخل ہوگیا اور کمرے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ خاصا بڑا کمرا تھا۔ کرسیاں صوفے وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں ایک ٹیپ ریکارڈر رکھا ہوا تھا۔ دوسرے کونے پر ٹیلی ویژن سیٹ رکھا ہوا تھا۔ غرض یہ کہ کمرا کسی ڈرائیور کے لیے معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا تو وہ بولا۔

”ہاں، یہاں کوٹھی میں سرونٹ کوارٹر موجود ہے لیکن تم نے دیکھ لیا کہ میں کس قدر بیمار ہوں۔ چنانچہ تمہیں یہیں رہنا ہوگا تاکہ میری ضرورت کے مطابق میرے پاس پہنچ سکو۔“

”جی راؤ صاحب۔“ میں نے آہستہ سے کہا تو وہ گردن خم کرکے وہاں سے باہر نکل گیا۔ میں حیران نگاہوں سے اس کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر دفعتاً مجھے ہنسی آگئی۔ عالمِ خواب میں، میں نے کبھی ایسی رہائش گاہ کا تصور بھی نہیں کیا تھا اور یہ سوچ کر خود بھی ہنس پڑا تھا کہ یہ زندگی کم از کم میرے جیسے کسی شخص کے لیے نہیں ہوسکتی۔ لیکن اب میں ایسے ہی ایک شان دار کمرے میں تھا جہاں اگر کوئی مجھ سے ملنے آئے تو میری حیثیت سے مرعوب ہوجائے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن میری حیثیت یہاں ایک ڈرائیور کی تھی۔ اگر حیدر علی یہ نہ بتا دیتے کہ یہ سب کچھ عارضی ہے اور کچھ عرصے کے بعد مجھے واپس جانا ہے تو میں یقینی طور پر دل ہی دل میں یہ آرزو کرتا کہ ڈرائیور ہی کی سہی، یہ نوکری اگر مجھے مستقل مل جائے تو میری خوش بختی ہے۔ اتنی شان دار کار میں سفر کروں گا۔ اتنے اعلیٰ درجے کی کوٹھی میں رہوں گا۔

ظاہر ہے، اس رہائش گاہ کے دوسرے لوازمات بھی ایسے ہوں گے۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ کر یہ سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اچانک ہی یہ سب کچھ مل گیا تھا۔ ظاہر ہے، کپڑوں کی ضرورت بھی ہوگی۔ پانچ ہزار روپے میرے پاس موجود تھے جس میں چند جوڑے آسکتے تھے۔ نیز بیس ہزار روپے حیدر علی صاحب کے پاس موجود تھے اور وہ انہیں دینے میں سنجیدہ نظر آرہے تھے۔ چنانچہ عارضی ہی سہی لیکن اس حسین زندگی سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے۔ اپنے ذہن سے سارا تردد کھرچ دیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس کوٹھی میں کیا ہو رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی ایسی صورت حال بن جائے جس کی بنا پر مجھے یہاں مستقل بنیادوں پر رہائش گاہ مل جائے۔ ذہن میں جرم کا کوئی تصور نہیں تھا اور فطرتاً بھی میں مجرم نہیں تھا۔ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ آپ کے علم میں آچکا ہے۔ مزید یہ کہ اگر زندگی کوئی بہتر سہارا نہ دیتی تو شاید برائیوں کے راستے پر ہی نکل جاتا کیونکہ بہت سے علوم کا فنکار بن چکا تھا لیکن ایسے کسی کام کے لیے دل نہیں چاہتا تھا۔

اجنبی لیکن انتہائی خوب صورت جگہ، وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا پھر جب چونکا اور دیوار پر لگی گھڑی میں وقت دیکھا تو پونے پانچ بج رہے تھے۔ بہت وقت یہاں گزر گیا تھا اور ابھی تک میری طلبی نہیں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے، کوٹھی کے مکین آرام کر رہے ہوں گے لیکن مجھے کیا کرنا چاہیے؟ یہاں کمرے میں بیٹھے بیٹھے تو وقت گزارنا ایک نامناسب بات تھی۔

باہر نکل کر دیکھا جائے کہ ماحول کیسا ہے۔ کتنے لوگ یہاں رہتے ہیں۔ جب کوٹھی میں داخل ہوا تھا تو یوں لگ رہا تھا جیسے کوٹھی میں کوئی نہ ہو۔ چوکیدار تک نہیں تھا اور گیٹ کھلا ہوا تھا۔ کوئی بھی شخص بہ آسانی اندر داخل ہوسکتا تھا۔ بہرطور، میں اپنے کمرے سے باہر نکل آیا اور راہداری عبور کر کے سامنے والے حصے میں پہنچ گیا۔ اس وقت بھی کوٹھی کا وسیع و عریض لان سنسان پڑا ہوا تھا لیکن وہ گیٹ بند تھا جس سے گزر کر میں اندر داخل ہوا تھا۔ بعد میں گیٹ میں نے بند نہیں کیا تھا کیونکہ مجھے اس کی ہدایت نہیں کی گئی تھی۔

دیر تک میں کیاریوں میں لہلہاتے پھولوں کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر کار پر نظر پڑی تو میں کار کی جانب بڑھ گیا۔ گاڑی کی چابی اب بھی میری جیب میں موجود تھی۔ میں صرف وقت گزاری کے طور پر کار کی صفائی کرنے لگا۔ مجھے اندازہ نہیں ہوسکا کہ کس وقت دو افراد اندرونی کمروں سے باہر نکلے۔

میں نے کچھ آوازیں سنیں اور جب پلٹ کر دیکھا تو راؤ ریاست ایک عورت کے ساتھ میری جانب آرہا تھا۔ عورت اس سے تیز، تیز لہجے میں کچھ بات کر رہی تھی جو اتنی دور سے میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن میں کپڑا ہاتھ میں سنبھالے سیدھا ہوگیا۔

راؤ ریاست گھریلو لباس میں تھا۔ اس کے جسم پر ایک گاؤن تھا۔ گاؤن تو خوب صورت عورت بھی پہنے ہوئے تھی لیکن وہ بالکل مختلف قسم کا گاؤن تھا۔ میں نے گہری نگاہوں سے اس عورت کا جائزہ لیا۔ اس کی عمر اٹھائیس اور تیس کے درمیان ہوگی۔ لمبا قد تھا۔ بڑے بڑے بال جن کے ہالے میں اس کا چہرہ انتہائی سفید معلوم ہو رہا تھا۔ سب سے حسین چیز اس کے چہرے پر اس کی آنکھیں تھیں جو گہری سبز اور بلیوں کی طرح چمکتی نظر آتی تھیں۔ چہرے پر ایک خاص تمکنت چھائی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے نزدیک پہنچ گئی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں ناپسندیدگی کے تاثرات دیکھ لیے تھے جبکہ راؤ ریاست بالکل نارمل نظر آرہا تھا۔

”ہمیں کسی ڈرائیور کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے کرخت لہجے میں کہا۔

”مگر مجھے ہے۔ تم سمجھتی کیوں نہیں؟“

”تم سے میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ اب حالات کو سنبھالنا ہماری ذمّے داری ہے۔ میں جو کچھ کر چکی ہوں، بھلا اس کے بعد اس کی کیا گنجائش تھی۔ تم بھی ڈرائیونگ کر سکتے ہو اور میں بھی ڈرائیونگ کر لیتی ہوں۔ ہمیں ہر حالت میں پیسا بچانا چاہیے۔“

”تم اس شخص کے سامنے ایسی باتیں کر رہی ہو بیگم... میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے۔ بے شک تم ڈرائیونگ کر لیتی ہو لیکن میری جو کیفیت ہوگئی ہے، اس کا تمہیں اندازہ ہے؟ کسی بھی وقت سانس کا دورہ پڑ سکتا ہے۔ ایسی حالت میں مجھے ڈرائیور کی اشد ضرورت ہے۔ بہادر شاہ! ان سے ملو، یہ تمہاری بیگم صاحبہ ہیں۔“ میں نے اسے سلام کیا جس کا اس نے جواب نہیں دیا اور وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ اس کا

رخ کیاریوں کی طرف تھا۔ راؤ ریاست گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسے جاتے دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

”اس کی بدمزاجی کا خیال نہ کرنا۔ اطمینان سے اپنا کام کرتے رہو۔ اور ہاں، پھول اس کی کمزوری ہیں۔ اگر تم نے باغبانی میں اس کا ہاتھ بٹا دیا اور پھولوں پر کچھ گفتگو کرلی تو یوں سمجھ لو اس کی ساری مخالفت دور ہوجائے گی۔“ یہ جملے ادا کرتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ راؤ ریاست اپنی بیوی سے کچھ ڈرتا ہے۔ شام رات میں ڈھل گئی۔ میں نے یہ وقت باہر ہی گزارا تھا۔ وہ دونوں کہیں نہیں گئے تھے۔ اس دوران میں کھانے پینے کے لیے بھی کچھ نہیں ملا تھا۔ کھانے کا کیا ہوگا؟ کل کچھ کرنا پڑے گا لیکن رات کو ایک نئے کردار سے ملاقات ہوئی۔ یہ بھی ایک دراز قد لڑکی تھی۔ عمر اکیس کے قریب، لباس سادہ، چہرہ بے شک حسین البتہ شگفتگی سے عاری۔ وہ میرے لیے کھانا لائی تھی۔

”کل سے یہاں تمہارے دن کا آغاز ہوگا۔ صبح کا ناشتا کچن میں آکر کرلیا کرو۔ دوپہر کا کھانا یہاں تین بجے کھایا جاتا ہے۔ رات کا نو بجے۔ دونوں وقت کھانا میں پہنچا دیا کروں گی۔“

”آپ کون ہیں؟“

”میرا نام سائرہ ہے۔“ اس نے کہا اور باہر نکل گئی۔

میں نے گہری سانس لی۔ اس سے قبل ایسے لمحات کبھی نہیں گزرے تھے۔ یہ کائنات اس قدر پُراسرار ہے، اس کا اندازہ اب ہو رہا تھا۔ سب کچھ عجیب اور حیران کن تھا۔ کچھ بھی فطری نہیں لگ رہا تھا۔ ایک پولیس آفیسر ایک ایسے شخص پر اتنا بھروسا کرلیتا ہے جو چار سال کی سزا کاٹ کر آیا ہے۔ ایک ایسا گھر جس میں کسی جرم کے ہونے کے امکانات ہیں۔ صرف ایک نام دہرانے سے مجھے ملازمت مل گئی اور وہ بھی بڑے اعتماد کے ساتھ۔ اور مجھے اس نام کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ کیا یہ سب کچھ قابلِ یقین ہے؟ لیکن یقین اس لیے کیا جاسکتا تھا کہ میں یہاں موجود تھا۔ کھانا بہت عمدہ تھا۔ میں کھانے کے بعد دیر تک اس لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا۔ صبح کو وہ پھر یاد آئی اور میں ضروریات سے فارغ ہوکر کچن کی تلاش میں چل پڑا۔ چائے کی خوشبو نے راہنمائی کی، وہ کچن میں ہی تھی۔ مجھے دیکھ کر سہم گئی پھر خوف زدہ انداز میں مسکرادی۔

”تم مجھے یاد نہیں رہے تھے۔“ اس نے کہا۔

”ناشتا!“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

سرداری

سردار جی سیٹ بیلٹ لگائے بہت اطمینان سے موٹروے پر گاڑی چلا رہے تھے کہ ایک پولیس موبائل نے اشارہ دے کر انہیں روکا۔ افسر نے آکر ادب سے ان کی مزاج پُرسی کی پھر اطلاع دی کہ بہترین اور محتاط ڈرائیونگ پر موٹروے پولیس کی جانب سے انہیں دو ہزار روپے کا نقد انعام دیا جارہا ہے۔

”واہ! اب میں ان روپوں سے اپنا ڈرائیونگ لائسنس بنوالوں گا۔“ سردار جی نے خوش ہوکر کہا۔

”اس کا بالکل بھروسا نہ کرنا۔“ برابر والی سیٹ سے اس کی ماں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ”شراب پی کر یہ ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔ سارے روپے کی دارو پی جائے گا۔“

پچھلی سیٹ پر سوئے ہوئے اباجی ان آوازوں کو سُن کر بیدار ہوئے اور پولیس والوں پر نظر پڑتے ہی ہڑبڑا کر بولے۔ ”پکڑ لیا نا پولیس نے... مجھے پتا تھا کہ چوری کی گاڑی میں چلنے کا یہی انجام ہوتا ہے۔“

پولیس افسر ہکا بکا تھا کہ قدرے توقف کے بعد ڈکی سے ایک پھنسی پھنسی مردانہ آواز آئی۔ ”بھایا جی! سرحد پار کرلی ہے تو اب مجھے باہر نکال لو... گرمی سے میرا دم گھٹا جارہا ہے۔“

(اسلام آباد سے عائشہ خرم کی عنایت)

”کچھ دیر لگے گی، بیٹھ جاؤ۔“ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا تو میں کرسی پر جا بیٹھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”بہادر شاہ۔“ میں نے بتایا۔

”ظفر، نہیں۔“ وہ ہنس پڑی۔ اس نے رخ نہیں بدلا تھا۔ وہ اوون پر مصروف تھی۔ میری خاموشی پر اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور بولی۔ ”تمہارے آنے سے میں بہت خوش ہوں۔ انڈے کے ساتھ پراٹھا لوگے یا سلائس؟“

”پراٹھا مل سکے گا؟“

”ضرور۔“ اس نے کہا۔ ”میں بہت خوش ہوں۔“

”کیوں خوش ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”قوتِ گویائی ختم ہوتی جارہی تھی۔ زبان ہلانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی۔ کوئی ہے ہی نہیں بات کرنے کے لیے۔ تم سے باتیں کر کے عجیب سا لگ رہا ہے۔“

”کیا یہ بھوت گھر نہیں ہے؟“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”ہے...“ اس نے کہا اور ٹرے سجا کر میرے سامنے رکھ دی۔ ”یہیں بیٹھ کر ناشتا کر لو۔ وہ دونوں تو گہری نیند سو رہے ہوں گے۔“

”تم ناشتا نہیں کرو گی؟“

”میں صرف چائے پیتی ہوں۔“

”وہ لوگ کس وقت جاگتے ہیں؟“

”نو بجے... ساڑھے نو بجے ناشتا کرتے ہیں۔ ساڑھے دس بجے راؤ صاحب آفس کے لیے نکلتے ہیں۔“

”ناشتا اتنی جلدی تیار کر لیتی ہو؟“

”ہاں، بیگم صاحبہ ٹھنڈے پراٹھے کھاتی ہیں۔“

”پراٹھے؟“ میں نے کہا۔

”صرف دو عدد کنگ سائز چار انڈوں کے ساتھ، چار سلائس، مارملیڈ اور مکھن کے ساتھ کچھ حلوہ جات، اصلی گھی میں ڈوبے ہوئے اور صرف تین کپ چائے... وہ بھی ٹھنڈی۔“ اس نے کہا اور ہنس پڑی پھر چونک کر بولی۔ ”کہیں میرے یہ الفاظ ان لوگوں کے سامنے نہ دہرا دینا۔“

”تم یہاں نوکری کرتی ہو... سائرہ؟“

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا کام کرتی ہو؟“

”بہت سے۔ فہرست بتانے سے کیا فائدہ... تم کچھ پڑھے لکھے ہو؟“

”معمولی سا۔“ میں نے جواب دیا تو وہ دوسری طرف متوجہ ہو گئی۔ میں نے ناشتا کر لیا تو اس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔

”ناشتا کر چکے؟“

”ہاں۔“

”تو اب جاؤ۔“ وہ خشک لہجے میں بولی تو میں حیران رہ گیا۔

رات کو بھی اس کا رویہ ایسا ہی تھا اور اب اچانک... بھوت گھر کا تیسرا بھوت جو لمحوں میں رنگ بدلتا ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔

دروازے کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اس نے کہا۔ ”سنو، میرے رویے کو محسوس نہ کرنا۔ یہاں کچھ سختیاں ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ مجھے تم سے بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ہاں، اگر اس سلسلے میں کوئی مداخلت نہ ہوتی تو... پلیز محسوس نہ کرنا۔“

میں نے ٹھنڈی سانس بھری اور کچن سے نکل آیا۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے میں نے سائرہ کو ٹرالی لے جاتے ہوئے دیکھا پھر واپس آ کر اس نے مجھے طلبی کی اطلاع دی۔ میں تیزی سے چلتا ہوا ان دونوں کے سامنے پہنچ گیا۔ راؤ ریاست، بیگم سے کہہ رہے تھے۔

”کیا بات ہے، کئی دن سے میں تمہاری خوراک کم محسوس کر رہا ہوں۔“

”لو، اتنا تو کھاتی ہوں۔“

”کہاں، دیکھو! یہ بادام کے حلوے کی پلیٹ جوں کی توں رکھی ہے اور یہ ابلے ہوئے انڈے۔ میں تمہیں ڈاکٹر سعید کے پاس لے چلوں گا۔ وہ صحت ہی نہیں رہی تمہاری... کیوں مجھے پریشان کرتی ہو؟“

”اپنے آپ کو دیکھ رہے ہو؟“

”میری بات چھوڑو، تم سے دگنی عمر ہے۔ اب صحت تو خراب ہونی ہی ہے۔ میری زندگی اسی میں ہے کہ تم خوش رہو۔ بہادر شاہ! تم مجھے دفتر چھوڑ کر واپس آ جانا، بیگم صاحبہ کو کہیں جانا ہے۔“ راؤ صاحب اچانک مجھ سے مخاطب ہو گئے۔

”جی راؤ صاحب۔“ میں نے ادب سے جواب دیا۔

راؤ صاحب انڈوں پر نمک چھڑک رہے تھے۔ وہ انڈے بیگم صاحبہ کی طرف بڑھا کر بولے۔ ”لو۔“

”اُفوہ... اب نہیں کھاؤں گی۔“ بیگم نے ناز سے کہا۔

”جی نہیں، آپ انہیں کھائیں گی۔ بس میں نے کہا نا۔“ راؤ صاحب نے سخت لہجے میں کہا۔

”اللہ۔“ بیگم صاحبہ نے پلیٹ لے لی پھر چونک کر مجھے دیکھنے لگیں اور غرا کر بولیں۔ ”اب یہاں کیوں کھڑے ہو؟ جاؤ۔“ میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔ عقل چکرا کر رہ گئی۔

نہ جانے انسپکٹر حیدر علی پر کیا سنک سوار ہو گئی تھی کہ یہاں کیا ہو سکتا ہے۔ اس کوٹھی میں ہے ہی کون؟ ایک عمر رسیدہ شوہر، ایک جوان بیوی اور ایک جوان ملازمہ۔ ان میں سے کون مجرم ہے اور کون جرم کر رہا ہے؟ پھر ایک اور خیال دل میں آیا۔ ممکن ہے سرے سے کچھ نہ ہو۔ انسپکٹر حیدر علی فطرتاً نیک آدمی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ جس کیس میں مجھے سزا ہوئی ہے، اس میں، میں بے قصور تھا اور نادانستگی میں بس آلۂ کار بن گیا تھا۔ اس کے بعد مجھے ایک بہتر زندگی حاصل کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ ان حالات سے متاثر ہو گیا اور

اس لیے اس طرح میری مدد کرنا چاہی۔ مگر یہ خیال بھی تسلیم کہیں ہو رہا تھا۔ راؤ ریاست باہر نکل آئے تو میں نے ادب سے کار کا دروازہ کھول دیا اور انہیں لے کر چل پڑا۔

راؤ ریاست کو ان کے دفتر پر اتارا تو وہ بولے۔ ”جاؤ، اور ہاں... تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ اس کے غصے کو محسوس نہ کرنا۔“

”جی۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ میں منتظر تھا کہ راؤ ریاست اور کہیں لیکن وہ خاموشی سے چلے گئے۔ میں نے کار واپس موڑ دی۔ صبر کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ واپس کوٹھی آ گیا۔ بیگم صاحبہ تیار ہو گئی تھیں۔ لباس خوب صورت لیکن سادہ تھا۔ اگر موٹاپا تیزی سے نہ چڑھ رہا ہوتا تو یقیناً حسین کہلاتیں مگر اب بھی کافی خوب صورت لگ رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے تین پتے بتائے جہاں انہیں جانا تھا۔ پہلی جگہ وہ دس منٹ رکیں اور اس کے بعد وہاں سے واپس آ گئیں۔ ان کا موڈ اس وقت خوش گوار لگ رہا تھا، کہنے لگیں۔

”تم گونگے ہو کیا؟“

”نہیں بیگم صاحبہ۔“ میں نے ادب سے کہا۔

”تو گویا خاموش طبع ہو؟“ انہوں نے سوال کیا۔

”میں نے کہا ــ ”نہیں بیگم صاحبہ! ایسا بھی نہیں ہے۔ لیکن آپ سے باتیں کرنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں؟“

”اس سے پہلے کہاں ملازمت کرتے تھے؟“ انہوں نے اچانک ہی سوال کیا لیکن میرے پاس اس کا جواب پہلے ہی سے موجود تھا۔ میں نے کہا۔

”ایک دواؤں کی کمپنی کے انگریز منیجر کے پاس ذاتی ملازم تھا۔ وہ انگلینڈ چلا گیا تو میں بے روزگار ہو گیا۔“

”تم سے کس نے کہا کہ راؤ صاحب کو ڈرائیور کی ضرورت ہے؟“

”نہیں بیگم صاحبہ! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس میں نے خود ہی راؤ صاحب کو کار سے اترتے ہوئے دیکھا۔ ان کی حالت خراب ہو رہی تھی، انہیں سنبھال کر میں نے انہیں ان کے دفتر پہنچا دیا۔ تب انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور کیا کرتا ہوں؟ میں نے انہیں بتایا کہ میں بے روزگار ہوں تو انہوں نے مجھے ڈرائیور کی حیثیت سے رکھ لیا۔“

بیگم صاحبہ نے کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ”یہ ایک بہت افسوس ناک پہلو ہے بہادر شاہ کہ راؤ ریاست

آخرکار

یہاں پل کمزور سا ہے...... یہ احمق ہمیں نیچے گرا دے گا

ذہنی طور پر متوازن نہیں ہیں۔ کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ وہ اپنی ذہنی قوتیں کھو چکے ہیں اور بعض اوقات سوچے سمجھے بغیر بات کرتے ہیں۔ تمہیں ابھی آئے ہوئے زیادہ وقت نہیں ہوا لیکن نوجوان آدمی ہو، مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ ویسے بھی خاصے سلیقے کے معلوم ہوتے ہو۔ کچھ پڑھے لکھے ہو؟“

”بہت معمولی سا۔“ میں نے جواب دیا۔

”اسی لیے میں تمہیں صورتِ حال بتا دینا چاہتی ہوں۔ یہ کوٹھی... اس کی شان و شوکت جو کچھ بھی تم دیکھ رہے ہو، بالکل عارضی ہے، بہت مختصر وقت رہ گیا ہے، جب یہ سب کچھ ہم سے چھن جائے گا۔ راؤ ریاست دوالیا ہو چکے ہیں اور اسی لیے وہ ذہنی توازن بھی کھوتے جا رہے ہیں۔

”اگر تم انہیں پہنچانے ان کے دفتر گئے تھے تو تم نے دیکھا ہو گا کہ سجے سجائے دفتر میں وہ خاموش اور تنہا بیٹھے رہتے ہیں۔ کچھ عرصے پہلے اس دفتر میں بہترین کاروبار ہوتا تھا لیکن راؤ ریاست کی غلط پالیسیوں نے نقصانات پر نقصانات پہنچانا شروع کر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرم قطعی طور پر دوالیا ہو گئی۔ سارے اسٹاف کو چھٹی دے دی گئی۔ کاروبار بند ہو گیا اور اب راؤ صاحب وہاں بیٹھ کر صرف لکیر پیٹتے ہیں۔ یہی مسئلہ ہماری کوٹھی کا ہے۔ دنیا کی ہر چیز قرض پر آ رہی ہے اور قرض اتنا بڑھ چکا ہے کہ بالآخر ہمیں کوٹھی، دفتر اور وہاں کی ایک ایک چیز چھوڑنا ہو گی۔ ہمارے پاس اتنی سکت نہیں کہ ہم ملازموں کو تنخواہ دے سکیں۔ سائرہ ہمارے ساتھ بہت عرصے سے ہے۔ وہ تنخواہ نہیں لیتی۔ خود بھی بے سہارا ہے اور ہماری مشکلات میں ہمارا ساتھ دے رہی ہے... تو یہ ہے صورتِ حال۔

”پہلے اس کوٹھی میں بھی کئی ملازم تھے لیکن میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رفتہ رفتہ سب کو نکال دیا۔ ان میں سے کچھ خود ہی چلے گئے کیونکہ انہیں تنخواہ نہیں مل پاتی تھی۔ کوئی کہاں تک انتظار کر سکتا ہے۔ میں نے بہت مشکل سے کچھ چیزیں فروخت کر کے ان کی تنخواہیں ادا کی ہیں اور اب تم اس بات سے خود اندازہ لگا سکتے ہو کہ یہاں تمہارا مستقبل کیا ہے۔ ہم ہوا کے دوش پر رکھے ہوئے چراغ ہیں، کوئی بھی جھونکا ہمیں بجھا سکتا ہے۔ تم میرے خیال میں خاموشی سے یہاں سے رخصت ہو جاؤ۔ اگر ضرورت مند ہو تو میں تھوڑی بہت مالی امداد کر سکتی ہوں۔ تمہیں خوامخواہ اپنے آپ کو مشکلات میں ڈالنے کا کیا فائدہ؟"

میں بغور اس کی گفتگو سن رہا تھا اور سست رفتاری سے کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ اب اتنا ناتجربہ کار بھی نہیں تھا کہ ان باتوں کے جواب میں کوئی معقول بات نہ کر سکتا۔ میں نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا آپ مجھے انسان نہیں سمجھتیں بیگم صاحبہ؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"بیگم صاحبہ! میرے سینے میں بھی دل موجود ہے۔ ملازمتیں تو مجھے اور بھی مل سکتی ہیں لیکن آپ لوگوں کو چھوڑنا اب میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ پتا نہیں کہاں اور کس جگہ کام آ جاؤں۔ آپ نے راؤ ریاست صاحب پر غور نہیں کیا۔ جس وقت میں نے انہیں دیکھا تھا، وہ بالکل نیم مردہ کیفیت میں تھے۔ ان حالات کو جاننے کے بعد میں اس گھر کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

"بالکل احمق ہو تم۔ ہمیں ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنے مسائل سے خود نمٹنے کی کوشش کر رہے ہیں... سمجھے تم؟ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہے۔"

"معافی چاہتا ہوں بیگم صاحبہ! راؤ ریاست کو میری ضرورت ہے۔ تنخواہ ملنے نہ ملنے کا معاملہ بعد کا ہے۔" میں نے کہا۔

"بائیں سمت موڑ لو۔" انہوں نے کہا۔ اس کے بعد.... کچھ نہیں کہا تھا پھر میں نے انہیں تیسری جگہ پہنچایا تو انہوں نے کہا۔ "اب تم یوں کرو کہ راؤ صاحب کے پاس چلے جاؤ۔ ان کی طبیعت ٹھیک ہو تو انہیں لے کر ادھر سے گزرنا اور مجھے ساتھ لے لینا۔ اگر طبیعت خراب ہو تو انہیں گھر پہنچانے کے بعد میرے پاس آ جانا۔"

میں واپس چل پڑا۔ ابھی کافی وقت تھا۔ انسپکٹر حیدر علی سے ملنے کو دل چاہا اور انہیں تلاش کرنے میں ناکام نہ رہا۔

"گڈ!" وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے۔ "کہو کیسا تجربہ ہے؟"

"اجازت ہو تو سچ بول دوں؟ برا نہ مانیے گا۔"

"کہو؟"

"آپ نے مجھے جس بھوت گھر میں بھیجا ہے، اس میں شاید میں اپنا ذہنی توازن قائم نہ رکھ سکوں۔"

"میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کس قسم کی ملازمت چاہتے ہو؟ تم نے ازراہِ تفنن کہا تھا کہ محکمۂ پولیس میں بھرتی کرا دیجیے۔ ظاہر ہے، تمہیں کانسٹیبل بھرتی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کسی مناسب عہدے کے لیے عمدہ تربیت ضروری ہوتی ہے اور شاید تم نہیں جانتے کہ پولیس کو جرم کے خلاف ہی سب کچھ کرنا ہوتا ہے۔ یہ تمہاری ملازمت نہیں بلکہ امتحان ہے اور اس کے بعد تم سے دوسری ملازمت کا وعدہ کیا گیا ہے۔"

"وہ ایک دوالیا خاندان ہے جہاں ایک بیوی پرست شوہر ہے۔ ایک شوہر سے بے نیاز بیوی ہے۔ ایک نوجوان ملازمہ ہے۔ راؤ ریاست ایک خالی دفتر میں جا کر خاموش بیٹھ جاتے ہیں۔ جہاں کوئی کاروبار نہیں ہوتا۔ ان کی بیوی ڈرائیور رکھنے کی مخالف ہے کیونکہ وہ اسے تنخواہ نہیں دے سکتے۔"

"ہمیں اس کا علم ہے۔" انسپکٹر حیدر نے سکون سے کہا پھر بولے۔ "تمہیں وہاں کوئی دقت ہوئی؟"

"نہیں۔"

"پھر کیا مشکل ہے؟"

"صرف ایک۔" میں نے کہا۔

"کیا؟"

"میں نہیں جانتا کہ مجھے وہاں کیا کرنا ہے۔ بیگم راؤ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ مجھے کس نے بتایا کہ راؤ صاحب کو کسی ڈرائیور کی ضرورت ہے۔"

"اوہ... تم نے کیا جواب دیا؟" انسپکٹر حیدر علی نے چونک کر پوچھا تو میں نے انہیں مختصر تفصیل بتا دی۔ وہ خوش ہو کر بولے۔ "یہ بھی ایک چکر ہے۔ مرزا منیر بیگ صاحب ریٹائرڈ، ڈی آئی جی اور راؤ ریاست ان کا شناسا یا معمولی سا دوست، اس نے مرزا منیر بیگ سے درخواست کی تھی کہ اس کا تحفظ کیا جائے۔ اسے خطرہ ہے کہ اسے ہلاک کر دیا جائے گا۔ اسے زندگی کا خطرہ ہے۔"

"کس سے؟"

"شاید اپنی بیوی سے..... منیر بیگ نے مجھ سے تذکرہ کیا لیکن جرم سے پہلے کوئی مؤثر کارروائی نہیں کی جا سکتی تھی۔ حالات کا اندازہ لگانے کے لیے ہمیں کسی غیر متعلق لیکن ذہین آدمی کی ضرورت تھی جسے وہاں پہنچایا جا سکے...

اور میری نگاہِ انتخاب تم پر پڑی۔ مجھے پولیس میں سولہ سال گزر چکے ہیں برخوردار! میرا کچھ تو تجربہ تسلیم کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد صورتِ حال کا اندازہ لگا لو گے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ اور ایسے معاملات ہیں جن کی تصدیق ضروری ہے۔ میں کسی ذمے دار آدمی کے سپرد بھی یہ کام کر سکتا تھا لیکن اس بار میں نے ایک تجربہ کیا ہے۔"

حیدر علی صاحب کے انکشافات بڑے دلچسپ تھے۔ مجھے بڑا عجیب لگا۔ میں تو اس مختصر ترین خاندان کے بارے میں بالکل ہی مختلف انداز میں سوچ رہا تھا۔ گو مجھے وہاں پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا لیکن بیگم صاحبہ نے جو کچھ بتایا تھا، اس سے میں نے ایک تاثر قائم کر لیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ بیگم ریاست بے حد نیک فطرت خاتون تھیں۔ انہیں اپنے شوہر کا کاروبار تباہ ہونے کا رنج تھا مگر وہ ان حالات سے خوش اسلوبی کے ساتھ گزرنا چاہتی تھیں اور اپنے شوہر کو مشکلات کا شکار نہیں ہونے دینا چاہتی تھیں۔ اس کے لیے انہوں نے کوٹھی کو غیر ضروری ملازموں سے خالی کر دیا اور ہر ممکن طریقے سے بچت کر رہی تھیں۔ دوسری طرف راؤ صاحب تھے جن کے ہر انداز سے بیوی کے لیے محبت ٹپکتی تھی مگر دوسری طرف یہ سب کچھ۔

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی تمہیں یہ سوچنا ہے کہ وہاں کیا ہوگا۔ بس تمہیں آنکھیں کھلی رکھ کر یہ اندازہ لگانا ہے کہ کون کیا کر رہا ہے۔ یہ مختصر تفصیل معلوم ہونے کے بعد چونکہ تم خصوصی طور پر ان باتوں پر نگاہ رکھو گے، اس لیے معلومات بھی حاصل کر سکو گے۔ پولیس کو ان دونوں کے ماضی کی تلاش ہے۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ ریٹائرڈ ڈی آئی جی مرزا منیر بیگ، راؤ ریاست کے خدشے کے پیشِ نگاہ یہ سب کچھ کر رہے ہیں بلکہ کچھ اور امور بھی ہیں جن کی تصدیق کرنی ہے اور اس کے لیے جو کچھ تم کرو گے، اسی سے باقی معاملات بھی حل ہو جائیں گے۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا تم؟"

"زیادہ نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"زیادہ سمجھنا بھی نہیں چاہیے ورنہ تیز رفتار ہو جاؤ گے اور تیز رفتاری تمہیں ناکامی سے دوچار کر دے گی۔ اس لیے جتنا سمجھ چکے ہو، اسی کے مطابق کام کرتے رہو۔ ہاں، جوں جوں تم رپورٹ دیتے رہو گے، تمہیں معاملات بتائے جاتے رہیں گے۔"

"گویا آپ میری تربیت بھی کر رہے ہیں؟"

"یہی سمجھ لو۔" حیدر علی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا، اب اجازت چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، کسی بھی اہم واقعے سے پریشان نہ ہونا۔ تم سے وعدہ کیا گیا ہے کہ تمہیں کسی بھی مشکل میں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ تم قانون کے محافظ کی حیثیت سے کام کر رہے ہو۔" ان الفاظ پر دل تو بہت چاہا کہ حیدر علی صاحب سے بہت سے شکوے کروں مگر یہ نامناسب تھا اور حیدر علی صاحب کی شخصیت سے انحراف تھا۔ میں وہاں سے اٹھا اور دفتر چل پڑا۔ راؤ صاحب بہتر حالت میں تھے۔ مجھے دیکھ کر اشارے سے پاس بلا لیا۔ میں ان کے کیبن میں داخل ہو گیا۔

"بیٹھو۔" انہوں نے کہا تو میں بیٹھ گیا۔ "کیسی گزر رہی ہے؟"

"ٹھیک ہوں راؤ صاحب۔"

"کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

"کہاں، کہاں گئے تھے اسے لے کر؟" انہوں نے پوچھا تو میں نے تفصیل بتا دی۔ "اور کوئی خاص بات؟"

"نہیں... راؤ صاحب۔"

"کبھی کوئی پریشانی ہو، کوئی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا۔"

"جی راؤ صاحب۔" میں نے کہا۔ راؤ کے چہرے سے یہ اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہوں مگر کہہ نہ پا رہے ہوں۔ ان کی متجسس آنکھیں میرا جائزہ لے رہی تھیں لیکن وہ مجھ سے مزید کہنے کی ہمت نہ کر پائے۔ پروگرام کے مطابق میں انہیں لے کر اس جگہ پہنچا جہاں مسز راؤ کو چھوڑا تھا۔ وہاں سے انہیں ساتھ لیا اور کوٹھی واپس چل پڑا۔ راستے میں راؤ صاحب نے بیگم سے پوچھا۔

"کیا رہا؟"

"وہ مجھے منع تو نہیں کر سکتی تھی۔"

"تو کام بن گیا؟"

"ہاں، سنو عالیہ کے پاس ایک کرولا بیکار کھڑی ہوئی ہے۔ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ چاہوں تو لے جاؤں۔"

"چلتی ہوئی ہے؟" راؤ صاحب نے پوچھا۔

"ہاں، پرفیکٹ کنڈیشن میں ہے۔"

"کون سا ماڈل ہے؟"

"پچاسی کا۔"

"لے لو۔ کتنے پیسے دینے پڑیں گے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میرا خیال ہے، پیسے نہیں لے گی۔''
''اوہو... تو پھر تم نے تکلف کیوں کیا لے لیتیں۔ اس وقت تو ہمیں ہر سہارے کی ضرورت ہے۔ بیچ دیں گے، اچھے خاصے پیسے مل جائیں گے۔ بعد میں اگر کوئی بات ہوئی تو دیکھ لیں گے۔'' راؤ ریاست نے کہا۔
''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ آخر سوسائٹی میں منہ بھی دکھانا ہے۔ ایسی حرکتیں کر کے کیا ہم عزت سے زندگی گزار سکیں گے؟''
''ارے نہیں... نہیں، میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میرا مطلب تو بس یہ تھا کہ اگر کوئی ایسی چیز ہاتھ آ رہی ہے تو کیا حرج ہے۔ بھئی برا نہ ماننا میری بات کا۔''
''گاڑی لینے کا فیصلہ تو میں نے بھی کر لیا ہے مگر جلد بازی نہیں کی۔ بس ایسے ہی ذرا تکلف سے کام لیا ہے۔ میرا خیال کچھ اور ہے...''
''کیا...؟'' راؤ ریاست نے پوچھا۔
''مطلب یہ ہے کہ گاڑی ورکنگ آرڈر میں ہے۔ تم استعمال کر لینا۔ مجھے کتنی تکلیف رہتی ہے۔ میں یہ گاڑی چلا لیا کروں گی۔ دوسری گاڑی وہ ہو جائے گی۔ کیا خیال ہے؟''
راؤ ریاست خاموش رہے پھر انہوں نے کہا۔
''ہاں... ہاں... کیا حرج ہے۔ ٹھیک ہے تو پھر تم یوں کرو کہ ٹیلی فون پر عالیہ سے کہہ دینا کہ ہم گاڑی منگوا لیں گے۔''
بیگم راؤ خاموش ہو گئیں۔ میں یہ تمام گفتگو سن رہا تھا۔ بڑے دلچسپ معاملات تھے ان میاں بیوی کے بھی۔ اگر حالات میرے علم میں نہ آ جاتے اور صورتِ حال یہ نہ ہوتی جس کی بنا پر یہاں پہنچا تھا تو اسے میں ایک عام گھریلو بات سمجھتا لیکن اب خوامخواہ حیدر علی کے انکشاف کے بعد دل میں تجسس پیدا ہو گیا تھا اور اب ہر چیز پر نگاہ رکھنے کو جی چاہتا تھا۔ کوٹھی کے معاملات بالکل ویسے ہی تھے اور ان میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ باقی وقت میں نے بھی گھر پر ہی گزارا تھا۔
نہ بیگم صاحبہ کہیں باہر نکلیں اور نہ راؤ صاحب۔ ویسے راؤ صاحب نے میری رہائش گاہ سرونٹ کوارٹر میں رکھنے کے بجائے اندر ہی رکھ کر مجھے بہتر کام کرنے کا موقع دیا تھا۔ ان کی متجسس نگاہوں سے بھی میں نے یہ اندازہ قائم کیا تھا کہ غالباً وہ مجھ سے میرے ہی بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں لیکن ہمت نہیں کر پا رہے... بہرطور، وہ دن معمول کے مطابق گزر گیا اور کوئی ایسی بات محسوس نہ ہوئی جو خلافِ طبع ہوتی۔

دوسرے دن جب میں راؤ صاحب کو لے کر آفس جانے لگا تو بیگم صاحبہ نے مجھ سے کہا۔
''سنو... بہادر! وہ گھر تو تمہیں یاد ہے نا جہاں مجھے سب سے آخر میں چھوڑا تھا اور جہاں سے تم مجھے لے کر گھر واپس آئے تھے؟''
''جی بیگم صاحبہ!'' میں نے جواب دیا۔
''راؤ صاحب کو دفتر چھوڑ کر وہاں چلے جانا۔ میں اپنی دوست عالیہ کو فون کر دوں گی۔ تم اسے اپنا نام بتا دینا۔ وہ تمہیں ایک گاڑی دے گی۔ اسے لے کر یہاں گھر آ جانا۔ بعد میں راؤ صاحب کو لینے چلے جانا۔''
''جی بیگم صاحبہ...'' میں نے جواب دیا۔ راستے میں راؤ صاحب نے مجھے کہا۔
''گاڑی لے کر پہلے کسی مکینک کے پاس لے جانا اور اسے چیک کرا لینا، بعد میں اسے گھر لانا۔ میں تمہیں پیسے دے دوں گا۔'' میں نے راؤ ریاست صاحب سے بھی اس کا وعدہ کر لیا۔ پھر انہیں چھوڑنے کے بعد میں اس کوٹھی پر جا پہنچا۔ ایک نوجوان خاتون سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنا نام بتایا تو انہوں نے گہرے نیلے رنگ کی ایک کرولا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔
''یہ گاڑی ہے اور یہ اس کی چابی ہے۔ لے جاؤ...''
میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اس کے بعد اسے چلاتا ہوا باہر لے آیا۔ کسی مکینک سے میرا کوئی تعارف نہیں تھا لیکن پھر بھی ایک جگہ ایک آٹو گیراج پر رکا اور وہاں ایک مکینک سے کرولا کو چیک کرایا۔ دو سو روپے اسے دیے جو راؤ صاحب نے مجھے دیے تھے۔ مکینک نے گاڑی کو فٹ قرار دیا تھا۔ میں اسے لے کر کوٹھی پہنچ گیا۔ بیگم صاحبہ باہر ہی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ سائرہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ گاڑی کے قریب آ گئیں اور اندر باہر سے اس کا جائزہ لینے لگیں پھر مطمئن انداز میں گردن ہلا کر بولیں۔
''ٹھیک ہے۔ میں نے راؤ صاحب کو.... فون کر دیا ہے۔ دوپہر کو تم مجھے ساتھ لے کر اس گاڑی میں چلنا۔ میں وہاں سے وہ گاڑی اٹھا لوں گی۔ مجھے کچھ کام ہیں۔''
یہی کیا گیا اور میں دوپہر کو راؤ صاحب کے دفتر پہنچ گیا۔ بیگم صاحبہ گاڑی کی چابی لے کر چل پڑیں۔ راؤ صاحب نے بھی کرولا کا بغور معائنہ کیا بعد میں اس میں بیٹھنے کے بعد گھر کی سمت چلتے ہوئے بولے۔
''تم نے گاڑی مکینک کو چیک کرا لی؟''
''جی... راؤ صاحب۔''

''کیا کہتا ہے؟''
''بالکل فٹ کہتا ہے راؤ صاحب۔''
''چلو ٹھیک ہے۔ اس کے کاغذات وغیرہ کہاں ہیں؟''
''جی، وہ گاڑی میں موجود ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''بیگم صاحبہ نے اس کے بارے میں اور تو کچھ نہیں کہا؟''
''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔
رات کو راؤ صاحب اور بیگم صاحبہ کہیں چلے گئے۔ اس دوران راؤ صاحب کی حالت خاصی ٹھیک لگ رہی تھی۔ سائرہ اور میں گھر میں تنہا تھے۔ میں نے جان بوجھ کر سائرہ کی جانب رخ نہیں کیا۔ ویسے بھی وہ بڑی پُراسرار سی لڑکی تھی۔ اس دن کے بعد سے آج تک مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔ میں اپنے کمرے میں ہی تھا کہ دروازے پر قدموں کی چاپ سنائی دی اور سائرہ چائے کی دو پیالیاں ٹرے میں رکھے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے سرد اور سپاٹ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت بھی الجھی الجھی سی نظر آ رہی تھی۔ چائے کی دونوں پیالیاں ایک جگہ رکھ کر وہ ایک پیالی لے کر میرے قریب آئی اور مجھے پیالی پیش کرتے ہوئے بولی۔
''موڈ ہے نا چائے کا؟''
''کیوں نہیں... چائے سے کون انکار کر سکتا ہے؟''
''تم مجھ سے ناراض معلوم ہوتے ہو؟''
''نہیں سائرہ صاحبہ! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''
''اس دن سے بالکل خاموش ہو۔ بات بھی نہیں کی مجھ سے؟'' میں نے نگاہیں اٹھا کر سائرہ کو دیکھا اور بولا۔
''اور مجھے یہی محسوس ہوتا ہے سائرہ صاحبہ کہ جیسے آپ خود مجھ سے دور رہنا چاہتی ہیں۔ حالانکہ اس دن آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ میرے آ جانے سے آپ کو خوشی ہوئی ہے لیکن بعد میں، میں نے یہ محسوس کیا کہ جیسے آپ مجھے ناگوار محسوس کر رہی ہیں۔''
''بالکل نہیں، بہادر شاہ! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ برائے کرم میری کسی بات کا برا نہ ماننا۔ میں بہت زیادہ پریشان حال اور الجھی ہوئی لڑکی ہوں۔'' میں خاموش نگاہوں سے سائرہ کو دیکھتا رہا۔ وہ چند لمحے توقف کے بعد بولی۔
''بیگم صاحبہ نے محسوس کر لیا تھا کہ میں تم سے گھلتی ملتی جا رہی ہوں۔ چنانچہ مجھے ڈانٹ پلائی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ اگر میں عزت سے رہنا چاہتی ہوں تو اپنے آپ کو محدود رکھوں۔ ورنہ خوامخواہ نکال دی جاؤں گی۔ بس یہی وجہ تھی۔ مجھے تمہارا ابھی احساس تھا کہ نہ جانے تم کیا سوچتے ہو گے۔''
میں چائے کے گھونٹ لیتا رہا۔ سائرہ کی جانب میں نے نظر نہیں اٹھائی تھی۔ وہ بھی خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔
''میرا خیال غلط نہیں تھا...؟''
''کون سا خیال۔'' میں نے چونک کر پوچھا۔
''یہی کہ تم نے میرے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی ہو گی۔''
''نہیں... سائرہ صاحبہ! لیکن میں انسان ہوں۔ خیالات تو ذہن میں آتے ہی ہیں جبکہ آپ نے میرے ہر طرح کے سوالات پر پابندی لگا دی ہے۔''
''میں نے...؟'' وہ حیرت سے بولی۔
''کیوں، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''
''میرا تو خیال ہے، میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔'' وہ تعجب بھرے لہجے میں بولی۔
''خیر، آپ نے لفظوں میں یہ بات نہیں کہی لیکن احساس ضرور دلا دیا ہے۔ آپ نے مجھ سے کہا تھا تاکہ تفصیلات پوچھنے نہ بیٹھ جاؤں۔ لیکن ظاہر ہے جب دو افراد آمنے سامنے ہوتے ہیں اور کوئی انوکھی بات سامنے آ جاتی ہے تو سوالات خودبخود ذہن میں پیدا ہو جاتے ہیں۔'' وہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔
''نہیں، اب اتنی پابندیاں بھی نہیں ہیں تم پر۔ بس یوں سمجھ لو کہ جن باتوں کے لیے مجھے منع کیا گیا ہے، میں وہ باتیں تمہیں نہیں بتا سکتی۔ ہر گھر کے اپنے معاملات ہوتے ہیں اور ملازموں کو ان کی پابندی کرنا ہی پڑتی ہے۔''
''بیگم صاحبہ میرے یہاں ملازم ہونے کے خلاف ہیں۔ ہو سکتا ہے مجھے جلد یہاں سے نکال دیا جائے۔''
''تم مرد ہو، تمہیں دوسری نوکری تلاش کرنے میں کیا دقت ہو گی؟''
''نہیں، نوکریاں آسانی سے کہاں ملتی ہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ عورتوں کو آسانی سے ملازمت مل جاتی ہیں۔ ویسے تمہیں تو ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ بیگم صاحبہ تمہارے خلاف ہیں اور نہ راؤ صاحب۔'' میں نے کہا۔ وہ خاموش ہو گئی اور دیر تک کچھ نہ بولی تو میں نے کہا۔ ''ویسے تم بھی مجھے یہاں خوش معلوم نہیں ہوتیں۔ کیا تم یہاں نوکری کرنے پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجبور ہو؟''

''ہاں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''کیوں؟ میرا خیال ہے تم پڑھی لکھی ہو اور پھر نوجوان ہو۔ کہیں بھی محنت کر سکتی ہو۔ تمہارے دوسرے رشتے دار وغیرہ بھی ہوں گے۔''

''نہیں، کوئی نہیں ہے۔''

''اوہ... تنہا ہو؟''

''ہاں... والد بچپن میں مر گئے تھے۔ والدہ بیمار رہتی تھیں۔ میں نے میٹرک پاس کیا تھا۔ والدہ نے شادی کر دی مگر...'' وہ سسکی سی لے کر خاموش ہو گئی۔

''مگر کیا...؟'' میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

''شادی میرے لیے ایک بھیانک تجربہ ثابت ہوئی۔ میرا شوہر مجھ سے عمر میں کافی بڑا اور نشہ آور ادویات کا رسیا تھا۔ اس کے ذرائع آمدنی بھی اچھے نہ تھے۔ فاقے اور پریشانیوں کے علاوہ مجھے کچھ نہ ملا۔ بیمار ماں میرے دکھوں کی تاب نہ لاسکی اور مجھے مشکل میں چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ میری مشکلات کا کوئی حل نہیں تھا۔ تقدیر کے بہتر فیصلے کا انتظار کر رہی تھی اور فیصلہ میرے حق میں ہو گیا۔''

''کیا؟'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

''وہ جس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، خدا کے عتاب کا شکار ہو گیا۔ نشے کے عالم میں سڑک پار کر رہا تھا کہ ایک منی بس کے نیچے آکر ہلاک ہو گیا۔ بیوگی کا ایک سال گزارا اور فاقہ کشی کی عادی ہونے کی وجہ سے زیادہ دقت نہیں ہوئی مگر کہاں تک؟ روٹی نہ سہی سر چھپانے کا ٹھکانا تو چاہیے تھا۔ یہ پہلی جگہ ملی اور یہاں نوکر ہو گئی۔ یہ گوشۂ عافیت ہے کچھ پابندیوں کے ساتھ... مگر یہ پابندیاں عزت کی زندگی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔''

''اوہ... مجھے بہت افسوس ہوا۔ یہاں نوکری کرتے کتنا عرصہ گزرا ہے؟''

''تین سال ہو گئے۔''

''یہ دونوں ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں؟''

''ہمیشہ سے۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا پھر بولی۔ ''یہ دونوں دو سال سے ایسے ہیں۔''

''دو سال سے؟ اس سے پہلے؟''

''مجھے یہاں آئے ہوئے تین سال ہو گئے ہیں میرے آنے سے تین ماہ پہلے ان کی شادی ہوئی تھی۔ بیگم صاحبہ نئی نویلی دلہن تھیں اور راؤ صاحب ان کے دیوانے۔ وہ آج بھی ان کے دیوانے ہیں مگر دو سال سے حالات بہت خراب ہیں۔ راؤ صاحب کے کاروبار میں بڑے بڑے گھاٹے ہوئے اور حالات بگڑتے چلے گئے ہیں۔ دفتر کا کام بند ہوا۔ قرضے چڑھتے چلے گئے۔ لاکھوں پریشانیاں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ گھر میں پانچ ملازم تھے۔ میرے علاوہ ایک ایک کر کے انہیں جواب دے دیا گیا۔ پہلے یہاں بہت کچھ ہوتا تھا۔ بیگم صاحبہ کی دوست لڑکیاں اور لڑکے آتے تھے۔ دعوتیں ہوتی تھیں۔ ہنگامے ہوتے تھے۔ سب بند ہو گئے اور اب قرضوں پر دارومدار ہے۔ کبھی بیگم صاحبہ اپنی کسی دوست سے قرض لے آتی ہیں اور کبھی راؤ صاحب۔ یوں کام چل رہا ہے۔''

''راؤ صاحب کی تو صحت بھی خراب ہو گئی ہے؟''

''ہاں... پریشان جو ہیں۔''

''مگر بیگم صاحبہ تندرست ہیں؟''

''کہاں، بلڈ پریشر کی مریض ہیں۔ کبھی کبھی طبیعت خراب ہو جاتی ہے مگر کھانے پینے کی بے حد شوقین ہیں۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کھاتی پیتی رہتی ہیں۔ پھل، مٹھائیاں، حلوے۔ حالانکہ ڈاکٹر منع کرتے ہیں۔''

''راؤ صاحب بھی ان کا بہت خیال کرتے ہیں۔''

''حد سے زیادہ... مگر...'' سائرہ خاموش ہو گئی۔

''مگر کیا؟''

''نہیں، یونہی کہہ رہی تھی۔ عجیب بات ہے۔ بات گھوم پھر کر انہی لوگوں تک پہنچ جاتی ہے۔ تم اپنے بارے میں بھی کچھ بتاؤ۔''

''میں بھی اس کائنات میں تنہا ہوں۔ تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہوں۔ عرصے سے نوکریاں کرتا ہوں اور بس۔''

''والدین، بہن بھائی کوئی نہیں ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں... کوئی نہیں ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''شادی نہیں کی؟''

''نہیں...''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ میرے بارے میں کوئی سوچنے والا نہیں تھا۔'' میں نے کہا تو وہ خاموش ہو گئی پھر چونک کر بولی۔

''اب میں چلتی ہوں۔ آج تم سے اتنی باتیں کر کے خود کو دوبارہ زندگی کے قریب محسوس کر رہی ہوں ورنہ...'' وہ برتن سمیٹنے لگی پھر بولی۔

''میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ مجھ پر کیا پابندیاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ میرے بارے میں کوئی غلط خیال دل میں نہ لانا اور میری خاموشی کو مجبوری سمجھنا۔" وہ برتن لے کر دروازے کی طرف چل پڑی پھر دروازے کے قریب رک کر بولی۔

"میرے اور اپنے درمیان ہونے والی باتوں کو کبھی کسی کے سامنے نہ کہنا، میری نوکری کا سوال ہے۔" وہ باہر نکل گئی مگر میرے دل پر ایک عجیب تاثر چھوڑ گئی۔

میں دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا پھر مجھے راؤ ریاست اور بیگم صاحبہ کا خیال آیا۔ صرف چند سال ہوئے ہیں ان کی شادی کو۔ اس سے پہلے دونوں کیا کرتے رہے؟ راؤ ریاست کا کاروبار کیوں تباہ ہوا اور راؤ صاحب کا خوف کیا معنی رکھتا ہے کہ اس کی بیوی اسے قتل کر دے گی؟

اچانک ہی ایک اور خیال میرے دل میں آیا۔ کیوں نہ کسی وقت راؤ ریاست اور بیگم صاحبہ کے کمرے کی تلاشی لی جائے۔ حیدر علی صاحب نے مجھے یہاں کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا تھا۔ ہو سکتا ہے اس تلاشی سے مجھے کوئی کارآمد بات معلوم ہو جائے لیکن اس میں خطرہ تھا۔ میرے دل میں کوئی مجرمانہ تصور نہیں تھا۔ اگر کوٹھی میں مجھے سونے کے انبار بھی مل جاتے تو بھی میرے دل میں کوئی مجرمانہ بے ایمانی نہیں آسکتی تھی کیونکہ میں فطرتاً برا نہیں تھا۔

جیل سے نکلنے کے بعد اتنے گر آ گئے تھے کہ دولت مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھی لیکن ایک بار بھی ان میں سے کوئی ذریعہ اختیار کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ ایسی کسی کوشش سے کوٹھی کے مکین میری طرف سے بدظن ہو سکتے تھے لیکن احتیاط کی جا سکتی تھی۔ اس وقت بھی وہ بڑے اطمینان سے کوٹھی ہم دونوں پر چھوڑ کر چلے گئے تھے حالانکہ وہاں کافی قیمتی سامان تھا۔ راؤ صاحب کو تو مجھ پر اس لیے بھروسا ہوگا کہ میں منیر بیگ کا بھیجا ہوا تھا مگر بیگم صاحبہ... میں یہ کام کروں گا کسی دن لیکن احتیاط کے ساتھ۔ دوسرا دن حسبِ معمول تھا۔ اب میں وہی کرولا چلاتا تھا جو بیگم صاحبہ کی دوست نے انہیں دی تھی۔ تین چار دن اسی طرح گزرے، کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ پانچویں دن دفتر پہنچنے کے بعد راؤ صاحب نے مجھ سے کہا۔

"کہو بہادر! کوئی خاص بات؟"

"نہیں راؤ صاحب! سب ٹھیک ہے۔"

"بیگم صاحبہ نے تو تم سے کوئی بات نہیں کی؟"

"نہیں، راؤ صاحب! وہ مجھ سے بات ہی کہاں کرتی ہیں۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔ راؤ ریاست عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہوں گر میں بھی ہوشیار تھا۔ بالآخر انہوں نے کہا۔

"مرزا منیر بیگ صاحب نے تمہیں میرے بارے میں کیا بتایا تھا؟"

"یہی کہ مجھے آپ کے پاس نوکری مل جائے گی؟"

"اور کچھ نہیں کہا تھا انہوں نے؟" راؤ ریاست کے انداز میں جھلاہٹ تھی۔

"کہا تھا راؤ صاحب۔"

"کیا...؟" وہ جلدی سے بولا۔

"انہوں نے کہا تھا کہ جب تک راؤ صاحب تمہارے سامنے زبان نہیں کھولیں اور تم سے کچھ نہ کہیں، تم خاموشی سے اپنا کام انجام دیتے رہنا۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا کام کرتے رہنا؟"

"آپ کی ڈرائیوری۔"

"مجھے ڈرائیور کی ضرورت نہیں تھی۔"

"میں جانتا ہوں راؤ صاحب۔" میں نے سکون سے جواب دیا۔ تو وہ مجھے گھورنے لگے پھر بولے۔

"تم محکمۂ پولیس کے ملازم ہو؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتا راؤ صاحب۔"

"کیوں...؟"

"مجھے منع کیا گیا ہے جناب۔"

"کمال ہے۔ منیر بیگ بھی عجیب ہیں۔ حالانکہ... مگر تم نے کیا کہا؟ اور تم کہہ رہے تھے کہ اگر میں زبان نہ کھولوں تو تم خاموش رہو اور اگر میں زبان کھول دوں تو؟"

"تو میں آپ کے سوالات کے جواب دوں گا۔"

"ہوں، یقیناً تم ایک چالاک آدمی ہو۔ چلو ٹھیک ہے۔ میں ہی ہار مان گیا ہوں۔ تم نے میرے تحفظ کے لیے کیا کیا ہے؟"

"ابھی تک یہ معلوم کر رہا ہوں کہ آپ کو خطرہ کیا پیش آسکتا ہے؟"

"کوئی بھی حادثہ پیش آسکتا ہے مجھے... کوئی گہری سازش ہو سکتی ہے میرے خلاف۔ مجھے تو ایک ایسے مستعد آدمی کی ضرورت ہے جو میرا تحفظ کر سکے۔ تم میری صحت دیکھ رہے ہو... روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ اس قابل بھی نہیں ہوں کہ گاڑی چلا سکوں۔ بعض اوقات ایسے دورے پڑتے ہیں کہ اعصاب بے قابو ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ بے پناہ پریشانیوں کی وجہ سے ہے۔"

"آپ علاج کیوں نہیں کراتے راؤ صاحب؟"

"علاج۔" راؤ صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لے

کر کہا۔ "شاید تم اس بات پر یقین نہ کرو کہ میرے حالات واقعی بے حد خراب ہیں۔ کاروبار بری طرح تباہ ہو چکا ہے۔ قرض خواہوں کو دلاسا دینے کے لیے دفتر میں آ بیٹھتا ہوں تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ میں ان سے منہ چھپا کر روپوش ہو گیا ہوں۔ میں نے ان سے بہت سے جھوٹ بول رکھے ہیں اور انہی سے کام چلا رہا ہوں مگر مجھ میں اور میری بیوی کے حالات میں بہت فرق ہے۔"

"وہ کیا راؤ صاحب؟"

"اس کا لاکھوں کا روپیا بینکوں میں محفوظ ہے۔ اس نے سیکڑوں قسم کے سیونگ سرٹیفکیٹ لے رکھے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس نے نہ جانے کہاں کہاں سرمایہ کاری کر رکھی ہے مگر یہ سب کچھ اس نے مجھ سے چھپا رکھا ہے۔ آہ، اگر وہ میرا ساتھ دے تو میں پھر کروڑوں کما سکتا ہوں مگر... وہ... وہ... مجھ سے اکتا چکی ہے۔ مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے۔"

"بظاہر تو ایسا نہیں ہے۔"

"بظاہر۔" راؤ ریاست نے تلخ لہجے میں کہا۔ "درپردہ وہ مجھ پر پانچ قاتلانہ حملے کرا چکی ہے۔"

"جی۔" میں اچھل پڑا۔

"ہاں میرے دوست... میں غلط نہیں کہہ رہا۔"

"ان حملوں کی نوعیت کیا تھی؟"

"بتاؤں گا تو بھی یقین نہیں کر پاؤ گے۔ بتانا نہیں چاہتا لیکن اسے احساس ہو گیا کہ میں اس کی طرف سے ہوشیار ہوں۔ اس لیے وہ اب جو کچھ کرے گی، سوچ سمجھ کر کرے گی۔ میں اس بات سے خوف زدہ ہوں۔"

"آپ کے خیال میں وہ آپ سے پیچھا صرف اس لیے چھڑانا چاہتی ہے کہ آپ قلاش ہو چکے ہیں؟"

"ہاں... میں اس کے لیے کشش کھو چکا ہوں۔"

"وہ آپ سے طلاق بھی لے سکتی ہیں۔"

"ایسا کرنے سے اسے گھاٹا ہو جائے گا۔"

"کیوں؟"

"میرا ایک کروڑ کا بیمہ ہے جو اسے میری موت کی شکل [illegible] سکتا ہے۔ مجھ سے علیحدہ ہو کر نہیں۔"

"اس کے پریمیم آپ کہاں سے ادا کرتے ہیں۔"

"قرض لے کر۔ ہم نے اپنی ساکھ بنا رکھی ہے۔ میں اپنے بعض دوستوں سے قرض لے رہا ہوں۔ وہ بھی کچھ دوستوں سے بظاہر قرض لیتی ہے مگر میں جانتا ہوں، یہ قرض نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ کرولا بھی ضروری ہے کیونکہ اسے دوسری گاڑی درکار تھی۔ وہ بے حد چالاک ہے۔"

"بڑے سنسنی خیز حالات ہیں راؤ صاحب... آپ خود ان سے علیحدہ کیوں نہیں ہو جاتے؟"

"بے موت مر جاؤں گا کیونکہ اس کے بعد وہ مجھے سب کے سامنے عریاں کر دے گی۔ اسے سارے اِن اور آؤٹ معلوم ہیں۔"

"بظاہر تو آپ کے درمیان بڑی محبت ہے۔ مجھے یہ سب سن کر بڑی حیرت ہوئی۔"

"یہ محبت یکطرفہ ہے۔ میں بدنصیب اسے اپنی زندگی سے زیادہ چاہتا ہوں۔ وہ میرے لیے بہت قیمتی ہے مگر میں اس کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتا۔ میری آرزو ہے کہ میں اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کر لوں۔ اس کے سامنے دولت کے انبار لگا کر اس سے محبت کی بھیک مانگوں۔ آہ... میں... میں۔" راؤ کی آواز بھرا گئی۔ میں نے کہا۔

"آپ کو امید ہے راؤ صاحب کہ آپ پھر سے اسٹیبلش ہو سکیں گے؟"

"کوشش کر رہا ہوں۔"

"مجھے بتائیے کہ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟" میں نے صرف ہمدردی سے کہا تو وہ خاموشی سے سوچنے لگے پھر بولے۔

"میں اسے نقصان نہیں پہنچانا چاہتا مگر خود بھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اس پر نگاہ رکھنا ہوگی کہ وہ کس کس سے ملتی ہے۔ اور وہ تمہاری شدید مخالف ہے مگر تم کوشش کر کے اس کی ہمدردیاں حاصل کر لو۔ اس کے رازدار بن جاؤ۔ اس کے لیے تمہیں محنت کرنا ہوگی۔ میں نے منیر بیگ...... سے کہہ دیا ہے کہ یہ کام ہفتہ پندرہ دن میں نہیں ہوگا۔ اس کے لیے وقت درکار ہوگا۔ تمہیں ایک پیشکش بھی کرنا چاہتا ہوں۔ میری بات کا برا مت ماننا۔ انسان مجبور ہو کر نہ جانے کیا کیا کرتا ہے۔ اجازت دو گے کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، کہہ دوں؟"

"جی راؤ صاحب۔"

"تم کس حیثیت کے مالک ہو یہ میں نہیں جانتا لیکن ڈرائیور کی تنخواہ کے علاوہ میں دس ہزار ماہوار تمہیں خفیہ طور پر ادا کروں گا۔ اس کا ذکر اگر تم چاہو تو منیر بیگ صاحب سے بھی نہ کرنا بلکہ بہتر ہوگا کہ ذکر ہی نہ کرنا۔ اس رقم کے عوض تمہیں اس کے بارے میں سب کچھ معلوم کرنا ہوگا۔ یہ میرے اور تمہارے درمیان خفیہ رابطہ ہوگا اور میں تمہیں ہدایت دیتا رہوں گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ پہلے مجھے بتاؤ کہ یہ پیشکش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہارے لیے قابلِ قبول ہے یا نہیں؟"

"دولت کسے بری لگتی ہے راؤ صاحب مگر آپ کے حالات ایسے کہاں ہیں؟"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ جو کچھ میں کر رہا ہوں، تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔ میری بیماری کچھ نہیں ہے۔ بس یہی پریشانیاں ہیں جنہوں نے میری صحت خراب کر دی ہے۔ میری خواہش ہے کہ میرے اور اس کے درمیان سمجھوتا ہو جائے۔ میں اسے بہت چاہتا ہوں۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

میں عجیب سی الجھن میں پڑ گیا تھا۔ بڑے انوکھے واقعات تھے۔ ان کے پس پردہ کیا ہے۔ لوگ اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر ایسے مضبوط رشتوں کے ساتھ بھی ایسے انوکھے کھیل کھیلتے ہیں۔

"کیا فیصلہ کیا تم نے؟"

"میں تیار ہوں راؤ صاحب۔"

"تمہارا شکریہ بہادر شاہ! اب تم اپنے پروگراموں میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کرلو۔ مجھے دفتر چھوڑ کر واپس گھر چلے جایا کرو۔ اس طرح تمہیں اس کے ساتھ رہنے کا موقع ملے گا اور تم اس کا اعتماد حاصل کر سکو گے۔ آخری بات کہہ کر یہ گفتگو ختم کر دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ اسے ایک مرد کی حیثیت سے متاثر کرنے کی کوشش مت کرنا۔ وہ اس جال میں نہیں پھنسے گی کیونکہ میں اسے جانتا ہوں کہ اگر تم نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو فائدہ اسے حاصل ہوگا۔ وہ تمہیں ایک بدکردار انسان قرار دے کر کوٹھی سے نکلوا سکتی ہے۔ اس بات پر میں بھی اس سے انحراف نہیں کر سکتا۔ اب تم جاؤ۔"

میں راؤ کے پاس سے چلا آیا مگر میرے سر میں ہانڈی پک رہی تھی۔ یاالٰہی! اس دنیا میں یہ سب بھی ہوتا ہے۔ غالباً اس کہانی کو دہراتے ہوئے راؤ ریاست کا غم پھر سے ابھر آیا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد جب میں نے راؤ پر نگاہ ڈالی تو وہ برے حال میں نظر آیا۔ اس پر سانس کا دورہ پڑ گیا تھا۔ آنکھیں چڑھ گئی تھیں اور حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ میں گھبرا گیا، کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ مجبوراً راؤ کے گھر فون کیا۔ سائرہ نے فون ریسیو کیا۔ میں نے اسے صورتِ حال بتائی تو اس نے کہا کہ وہ بیگم صاحبہ کو اطلاع دیتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد بیگم صاحبہ کی آواز سنائی دی۔

"ہاں... کیا بات ہے؟"

"راؤ صاحب کو سانس کا دورہ پڑا ہے۔ حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ میں کیا کروں بیگم صاحبہ؟"

"انہیں گھر لے آؤ۔ یہاں دوائیں موجود ہیں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"جی بیگم صاحبہ!" فون بند کر کے میں نے راؤ صاحب کو سنبھالا اور ہزار دقتوں کے بعد دفتر کا کمرا بند کر کے انہیں لے کر چل پڑا۔ راستے بھر ان کی حالت سخت تشویش ناک رہی۔ ان کا سانس ٹھہر ہی نہیں رہا تھا۔ سینہ دھونکنی بنا ہوا تھا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے گھر تک وہ زندہ نہیں پہنچ سکیں گے سانس کے ساتھ بڑی کرب ناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں تیز رفتاری سے کرولا دوڑاتا ہوا کوٹھی پہنچ گیا۔ بیگم صاحبہ، سائرہ کے ساتھ برآمدے میں موجود تھیں۔ راؤ صاحب کو اندر پہنچا دیا گیا۔

"کسی ڈاکٹر کو لاؤں بیگم صاحبہ؟"

"نہیں... دوائیں موجود ہیں۔ ٹھیک ہو جائیں گے۔" بیگم صاحبہ نے خشک لہجے میں کہا۔ میں وہاں رکا رہا تو انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے؟"

"جی، میرے لیے کوئی ہدایت؟"

"جاؤ... آرام کرو۔" انہوں نے اسی انداز میں کہا تو میں وہاں سے نکل آیا۔ راؤ ریاست کے لیے دل دکھ رہا تھا۔ محبت کا مارا ہوا مظلوم انسان، عجیب الجھا ہوا کیس تھا لیکن میرے لیے ہر طرح سے منافع بخش۔ ہاں، یہ دوسری بات ہے کہ کسی قدر انسانی ہمدردی کا معاملہ بھی تھا مگر میں کیا کر سکتا تھا؟ جس حد تک مجھے راؤ ریاست نے بتایا تھا، اتنا تو خود حیدر علی صاحب کو معلوم تھا۔ باقی دن خاموشی سے گزر گیا۔ سائرہ نے شام کی چائے دی مگر نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا تک نہیں، دوسرے دن نو بجے اس نے کہا۔

"راؤ صاحب دفتر نہیں جائیں گے۔ تم لان کی صفائی کرا دو اور الیکٹریشن کو بلا کر بجلی کے کچھ پوائنٹ ٹھیک کرا دو۔"

"کیسی طبیعت ہے... راؤ صاحب کی؟"

"ٹھیک ہیں۔" اس نے جھٹکے دار آواز میں کہا اور چلی گئی۔ میں بھی کمرے سے باہر نکل آیا... پھر میں سائرہ کے بتائے ہوئے کاموں میں مصروف ہو گیا اور سارا دن اسی میں گزر گیا۔ راؤ صاحب پورے دن نظر نہیں آئے۔ دوسرے دن بھی وہ دفتر نہیں گئے۔ البتہ شام کو میں نے انہیں بیگم صاحبہ کے ساتھ لان میں ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ بالکل ٹھیک نظر آ رہے تھے۔ مجھے اشارے سے بلایا تو... میں ان کے پاس پہنچ گیا۔

"کل دفتر چلنا ہے اور سنو... تم مجھے دفتر چھوڑ کر گھر

واپس آ جایا کرو۔ دفتر میں کوئی کام نہیں ہوتا۔ گھر کے بہت کام ہوتے ہیں۔ کچھ فرنیچر درست کرانا ہے۔ سارا لان اجڑا پڑا ہے۔ تھوڑی سی اس کی دیکھ بھال کرلیا کرو اور بھی کچھ کام ہیں۔ سائرہ تمہیں بتا دیا کرے گی۔ مقررہ وقت پر مجھے جا کر لے آیا کرو۔ میں نے بیگم صاحبہ سے بات کر لی ہے۔"

"جی راؤ صاحب۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔ بیگم صاحبہ نے میری طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ بات ختم ہو گئی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد میں آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ سائرہ اس دوران مجھ سے اس طرح بے تعلق رہی... جیسے شناسائی ہی نہ ہو لیکن اس کی مجبوری میں سمجھتا تھا۔ چنانچہ اب اس کی ان حرکتوں پر میں توجہ نہیں دیتا تھا۔

اس وقت صبح کے ساڑھے پانچ بجے تھے اور میں خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا کہ کسی نے مجھے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ میں نے حیران نگاہوں سے جھنجوڑنے والے کو دیکھا۔ وہ سائرہ تھی۔ وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"بہادر شاہ! ہوش میں آؤ... سنو، گاڑی احتیاط سے چلانی ہے۔ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے اس میں... خیال رکھنا۔ یہ اندازہ خود لگانے کی کوشش کرنا کہ گاڑی میں کیا ہوا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟ میرے الفاظ تمہارے ذہن میں آ گئے ہیں نا؟" اس نے ایک بار پھر مجھے جھنجوڑنے کی کوشش کی۔ میں ہکا بکا اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے کہا۔

"کک... کیا مطلب؟ کیا... کیا کہا ہے؟ گاڑی میں کس نے کچھ کیا ہے؟"

"گاڑی احتیاط سے چلانا۔ بس اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔" وہ برق رفتاری سے واپس پلٹی اور کھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔ میں آنکھیں پھاڑے دروازے کو گھورتا رہا۔ میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ایک تو کچی نیند سے جاگ گیا تھا، اوپر سے سائرہ کے الفاظ... آنکھیں بند ہونے لگیں۔

لیکن دفعتاً ہی ذہن ایک جھٹکے سے جاگ گیا۔ یقینی طور پر سب کچھ خواب نہیں تھا۔ سائرہ اندر آئی تھی۔ اس نے مجھے اطلاع دی تھی۔ چند لمحوں تک میں اسی طرح چکرایا... چکرایا سا لیٹا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر میں اٹھ کر غسل خانے کی طرف چل پڑا۔

سر پر خوب ٹھنڈا پانی بہایا جس سے دماغی کیفیت کچھ بحال ہوئی۔ میں سائرہ کے الفاظ پر غور کرنے لگا۔ ہاں، سائرہ گاڑی کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھی۔ گاڑی... گاڑی... بات کچھ سمجھ میں آنے لگی اور پھر میں اپنے بال وغیرہ سنوار کر باہر نکل آیا اور دیر تک دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھا رہا۔ گاڑی میں کیا کیا گیا ہے؟ کس نے کیا ہے؟ یہ سوچتا رہا۔ بہرحال، صورتِ حال بہت سنسنی خیز تھی۔

مجھے خود کو سنبھالے رکھنا تھا۔ گاڑی میں آخر کیا کیا گیا ہے؟ کچھ سمجھ میں تو آئے۔ سائرہ نے یہ اطلاع مجھے کیوں دی؟ اسے کیوں شبہ ہوا ہے؟ دل چاہا کہ کچن میں جا کر اس سلسلے میں اس سے بات کروں لیکن اس نے محتاط رویہ اپنایا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے میں خاموش رہ گیا۔ بے چاری میری وجہ سے کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔ چنانچہ خاموشی سے ناشتا کیا۔ ادھر بیگم صاحبہ اور راؤ صاحب بھی جاگ گئے تھے۔ میں نے انہیں لان میں ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ عام طور سے اتنی صبح یہ لوگ نہیں جاگتے تھے۔ نہ جانے کیوں آج معمول کے کچھ خلاف یہ بات ہوئی تھی لیکن ظاہر ہے، ان سے یہ سوال نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں گاڑی کی صفائی میں مصروف ہو گیا لیکن یہاں بھی میں نے محتاط رویہ اپنائے رکھا۔ حالانکہ میرے ذہن میں شدید تجسس تھا لیکن گاڑی کی دیکھ بھال کرنے کا مقصد یہ تھا کہ بیگم صاحبہ شبے کا شکار نہ ہو جائیں۔ سارا کیا دھرا چوپٹ ہو جائے گا۔ جب راؤ ریاست گاڑی میں آ کر بیٹھے تو بیگم صاحبہ نے برآمدے میں انہیں خدا حافظ کہا۔ یہ بھی کچھ خلافِ معمول سا تھا کیونکہ عموماً ایسا نہیں ہوتا تھا۔

میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ تو گیا تھا لیکن دل میں ایک عجیب سی ہلچل ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیا کیا خیالات آ رہے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے جونہی سوئچ آن کیا، بم دھماکا ہوگا اور گاڑی کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ ہمت کر کے سوئچ لگایا۔ گاڑی گیئر میں ڈالی۔ سائرہ نے گیٹ کھول دیا تھا۔ میں فرسٹ گیئر میں گیٹ سے باہر نکل آیا۔ سیکنڈ گیئر لگایا اور گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ میں انجن کی آواز سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ گو بہت زیادہ مشق نہیں تھی مجھے لیکن یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ انجن کی آواز میں کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ پھر زیادہ فاصلہ نہیں طے کیا تھا کہ مجھے بریکوں کا خیال آیا اور میں نے بریک چیک کرنے کے لیے پیڈل پر پیر رکھ دیا۔

دوسرے لمحے مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ پیڈل نیچے بیٹھ گیا تھا اور بریک نہیں لگا۔ رفتار میں نے ابھی زیادہ تیز نہیں کی تھی اور سیکنڈ گیئر میں چل رہا تھا اس لیے گاڑی کو روک لینا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ لیکن اب میری ذہانت بھی جاگ اٹھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ سڑک سنسان تھی اور پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم کم از کم اب کوٹھی سے اتنی دور نکل آئے تھے کہ کوٹھی سے گاڑی کو دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ عقب نما آئینے میں جب میں نے کوٹھی کو بالکل گم پایا اور یہ شبہ باقی نہ رہا کہ وہاں سے کوئی گاڑی کو دیکھ لے گا تو میں نے سڑک کی سائڈ کر کے گاڑی روک دی۔ راؤ ریاست چونک پڑے۔ اس نے پیچھے سے کہا۔

''کیا بات ہے... خیریت؟''

''گاڑی کے بریک فیل ہو گئے ہیں۔''

''ہیں؟'' وہ کسی قدر ہراساں لہجے میں بولے۔

''جی ہاں... بریک بالکل نہیں لگ رہے۔''

''ارے... اچانک یہ کیسے ہوا؟ ایسی کوئی بات پہلے تو محسوس نہیں ہوئی تھی؟''

''بالکل نہیں جناب!'' میں نے جواب دیا۔ وہ راؤ صاحب گہری گہری سانسیں لینے لگے پھر انہوں نے میری طرف دیکھ کر پھیکے سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''چھٹا قاتلانہ حملہ۔'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بولے۔

''تمہارا کیا خیال ہے... کیا بریک خود فیل ہو گئے؟''

''خود بخود تو نہیں ہو سکتے جناب... یقیناً کچھ کیا گیا ہے۔'' وہ کچھ دیر تک سوچتے رہے پھر بولا۔

''اب ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ میں حیران تھا کہ کرولا کیوں خریدی گئی؟ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ اسے چونکہ خود آنے جانے میں تکلیف ہوتی ہے اس لیے اس نے یہ گاڑی خرید کر میرے حوالے کر دی لیکن اب اصل بات سمجھ میں آ گئی ہے۔ پہلے اس نے وہ عمدہ گاڑی داؤ پر لگا رکھی تھی، بعد میں سوچا کہ لاکھوں کی چیز کیوں ضائع کی جائے۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟ اب تو تمہیں میری باتوں پر یقین آ گیا ہوگا؟''

''راؤ صاحب! یہ سب کچھ حل تو نہیں ہے۔ آپ کسی بھی وقت نقصان اٹھا سکتے ہیں۔ بات اگر یہاں تک پہنچ گئی ہے تو آپ کو کوئی ٹھوس اقدام اٹھانا چاہیے۔ بلاوجہ آپ نے یہ الجھن پال رکھی ہے۔ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔ آپ کی صحت پہلے ہی خراب ہے۔'' انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولا۔

''اب کیا کریں؟''

''جو حکم راؤ صاحب۔''

''کچھ ہونا ضرور چاہیے۔ یہاں رک کر کیا کریں گے۔ ویسے اس وقت میری سمجھ میں ایک بات ضرور آئی ہے۔ پوری طرح آ گئی ہے۔ وہ تمہاری مخالفت صرف اس لیے کرتی ہے کہ اس کا پلان خراب ہو گیا ہے۔ پہلے میں خود گاڑی چلاتا تھا۔ مجھ پر اچانک دورے پڑتے ہیں۔ ایسے ہی کسی لمحے کار کا حادثہ ہو سکتا تھا مگر وہ دیر میں سوچتی ہے۔ اسے تمہارے آنے سے پہلے ہی کوئی اس طرح کی خراب حالت کی گاڑی خریدنا چاہیے تھی۔'' راؤ ریاست بے اختیار مسکرا پڑے۔ میں نے حیرانی سے انہیں مسکراتے ہوئے دیکھا۔ یہ مسکراہٹ بڑی جان دار تھی۔

اچانک انہوں نے سنبھل کر کہا۔

''اب تم یوں کرو، گاڑی کسی جگہ ٹکرا دو۔ ذرا ٹھیک ٹھاک ٹکر ہونی چاہیے۔ گاڑی کا اگلا حصہ کافی خراب ہو جانا چاہیے۔ پھر اسے مکینک کے ہاں پہنچا دو اور اطمینان سے وہاں کھڑا رہنے دو۔ اس طرح ایک لمبے عرصے کے لیے ہمیں اس سے نجات مل جائے گی۔ چلو یوں کرو، اس سامنے والے درخت کی طرف اس کا رخ کر دو اسی گیئر میں ڈالو اور ایکسلریٹر پر ایک بھاری پتھر رکھ دو۔ بعد میں پتھر اٹھا لینا۔''

یہ ساری کارروائی بھی میرے لیے ایک سنسنی خیز تجربہ تھی۔ گاڑی درخت سے ٹکرا گئی اور پھر میں نے پتھر اٹھا لیا۔ پھر ہم ایک ٹیکسی کر کے دفتر پہنچ گئے۔

راؤ ریاست کی آنکھوں میں ایک شریر سی چمک تھی۔ ان کا موڈ بے حد خوش گوار تھا۔ انہوں نے کہا۔

''جاؤ، اب تم گاڑی کسی آٹو گیراج سے اٹھوا لو۔''

مجھے مصروفیت کی وجہ سے ان تمام واقعات کے بارے میں سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن بدن میں پھریریاں ضرور دوڑ رہی تھیں۔ اگر سائرہ بروقت اطلاع نہ دیتی تو کوئی بڑا حادثہ ضرور ہو سکتا تھا۔ سائرہ کے لیے اچانک میرے دل میں بڑی محبت جاگ اٹھی تھی۔ میں واپس دفتر پہنچا تو راؤ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں نے اسے فون پر حادثے کی اطلاع دے دی ہے اور اطمینان دلا دیا ہے کہ ہم دونوں خیریت سے ہیں۔'' وہ ہنس پڑا پھر بولا۔ ''البتہ تمہاری خیریت نہیں ہے۔ خود کو تیار رکھنا۔ فون پر چیخ رہی تھی کہ ڈرائیور کو بریک خراب ہونے کا احساس نہ ہو سکا... وہ کیسا ڈرائیور ہے؟''

''آپ خود سمجھ لیں، راؤ صاحب اور مجھے بتا دیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''او یار... میری مدد پر آمادہ ہوئے ہو تو پھر پوری کرو۔ کچھ بکواس کرے تو سن لینا، اس سے زیادہ کیا ہوگا۔ چاہو تو اس ڈانٹ ڈپٹ کا بل الگ سے بنا دینا، ادا کر دوں گا۔ اب بھگتنا تو ہے۔'' انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

دوپہر کو ٹیکسی سے گھر واپسی ہوئی۔ راؤ ریاست نے ٹیکسی ایک سویٹ ہاؤس کے سامنے رکوائی اور مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ سویٹ میٹ مارٹ سے انہوں نے اخروٹ کا حلوہ، کھانے کا حلوہ کافی مقدار میں خریدا اور ٹیکسی میں آ بیٹھے۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے ہنس کر کہا۔

''یہ حلوے اس کا موڈ درست کرنے میں اکسیر کا کام کریں گے۔ اپنی جیسی کوشش کر لیتے ہیں۔ آگے اللہ مالک ہے۔'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ دل میں یہ ضرور سوچا کہ حیدر علی صاحب نے بظاہر ایک آسان کام میرے حوالے کیا ہے لیکن درحقیقت یہ ایک مشکل ترین کام ہے اور اس بھوت گھر میں دماغ کی چولیں درست رکھنا سخت مشکل ہے۔ تاہم چھ ہزار روپے ماہانہ حیدر علی کی طرف سے، چھ ہزار ڈرائیور کی تنخواہ اور دس ہزار اسپیشل معاوضہ اور اس معاوضے میں یہ سب کچھ کیا جا سکتا تھا۔

ٹیکسی گھر کے سامنے رک گئی۔ راؤ صاحب نے کہا۔

''تم یہ سامان اٹھا کر دو منٹ کے بعد اندر آ جاؤ۔ اس وقت صورتِ حال کیا ہوگی، میں جانتا ہوں۔''

میں نے گردن ہلا دی۔ ٹیکسی کا کرایہ راؤ صاحب دے گئے تھے۔ میں نے ڈبے اٹھائے اور گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ برآمدے میں بیگم صاحبہ اور سائرہ کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ راؤ صاحب ان کے پاس پہنچ گئے تھے۔ میں راؤ صاحب کے حکم کے مطابق رکا اور یہیں سے میں نے انہیں بیگم صاحبہ کے ساتھ اندر جاتے ہوئے دیکھا، سائرہ البتہ کھڑی رہی۔ جب راؤ صاحب اندر چلے گئے تو میں بھی گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔ سائرہ نے آگے بڑھ کر خاموشی سے ڈبے میرے ہاتھ سے لے لیے اور تیزی سے واپس مڑ گئی۔

''سائرہ... سنو۔'' میں نے اسے پکارا مگر وہ رکے بغیر اندر داخل ہو گئی۔ میں سر کھجا کر رہ گیا۔ ظاہر ہے، اس گھر میں اگر کسی کی کھوپڑی درست ہوتی تو یہ گھر نرالا کیسے ہوتا۔ میرے پاس اس کے سوا کیا چارہ تھا کہ میں بھی اپنے کمرے میں چلا جاتا۔

باقی دن خاموشی سے گزر گیا۔ کوئی چھ بجے کے قریب میں باہر نکلا اور نئی گاڑی کے قریب پہنچ کر اس کے دروازے کھول لیے۔ پائدان وغیرہ نکال کر جھاڑنے لگا۔ یہ میرا روزانہ کا معمول تھا۔ لیکن ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اندرونی دروازے سے طوفان برآمد ہوا اور ایک سو ساٹھ میل فی گھنٹا کی رفتار سے میری جانب بڑھا۔ اس نے میرے قریب پہنچ کر پائدان میرے ہاتھ سے چھین کر دور اچھال دیا اور کڑک دار لہجے میں چنگھاڑا۔

''آئندہ تم میری گاڑی کے قریب نظر آئے تو میں تمہیں گولی مار دوں گی، سمجھے... میری گاڑی کو ہاتھ نہ لگانا۔'' میں نے سرد نگاہوں سے بیگم صاحبہ کو دیکھا اور دل میں سوچا کہ محترمہ... میں بھی زیادہ ٹھنڈے مزاج کا آدمی نہیں ہوں۔ اس کا جواب ایسا دے سکتا ہوں کہ آپ کو آخری دم تک یاد رہے گا مگر حیدر علی صاحب نے مجھے کسوٹی پر رکھا ہے اور مجھے ان کے معیار پر پورا اترنا ہے۔ اس لیے مجبور ہوں۔ وہ بولیں۔

''تم ڈرائیور ہو یا گھسیارے... تمہیں اتنا اندازہ نہیں ہو سکا کہ گاڑی کے بریک فیل ہیں۔''

''کیا مجھے اس کا اندازہ ہو جانا چاہیے تھا بیگم صاحبہ؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا مگر وہ غصے میں تھیں۔ انہوں نے میرے سوال کا مفہوم نہیں سمجھا اور بولیں۔

''گاڑی پر جو خرچ آئے گا وہ کون دے گا؟''

''مشین تو مشین ہے بیگم صاحبہ! کوٹھی سے نکلتے ہوئے تو بریک درست تھے۔ راستے میں فیل ہو گئے۔''

''بکواس کرتے ہو۔'' وہ غرائیں۔

''میں سمجھا نہیں بیگم صاحبہ... کیا وہ یہیں خراب ہو چکے تھے؟'' میں نے پوچھا تو وہ سٹپٹا گئیں۔ ایک لمحے کے لیے الجھی پھر اسی انداز میں بولیں۔

''تم ہماری جان بخشی نہیں کر سکتے؟ میں نے تمہیں ہر طرح سمجھایا ہے کہ ہمیں ڈرائیور کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ویسے ہی برے حالات کا شکار ہیں، تم اور مصیبت بن کر ہم پر نازل ہو گئے ہو۔''

''میں آپ کا ہمدرد ہوں بیگم صاحبہ... میں نے تنخواہ بھی نہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''ہم تمہارا احسان نہیں لینا چاہتے۔''

''اس میں احسان کی کیا بات ہے؟ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔''

''ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہے، سمجھے؟ خدا کے لیے ہماری جان چھوڑ دو۔ گاڑی تباہ کر دی تم نے... اگر میرے شوہر کو کچھ ہو جاتا تو؟''

''آپ کے حق میں بہتر ہوتا۔'' میں نے کہا۔ وہ دم بخود رہ گئیں۔ میں نے عقب سے راؤ ریاست کو آتے دیکھا، وہ چیل کی طرح پرواز کرتے ہوئے ہمارے پاس پہنچ گئے۔

''کیا بات ہے؟ کیا کہہ رہی ہو تم اس سے؟''

''آپ... آپ اسے فوراً نکال دیں، سمجھے... آپ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے فوراً نکال دیں، یہ بدتمیز ہے۔ مجھ سے زبان چلاتا ہے۔''

''میں نے آپ کو سمجھایا تھا۔ آپ سے کہا تھا کہ اس سے کچھ نہیں کہیں گی آپ۔''

''کیوں... آپ کو وجہ بتانی ہوگی؟''

''مجھے اس کی ضرورت ہے۔''

''مجھے نہیں ہے۔''

''میں نے اپنی ضرورت بتائی تھی... آپ کی نہیں۔''

''کیا ضرورت ہے آپ کو اس کی؟''

''میں گاڑی نہیں چلا سکتا۔ میری صحت کا کچھ اندازہ ہے آپ کو؟ کسی بھی وقت حادثے کا شکار ہو سکتا ہوں۔''

''ہم اپنے اخراجات نہیں بڑھا سکتے۔ آپ اسے نکال دیں۔

''نہیں نکالوں گا۔''

''نکالنا ہوگا... آپ کو۔'' وہ غرائیں۔ ان کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

''دیکھتا ہوں کون نکالتا ہے اسے۔''

''میں... میں نکالوں گی... میں... نکالوں گی۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخیں ان کا چہرہ بگڑنے لگا۔ پھر اچانک وہ چکرانے لگیں اور پھر زمین پر گر پڑیں۔ راؤ کے ہوش اڑ گئے۔ وہ بدحواس ہو کر بیگم صاحبہ کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگے لیکن وہ دھان پان تھے۔ کامیاب نہ ہو سکے۔ مجھے ہی یہ خدمت انجام دینا پڑی مگر راؤ کی پریشانی قابلِ دید تھی۔

''کسی ڈاکٹر کو بلا کر لاؤں راؤ صاحب؟'' میں نے پوچھا۔

''جان دے دے گی دوا نہیں کھائے گی۔ انجکشن سے اس طرح ڈرتی ہے جس طرح بکری قسائی کی چھری سے۔'' انہوں نے مغموم لہجے میں کہا تو میں خاموش ہو گیا۔ بڑا الجھا ہوا معاملہ تھا۔ راؤ مجھ پر کھل گیا تھا۔ کھلنا ہی تھا اسے۔ اس نے اپنی زندگی کے تحفظ کے لیے مجھے بلایا تھا مگر اس کے باوجود کہ اسے بیگم صاحبہ سے زندگی کا خطرہ تھا۔ اس کی پریشانی قابلِ دید تھی۔ وہ پتھرایا ہوا بیوی کے سرہانے بیٹھا رہا۔ میرا اس کے پاس رکنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں وہاں سے چلا آیا۔ کچھ دیر بعد پتا چلا کہ بیگم صاحبہ ہوش میں آ گئی ہیں اور ان کی کیفیت بہتر ہے۔

رات ہو گئی۔ سائرہ نے مجھے کھانا دیا تو میں نے کہا۔

''سائرہ! مجھے تم سے شکایت ہے۔''

''کیا بات ہے؟''

''دن اور رات کے کچھ حصے ایسے ضرور ہوتے ہیں جب ہمیں ان کا خطرہ نہیں ہوتا۔ اس وقت تو تم مجھ سے مل سکتی ہو۔''

''بہادر شاہ! میں بہت بزدل ہوں۔ یقین کرو، بہت بزدل ہوں۔ کسی کو کچھ ہو نہ ہو، میری جان ضرور چلی جائے گی۔ ان حالات میں بیگم صاحبہ مجھ پر کڑی نظر رکھتی ہیں۔ انہیں میرے اور تمہارے درمیان یگانگت کا پتا چل جائے گا تو سمجھ لو مجھے مرنا پڑے گا۔''

''حالانکہ تم نے میرے یہاں آنے پر بہت خوشی کا اظہار کیا تھا؟''

''بعد میں جو ہدایات مجھے ملیں، وہ میرے خیال کے برعکس تھیں۔''

''بیگم صاحبہ کی طرف سے؟''

''یہ سوال کیوں کرتے ہو؟''

''اب کیا ہوگا؟ میرا مطلب ہے کہ بیگم صاحبہ اتنا شدید اختلاف کر رہی ہیں میرے سلسلے میں تو کیا میں یہاں رہ سکوں گا؟''

''ہاں... تم یہاں رہ سکو گے۔'' وہ مسکرا دی۔ میں تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''حالات ہموار ہو گئے ہیں۔''

''کیسے...؟''

''ایسے ہی ہوتا ہے۔ کبھی راؤ صاحب کی حالت زیادہ خراب ہو جاتی ہے تو وہ بیماری کے عالم میں بیگم صاحبہ کی ہر بات مان لیتے ہیں اور کبھی بیگم صاحبہ بیمار ہوتی ہیں تو شوہر کی ہر بات مان جاتی ہیں۔''

''یعنی الٹا معاملہ؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''یہاں کچھ سیدھا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''خدایا۔'' میں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

''کھانا کھاؤ۔ معدہ بھر جائے گا تو خیالات زیادہ پریشان نہیں کریں گے۔'' سائرہ نے کہا۔

''میرا معاملہ ہموار ہو گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں... بیگم صاحبہ نے اپنا مطالبہ واپس لے لیا ہے۔ اب شاید تمہاری مخالفت کبھی نہ ہو۔''

''تمہیں کیسے معلوم؟''

''اتفاق سے یہ گفتگو... یہ معاہدہ میرے سامنے ہی ہوا تھا۔''

''اوہ... اور اب مجھے وہ سب سے اہم بات نہیں بتاؤ

گی؟''

''کون سی بات؟''

''سائرہ! تم نے مجھ پر احسان کیا ہے، اگر تم مجھے ہوشیار نہ کرتیں تو میں خود بھی اس حادثے کا شکار ہو سکتا تھا۔''

''اس انکشاف کا تعلق خالص میری اپنی ذات سے ہے۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ہے۔ تفصیل سن کر ہنسو گے۔''

''میں جاننا چاہتا ہوں سائرہ... پلیز مجھے بتاؤ۔''

''میں سچے خواب دیکھتی ہوں بہادر! بہت سے سچے خواب دیکھے ہیں میں نے... اور میرے خوابوں کا نتیجہ فوراً نکلتا ہے۔ میں کبھی فرصت میں تمہیں ان خوابوں کے بارے میں بتاؤں گی جو میں نے دیکھے۔ رات کو بھی میں نے خواب دیکھا تھا اور یہی دیکھا تھا کہ گاڑی کے بریک فیل ہو گئے ہیں اور تمہیں حادثہ پیش آ گیا ہے۔''

''سائرہ... کیا یہ قابلِ یقین بات ہے؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہے تو... کیونکہ جو کچھ میں نے تمہیں بتایا، وہ ہوا تو...''

''تمہاری مرضی ہے سائرہ۔ میں اس سے صرف ایک نتیجہ نکال سکتا ہوں... وہ یہ کہ تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتیں۔ خیر، ایک طرح سے یہ درست بھی ہے۔ ظاہر ہے، ہمارے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ تمہاری مرضی سائرہ... میں آئندہ تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔''

''تم بلاوجہ میری طرف سے بدظن ہو رہے ہو۔ میں نے تم سے سچ کہا ہے۔'' سائرہ نے کہا۔

''سچ نہیں کہا ہے۔ سائرہ! تم نے کہا تھا کہ گاڑی احتیاط سے چلانا۔ اس میں کچھ ہوا ہے۔''

''اور اب مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ گاڑی کے بریک فیل ہو گئے تھے۔ اچھا اب مجھے چلنا چاہیے کیونکہ وہ دونوں جاگ رہے ہیں۔'' سائرہ چلی گئی اور میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں نے بڑی فاش غلطی کی ہے۔ سائرہ بے شک ملازمہ ہے لیکن وہ کچھ اور بھی تو ہو سکتی ہے۔ وہ بھی کافی پُراسرار کردار ہے لیکن کسی بھی طور ان دونوں میاں بیوی سے کم پُراسرار نہیں ہے۔ اس نے اپنے بارے میں جو کچھ کہا ہے، کیا ضروری ہے کہ درست ہو؟ میں سائرہ پر بھروسا کرتا جا رہا ہوں بلکہ میرے دل کے کچھ گوشے اس کے لیے نرم ہو گئے ہیں۔ یہ چیز میرے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے، اعتماد میں کچھ ایسی باتیں نکل جائیں۔ میرے منہ سے جو بعد میں خطرناک ثابت ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گاڑی کے بارے میں بتا کر اس نے مجھے حادثے سے بچایا تھا۔

دوسری صبح میری بہت جلدی آنکھ کھل گئی۔ میں معمول کے مطابق ناشتے کے لیے کچن میں نہیں گیا۔ ساڑھے آٹھ بجے سائرہ خود ہی میرے لیے ناشتا لائی اور کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی۔ تب میں نے سوچا، سائرہ پر نگاہ رکھنا بھی ضروری ہے۔ پھر اتفاق سے صبح ناشتے پر میں نے اس عجیب وغریب جوڑے کو دیکھا۔ ناشتے کی میز بھری ہوئی تھی۔ لاتعداد لوازمات سجے ہوئے تھے اور بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں۔

''اللہ... مجھ سے نہیں کھایا جا رہا۔''

''دیکھو بیگم! مجھے پریشان نہ کرو۔ تمہیں میری پریشانیوں کا اندازہ ہے۔''

''میں نے کیا کیا؟''

''آئینہ دیکھتی ہو کبھی؟''

''روز دیکھتی ہوں۔''

''میری آنکھوں سے بھی دیکھو کبھی... کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''

''اچھی خاصی گول ہوتی جا رہی ہوں۔''

''خاک گول ہو رہی ہو۔ میں کہتا ہوں یہ جسم دکھاوے کا ہے۔ خون نہ ہونے کے برابر ہے جسم میں۔ غذا نہیں پہنچے گی بدن میں تو خون کہاں سے بنے گا۔ تمہیں مقوی غذاؤں کی ضرورت ہے۔ یہ مکھانوں کا حلوہ لو۔''

''ناک تک پیٹ بھر گیا ہے، اب گنجائش نہیں ہے۔''

''تھوڑا سا اور لے لو پلیز... میرے دل میں ٹھنڈک اترتی ہے۔ مجھے تمہاری زندگی درکار ہے۔''

''تقدیر نے ہمارا ساتھ نہ دیا ریاست۔'' بیگم صاحبہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''تقدیر ضرور ساتھ دے گی، تم فکرمند کیوں ہو۔ ایک دن تمہیں بتاؤں گا کہ دیکھ لو، میں نے اپنی کھوئی ہوئی حیثیت پھر سے حاصل کر لی ہے۔''

''وہ دن کب آئے گا؟''

''ضرور آئے گا۔ کہیں سے کچھ رقم ہاتھ لگ جائے پھر تم دیکھنا، میں کیسے دو کے چار اور چار کے آٹھ بناتا ہوں۔''

''صحت تو ساتھ چھوڑتی جا رہی ہے تمہاری... ہر وقت تمہارے لیے فکرمند رہتی ہوں۔ کیا کرو گے، کیسے کرو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گے؟ مجھ پر اتنا خرچ کرتے ہو۔ اپنا علاج بھی نہیں کراتے۔ کتنی بار کہا ہے کہ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔"

"ڈاکٹر مجھے بستر نشین کر دے گا اور صحیح معنوں میں وہی میری موت ہو گی۔ میں ڈاکٹر سعید سے مشورہ کرتا رہتا ہوں۔ اپنے بارے میں اور تمہارے بارے میں بھی۔"

"پتا نہیں یہ ڈاکٹر سعید کون ہے۔ کبھی مجھے تو اس سے ملاؤ۔ تمہاری بیماری کے بارے میں بھی اس سے مشورہ کروں گی۔ میرے لیے تو مشورے دیتا رہتا ہے، تمہارے بارے میں کیا کہتا ہے وہ؟"

"میرے بارے میں وہ کیا کہے گا جبکہ اپنی بیماری میں خود سمجھتا ہوں۔ مشکلات نے مجھے نڈھال کر دیا ہے۔" راؤ نے کہا۔ بیگم صاحبہ اس گفتگو کے دوران مسلسل حلوے پر ہاتھ صاف کیے جا رہی تھیں اور میں اس بلانوش عورت کو حیرت سے دیکھ رہا تھا جو اس غم ناک گفتگو کے دوران حلوے کی پوری پلیٹ صاف کر گئی تھی۔

راؤ ریاست اس دن دفتر نہیں گئے۔ شام کو وہ بیگم صاحبہ کو سیر کے لیے لے کر نکل گئے۔ گھر میں سائرہ تنہا میرے ساتھ تھی لیکن میں اپنے کمرے ہی میں رہا۔ میں سائرہ سے اظہارِ ناراضی کرنا چاہتا تھا۔ البتہ اس کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ بھی میرے پاس نہیں آئی۔ البتہ رات کا کھانا رکھ کر چلی گئی۔ نہ جانے میرے ذہن میں کیا خیال آیا۔ میں نے اس کے باہر نکلتے ہی خود بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور باہر نکل آیا۔

سائرہ اپنے کمرے میں نہیں گئی تھی بلکہ اس کا رخ ان دونوں کی خواب گاہ کی جانب تھا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ خواب گاہ میں روشنی کر کے اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ میں اندر جھانک سکتا۔

چند لمحوں تک میں وہاں رکا اور پھر یہ تگ و دو بیکار سمجھ کر وہاں سے پلٹ آیا۔ کھانا کھاتے ہوئے میں دیر تک سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟

دوسرے دن میں نئی گاڑی میں راؤ کو لے کر دفتر کی طرف چل پڑا۔ طے یہ ہوا تھا کہ میں گاڑی لے کر واپس آجاؤں گا۔ راستے میں راؤ صاحب نے کہا۔

"اس واقعے نے تمہارے حالات بہتر کر دیے ہیں۔"

"وہ کیسے راؤ صاحب؟"

"اب وہ تمہاری مخالفت نہیں کرے گی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے۔"

"یہ سب کچھ میرے لیے بہت عجیب ہے راؤ صاحب۔"

"میں جانتا ہوں مگر تم مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟ میں اسے چاہتا ہوں اور وہ... وہ میری موت کی خواہاں ہے۔"

"آپ کے ذہن میں یہ خیال کیسے پیدا ہوا راؤ صاحب؟"

"صرف خیال پر تو یہ سب نہیں کیا جا سکتا۔ کون گھر کی بات باہر نکالنا پسند کرتا ہے۔"

"گویا... آپ کو پورا یقین ہے؟"

"کتنی بار مجھ سے یہ سوال کرو گے؟"

"دراصل یہ سب کچھ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اگر بیگم صاحبہ کبھی آپ کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں تو آپ کو کیا فائدہ ہو گا؟ آپ تو جان سے جائیں گے اور فرض کیجیے ان کے جرم کا راز فاش ہو جائے تو ظاہر ہے ان کو سزا ہو جائے گی۔ آپ کو کیا ملے گا؟"

راؤ پھیکے سے انداز میں ہنس پڑے۔ "تمہارا دل چاہے تو تم اسے میری دیوانگی کہہ سکتے ہو۔ میں اسے اپنی زندگی سے زیادہ چاہتا ہوں مگر وہ... کوئی کیا کر سکتا ہے۔ کسی کے دل کو تو نہیں بدلا جا سکتا۔ وہ مجھ سے اس لیے بددل ہے کہ میں قلاش ہو چکا ہوں۔ میں تھوڑا سا وقت چاہتا ہوں۔ اگر مجھے سنبھلنے کا موقع مل جائے تو میں وہ سب کچھ پھر حاصل کر سکتا ہوں جو کھو چکا ہوں اور اس وقت مجھے یقین ہے کہ اسے اپنے کیے پر پچھتاوا ہو گا۔ گو اسے اس کا یقین نہیں ہے اور وہ صرف میری موت کا انتظار کر رہی ہے تا کہ میرے بیمے کی رقم اسے مل جائے۔ مگر میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

"آپ کے درمیان اس موضوع پر بات ہوئی ہے کبھی؟"

"کس موضوع پر؟"

"میرا مطلب ہے، آپ نے کبھی بیگم صاحبہ سے اپنے بارے میں خدشے کا اظہار کیا ہے؟"

"ظاہر ہے، وہ جو کچھ کر رہی ہے وہ تو میں اس سے نہیں کہہ سکتا۔ ہاں، وہ میری طرف سے فکرمندی کا اظہار کرتی ہے۔"

"کبھی آپ نے ان سے علیحدگی کا تذکرہ کیا ہے؟"

"صرف ایک بار... اور اس پر دورہ پڑ گیا تھا۔ اس نے بہت رنج کا اظہار کیا تھا۔ ویسے بھی اسے شدید بلڈ پریشر رہتا ہے۔"

"یہ خطرناک ہو سکتا ہے جبکہ وہ کوئی علاج بھی نہیں

کرتیں اس کا۔"

"اسے دواؤں سے چڑ ہے۔"

"ان کی خوراک بھی معاف کیجیے گا بہت ہے اور بلڈ پریشر کے باوجود وہ ان اشیا کو پسند کرتی ہیں جن میں کولیسٹرول کی مقدار بے حد ہوتی ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مریضہ ہے مگر یہ چیزیں اسے تندرست رکھتی ہیں۔ اس نے اپنے بڑھتے ہوئے وزن کی وجہ سے ڈائٹنگ کی جس نے اسے زندہ درگور کر دیا ہے۔ وہ کھا پی کر ہی تندرست رہتی ہے۔ ان تمام چیزوں کا اسے بے حد شوق ہے۔ اگر کبھی کچھ کمی ہو جائے تو وہ محسوس کرنے لگتی ہے۔"

"عجیب گورکھ دھندا ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا پھر اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے پوچھا۔ "سائرہ کیسی لڑکی ہے؟"

"سائرہ... کیوں؟" راؤ نے چونک کر پوچھا۔

"وہ کبھی بیگم صاحبہ کی آلۂ کار نہیں بن سکتی؟"

"اوہ... ہرگز نہیں۔ وہ بہت پیاری بچی ہے۔ بالکل معصوم اور بے ضرر... اگر اس کے کانوں میں کوئی بات ڈال بھی دی جائے تو کسی کو نقصان پہنچانے کے بجائے وہ خود ہی خوف سے مر جائے گی۔ میں بے وقوف نہیں ہوں، اس کا جائزہ لے چکا ہوں۔ تمہیں اس پر کوئی شک ہوا ہے؟"

"بالکل نہیں... میں نے بس یونہی اس کے بارے میں سوچا تھا۔"

"نہیں، اس پر کوئی شبہ نہ کرو۔ بیگم بھی اتنی بے وقوف نہیں ہیں کہ اس سے ایسا کوئی کام لینے کی کوشش کریں۔ وہی بعد میں ان کی گردن پھنسانے کا باعث بن سکتی ہے۔" میں راؤ کی بات سے متفق نہیں تھا لیکن کوئی اظہار بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ انہیں دفتر پہنچا کر میں واپس پلٹا۔ حیدر علی صاحب بہت یاد آ رہے تھے اور پھر موقع بھی تھا چنانچہ ان کی طرف چل پڑا۔ انہوں نے حسبِ عادت مسکرا کر میرا استقبال کیا۔

"آپ نے جو کام میرے سپرد کیا ہے، اس کے بارے میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور۔" انہوں نے کہا۔

"یہ کام کوئی اور بھی کر سکتا تھا؟"

"کیا مطلب؟"

"آپ کو کوئی دوسرا بے وقوف نہیں ملا تھا؟"

"کوئی اہم بات ہو گئی شاید؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ سب کچھ معمول کے مطابق ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی خاص بات بہت جلد ہو جائے۔"

"کیا مطلب؟"

"اس بار آپ کو مجھے چار سال کے لیے پاگل خانے پہنچانا پڑے گا کیونکہ آپ نے مجھے غیر سرکاری پاگل خانے تو بھیج ہی دیا ہے۔"

"تم ہمت ہار رہے ہو؟"

"نہیں ہمت نہیں ہار رہا بلکہ میرے دماغ کے کل پرزے کچھ گڑبڑ ہونے لگے ہیں۔" میں نے کہا تو حیدر علی صاحب مجھے پُرخیال نظروں سے دیکھنے لگے پھر بولے۔

"دراصل یہ مسئلہ میرے لیے بھی اتنا اہم نہیں ہے دوست! یوں سمجھ لو کہ میں منیر بیگ صاحب کی مروت میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔ اخراجات بھی وہی کر رہے ہیں اور ان کا بوجھ مجھ پر نہیں ہے۔ تم اگر کچھ مشکل محسوس کر رہے ہو تو واپس آ سکتے ہو۔ ویسے میں نے تم سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی تھیں اور یہ تجربہ کر کے بہت خوش تھا۔"

"تجربہ؟" میں نے سوال کیا۔

"پولیس دن رات یہی سب کچھ کرتی ہے۔ ایسے جرائم شدید ذہنی کاوش کے بعد کیے جاتے ہیں اور شدید ذہنی کاوشوں کے بعد ان کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ گتھیوں کو سلجھانے کے لیے بڑی محنت ہوتی ہے۔ تجربہ یہ کیا تھا میں نے کہ ایک غیر سرکاری کام ایک غیر سرکاری شخص کے حوالے کیا۔ اگر کوئی تربیت یافتہ آدمی اس طرح کسی جگہ بھیجا جاتا ہے تو وہ تربیت یافتہ افراد کی طرح کام کرتا ہے۔ اس طرح ناکامی کا اندیشہ ہوتا اور بات سرکاری حیثیت اختیار کر جاتی ہے جبکہ ابھی یہ معاملہ بالکل غیر سرکاری ہے۔ یوں سمجھ لو کہ منیر بیگ احمد صاحب کو اپنی ڈیوٹی کے دوران ایک کیس ملا تھا جسے حل کرنے میں انہیں ناکامی ہوئی تھی۔ یہ ایک قتل کا معاملہ تھا اور قتل بھی ان کی ایک عزیزہ کا ہوا تھا مگر کوئی کوشش کارگر نہیں ہوئی اور وہ مجرم کو پکڑ نہ سکے بلکہ انہیں ثبوت ہی نہیں ملا۔ یہ داغ ان کے ذہن میں تھا اور وہ اس داغ کو دور کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے ریٹائر ہو کر بھی انہوں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ تم سمجھ رہے ہو نا...؟ یہ انا کا معاملہ بھی تھا اور رشتے کا بھی۔"

"جی۔"

"راؤ ریاست اس پائے کا آدمی نہیں تھا کہ ڈی آئی جی منیر بیگ اس سے دوستی کرتا۔"

"پھر؟"

"یہ دوستی انہوں نے اپنے شبہے کی بنا پر خود کی تھی کیونکہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی اس عزیزہ کے قتل کے سلسلے میں انہیں راؤ ریاست پر شبہ تھا۔'' حیدر علی کے اس انکشاف پر میں اچھل پڑا۔

''راؤ ریاست پر...؟''

''ہاں... تمہیں حیرت ہوئی ہوگی سن کر؟''

''وہ تو بہت مرنج و مرنجاں مرنج آدمی ہیں اور... اور...''

''ان الفاظ کی روشنی میں تم اس پر غور کرو اور بتاؤ کیا وہ قاتل ہوسکتا ہے؟'' حیدر علی مسکرا کر بولے۔

''خدا کی پناہ... میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''میں نے ابتدا ہی سے یہ پوائنٹ تمہارے ذہن میں رکھا ہے کہ تم صرف راؤ ریاست کی بیوی کی طرف ہی متوجہ نہ رہنا بلکہ خود راؤ ریاست پر بھی نگاہ رکھنا۔ اس کی یہی وجہ تھی۔ راؤ ریاست نہیں جانتا کہ منیر بیگ صاحب کا اس عورت سے کوئی رشتہ تھا اور وہ اس قتل کی تفتیش اپنی نگرانی میں کراتے رہے ہیں۔ بات آئی گئی ہوگئی تھی مگر وہ منیر بیگ کے ذہن سے نہیں نکلا تھا اور منیر بیگ بڑی مشکل سے اسے اپنے جال میں پھانس سکے تھے۔ یہاں تک کہ راؤ ریاست ان سے اپنے دل کی بات کہہ بیٹھا اور انہوں نے اس سے ہمدردی کرتے ہوئے اسے یقین دلایا کہ وہ کچھ کریں گے۔ انہوں نے مجھ سے بات کی اور میں نے اتفاق سے تمہیں اس کام کے لیے منتخب کرلیا۔ اس کی اطلاع میں منیر بیگ صاحب کو بھی دے چکا ہوں۔''

منیر بیگ صاحب سے اس عورت کا کوئی رشتہ تھا مگر راؤ صاحب سے اس کا کیا رشتہ تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''میاں بیوی کا۔'' حیدر علی صاحب نے ایک اور دھماکا کیا۔

''یعنی... یعنی... راؤ ریاست اس سے پہلے بھی شادی کرچکا ہے اور یہ خاتون اس کی دوسری بیوی ہیں؟''

''دوسری نہیں چوتھی۔''

''اوہ میرے خدا... میرے خدا، وہ اس سے پہلے تین شادیاں کرچکا ہے۔''

''اور بھی بہت سی دلچسپ باتیں ہیں، سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ اس کی پہلی تینوں بیویاں غیر طبعی موت مری تھیں۔''

''یعنی قتل؟''

''خدا بہتر جانتا ہے۔ سب سے پہلی بیوی... مگر ٹھہرو، راؤ صاحب کے بارے میں تمہیں کچھ اور بھی بتانا مناسب رہے گا۔ بہت پہلے وہ راؤ ریاست نہیں تھا۔ شاید تم نے کبھی راجا جانی کا نام سنا ہو؟''

''کبھی نہیں۔''

''فلم انڈسٹری کا ایک ناکام اداکار... جو ایک نامور اداکارہ نگینہ کی دریافت تھا۔ نگینہ کا اصل نام ریحانہ اختر تھا۔ فلمی نام نگینہ، اسی طرح راجا جانی کا اصلی نام ریاست چن تھا اور فلمی نام راجا جانی۔ نگینہ کو اس سے محبت ہوگئی اور اس نے اپنی انتہائی کوششوں سے راجا جانی کو ایک فلم میں اپنے مقابل ہیرو کا کردار دلوادیا۔ وہ فلم صرف راجا جانی کی وجہ سے فلاپ ہوگئی۔ پھر کئی فلموں میں اسے ولن کا کردار ملا مگر وہ بالکل ناکام رہا۔

''کچھ عرصے اسے چھوٹے چھوٹے رول ملتے رہے مگر اسے کسی حیثیت سے پسند نہ کیا گیا۔ اس کی وجہ سے نگینہ نے فلم انڈسٹری سے ناراض ہوکر اداکاری ترک کردی اور راجا جانی سے شادی کرلی۔ وہ لاکھوں کی دولت رکھتی تھی۔ یہ ساری دولت اس نے جذباتی ہوکر راجا جانی کے نام کردی۔ اسے بے حد دکھ تھا کہ انڈسٹری نے اس کے محبوب کا کیریئر نہ بننے دیا اور اس دکھ نے اسے شاید ذہنی صدمے سے دوچار کیا۔ اس نے کئی ڈائریکٹروں کی پٹائی کردی اور ایک سرپھرے ڈائریکٹر نے اسے کھلے عام گولی ماردی اور خود عمر قید بھگتنے نکل گیا۔''

''اداکارہ کی دولت راجا جانی کو مل گئی؟''

''صاف ستھرے قانونی راستے سے۔ قتل کے ملزم کو سزا ہوئی پھر راجا جانی یعنی ریاست چن، راؤ ریاست کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس بار اس نے ایک شاہینہ نامی لڑکی سے شادی کی جس سے اس کی ملاقات ایک کلب میں ہوئی تھی۔ شاہینہ کو کوٹھی، کار اور لاکھوں روپے نقد کے علاوہ ایک صابن کی فیکٹری جہیز میں ملی تھی۔ ویسے بھی اس کا باپ فوت ہوچکا تھا۔ صرف ماں تھی جس سے شاہینہ کو بہت پیار تھا۔

''شادی کے ایک سال کے بعد شاہینہ کی ماں کا انتقال ہوگیا اور وہ ماں کی موت کے صدمے سے پاگل ہوگئی۔ بعد میں اس نے دماغی اسپتال میں بلند جگہ سے کود کر خودکشی کرلی اور راؤ ریاست کو عرصہ دراز تک ساحلِ سمندر پر اور ویرانوں میں اداس دیکھا گیا۔ رفتہ رفتہ اسے صبر آنے لگا۔ البتہ اس نے وہ صابن کی فیکٹری بیچ دی۔ شاہینہ کی کوٹھی اور اس کی یاد دلانے والی ہر چیز بیچ دی اور روپیا بینک میں جمع کرادیا۔

''پھر زنوبیہ نے اس کا غم بانٹ لیا۔ زنوبیہ، منیر بیگ کی دور کی عزیزہ تھی۔ وہ بھی تنہا اور دولت مند تھی۔ ریاست نے اسے پچاس لاکھ مہر نقد ادا کیا اور بعد میں اپنی دولت اس کے نام منتقل کردی اور خود اس کا اٹارنی رہ گیا۔ شاہینہ نے اس جذباتی قدم کا جذباتی جواب دیا اور اپنے شوہر کو کنگال نہ رکھا۔ اس نے بھی وہی جذباتی کارروائی کی۔ زنوبیہ نے بھی صرف ڈیڑھ سال راؤ ریاست کا ساتھ دیا۔ اس کی کار کا حادثہ ہوگیا' وہ اور اس کا ڈرائیور ہلاک ہوگئے۔ ظاہر ہے اس کا نتیجہ کیا ہوسکتا تھا۔ منیر بیگ صاحب ان دنوں آن ڈیوٹی تھے۔ انہوں نے سخت ترین تفتیش کرائی لیکن راؤ ریاست بے داغ تھا۔ وہ کسی جرم میں ملوث نہیں پایا گیا لیکن منیر بیگ کی تشفی نہیں ہوئی۔

''وہ بعد میں بھی کوششیں کرتے رہے مگر کامیاب نہ ہو پائے پھر وہ ریٹائرڈ ہوگئے۔ اس تفتیش کے دوران وہ راؤ صاحب کے سامنے کبھی نہیں آئے تھے اس لیے راؤ صاحب انہیں نہیں پہچانتے تھے۔ ایک جگہ ان کا تعارف ہوا اور منیر بیگ کے احساسات پھر جاگ اٹھے۔ انہوں نے اس سے گہری دوستی گانٹھ لی۔ انہیں علم ہوا کہ راؤ ریاست نے پھر شادی کرلی ہے مگر اس بار شاید اس کے ستارے گردش میں ہیں۔ جن محترمہ سے راؤ نے شادی کی ہے، وہ بھی دو عدد شوہروں کا ناشتا کرچکی ہیں۔ ان کا ماضی بھی راؤ صاحب سے مختلف نہیں ہے۔

''کسی زمانے میں وہ فرید سنز لمیٹڈ نامی ایک فرم کے مالک کی سیکریٹری تھیں۔ بعد میں فرید صاحب نے ان سے شادی کرلی اور سوئٹزرلینڈ میں وفات پاگئے۔ بیگم صاحبہ تنہا شوہر کی میت کے ساتھ واپس آئی تھیں اور بہت عرصے تک ایک مشہور بیوہ رہیں۔ پھر ان کی بیوگی دور ہوگئی۔ تیس گھوڑوں کے مالک ریس کورس کے شہنشاہ رانا افتخار سے انہوں نے شادی کرلی۔ رانا افتخار نے اپنے ایک پسندیدہ گھوڑے کے غیر متوقع طور پر ہار جانے سے ریس کورس میں ہی خودکشی کرلی۔ خیر سے راؤ ریاست ان کے تیسرے شوہر ہیں۔ اس طرح انہوں نے گویا راؤ ریاست کا چیلنج قبول کیا ہے۔ تم بور تو نہیں ہورہے اس کہانی سے؟'' حیدر علی صاحب نے پوچھا۔

''ہرگز نہیں جناب! میرا تو سانس رک رہا ہے۔'' میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''کیوں... کیا کسی بیوہ سے شادی کررہے ہو؟''

''اوہ شکر ہے، نہیں... لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟''

''خدا جانے کیا ہوا۔ راؤ خوف زدہ ہوگیا۔ غالباً بیگم صاحبہ بھاری پڑرہی ہیں۔''

''آپ کے خیال میں خطرہ کس کو ہے راؤ صاحب کو ہے یا اس کی بیوی کو؟''

''منیر بیگ کا کہنا ہے کہ راؤ صاحب اپنی بیوی سے ایک بیوی آگے ہے۔ اس کا تجربہ زیادہ ہے۔''

''مگر خطرے کا اظہار تو اس نے کیا ہے؟''

''ہاں، یہ ذرا الجھن کی بات ہے۔ منیر بیگ بھی اس الجھن میں ہیں مگر ان کا دل صاف نہیں ہو پارہا۔''

''وہ کیسے؟''

''یہ حقیقت ہے کہ راؤ کے سلسلے میں نہایت باریک بینی سے چھان بین کی گئی تھی مگر اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ وہ صرف اس لیے مشکوک ہے کہ اس کی بیویاں غیر طبعی موت مری تھیں اور ان کی دولت بہ آسانی راؤ کے قبضے میں آگئی جبکہ اس بیوی نے اسے ہری جھنڈی دکھادی ہے۔''

''یعنی؟''

''فرید احمد صاحب نے اس کے لیے بہت کچھ چھوڑا تھا۔ عالی شان کوٹھی، کاروبار اور پھر رانا افتخار کے بارے میں بھی لوگوں کے بڑے اندازے تھے... اور ہوسکتا ہے راؤ ریاست کا بھی یہی خیال ہو۔ بقول راؤ کے وہ بالکل قلاش نکلی۔ شادی کے بعد اس نے بتایا کہ درحقیقت رانا افتخار نے اس لیے خودکشی نہیں کی تھی کہ اس کا فیورٹ گھوڑا ہار گیا تھا بلکہ اس لیے خودکشی کی تھی کہ وہ دوالیا ہوگیا تھا اور اس گھوڑے پر اس نے اپنی آخری پونجی بھی لگادی تھی۔ وہ صرف ساکھ سے کام چلا رہا تھا، بات ماننے والی بھی تھی۔ چنانچہ جہیز میں بے چاری مسز راؤ صرف تین گھوڑے اور ایک مکان لائی تھی مگر گھوڑے بھی رہن تھے۔ چنانچہ وہ بھی گئے اور سود میں مکان چلا گیا۔''

''خدا کی پناہ... بڑی انوکھی کہانی ہے۔''

''دوسرا پہلو بھی مدِنظر رکھو۔''

''وہ کیا جناب؟''

''جس دن سے راؤ ریاست پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا، اسی دن سے اس کے کاروبار پر زوال آنا شروع ہوگیا۔ اس کے اثاثے فروخت ہوئے، کاروبار بند ہوگیا اور وہ دوالیا ہوگیا۔''

''وہ کیسے؟''

''خدا بہتر جانتا ہے۔ وہ اپنی اس بیوی کو بے انتہا چاہتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اس کے لیے آسمان سے تارے توڑ لائے مگر وہ اسے تارے توڑنے کے لیے آسمان پر بھیجنا چاہتی ہے۔''

''کیا راؤ ریاست واقعی اپنی بیوی کو اتنا ہی چاہتا ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود وہ اسے خوش کرنے کی فکر میں سرگرداں ہے؟"

"خدا جانے... اس کا سابقہ ریکارڈ تو اس بات کی نفی کرتا ہے مگر ہوسکتا ہے وہ اس سے مخلص ہو۔"

"حالانکہ اس بار اس کی بیوی قلاش ہے۔"

"نہیں، وہ بھی قلاش نہیں ہے بلکہ ایک بڑی رقم کی بیمہ شدہ ہے۔" حیدر علی صاحب ہنس پڑے اور میں حیرت سے منہ پھاڑے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

"انہوں نے گھر کے سارے ملازموں کو نکال دیا ہے اس لیے کہ وہ انہیں تنخواہ نہیں دے سکتے۔ راؤ ریاست خالی دفتر لیے بیٹھے ہیں اور اپنی ساکھ بحال کرنے کی فکر میں ہیں۔ گھر میں عیش و عشرت کا دور دورہ ہے، کسی شے کی کمی نہیں ہے۔ راؤ صاحب نے چھ ہزار روپے تنخواہ کے علاوہ دس ہزار روپے ماہوار کی پیشکش مجھے کی ہے۔"

"کیا؟" حیدر علی صاحب اچھل پڑے۔

"جی ہاں۔"

"اس کی تفصیل؟" انہوں نے پوچھا تو میں نے انہیں راؤ کی سونپی ہوئی ذمے داری بتادی۔ حیدر علی صاحب گردن ہلانے لگے۔

"اس کے علاوہ..." میں نے کہا۔ "راؤ صاحب ایک کروڑ کے بیمہ شدہ ہیں، اس رقم کی سالانہ پریمیم کیا ہوگی اور پھر قلاش بیگم صاحبہ بھی بیمہ شدہ ہیں۔ ان کی پریمیم... طرہ یہ ہے دونوں میاں بیوی قرض لے لے کر زندگی گزار رہے ہیں۔ بیگم صاحبہ نے شوہر کی ہلاکت کے لیے گاڑی خریدی ہے جو چھ، سات لاکھ مالیت کی ضرور ہوگی۔"

"مجھے اس کیس کے اس قدر پُرلطف ہونے کی امید نہیں تھی۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو اس سے پورا پورا لطف اٹھاتا۔"

"آپ نے طویل عرصہ تربیت اور اس کے بعد تجربے میں گزارا ہے۔ جناب... اور میرے بارے میں آپ جانتے ہیں۔"

"نہیں بہادر شاہ! وقت تجربہ دیتا ہے۔ تم کچھ کرو گے ہی نہیں تو تجربہ کیسے حاصل ہوگا۔ اس وقت تمہارا دو شاطروں سے واسطہ ہے جنہوں نے بساط بچھا رکھی ہے اور اس پر بہترین کھیل کھیل رہے ہیں۔ تمہیں اس کھیل کا جائزہ لینا ہے اور میں تمہیں اتنا کمزور نہیں سمجھتا کہ تم اس بساط پر ان کا مہرہ بن کر پٹ جاؤ۔ تمہیں اپنی حیثیت منوانی ہوگی اور کسی فیصلے پر پہنچنا ہوگا۔ پھر تمہیں کوئی فکر بھی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ تمہیں قانون کا سہارا حاصل ہے اور تم قانون کے لیے کام کررہے ہو۔"

میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ دماغ کی چولیں ہل گئی تھیں۔ انوکھے انکشافات ہورہے تھے اور یہ حیدر علی صاحب خود بھی کسی سے کم نہیں تھے۔ ہر بار نیا شوشا چھوڑتے تھے۔ یہ نہیں کہ شروع ہی میں سب کچھ بتادیتے۔ ظاہر ہے وہ ایک گھاگ پولیس آفیسر تھے۔

"راؤ ریاست خود بھی ایک بہت چالاک انسان ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنا کہ اگر صرف چاہتوں کا معاملہ ہوتا تو وہ اپنے خدشات پولیس تک کبھی نہیں لاتا۔ آخر اس سے اس کا کیا مقصد ہے؟" حیدر علی نے کہا۔

"ممکن ہے وہ اسے احساس دلانا چاہتا ہو کہ وہ تمام تر محبتوں کے باوجود اپنا تحفظ بھی کررہا ہے۔"

"ہاں، یہ بھی ہے مگر تمہارا یہ نکتہ بے بنیاد بھی نہیں۔ ممکن ہے تمہارا مسئلہ اس نے اپنی بیوی کی ذہانت پر چھوڑ دیا ہو اور بڑی گہرائی میں جاکر اسے یہ احساس دلانا چاہتا ہو کہ وہ اپنے تحفظ سے غافل نہیں ہے۔"

"آہ... ان بے شمار نکتوں میں، میں کہیں نقطہ بن کر نہ رہ جاؤں۔"

"ہمت سے کام لو دوست... سونا آگ میں تپ کر ہی کندن بنتا ہے۔ گھبرانے یا اکتانے کی ضرورت نہیں۔ اس طرح زندگی کے مسائل حل نہیں ہوتے۔ میرے خیال میں اب تمہارے پاس معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے... تم اس کے سہارے کام کرسکتے ہو۔"

"جی بہتر۔" میں ٹھنڈی سانس لے کر ان کے پاس سے اٹھ گیا اور ان تمام نکتوں میں گھرا گاڑی چلاتا ہوا اس پُراسرار عمارت میں داخل ہوگیا۔ لیکن یہاں داخل ہوکر میں نے خود کو سنبھال لیا۔ میں کیوں حماقت کروں؟ جو کچھ ہورہا ہے یا جو کچھ ہونے والا ہے اسے روکنے کی ذمے داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔ میں اپنی رقم کھری کروں جب تک بھی گاڑی چل جائے۔ یہ معاملہ ختم ہوجائے گا تو بعد میں دیکھا جائے گا کہ مستقبل کیا ہے۔ یہاں بیکار بیٹھنا مناسب نہیں تھا۔

چنانچہ میں نے لان میں آکر کیاریاں درست کرنا شروع کردیں۔ پھولوں کی ترتیب کی اور ان کے فالتو حصے کاٹنے لگا۔ مجھے واقعی اندازہ نہیں ہوسکا کہ کب بیگم صاحبہ باہر نکلیں اور کتنی دیر تک مجھے کام کرتے دیکھتی رہیں۔ اچانک میری نگاہ ان پر پڑی۔ میں سنبھل کر سیدھا ہوگیا۔

"تم باغ بانی سے واقف ہو؟" انہوں نے نرم لہجے

میں کہا۔

"کک... کوئی غلطی ہوگئی بیگم صاحبہ؟" میں نے گھگیائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں، تم نے کیاریاں بہت اچھی طرح سنواری ہیں۔ یہ کام تم نے کہاں سے سیکھا؟"

"سب کچھ کرتا تھا... انگریز بہادر کے ساتھ۔"

"پڑھے لکھے بھی لگتے ہو۔"

"بس کام چلانے کی حد تک۔"

"مجھے پھولوں کا ایک گلدستہ بنا کردو۔"

"جی ابھی تیار کرتا ہوں۔" میں نے کہا تو وہ اندر چلی گئیں۔ دوسرا موقع تھا جب انہوں نے سیدھے منہ بات کی تھی۔ ورنہ ان کی نگاہ جب بھی میری جانب اٹھتی تھی، اس میں قہر و غضب کی بجلیاں کوندتی ہوئی لگتی تھیں۔ باغبانی سے میرے فرشتوں کی بھی کوئی واقفیت نہیں تھی۔ کبھی اس طرح کی باتوں کی طرف توجہ ہی نہیں دی تھی لیکن بہر طور گلدستہ بنایا۔ ان کی اس توجہ سے میں بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اپنی دانست میں، میں نے پھولوں کی ترتیب بہت خوب صورت کی تھی اور پھر یہ گلدستہ لے کر بیگم صاحبہ کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ اندر موجود تھی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی ہوئی چہرے پر کولڈ کریم مل رہی تھیں میں نے انہیں پھولوں کا گلدستہ پیش کیا تو وہ اسے ناقدانہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں پھر مسکرا کر بولیں۔

"خوب صورت ہے۔ تم میں سلیقہ ہے۔ وہ سامنے گل دان رکھا ہوا ہے، اس میں لگادو پہلے جب ہمارے ہاں بہت سے ملازم تھے، مالی بھی تھا تو وہ مجھے تازہ پھولوں کا گلدستہ دیا کرتا تھا لیکن جب سے یہ سب کچھ ختم ہوا ہے، یہ گل دان خالی پڑے ہوئے ہیں۔ لگادو اس میں اور سنو... تم روزانہ ایک گلدستہ میرے لیے بنادیا کرو۔"

"جی بیگم صاحبہ۔" میں نے جواب دیا اور گلدستہ گل دان میں لگادیا۔ "اور کوئی حکم بیگم صاحبہ؟"

"نہیں، تم کل سے روزانہ صاحب کو دفتر چھوڑ کر واپس آجایا کرو۔ کچھ ایسے کام پڑے ہوئے ہیں جنہیں میں بہت عرصے سے کرنا چاہتی ہوں لیکن مجبور تھی۔ کوئی تھا ہی نہیں۔ سائرہ بے چاری تنہا ہی پورے گھر کی صفائی کرتی ہے۔ پھر کچن میں کھانا وغیرہ پکانا۔ اس سے زیادہ اس سے کام لینے کا مطلب ہے کہ وہ بیمار پڑ جائے گی۔"

"جی بیگم صاحبہ۔"

"بس اب جاؤ۔" انہوں نے کہا تو میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ دفعتاً ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ کمرے کے باہر اور

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کرکے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک
لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوئی بھی موجود تھا جو میرے واپس پلٹتے ہی تیز قدموں سے کہیں چلا گیا ہے۔ یہ احساس ایک انوکھی حیثیت رکھتا تھا۔ سائرہ کے علاوہ بھلا گھر میں اور کون ہے؟ میں نے تیزی سے سامنے والی راہداری کا رخ کیا۔ یہ راہداری آگے بڑھ کر کچن میں ختم ہو جاتی تھی اور سائرہ کچن میں موجود تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سائرہ کو دیکھا۔

اس کی تیزی سے چلتی سانس بتا رہی تھی کہ وہ دوڑتی ہوئی یہاں تک آئی ہے۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور مسکرائے بغیر پوچھا۔

''ہاں... کوئی بات ہے؟''

''جی...'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''کیا؟''

''ایک پیالی چائے مل سکتی ہے؟''

''بن رہی ہے۔ میں تمہیں پہنچا دوں گی... کہاں ہو اس وقت؟''

''گاڑی کی صفائی کرنی ہے، کافی گندی ہو رہی ہے۔''

''چائے وہیں پہنچا دوں؟''

''مہربانی ہوگی۔'' میں نے جواب دیا اور کچن سے واپس پلٹ آیا۔ لیکن یہ بات سوچنے کے قابل تھی کہ اگر میں بیگم صاحبہ کے سامنے تھا تو سائرہ میری جاسوسی کیوں کر رہی تھی؟ ایک بار پھر ذہن پر وہی کیفیت طاری ہو گئی۔ بلاشبہ اس بھوت گھر میں یہ تین کردار تھے جو اپنی اپنی جگہ الگ الگ نوعیت کے حامل تھے ...... اب سائرہ کے لیے بھی میرے دل میں کچھ عجیب سے خیالات پیدا ہو گئے تھے۔ حالانکہ وہ ایک اچھی لڑکی تھی لیکن اس کی شخصیت بھی کسی طور پر ان لوگوں سے کچھ کم پُراسرار نہیں تھی۔ واپس باہر نکل آیا اور گاڑی کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد سائرہ چائے کی پیالی لے کر باہر آ گئی۔

میں نے سرد نگاہوں سے سائرہ کو دیکھا تو وہ مسکرا دی۔

''تعجب ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''کس بات پر؟''

''تم کبھی کبھی مسکراتی بھی ہو۔'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ کچھ دیر خاموش کھڑی رہی پھر واپس پلٹی تو میں نے اسے آواز دی۔ ''سائرہ!'' وہ رک گئی۔

''برا مان گئیں میری بات کا؟''

''کیا جواب دوں؟''

''کیوں، جواب اتنا مشکل تو نہیں ہے۔''

''ہاں میں تو بے وقوف ہوں۔''

''تم مجھ پر طنز کرتے ہو، حالانکہ تمہیں پوری طرح نہ جانتے ہوئے بھی میں نے خود تم پر عیاں کر دیا تھا۔ میری نگرانی ہوتی ہے۔ بہادر شاہ! خدا کے لیے میرے لیے خطرات پیدا نہ کرو۔ میں تم سے ملوں گی۔ کسی وقت کچھ باتیں کروں گی۔ خود میں بھی اب اکتا چکی ہوں بری طرح۔''

''میں تمہارا انتظار کروں گا سائرہ۔''

''ہاں لیکن جلد بازی نہ کرنا۔ چائے پی لو تاکہ میں پیالی واپس لے جاؤں۔'' میں نے چائے پی کر پیالی اسے واپس کر دی اور وہ خاموشی سے چلی گئی۔ نہ جانے کب تک میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ وقت ہو گیا تھا اور میں راؤ ریاست کو لینے چل پڑا۔

''کہو کیا حالات ہیں؟'' انہوں نے واپس آتے ہوئے راستے میں پوچھا۔

''بیگم صاحبہ کچھ نرم نظر آتی ہیں۔''

''ہاں، تمہاری مخالفت تو وہ اب نہیں کرے گی۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''اب اس نے سائرہ کے علاوہ ایک آدمی کی ضرورت کو تسلیم کر لیا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا ہے۔''

''ان کی نرمی کی غالباً یہی وجہ ہو سکتی ہے۔''

''ہاں لیکن تم اس تبدیلی سے فائدہ اٹھاؤ۔ اس کی دلداری کرو اور اسے زیادہ سے زیادہ متاثر کرنے کی کوشش کرو۔''

''جی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ وہ شام خوش گوار تھی۔ دونوں میاں بیوی ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔ شام کی چائے انہوں نے لان پر لگانے کا حکم دیا تھا۔ میں بھی سرگرم تھا۔ راؤ نے کہا۔

''جاؤ، سائرہ کی مدد کرو۔ گھر کے دوسرے کام بھی دیکھ لیا کرو۔'' میں خاموشی سے کچن کی طرف چل پڑا۔ کچن میں جھانک کر دیکھا تو سائرہ موجود نہیں تھی۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ مجھے دوڑتی ہوئی اس طرف آتی نظر آئی۔ یہ ایک اضطراری کیفیت ہی تھی کہ میں فوراً آڑ میں ہو گیا۔ اس کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ سائرہ نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کچن میں داخل ہو گئی اور اس نے کچن کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

میرا تجسس بڑھ گیا اور میں نے کی ہول سے آنکھ لگا دی۔ اندر کا منظر میرے سامنے تھا۔ چائے کی ٹرے سجی ہوئی رکھی تھی۔ ٹرے میں چائے کے ساتھ اورنج جوس کا ایک گلاس رکھا نظر آ رہا تھا۔ سائرہ نے اپنے لباس سے کچھ نکالا تو میں

نے اس چیز کو دیکھ لیا۔ یہ ایک چھوٹی سی شیشی تھی۔ اس نے شیشی سے ہتھیلی پر کچھ انڈیلا اور پھر چٹکی سے اسے اٹھا لیا۔ اس کے بعد اس نے رخ بدل لیا اور اس کی پشت کی ہول کے سامنے آ گئی۔ البتہ کسی برتن میں چمچہ ہلانے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سائرہ نے ان مشروبات میں سے کسی ایک میں کچھ ملایا تھا۔ پتا نہیں کس میں؟ چائے میں یا جوس میں؟ مگر کیا... یہ کیسے پتا چلے گا؟ لیکن کچھ ہوا تھا... کچھ ضرور ہوا تھا۔

سائرہ کے بارے میں میرا نظریہ ایک بار پھر تبدیل ہو گیا۔ جو کچھ بھی اسے کرنا تھا، کر چکی تھی اور اب برتن لے جانے کے لیے تیار تھی۔ میرا ذہن فوری طور پر ساتھ نہیں دے سکا اور میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اس وقت مجھے کیا کرنا چاہیے؟ لیکن سائرہ کے سامنے مشکوک ہونا بھی مناسب نہیں تھا چنانچہ میں دروازے سے تھوڑا پیچھے ہٹ گیا اور جب سائرہ نے دروازہ کھولا تو اس طرح آگے بڑھا جیسے ابھی اس طرف آیا ہوں۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولی۔

''خیریت... کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں۔ راؤ صاحب نے بھیجا تھا کہ تمہاری مدد کروں۔ لاؤ، یہ برتن مجھے دے دو۔'' وہ آہستہ سے ہنسی اور بولی۔

''برتن اتنے وزنی نہیں ہیں۔ میرے پیچھے ہی چلے آؤ۔'' میں نے اس کی ہدایات پر عمل کیا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جو کچھ کر رہی تھی، اس میں ماہر ہو چکی ہے۔ لیکن میری کیفیت اندر سے اب بھی خراب تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ راؤ اور بیگم صاحبہ کو کیسے خبردار کروں؟ سائرہ کے پیچھے چلتا ہوا میں وہاں پہنچ گیا جہاں وہ دونوں موجود تھے۔ سائرہ نے جوس کا گلاس راؤ کے سامنے رکھا۔ چائے کے برتن بیگم صاحبہ کے سامنے رکھ دیے اور اس کے بعد پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ میں سخت پریشان تھا لیکن جلد بازی مناسب نہیں تھی۔ میں کر بھی کیا سکتا تھا؟ کیسے ہوشیار کرتا اور کیا کہتا؟ خاموشی ہی مناسب تھی۔ دونوں اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ راؤ ریاست بولے۔

''سائرہ! میں نے بہادر شاہ سے کہہ دیا ہے۔ اس سے کچن میں مدد لیا کرو اور اس کے ساتھ گھر کے تمام کاموں میں بھی۔ تم تنہا سارے کام نہیں کر سکتیں۔ میرا خیال ہے کہ بہادر شاہ تمہاری بہترین مدد کرے گا۔''

''جی راؤ صاحب۔'' سائرہ نے باادب لہجے میں کہا۔

''جاؤ، تم لوگ اپنا کام کرو۔ ابھی ہم لوگ یہاں دیر تک بیٹھیں گے۔'' میں سائرہ کے ساتھ کچن میں آ گیا۔

''چائے پیو گے؟''

''نہیں۔''

''کیا بات ہے... تمہارا چہرہ کیسا ہو رہا ہے؟''

''نہیں، کوئی بات نہیں۔ ٹھیک ہوں۔ کوئی کام ہے؟''

''فی الحال تو کوئی نہیں۔ مجھے ضرورت ہوئی تو میں خود ہی تمہیں بتا دوں گی۔ کل سے پھر شروع کریں گے۔''

میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن سائرہ نے جو کچھ کیا تھا، اس کا نتیجہ دیکھنا چاہتا تھا اور اسی رات نتیجہ برآمد ہو گیا۔ مجھے پتا چل گیا کہ سائرہ نے کس کے لیے یہ کیا تھا۔ راؤ کی حالت اچانک بگڑ گئی تھی اور اس کی اطلاع بھی سائرہ ہی نے مجھے دی تھی۔

''راؤ صاحب پر سانس کا دورہ پڑا ہے۔ بڑی بری حالت ہو رہی ہے۔ آؤ ذرا۔''

میں تیزی سے سائرہ کے ساتھ باہر نکل آیا۔ بیگم صاحبہ راؤ کے نزدیک ہی بیٹھی تھیں اور راؤ کی حالت بری طرح بگڑی ہوئی تھی۔ سانس سینے میں نہیں سما رہا تھا۔ حلق سے ایک بھیانک آواز نکل رہی تھی اور وہ بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔

''بیگم صاحبہ! کیا خیال ہے، کسی ڈاکٹر کو بلاؤں یا انہیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے جایا جائے؟'' میں نے پوچھا۔

''اوہ... میں تو... میں تو پاگل ہو جاؤں گی۔ دماغ خراب ہو جائے گا میرا... انہیں تو کچھ نہیں ہوگا لیکن میں... میرے اعصاب... میرے اعصاب...'' بیگم صاحبہ نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

''آپ مجھے حکم دیں بیگم صاحبہ؟''

''کیا حکم دوں... کوئی علاج نہیں کرتے۔ سختی سے مخالفت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کوئی علاج کرایا تو خودکشی کر لیں گے۔ اب بتاؤ میں کیا کروں؟ ایسی ہی حالت ہو جاتی ہے۔ بے شک ٹھیک ہو جاتے ہیں لیکن میں... میں، میرے اعصاب... میرے اعصاب...'' بیگم صاحبہ نے پھر سر پکڑ لیا۔

راؤ کو دورہ ضرور پڑا تھا لیکن وہ ہوش و حواس میں تھے۔ انہوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

''تم لوگ... تم لوگ فکر... نہ کرو... ٹھیک... ٹھیک عارضی ہے... سب کچھ عارضی ہے... ٹھیک ہو جاؤں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گا۔“

”دیکھا تم نے بہادر شاہ... جاؤ بلاوجہ اپنا وقت برباد نہ کرو۔ میں تو عرصے سے یہ سب کچھ دیکھ رہی ہوں۔ کچھ نہیں کرسکتی۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتی۔“ بیگم صاحبہ کی ہدایت پر میں وہاں سے نکل آیا۔ سائرہ البتہ وہیں تھی۔ نہ جانے کیوں... اپنے کمرے میں آکر میرے بدن میں سنسنی سی طاری ہونے لگی۔

یہ تو اب صاف معلوم ہوگیا تھا کہ سائرہ، راؤ کے خلاف کوئی کارروائی کررہی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ کارروائی بیگم صاحبہ کے ایما پر ہو لیکن اب یہ بات میرے علم میں آگئی تھی اور اس کے بعد اب مجھے یہ دیکھنا تھا کہ سائرہ، راؤ کو وہ کیا چیز دے رہی ہے جس سے اس کی یہ حالت ہوجاتی ہے۔ اور اس کا مطلب ہے راؤ ریاست کا خدشہ بالکل درست ہے۔ مگر... مگر وہ احمق آدمی، وہ خود ہی پاگل تھا۔ کوئی بھلا کیا کرسکتا ہے اس کے لیے... حیدر علی صاحب کو یہ اطلاع دینا ضروری ہے تھی۔ سائرہ اب پوری طرح میری نظروں میں مشکوک ہوگئی تھی۔ حالانکہ میرے دل کے کچھ گوشے اس کی کہانی سننے کے بعد نرم ہوگئے تھے اور میں اس کے بارے میں نہ جانے کس کس طرح سوچنے لگا تھا لیکن اس وقت ان حالات نے سائرہ کو میری نگاہوں میں بے حد مشکوک کردیا تھا۔ مجھے تھوڑا سا افسوس بھی ہوا لیکن کیا کرسکتا تھا۔ حیدر علی صاحب ہی اس سلسلے میں اگر کوئی حکم دیتے تو اس کی تعمیل ہوسکتی تھی۔ نہ جانے رات کے کس پہر تک میں یہ تمام باتیں سوچتا رہا۔ صبح کو مقررہ وقت پر سائرہ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے فوراً ہی راؤ کی کیفیت پوچھی تو سائرہ ہنس کر بولی۔

”دورہ ایک آدھ گھنٹے کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد راؤ صاحب نارمل ہوجاتے ہیں۔“

”بالآخر ایک دن ایسا ضرور آجائے گا جب وہ نارمل نہیں ہوسکیں گے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب... میں ڈاکٹر تو نہیں ہوں کہ مطلب بتاؤں۔“

اس دن راؤ دفتر نہیں گئے۔ بلکہ دن میں دس بجے کے قریب میری ان سے ملاقات ہوئی۔ واقعی حیرت انگیز طور پر وہ بہتر حالت میں تھے۔ کہنے لگے۔

”تمہیں یہاں کوئی کام ہے بہادر شاہ؟“

”نہیں راؤ صاحب۔“

”آج میں دفتر نہیں جاؤں گا، تم چابیاں لے لو۔ بس سے دفتر چلے جاؤ۔ پورے دفتر کی صفائی کرڈالو۔ بہت دن سے میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایک دن پورے دفتر کی صفائی کی جائے۔ یہ کام تمہارے لیے ممکن ہے یا نہیں؟“

”کیوں نہیں راؤ صاحب۔“ میں نے کہا۔

”جس وقت بھی کام سے فارغ ہو، واپس آجانا... میرا آج کہیں بھی نکلنے کا پروگرام نہیں ہے۔“ میں نے گردن ہلادی اور اس کے بعد دفتر چل پڑا۔

دفتر واقعی گندا ہورہا تھا۔۔۔ وہ باقاعدہ آفس تھا۔ اس کی صفائی کرتے ہوئے میں سوچنے لگا، کیسی عجیب بات ہے کہ اتنا شاندار آفس قائم کیا گیا ہے لیکن یہاں کچھ نہیں ہوتا۔ معاملات واقعی اس قدر پُراسرار تھے کہ مجھ جیسے آدمی کی عقل بھی چکرا کر رہ گئی تھی۔ پولیس کا کام واقعی مشکل ہوتا ہے اور وہی الجھے ہوئے معاملات کو سلجھانے کی اہلیت رکھتی ہے۔

میں نے بڑے ہال نما کمرے کی مکمل صفائی کرڈالی جس میں میزیں وغیرہ پڑی ہوئی تھیں۔ تمام میزوں کی درازیں کھول کر دیکھیں۔ بہت سادہ کاغذات پڑے ہوئے تھے اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو قابلِ توجہ ہوتی۔ پھر میں راؤ ریاست کے کیبن میں داخل ہوگیا۔ دفتر کی صفائی شروع کرنے سے پہلے دفعتاً ہی میری نگاہ لوہے کی اس الماری پر پڑی جو تھوڑی سی کھلی ہوئی نظر آرہی تھی۔

نہ جانے کیوں میرے ذہن میں تجسس جاگا۔ میں نے اس الماری کا ہینڈل پکڑ کر کھینچا تو وہ کھل گئی۔ اس سے پہلے کبھی میں نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ نہ جانے راؤ اسے کھلا رکھتا تھا یا یہ بند رہتی تھی۔ الماری میں البتہ بہت سی فائلیں اور کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ یقیناً سارا ریکارڈ سمیٹ کر اس الماری میں منتقل کردیا گیا تھا۔ اس الماری کے مختلف حصے تھے۔ میری توجہ خصوصاً اس جانب مبذول ہوگئی جسے تجوری کہا جاسکتا ہے۔ اس کو کھول کر دیکھا تو میں ایک براؤن رنگ کا لفافہ رکھا ہوا تھا۔

اس کے علاوہ اس تجوری میں اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے لفافے کو نکال لیا اور اس میں رکھے ہوئے کاغذات دیکھنے لگا۔ یہ کام میری اپنی لائن کا تھا اس لیے اسے سمجھنے میں، میں ذرا بھی نہ الجھا۔ کاغذات میں بینک کے اسٹیٹ منٹس بھی شامل تھے اور یہ مختلف بینکوں کے تھے اور ان میں جو رقوم لکھی گئی تھیں، وہ ناقابلِ یقین تھیں۔ بڑی بڑی رقوم جن کی مالیت بے پناہ تھی۔ میں نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑیں۔ یہ اسٹیٹ منٹس راؤ صاحب ہی کے تھے۔

میں نے ان پر پڑی ہوئی تاریخیں دیکھیں اور مزید

حیران ہوگیا کیونکہ یہ تاریخیں زیادہ پرانی نہیں تھیں لیکن... لیکن... یہ سب کیا ہے؟ اگر راؤ کے اثاثے اتنے ہیں تو پھر... پھر وہ دوالیا کیسے ہوگیا؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں نے یہ تمام کاغذات دیکھنے کے بعد انہیں احتیاط سے ان کی جگہ پر رکھا۔ کچھ اور کاغذات بھی تھے جو ٹائپ شدہ تھے۔ میں نے انہیں دیکھا تو مزید حیرت کا شکار ہوگیا۔ ان کاغذات میں کچھ شیئرز کی تفصیلات تھیں اور جو سب سے زیادہ حیران کن بات تھی، وہ یہ تھی کہ بیگم صاحبہ کے اپنے اثاثوں کی تفصیلات بھی ان میں درج تھیں۔ یہ تاریخیں بھی زیادہ پرانی نہیں تھیں اور یہ تفصیلات غالباً کچھ کاغذات کی نقول کی شکل میں تھیں کیونکہ یہ سب فوٹو اسٹیٹ تھیں۔

میں احمقوں کی طرح یہ تمام چیزیں دیکھتا رہا اور میری الجھنوں میں بے پناہ اضافہ ہوتا گیا۔ ان کاغذات کی رو سے تو بیگم صاحبہ بے حد دولت مند خاتون تھیں اور راؤ کی دولت کی تو کوئی حد ہی نہ تھی لیکن پھر یہ سب کچھ... جبکہ تاریخیں انہیں تازہ تفصیلات کی شکل میں پیش کررہی تھیں۔ میں نے تجوری بند کرنے کے بعد الماری بھی بند کردی اور کسی خیال میں ڈوب گیا لیکن ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دفعتاً ہی بڑے دروازے سے راؤ ریاست اندر داخل ہوتے ہوئے نظر آئے اور تیر کی طرح میری جانب لپکا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی ان کے انداز میں اس قدر پھرتی نہیں دیکھی تھی۔ اندر آتے ہی وہ مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ میں نے حیرانی سے منہ کھول کر کہا۔

”آپ... آپ کو تو آفس نہیں آنا تھا؟“

”ہاں... کچھ... کاغذات تھے جنہیں دیکھنا تھا۔ بحالتِ مجبوری آنا پڑا۔“ راؤ صاحب نے آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا اور پھر میری طرف دیکھ کر کہا۔

”تم نے ابھی تک دفتر کی صفائی ختم نہیں کی؟“

”ابھی کہاں راؤ صاحب... میں ابھی تو یہاں پہنچا ہوں لیکن آپ تھوڑا وقت دے دیں تو میں صفائی کرلوں گا۔“

”نہیں نہیں، تم جاؤ باہر رکو۔ میرے کمرے کی صفائی بعد میں کرلینا۔ مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ میں کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ گیا ہوں۔ میرا خیال ہے پچھلے دن۔ اوہ، اس الماری کو کھول کر دیکھا تم نے؟“ اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ چند لمحوں قبل ہی میں نے یہ الماری بند کی تھی۔

”نہیں راؤ صاحب! ابھی ابھی تو میں اس دفتر میں داخل ہوا ہوں۔ یہ الماری تو لاک ہے شاید...“

”نہیں، شاید کھلی رہ گئی ہے... ذرا دیکھو تو۔ انہوں نے کہا تو میں نے الماری کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے کھولا۔

”جی ہاں، کھلی ہوئی ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ اتفاق سے اس کی چابی بھی اپنے ساتھ نہیں لایا خیر، تم باہر رکو۔“ راؤ نے کہا تو میں باہر نکل آیا۔ میرا ذہن سائیں سائیں کررہا تھا۔ راؤ کی مشکوک کیفیت بتا رہی تھی کہ اچانک ہی الماری کھلی رہ جانے کا احساس ہوا ہے اور وہ بیماری کے عالم میں ادھر دوڑ پڑا ہے۔

لیکن اب صورتِ حال میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی تھی۔ یہ نیا انکشاف تھا۔ دو باتیں جمع ہوگئی تھیں اور مجھے حیدر علی صاحب کو یہ تفصیلات ضرور بتانی تھیں۔ میں باہر آکر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد راؤ بھی واپس آگیا اور بولا۔

”آؤ چل رہے ہو گھر...؟“

”جو حکم آپ کا... اگر آپ کی اجازت ہو تو دفتر صاف کرلوں۔“

”بھئی رہنے دو آج... بس میں تو یونہی آگیا۔ ایک کاغذ دیکھنا تھا۔ خصوصی طور پر اسے دیکھ لیا... چلو واپس چلتے ہیں۔“

”آپ گاڑی لائے ہیں؟“

”تو اور کون لاتا؟“ راؤ نے جواب دیا تو میں اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ کچھ دیر کے بعد ہم گھر پہنچ گئے۔ راؤ کو غالباً اطمینان ہوگیا تھا کہ میں نے اس کی الماری کو کھول کر نہیں دیکھا اور یقیناً وہ اسی الماری کی وجہ سے دوڑا آیا تھا۔ گھر واپس آنے کے بعد مجھے باہر جانے کا موقع نہیں مل سکا۔ میں حیدر علی کے پاس نہیں جاسکا۔ مجھے بیگم صاحبہ کے کمرے کی صفائی کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ سائرہ بھی میرے ساتھ تھی اور کچھ شگفتہ سی نظر آرہی تھی۔

”تم بڑے باہمت انسان نظر آتے ہو۔“

”کیوں؟“

”ان حالات میں بھی گزارہ کررہے ہو جبکہ تمہاری تنخواہ کا معاملہ بھی کھٹائی میں ہے۔“

”ایک آدھ مہینے تو دیکھنا ہوگا۔ راؤ صاحب نے ملازم رکھا ہے مجھے۔ بات نہ بنی تو دیکھا جائے گا۔ وقت تو گزر رہا ہے۔“

”اور کوئی نہیں ہے تمہارا... کوئی تو ہوگا؟“

”کیا بات ہے۔ آج مجھ سے باتیں کرتے ہوئے تمہیں ڈر نہیں لگ رہا؟“

”تمہیں میری خاموشی سے شکایت تھی نا، بس میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمت کر لی۔ آخر انسان ہوں، مالکوں کی باتیں دوسروں سے نہیں کہوں گی لیکن زبان پر تالے تو نہیں لگائے جا سکتے۔''

''تم نے اعلانِ بغاوت کر دیا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ ہنس کر خاموش ہو گئی۔ صفائی کرتے ہوئے مجھے بیگم صاحبہ کے کمرے سے ایک چھوٹی سی شیشی ملی جس میں ننھی ننھی گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ میں چونک گیا۔

میں نے کسی خیال کے تحت شیشی اپنے لباس میں چھپالی اور کام میں مصروف ہو گیا۔ دل میں خیال آیا کہ ممکن ہے یہ وہی شیشی ہو جو کچن میں سائرہ کے پاس تھی۔ سائرہ کو اس کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ اس رات کھانا کھانے کے بعد بھی سائرہ دیر تک میرے پاس بیٹھی رہی۔ اس نے مجھ سے میری پسند کے کھانوں کے بارے میں بھی پوچھا۔

دوسرے دن میں نے خصوصی طور پر حیدر علی سے ملاقات کا وقت نکالا۔ راؤ کو دفتر پہنچانے کے بعد میں نے اس سے تھوڑی دیر کے لیے جانے کی اجازت مانگی۔

''ہاں ہاں، چلے جاؤ... کوئی کام ہے؟''

''جی راؤ صاحب! کچھ لوگوں سے ملنا ہے۔''

''ضرور جاؤ۔ منیر بیگ سے ملاقات ہو گی؟'' انہوں نے کہا۔

''نہیں راؤ صاحب! وہاں تو جب حکم ملے گا، تب ہی جاؤں گا۔''

''ہاں... ہاں... جاؤ، کوئی بات نہیں ہے۔'' راؤ نے کہا تو میں نے کار کی چابی ان کے حوالے کر دی۔ پہلے میں ایک کیمسٹ کے پاس پہنچا۔ شیشی اسے دکھا کر میں نے کہا۔

''ذرا دیکھیے بھائی صاحب... یہ کون سی دوا ہے؟ میں نے ڈاکٹر کے پرچے کے مطابق منگوائی تھی مگر میری بیوی کہتی ہے یہ وہ دوا نہیں جو وہ پہلے استعمال کرتی تھی۔'' کیمسٹ نے شیشی لے کر اسے دیکھا۔ ایک گولی نکال کر چیک کی پھر بولا۔

''یہ لو بلڈ پریشر کے لیے ہے مگر بہت ہائی پوٹینسی کی ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر استعمال نہ کرنا۔ تمہاری بیوی کو بلڈ پریشر رہتا ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تب پھر یہ دوا ٹھیک ہے۔'' کیمسٹ نے کہا تو میں وہاں سے چل دیا مگر بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اگر راؤ کو یہ گولیاں دی جا رہی تھیں تو اس کا بلڈ پریشر بڑھنا چاہیے تھا۔ سانس کا مرض اسے کیوں لاحق ہو گیا؟ ہو سکتا ہے کہ اس کے کچھ سائیڈ ایفیکٹ ہوں۔ حیدر علی صاحب ہی اس کے بارے میں کچھ صحیح تحقیق کر سکتے تھے۔

حیدر علی صاحب مجھے دیکھ کر ہمیشہ خوش ہوتے تھے۔ وہ بولے۔ ''جناب عالی! سنائیے کوئی اہم بات؟''

''اس کا تو فیصلہ آپ ہی کر سکتے ہیں حیدر علی صاحب۔ میں تفصیل عرض کیے دیتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اس دوران کی تمام رپورٹ حیدر علی صاحب کو دے دی۔ حیدر علی صاحب حیران رہ گئے پھر ان کے چہرے پر عجیب سی چمک نمودار ہو گئی، وہ بولے۔

''اور تم کہتے ہو کہ تم کچھ نہیں کر رہے... زبردست کارنامہ انجام دیا ہے تم نے۔ تمہاری رپورٹ کی روشنی میں آگے بڑھنے کا موقع ملا ہے۔ یہ سب کچھ واقعی سخت حیران کن ہے۔ گاڑی کے بریک خود بخود تو نہیں فیل ہوئے ہوں گے۔ اور فرض کرو ایسا ہو بھی جاتا تو سائرہ تمہیں ہوشیار کیوں کرتی؟ اس لڑکی کا کردار واقعی پُراسرار ہے اور خطرناک بھی۔ میرا خیال ہے کہ تم اس پر پوری نگاہ رکھو اور اس سے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرو۔ اس سے تمہیں بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ اور ہاں اس شیشی سے کچھ گولیاں میں نکال لیتا ہوں۔

''میں تمہاری رپورٹ پر تحقیق کروں گا۔ تم بس آنکھیں کھلی رکھو اور اپنی حفاظت بھی کرو۔'' حیدر علی کو یہ رپورٹ دے کر میں مطمئن ہو گیا پھر اس دن واپس آنے کے بعد میں نے موقع پاتے ہی وہ شیشی واپس اسی جگہ رکھ دی۔ سائرہ کے انداز میں جو تبدیلی رونما ہوئی تھی، اس سے مجھے حیرت بھی ہو رہی تھی اور میں مشکوک بھی ہو گیا تھا۔

''میں نے آج تمہاری پسند کا کھانا پکایا ہے۔'' اس نے کہا۔

''اس میں زہر تو نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا تو سائرہ تعجب سے مجھے دیکھنے لگی۔

''میں سمجھی نہیں۔''

''میں تم پر حیران ہوں سائرہ۔''

''کیوں؟''

''تمہارے اندر اس ماحول سے بغاوت کا جذبہ اچانک پیدا ہوا اور تمہیں پوری آزادی بھی مل گئی۔ اس کے پس پردہ کوئی راز تو نہیں ہے؟''

''کیا راز ہو سکتا ہے؟'' اس نے کسی قدر افسردگی سے پوچھا۔

''معاف کرنا۔ اس دن تم نے سچا خواب دیکھا تھا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو پھر...؟''

''اور نہ صرف راؤ صاحب بلکہ میں بھی بچ گیا۔ اس غلطی کا ازالہ تو تمہیں کرنا چاہیے۔'' میں نے کہا تو سائرہ میرے الفاظ سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔

ویسے میں نے یہ اندازہ ضرور لگا لیا تھا کہ سائرہ میرے اچانک سوال پر حیران نہیں بلکہ افسردہ ہوئی تھی۔ سائرہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور گردن جھکالی۔ میں نے اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے دیکھے۔ پھر اس نے میرے سامنے رکھے کھانے سے نوالہ لیا اور اسے منہ میں رکھ لیا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

''ارے سائرہ! اوہ... سائرہ... معاف کرنا۔ سوری بھئی، مذاق کا برا مان گئیں۔'' سائرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے کافی کھانا میرے سامنے کھایا اور مسلسل روتی رہی۔ میں اس سے معذرت کرتا رہا۔ پھر اس نے بقیہ کھانا اٹھایا اور باہر نکل گئی۔

میں سکتے کے سے عالم میں اسے دیکھتا رہا۔ جانے کیوں سائرہ کے انداز میں مجھے ایک عجیب سی کیفیت محسوس ہوئی تھی۔ رات کافی گزر گئی۔

بہت دیر تک میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے بعد سائرہ دوبارہ نہیں آئی۔ کافی رات گزر گئی۔ مجھے ہنسی بھی آرہی تھی۔ اس سوال نے مجھے بھوکا مار ڈالا تھا اور صبح کو جاگا تو سخت بھوک لگ رہی تھی۔ میں باورچی خانے میں جا پہنچا۔ سائرہ معمول کے مطابق مصروف تھی۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ''میری سزا پوری ہوگئی یا نہیں؟''

اس نے نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ کہا۔

''میں بھوکا ہوں۔'' میں نے پھر کہا۔

''مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''مجھے کھانا دے دو۔''

''کچن میں ساری چیزیں زہر آلود نہیں ہوں گی، اپنی پسند سے جو چاہو لے لو۔'' اس نے کہا۔

''سائرہ! میں نے مذاق کیا تھا، آئندہ نہیں کروں گا۔''

''پراٹھا بنا دوں؟''

''بنا دو۔'' میں نے کہا تو وہ خاموشی سے کام میں مصروف ہوگئی۔

پھر اس نے ناشتا میرے سامنے رکھ دیا۔ میں کھانے میں مصروف ہوگیا۔ ناشتا ختم کرنے کے بعد میں نے کہا۔ ''میں چلتا ہوں۔ سائرہ! مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہارا دل دکھایا۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔''

راؤ بالکل ٹھیک تھا۔ دفتر پہنچ کر بولا۔

''آج تم میرے کمرے کی صفائی کردو، مجھے باہر کے کچھ کام ہیں۔ دوپہر تک واپس آجاؤں گا۔''

''آپ گاڑی لے جائیں گے راؤ صاحب؟''

''ہاں... کوئی حرج نہیں ہے۔'' وہ چلا گیا۔ الماری بند تھی مگر مجھے اب اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے کمرے کی صفائی کردی پھر راؤ واپس آگیا اور اس کے بعد ہم کوٹھی پہنچ گئے۔ بیگم صاحبہ کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ راؤ رات تک باہر نہ نکلا۔ دوسرے اور تیسرے دن بھی بیگم صاحبہ کی طبیعت درست نہ ہوئی دوپہر کو راؤ نے کہا۔

''ہم ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں۔ واپسی میں ہمیں دیر بھی ہوسکتی ہے۔ تم لوگ فکر نہ کرنا۔'' اس دن بھی راؤ خود ہی گاڑی لے گیا تھا۔ بیگم صاحبہ کچھ زیادہ ہی بیمار تھیں کیونکہ پچھلی سیٹ پر لیٹ کر گئی تھیں۔ گاڑی باہر نکل گئی تو میں گیٹ بند کر کے واپس پلٹا۔ سائرہ اندر موجود تھی۔ ویسے اس دوران وہ مجھ سے کھنچی کھنچی رہی تھی۔ میں نے خود ہی اس سے دو تین بار بات کرنے کی کوشش کی مگر اس نے ضرورت سے زیادہ جواب نہیں دیے۔ اس لیے میں بھی پیچھے ہٹ گیا۔ اس دن بھی میری شام تک اس سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ شام کی چائے لے کر ہی وہ میرے کمرے میں آئی تھی۔ چائے رکھ کر وہ رکی اور مجھے دیکھ کر بولی۔

''کچھ اور چاہیے؟''

''نہیں، سائرہ! شکریہ۔'' میں نے نرمی سے کہا پھر بھی وہ واپس نہیں گئی اور کھڑی رہی۔ میں نے چونک کر کہا۔

''بیٹھو سائرہ! مجھ سے کوئی کام تو نہیں ہے؟''

''ہاں... ہے۔''

''اوہ، بیٹھو پلیز۔'' میں نے خوش اخلاقی سے کہا تو وہ بیٹھ گئی۔

''مجھے تم سے شکایت ہے بہادر شاہ۔'' اس نے کہا۔

''مجھے افسوس ہے... اگر بات اس دن کی ہے تو میں تم سے معافی مانگ چکا ہوں مگر تم نے مجھے معاف نہیں کیا۔''

''تم نے بہادر شاہ... تم نے اس دن مجھے بڑا دکھ پہنچایا تھا۔ ایسی بات کہی تھی تم نے کہ تمہارے بارے میں میرے تصورات کے سارے بت ٹوٹ گئے۔ بہادر شاہ! میں اپنی سطح سے بہت نیچے گر کر آج تم سے کچھ باتیں کر رہی ہوں۔ اس کے بعد خود کو بہت حقیر، پست سمجھوں گی مگر میرا دل آخری فیصلہ کر چکا ہے۔ بہادر شاہ! میری برداشت جواب

دے گئی ہے، شاید اس سے زیادہ میری قوتِ برداشت میرا ساتھ نہ دے سکے۔ میں خاموش رہی تو نہ جانے کیا ہو جائے۔''

''اگر تم مجھے اس قابل سمجھتی ہو... سائرہ تو جو دل چاہے کہو۔ شاید میرے بارے میں تمہارا فیصلہ بدل جائے۔''

''جو کچھ میں تمہیں بتاؤں گی بہادر شاہ... ہر خدشے سے بے نیاز ہو کر بتاؤں گی۔ نتیجہ کچھ بھی نکلے، پروا نہیں۔ آخر کچھ نتیجہ تو نکلے۔ کچھ تو ہو۔''

''تو پھر سوچو مت، بولتی رہو۔''

''مجھے ایک بات کا جواب دو۔ اس گھر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میں حیران ہوں، یہ دونوں میاں بیوی انوکھے ہیں۔''

''اتنے عجیب کہ تم یقین نہیں کرو گے۔ اور میں... میں ان کے درمیان رہ کر ذہنی مریض بنتی جا رہی ہوں۔ تمہیں کوئی نقصان ہو یا نہ ہو، میرے دماغ کی شریانیں ضرور پھٹ جائیں گی۔ میں تمہیں اپنے بارے میں جو کچھ بتا چکی ہوں، وہ بالکل صحیح ہے۔ میں لاوارث ہوں، یہاں نوکری مجھے اس لیے پسند آئی تھی کہ میں دنیا کی بری نگاہوں سے محفوظ رہوں۔ میں یہاں خوش تھی لیکن... لیکن...''

''سائرہ! میں ہر حالت میں تمہارا دوست ہوں۔ کچھ کہتے ہوئے ہر خوف کو ذہن سے نکال دو۔ مجھ سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

''میں اس بھیانک ماحول سے، اس قاتل ماحول سے نکلنا چاہتی ہوں۔ بہادر شاہ! نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ جیسے کچھ ہو جائے گا۔ اور کچھ نہیں تو میں کسی جال میں ضرور پھنس جاؤں گی۔ یہ لوگ ضرور مجھے پھانسی چڑھوا دیں۔ بہادر شاہ! میں سب کچھ بتا دوں گی تمہیں۔ سب کچھ بتاؤں گی۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا ہے۔ یہاں کا ماحول بہت خوفناک ہے۔ بیگم صاحبہ، راؤ صاحب کی موت چاہتی ہیں۔ وہ ایک نہ ایک دن انہیں ضرور ہلاک کر دیں گی۔ وہ مار دیں گی انہیں۔''

''کیسے؟'' میں نے سنبھل کر پوچھا تو سائرہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں بند کیے کیے کہا۔

''یہاں نوکری کرنے کے بعد کچھ دن تو سب ٹھیک رہا... بالکل ٹھیک۔ میں خوش تھی۔ پھر بیگم صاحبہ نے راؤ صاحب میں کیڑے نکالنے شروع کر دیے۔ ان کے سامنے وہ ہمیشہ ٹھیک رہتیں لیکن ان کے پیچھے ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتی رہتی تھیں۔ میں تمہیں وہ باتیں نہیں بتا سکتی۔ پھر ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا۔

''سائرہ! تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔'' میں نے اقرار کر لیا تو انہوں نے مجھے ایک شیشی دیتے ہوئے کہا کہ ہفتے میں تین دن ایک ایک گولی بڑی احتیاط سے راؤ صاحب کے مشروبات میں شامل کر دیا کرو۔ انہوں نے ایسی ایسی باتیں کر کے مجھے خوف زدہ کر دیا کہ میں بیان نہیں کرسکتی۔ میں دہشت زدہ ہوگئی تھی لیکن پھر بھی میں نے ہمت کی۔ میں نے راؤ صاحب کو یہ بات بتا دی۔

''بتا دی...؟'' میں اچھل پڑا۔

''ہاں... پہلی گولی دینے سے پہلے ہی یہ بات بتا دی۔ راؤ صاحب نے ان میں سے دو گولیاں مجھ سے لے لیں اور کہا کہ بیگم صاحبہ کو یہی بتاؤں کہ میں یہ گولیاں انہیں استعمال کرا رہی ہوں۔ پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ زہریلی گولیاں ہیں۔ سلو پوائزن... جس سے آہستہ آہستہ ان کی صحت خراب ہوتی جائے گی اور نتیجہ موت نکلے گا۔ میں لرز گئی تھی۔ راؤ صاحب بولے۔

''میں اسے دیوانوں کی طرح چاہتا ہوں سائرہ... میری زندگی کا مقصد اس کی زندگی ہے۔ میں جانتا ہوں، اسے اب کیا احساس ہے۔ مجھ سے اس کی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ سائرہ! میرا کاروبار تباہ ہوگیا ہے۔ میرے پاس دولت نہیں ہے لیکن میرا عزم ہے۔ میں اسے اتنی دولت کما کر دوں گا کہ اس سے سنبھالی نہیں جا سکے اور پھر وہ... وہ خود اپنے کیے پر شرمندہ ہوگی۔ میری آرزو ہے کہ وہ خوش رہے۔ صحت مند رہے، مجھ سے جو بھی بن پڑا، اس کی خدمت کروں گا۔ تم ایک کام کرو سائرہ۔''

''کیا راؤ صاحب...؟'' میں نے پوچھا۔

''دیکھو یہ اسی انداز کی گولیاں ہیں۔ یہ شیشی اپنے پاس رکھ لو اور اس کی ہدایت کے مطابق مجھے اس میں سے گولی دیتی رہو۔ یہ گولیاں بے ضرر ہیں اور وٹامن کی ہیں۔ ان سے مجھے نقصان نہیں پہنچے گا۔ وہ جب بھی تمہیں نئی شیشی دے، مجھے بتا دو اور میں اسے ان گولیوں میں تبدیل کرتا رہوں گا۔ میں بس اتنا جینا چاہتا ہوں کہ اس کے لیے دولت اکٹھی کرلوں۔ البتہ تم اگر میری زندگی چاہتی ہو تو مجھے اس کے اقدامات سے آگاہ کرتی رہا کرو۔ راؤ صاحب فرشتہ صفت انسان ہیں۔ وہ بیوی کے ہاتھوں اس کی دانست میں زہر کھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہے ہیں مگر اسے امرت دے رہے ہیں۔ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتے ہیں۔ راؤ صاحب کی حالت کبھی کبھی بہت خراب ہوجاتی ہے۔"

"ان کی یہ کیفیت کتنے دنوں سے ہے۔" میں نے پوچھا۔ مجھے وہ صبح یاد آگئی جب میں نے کچن میں سائرہ کی کارستانی دیکھی تھی۔ سائرہ جذباتی اور افسردہ ہونے کے باوجود مسکرادی۔ پھر اس نے کہا۔

"راؤ صاحب بے حد چالاک انسان ہیں۔ وہ کسی زمانے میں فلمی اداکار رہ چکے ہیں۔ ان گولیوں کے استعمال کے بعد سے انہوں نے زبردست ڈائٹنگ شروع کررکھی ہے۔ صرف جوس پیتے ہیں اور وٹامن کھاتے ہیں اور کبھی کبھی ان پر مصنوعی دورے پڑتے ہیں۔ انہوں نے ڈائٹنگ کر کے اپنی صحت کم کی ہے تاکہ بیگم صاحبہ یہ سمجھیں کہ ان کی گولیاں اثر کررہی ہیں ورنہ وہ بالکل تندرست ہیں۔ وہ صرف بیماری کا بہانہ کرتے ہیں اور مجھ سے اپنی پرفارمنس پوچھتے ہیں۔"

"اوہ... میرے خدا! بیگم صاحبہ کو شبہ نہیں ہوا؟"

"پتا نہیں، بیگم صاحبہ کا کہنا ہے کہ راؤ صاحب بے حد شاطر انسان ہیں۔ ان کا کاروبار تباہ نہیں ہوا ہے بلکہ انہوں نے اسے فروخت کر کے اپنی دولت چھپادی ہے۔ بس اپنی گڈول محفوظ کررکھی ہے تاکہ بیگم صاحبہ کی دولت ہڑپ کر کے اپنے کاروبار کو ازسرِنو شروع کرسکیں۔"

"بیگم صاحبہ کے پاس دولت ہے؟"

"یہ تو اللہ جانے لیکن کئی بار ان کے فون آئے ہیں جن پر ہونے والی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی اپنی دولت انڈرگراؤنڈ کردی ہے۔"

"گاڑی کا کیا قصہ ہے؟"

"بیگم صاحبہ کئی بار تشویش کا اظہار کرچکی تھیں کہ کہیں ڈرائیونگ کرتے ہوئے راؤ صاحب کو دورہ نہ پڑ جائے۔ ایسی حالت میں قیمتی گاڑی بھی تباہ ہوسکتی ہے۔ وہ کوئی پرانی گاڑی خریدنا چاہتی تھیں۔ تمہاری مخالفت بھی انہوں نے اس لیے کی تھی کہ یہ چانس تمہاری وجہ سے ہاتھ سے نکل گیا۔ پھر انہوں نے کہا۔ تم بھی جہنم میں جاؤ۔ جاتے ہی نہیں تو وہ کیا کرسکتی ہیں۔"

"گڈ! تو پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"انہوں نے کرولا میں کچھ کیا تھا۔ میں نے اتفاق سے دیکھ لیا۔ میں یہ تو نہیں جانتی کہ انہوں نے کیا کیا تھا لیکن وہ گاڑی کے نیچے سے نکلی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں اوزار تھے اور ہاتھ کالے ہورہے تھے۔ اس کے علاوہ چھپ چھپ کر واپس آئی تھیں۔ اس پر مجھے شک ہوگیا اور میں نے تمہیں بتادیا۔"

"تم نے بے شک اس دن ہم دونوں کی جان بچائی تھی مگر تمہارے خیال میں راؤ صاحب بے وقوف نہیں ہیں۔"

"تم دیکھتے ہو، اس کے باوجود وہ دیوانوں کی طرح انہیں چاہتے ہیں۔ عمدہ سے عمدہ لباس خریدتے ہیں ان کے لیے... اعلیٰ سے اعلیٰ کھلاتے ہیں۔ ان کی صحت کے لیے فکرمند رہتے ہیں۔ حالانکہ بیگم صاحبہ کو اپنے مٹاپے کا شدید احساس ہے اور یہ سچ ہے کہ بہت مختصر عرصے میں ان کا وزن بے پناہ بڑھا ہے۔"

"وزن کی وجہ سے انہیں ہائی بلڈ پریشر ہونا چاہیے۔ کیا وہ بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں؟"

"قطعی نہیں۔ ان کا بلڈ پریشر ہائی رہتا ہے مگر دواؤں سے وہ بہت گھبراتی ہیں۔ سوائے وزن کم کرنے کی دوائیوں کے وہ کچھ نہیں کھاتیں۔"

"اوہ... کیا وہ وزن کم کرنے کی گولیاں استعمال کرتی ہیں؟"

"اپنی دانست میں۔"

"کیا مطلب؟"

"ڈاکٹر کے مشورے سے انہوں نے وزن کم کرنے کی گولیاں کھانا شروع کیں مگر راؤ صاحب نے مجھ سے وہ گولیاں بھی تبدیل کرادیں۔"

"کیا مطلب؟"

"انہیں بیگم صاحبہ اسی انداز میں پسند ہیں۔ وہ انہیں طاقت کی گولیاں استعمال کراتے ہیں۔ بیگم صاحبہ وزن کم کرنے کی گولیاں منگواتی ہیں مگر راؤ صاحب انہیں صرف طاقت کی گولیاں استعمال کراتے ہیں۔" میں سوچ میں ڈوب گیا۔ کیمسٹ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ گولیاں جو میں بیگم صاحبہ کے کمرے سے لے گیا تھا، لو بلڈ پریشر کے مریضوں کے لیے ہیں جبکہ بیگم صاحبہ کو ہائی بلڈ پریشر تھا۔ میرے خیال میں وہ گولیاں بیگم صاحبہ کے لیے خطرناک ہوسکتی تھیں۔ سائرہ نے میرے خیالات کا سلسلہ منقطع کردیا۔ وہ بولی۔

"بیگم صاحبہ نے ایک ایک کر کے تمام ملازم نکال دیے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان حالات میں وہ ان کے اخراجات کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔ تمہاری طرف سے وہ تشویش کا شکار ہوگئی تھیں۔"

"کیا کہتی تھیں؟"

"یہی کہ یہ شخص ان کے راستے میں دشواریاں پیدا کرے گا۔ مجھے سختی سے ممانعت کی تھی کہ میں تم سے روابط نہ رکھوں۔"

"پھر تم نے بغاوت کی؟" میں مسکرا کر بولا۔

"نہیں، میری اتنی جرأت کہاں تھی۔"

"کیا مطلب؟"

"مجھے حکم ملا تھا۔"

"کیسا حکم ملا تھا؟"

"یہی کہ اب تم سے دوستی کروں۔ اندر سے تمہارا جائزہ لوں۔ یہ پتا چلاؤں کہ تم ہمارے کام آسکتے ہو یا نہیں۔"

"اوہ... وہ مجھ سے کام لینا چاہتی تھیں؟"

"شاید... انہوں نے مجھے اس بارے میں کچھ بتایا نہیں لیکن ان کا خیال تھا کہ تم ان کے راستے میں مشکل بن سکتے ہو۔ اگر کچھ رقم دے کر تمہیں بھی اپنے ساتھ شامل کرلیا جائے تو کام آسان ہوجائے گا مگر وہ اس میں جلد بازی نہیں کرنا چاہتیں۔ انہوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ پہلے میں تم سے قربت حاصل کرلوں۔ تم سے تمہاری مرضی کے بارے میں پوچھوں۔ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کروں کہ تم لالچ میں آسکتے ہو یا نہیں اور... اور..."

"بے دھڑک کہو سائرہ... میں تمہیں رازداری کا یقین دلاچکا ہوں اور تمہارے اس اعتماد سے میرے دل میں تمہارا احترام بھی پیدا ہوگیا ہے۔ اور کیا کہا تھا انہوں نے؟"

"انہوں نے کہا تھا کہ میں تمہارے دل میں اپنی محبت پیدا کروں۔ یہ بھی کہا تھا انہوں نے اگر تم... اگر تم بیگم صاحبہ کے مددگار بن جاؤ تو اپنے مقصد کی تکمیل کے بعد وہ ہم دونوں کو یکجا کردیں گی۔"

"ایں...؟" میں نے منہ پھاڑ کر کہا۔ سائرہ نے نگاہیں جھکالیں۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

"یہ... یہ ان کا کہنا تھا۔ بہادر شاہ! یہ بڑے لوگ غریبوں کو اپنا کھلونا سمجھتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ ان کا سوچا پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ کرسکتے ہیں، وہ کسی اور کے لیے ممکن نہیں ہوسکتا۔"

"تم نے ان کی ہدایت پر عمل نہیں کیا؟" میں نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" اس نے پوچھا۔

"مجھ سے تو آج تک تم نے ایسا رویہ ہی نہیں اختیار کیا۔"

"یہ سب کچھ کسی کے کہنے سے ہوسکتا ہے کیا بہادر شاہ... دل تو ہر انسان کا یکساں ہوتا ہے اور... اور... اب یہ سب کچھ تمہیں بتا کر تو میں اب کچھ اور ہی کرنا چاہتی ہوں۔ میں اب ان کی آلۂ کار نہیں بن سکتی۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے بہادر شاہ... خدا کی قسم میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔"

"کیا فیصلہ کیا ہے سائرہ؟"

"سارے حالات تمہیں بتا چکی ہوں۔ تم بھی ان واقعات سے لاعلم نہیں رہے۔ میرا دل بھی ہلکا ہوگیا۔ تم نے مجھ سے ایسی بات کی حالانکہ میں ان سے زیادہ تمہارے لیے فکرمند تھی۔ میں سوچتی تھی کہ کہیں بیگم صاحبہ اپنی سازش کی تکمیل کرتے ہوئے تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچادیں۔ سب کے اپنے اپنے رشتے ہوتے ہیں۔ کون کس کے لیے کیا ہوتا ہے، کوئی دوسرا تو نہیں جان سکتا۔ بیگم صاحبہ خود کو نہ جانے کیا سمجھتی ہیں۔ میں بھی تو انسان ہوں۔"

"بے شک ہمارے درمیان ان تمام باتوں سے الگ رشتہ ہے نا۔" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا؟" وہ چونک پڑی۔ پھر اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور پھر اس کے دوپٹے سے اس کے آنسو خشک کرنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔

"اس سے پہلے یہ رشتہ تھا یا نہیں سائرہ... لیکن آج یہ رشتہ قائم ہوگیا ہے، ہمیشہ کے لیے۔ اور سائرہ! تم نے جو فیصلہ کیا ہے، وہ میں نہیں جانتا لیکن میں نے جو فیصلہ کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اب میں بقیہ زندگی تمہارے ساتھ گزاروں گا۔ تم مزید کچھ نہ کہنا۔ سائرہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم میری آرزو ہو۔"

"ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا بہادر شاہ... یہاں کچھ ضرور ہوجائے گا۔ ہم پھنس جائیں گے۔ میں تم سے بھی یہی کہنا چاہتی تھی۔ یہاں سے نکل چلو، دنیا بہت وسیع ہے۔ ہم کوئی ٹھکانا ضرور تلاش کرلیں گے۔"

"کیوں نہیں سائرہ! لیکن تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

"پہلے میں تمہیں یہ سب کچھ بتا کر یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔ تم سے بھی یہی کہنا چاہتی تھی کہ یہ نوکری چھوڑ دو، یہ خطرناک ہے مگر اب ہم یہاں سے چلیں گے۔"

"خاموشی سے؟"

"ہاں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ اس سے زیادہ خطرناک ہوگا۔ وہ ہم پر کوئی الزام بھی لگا سکتے ہیں چوری کا۔ ڈاکا زنی کا۔ بیگم صاحبہ اپنی سازش پر فوری عمل کر کے کہہ سکتی ہیں کہ ان کے ملازم یہ کر کے بھاگ گئے اور دولت لے گئے۔ تم نے یہ نہیں سوچا؟"

میرے ان الفاظ پر سائرہ کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس نے کہا۔

"ہاں... میں نے یہ نہیں سوچا تھا۔ اب کیا کریں؟"

"مجھے سوچنے کا موقع دو۔" میں نے کہا تو سائرہ خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ پُرسکون ہو گئی مگر میرے دماغ میں ہانڈی پک رہی تھی۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ دل و دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ بڑی پُراسرار کہانی تھی۔ حیدر علی صاحب کے خیالات کے عین مطابق۔ چند الجھنوں کے ساتھ جنہیں سلجھانے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کی قدرت وقت کو حاصل تھی اور وقت کے لیے کوئی فیصلہ مشکل نہیں ہوتا۔ رات ہو گئی۔ کوئی نو بجے راؤ کا فون موصول ہوا۔ آواز گھبرائی ہوئی تھی۔

"بہادر شاہ! فوراً اسپتال پہنچ جاؤ۔ بیگم صاحبہ کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے وہ انتہائی نگہداشت کے شعبے میں ہیں۔ جلدی آجاؤ۔" سائرہ کو صورتِ حال بتا کر میں چل پڑا۔ میں اسپتال پہنچا تو راؤ پاگل ہو رہا تھا۔

"اچانک دورہ پڑا تھا۔ حالت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر کچھ بتا ہی نہیں رہے۔ نہ جانے کیا ہو گیا مگر پھر ڈاکٹروں نے بتایا کہ ہارٹ اٹیک کے ساتھ بیگم صاحبہ کو برین ہیمبرج بھی ہو گیا تھا اور وہ جانبر نہیں ہو سکی تھیں۔"

راؤ پچھاڑیں کھانے لگا مگر میری ذمے داری کچھ اور تھی۔ میں نے فوراً ہی ٹیکسی پکڑی۔ اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ حیدر علی کو تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ "ایک شاطر کی موت ہو گئی حیدر علی صاحب۔" میں نے اطلاع دی۔

"کیا ہوا؟" وہ چونک کر بولے تو میں نے انہیں بیگم صاحبہ کی موت کی اطلاع دی۔ اس کے بعد انہیں مختصر الفاظ میں پوری کہانی سنا دی۔ خصوصی طور پر میں نے لو بلڈ پریشر کی ان گولیوں کا تذکرہ کیا تھا۔

"اوہ... بالکل درست کہا تم نے۔ وہ دونوں بساط بچھائے ہوئے تھے اور اپنے اپنے مہرے چل رہے تھے۔ راؤ کامیاب ہو گیا اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ اسے ایک بیوی کا تجربہ زیادہ تھا۔ میرا مطلب ہے بیگم صاحبہ نے صرف دو شکار کیے تھے جبکہ وہ راؤ کا چوتھا شکار تھیں۔ اچھا تم رکو، میں منیر بیگ سے بات کرلوں۔" حیدر علی صاحب فون پر دیر تک منیر بیگ صاحب سے باتیں کرتے رہے۔ پھر فون بند کر کے انہوں نے مجھ سے کہا۔ "تم اسپتال واپس جاؤ۔ راؤ صاحب کو شبہ نہ ہونے پائے۔ ہمیں کافی محنت کرنی پڑے گی۔"

راؤ ریاست نے واقعی ان لوگوں سے خوب محنت کرائی تھی۔ بمشکل تمام وہ بیگم صاحبہ کا پوسٹ مارٹم کرانے کے لیے تیار ہوا۔ بیگم صاحبہ کے سسٹم پر بلڈ پریشر تیز ترین کر دینے والی دوا کا اثر پایا گیا تھا اور ظاہر ہے یہ ان کے لیے مضر تھی کیونکہ وہ پہلے ہی ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں۔ راؤ کسی طرح پھندے میں نہیں پھنس رہا تھا مگر منیر بیگ کے دل کو بھی لگی ہوئی تھی۔ بال کی کھال اتار ہی لی انہوں نے۔ سائرہ بھی اس سلسلے میں بہت کام آئی تھی۔ پھر کچھ باتیں ایسی تھیں جن کا راؤ کوئی جواب نہ دے سکا۔ دوالیا ہونے کا اعلان، کاروبار بند کرنا، کوٹھی کو ملازموں سے خالی کرا دینا۔ البتہ اس کے شان دار منصوبے کو بے حد سراہا گیا تھا۔ بیگم صاحبہ کو اپنی تباہ حالی سے مطمئن کرنے کے لیے اس نے ڈائٹنگ کر کے خود کو کمزور کیا تھا مگر ڈاکٹروں نے اس کا مکمل چیک اپ کر کے متفقہ فیصلہ دیا تھا کہ اس کے پھیپھڑے پوری طرح توانا ہیں اور اسے دمہ نہیں ہے۔ وہ صرف اداکاری کے جوہر دکھاتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے بیگم صاحبہ کو حلوہ جات کے ساتھ انتہائی حد تک شکر استعمال کرنے کی عادت ڈالی تھی اور بسیار خوری کا مریض بنا دیا تھا جس سے کولیسٹرول خطرناک حد تک بڑھ گیا تھا... پھر لو بلڈ پریشر کی گولیاں استعمال کرا رہا تھا۔ اس کا نتیجہ وہی نکلنا تھا جو نکلا تھا۔

بیگم صاحبہ بہ آسانی مار کھا گئی تھیں۔ بعد میں ان دونوں کے اثاثوں کی تفصیل بھی معلوم ہو گئی تھی۔ ایک طرف بیگم صاحبہ نے اپنی لاکھوں روپے کی دولت خفیہ طور پر پوشیدہ کر کے کروڑوں روپے کے مالک شوہر پر ہاتھ صاف کرنا چاہا تھا... تو دوسری طرف راؤ نے اس سے چھٹکارا پانے اور بھاگتے چور کی لنگوٹی حاصل کرنے کی کوشش بلکہ کامیاب کوشش کر ڈالی تھی تاکہ اصل حیثیت میں آکر کسی نئے شکار کا انتخاب کرے لیکن بدقسمتی نے اس بار اسے مات دی تھی۔

البتہ میری خوش قسمتی کا آغاز یہیں سے ہوا تھا۔ راؤ کے ساتھ منیر بیگ صاحب بھی میرے سرپرست بن گئے تھے۔ ان دونوں کی سرپرستی نے مجھے بیوی یعنی سائرہ اور ایک عمدہ نوکری دلوا دی تھی۔

جمال دستی

سنپولیا

وقت کا پہیا گھومتا ہوا اس محور پر ضرور پہنچتا ہے... جہاں سے اس کا سفر شروع ہوتا ہے... زندگی کے خزانے میں بھی ایسے دنوں کے ان گنت موتی ہوتے ہیں... جن کی چمک... اور دلکشی وقت کے ساتھ ماند نہیں پڑتی... ان کی چکا چوند پہلے روز کی طرح تروتازہ رہتی ہے... یادوں کے ایسے ہی جزیرے جو کبھی ڈوب جاتے ہیں اور کبھی ابھر آتے ہیں...

سیپوں اور موتیوں کی ہم نوائی میں زندگی تیاگ
دینے والے ہیرے کی وقعت

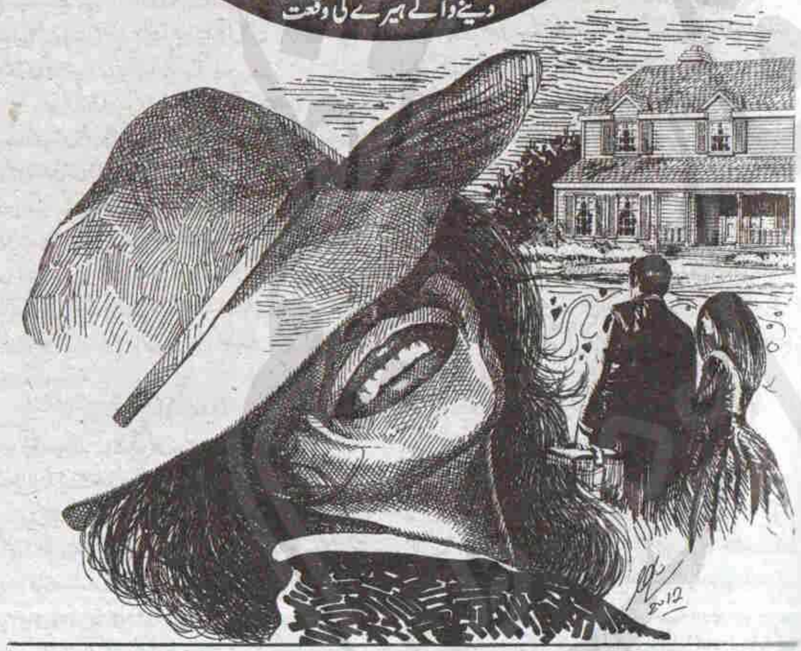

بینڈی نے اپنے اسٹال کا سائبان اوپر اٹھایا اور اپنے ہاتھوں سے کاؤنٹر پر جمی گرد صاف کرنے لگی۔ اس کی نظر دو سپاہیوں پر گئی جو لکڑی سے بنے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے ساحل کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر رک گئے تھے۔ ان میں سے ایک سیڑھیاں اتر کر نیچے گیا جبکہ دوسرا اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ پھر نیچے والے نے چلا کر کچھ کہا تو اس کا ساتھی سر ہلاتا ہوا واپس ہولیا۔ شاید اس کا رخ اپنی گشتی کار کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانب تھا۔

گریگ کا اسٹال اس کے برابر میں ہی تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا اس کی جانب آرہا تھا اور لگ رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی خبر ہے لیکن وہ اتنی جلدی میں کیوں تھا؟ بینڈی کہیں بھاگی تو نہیں جارہی تھی۔ اسے روزانہ کی طرح پورا دن اسٹال پر ہی رہنا تھا۔

''وہاں ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔'' گریگ نے کاؤنٹر پر جھکتے ہوئے کہا۔ ''پولیس والے ریڈیو کے ذریعے اطلاع دینے کار کی جانب گئے ہیں۔''

بینڈی نے زور سے ''ہوں'' کہا اور کاؤنٹر کا جائزہ لینے لگی۔ وہ اطمینان کرنا چاہتی تھی کہ اس کے پاس بڑے سائز کے اتنے کپ موجود ہیں جو دن بھر کے لیے کافی ہوں۔ اسے یہ کام رات کو ہی کر لینا چاہیے تھا لیکن مصروفیت کے باعث اس جانب اس کا دھیان نہیں گیا۔

''کیا کوئی ڈوب کر مرا ہے؟'' بینڈی نے پوچھا۔ اس علاقے میں اس طرح کے حادثات اکثر رونما ہوتے تھے اور ایسی صورت میں اس کا کاروبار چمک اٹھتا۔ ساحل پر آنے والوں کے لیے یہ ایک تماشا ہوتا۔ وہ اس وقت تک جائے واردات پر موجود رہتے جب تک ایمبولینس لاش کو لے کر وہاں سے نہ چلی جاتی۔ اس کے بعد بھی تبصروں اور قیاس آرائیوں کا سلسلہ جاری رہتا اور اس دوران لوگ وقفے وقفے سے اس کے اسٹال پر آکر کھانے پینے کی چیزیں خریدتے رہتے۔

''جس جگہ لاش پڑی ہے، وہ ساحل سے کافی دور ہے۔ لگتا ہے کہ کسی بڑی لہر نے اسے اتنی دور پھینکا ہے۔ ویسے ان دنوں سمندر پُرسکون ہوتا ہے۔''

''ضروری نہیں۔ سمندر کی موجوں میں کسی وقت بھی تلاطم ہوسکتا ہے۔'' بینڈی نے ماہرانہ انداز میں کہا۔ وہ گزشتہ کئی سالوں سے گرمیوں کے موسم میں یہاں اسٹال لگا رہی تھی اور سمندر کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

''اس کے کپڑے خشک تھے۔'' گریگ نے بتایا۔ ''میں چہل قدمی کرتے ہوئے اس جانب چلا گیا تھا پھر میں نے گارڈ کے کیبن سے ایمبولینس کو فون کیا اور انہیں بتا دیا کہ ایک شخص یہاں مُردہ حالت میں پڑا ہوا ہے۔''

''اوہ، میرے خدا! کیا تم لاش کے قریب گئے تھے؟''

''اس کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ منہ کے بل گرا تھا اور اس کا سر زمین سے ٹکرایا تھا۔ آنکھیں مُردہ مچھلی کے مانند نظر آرہی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ گزشتہ شب سیڑھیوں سے گرا ہے۔ یہ سیڑھیاں عمودی ڈھلوان میں ہیں، انہیں ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ اس حادثے کے بعد اس جانب توجہ دی جائے۔ وہ نشے میں بھی تھا کیونکہ دس فٹ کے فاصلے سے بھی شراب کی بو آرہی تھی۔ وہاں قریب ہی ایک بوتل بھی پڑی ہوئی تھی۔ نہ جانے یہ لڑکے ایسا کیوں سوچتے ہیں کہ ساری عمر زندہ رہیں گے۔''

''اوہو، بہت افسوس ہوا۔ مجھے اس کے والدین سے ہمدردی ہے۔'' بینڈی نے تاسف سے کہا۔

''وہ کوئی چھوٹا بچہ نہیں تھا۔ مجھے اس کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ وہ جمی والٹر ہے۔ اس کے والدین نے گزشتہ برس اسے ہارورڈ بھیجا تھا لیکن وہ وہاں نہیں رک سکا۔ حالانکہ گھر والے اسے اتنے پیسے بھیجتے تھے کہ وہ بہ آسانی اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا تھا لیکن پیسوں سے ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ سے ہی بے لگام تھا۔ تم تو اسے جانتی تھیں۔''

''میں، میں بھلا والٹر فیملی کے کسی فرد کو کیسے جان سکتی ہوں؟'' بینڈی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''وہ اپنے دوستوں کے ساتھ تمہارے اسٹال پر سوڈا لینے آتا رہتا تھا۔''

''اس طرح تو کئی لوگ میرے اسٹال پر آتے ہیں۔ میں ہر ایک کو تو نام سے نہیں پہچانتی۔''

''سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ لوگ ساحل کے اس حصے کی جانب کیوں آتے ہیں؟'' گریگ نے نتھنے پُھلاتے ہوئے کہا۔ ''حالانکہ یہاں سے دو تین میل کے فاصلے پر والٹرز فیملی کی اپنی ساحلی تفریح گاہ ہے۔''

بینڈی ہی کیا، اس ٹاؤن کے بھی لوگ جانتے تھے کہ والٹر فیملی کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں۔ وہ چاہیں تو پورا ساحل خرید سکتے ہیں۔ گریگ نے ریلنگ پر جھک کر نیچے کی جانب دیکھا اور بولا۔ ''وہاں کچھ لوگ نظر آرہے ہیں اور سپاہی انہیں وہاں سے ہٹانے کی کوشش کررہے ہیں۔ آج خوب ہنگامہ رہے گا۔ شرط لگا لو کہ کل کے اخباروں کی یہی سرخی ہوگی اور شاید اخبار والوں کو میری تصویر بھی درکار ہوگی کیونکہ لاش میں نے ہی دیکھی تھی۔ لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ اگر انہوں نے تصویر مانگی تو میں انکار کردوں گا۔''

بینڈی اس دوران اپنی تیاریوں میں مصروف رہی۔ پہلے اس نے سارے کپ ایک ترتیب سے رکھے۔ آئس میکر کو چیک کیا۔ اس میں سوڈے کی بوتلیں لگائیں۔ کاؤنٹر پر

قارئین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہوں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

مشروب پینے کی نلکیاں اور نیپکن کا ڈبا رکھا اور خوب صورت رنگ برنگی سیپیاں سجا دیں جنہیں اس نے خود ہی رنگ کیا تھا۔ گاہک بڑے شوق سے یہ سیپیاں خریدتے تھے۔ عام طور پر ان کی قیمت پچاس سینٹ ہوتی لیکن خوب صورت اور بڑی سیپیوں کا ایک ڈالر بھی مل جاتا تھا۔ ان سیپیوں کو چننے اور رنگ کرنے کا کام وہ موسم سرما میں کیا کرتی تھی۔ اسے بچپن سے ہی اس کام کی تربیت دی گئی تھی اور اس کی میز ہمیشہ سیپیوں سے بھری ہوتی تھی۔ پہلے اس کی ماں یہ کام کیا کرتی تھی پھر جب بینڈی کی لکھائی کچھ بہتر ہوئی تو سیپیوں پر رنگ کرنے کا کام اس کے سپرد کردیا گیا۔ جب اس کی ماں ایک دوسرے مرد کے ساتھ چلی گئی تب بھی بینڈی نے یہ کام جاری رکھا۔

تھوڑی دیر بعد وہی پولیس والا ایک بادامی رنگ کی چادر پکڑے واپس آتا نظر آیا جو پولیس کار کی طرف گیا تھا اور اس نے سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہوکر نیچے والے سپاہی سے کچھ کہا۔ وہ اوپر آیا اور چادر لے کر دوبارہ نیچے چلا گیا۔ اس کے بعد گریگ بھی اپنے اسٹال کی طرف آگیا اور اس کا سائبان کھولنے لگا۔

''بوڑھا والٹر خود یہاں آرہا ہے تاکہ تصدیق کرسکے کہ مرنے والا اس کا پوتا ہے۔'' گریگ نے برش سے اپنا کاؤنٹر صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''حالانکہ پہلے انہیں لاش کو یہاں سے ہٹا دینا چاہیے تھا جو لاوارثوں کی طرح پڑی ہے۔ باقی کارروائی تو مُردہ خانے میں بھی ہوسکتی ہے۔''

بینڈی اپنی ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اب اس کے پاس گاہکوں کا انتظار کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔ اس نے سمندر کی جانب دیکھا اور پہلے والا جملہ دہراتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اس کے والدین سے ہمدردی ہے۔''

''واقعی ان کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ ہے۔'' گریگ نے کہا پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بہت سی سیپیاں اور پتھر کے گول گول ٹکڑے اس کے کاؤنٹر پر پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''لاش دریافت کرنے سے پہلے میں نے تمہارے لیے یہ چیزیں اکٹھی کی تھیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ تمہارے مطلب کی ہوں۔''

بینڈی ان چیزوں کو دیکھ کر خوش ہوگئی۔ اس نے گریگ کا شکریہ ادا کیا کیونکہ انہیں بیچ کر وہ اچھے خاصے پیسے کما سکتی تھی اور گریگ بھی جانتا تھا کہ یہ چیزیں قابلِ فروخت ہیں۔ گریگ ہمیشہ اس کا خیال رکھتا تھا۔ جب بھی بینڈی کو آرام کرنا ہوتا تو وہ اس کے اسٹال پر دھیان دیتا اور بدلے میں بینڈی بھی ایسا ہی کرتی۔

''تم ایک اچھے لڑکے ہو۔''

بینڈی نے کہا تو اس کا منہ بن گیا اور وہ بولا۔ ''تم کبھی میرے گھر آؤ۔''

''اگر فرصت ملی تو ضرور آؤں گی۔'' بینڈی نے رسمی سا جواب دیا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ وہ ان پڑوسیوں میں سے نہیں تھے جو سارا دن باتیں کرتے رہیں۔

صبح میں کاروبار مندا ہوتا تھا لیکن جیسے جیسے گرمی بڑھتی جاتی، لوگ سمندر میں تیرنے اور پکنک منانے کے لیے ساحل کا رخ کرتے۔ وہاں آنے والوں میں سے کچھ لوگ لاش کو دیکھنے سے محروم رہے کیونکہ اس پر چادر ڈال دی گئی تھی۔ انہیں شکایت تھی کہ پولیس نے انہیں وہاں نہیں جانے دیا۔ بینڈی ان کی باتیں سنتی اور انہیں سوڈا واٹر دیتی رہی۔ اسی رفتار سے اس کے گلے میں سکے گرتے رہے۔ کئی دن سے اس نے نوٹ کی شکل نہیں دیکھی تھی، بس یہی سکے آتے اور خرچ ہوجاتے۔

گریگ کا کاروبار اس کے مقابلے میں کم تھا لیکن اس کے اسٹال پر آنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ وہ ربر ٹیوب، چھوٹی بالٹیاں اور بیلچے فروخت کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس کے اسٹال پر مختلف اقسام کے کھلونے موجود تھے جن کی کشش بچوں اور بڑوں کو اس کے اسٹال پر کھینچ لاتی۔ ان میں سے کچھ تو ایسے بھی تھے جو اسے باقاعدگی سے ہائے ہیلو کرنے آتے کیونکہ وہ بینڈی کے مقابلے میں زیادہ سوشل تھا۔ گو کہ ان میں سے کئی ایک بینڈی کو بھی ہیلو کہتے لیکن وہ بُت بنی بیٹھی رہتی۔

وہ اپنے اسٹال پر بیٹھی سفید پرندوں کو اڑتا ہوا دیکھ رہی تھی کہ اسے کونارڈ والٹر آتا دکھائی دیا جو والٹر خاندان کا سربراہ تھا۔ وہ گریگ کی طرف گئی تو وہ بولا۔

''اس کے ساتھ پولیس چیف بھی ہے۔''

بینڈی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''لگتا تو نہیں۔ یہ تو کافی کم عمر ہے۔''

''ہاں، حال ہی میں چیف بنا ہے۔ اس سے پہلے والا ریٹائر ہوچکا ہے۔ یہ خبر اخبار میں بھی آئی تھی۔''

''ممکن ہے میری نظر سے نہ گزری ہو۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں نے سنا ہے کہ وہ فلوریڈا چلا گیا ہے۔"

"اچھا ہی ہوا کہ اس سے نجات مل گئی۔ اس نے کبھی سوڈے کے پیسے نہیں دیے۔"

"یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"وہ مجھ سے کہا کرتا تھا کہ میرے اسٹال پر اس لیے آتا ہے کہ ڈاکو مجھے لوٹنے سے پہلے دوبار سوچیں۔ اس احمق کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جسے ڈاکو لوٹ سکیں۔ شاید وہ اپنی مفت خوری کا جواز پیش کرنے کے لیے ایسی باتیں کیا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ دوسرے اسٹال والوں سے بھی سامان بٹورنے کے لیے یہی کچھ کہتا ہو گا۔"

"وہ تو چلا گیا۔ اب ہمیں امید کرنی چاہیے کہ اس کی جگہ آنے والا بہتر ثابت ہوگا۔"

نیا چیف دیکھنے میں واقعی مختلف نظر آرہا تھا۔ اس کی وردی بے داغ اور شکنوں سے پاک تھی۔ اس کے سینے پر کئی تمغے سجے ہوئے تھے اور جوتے سلیقے سے پالش کیے ہوئے تھے۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے اسٹال کی جانب بڑھ رہے تھے۔

بوڑھا کونارڈ ہمیشہ کی طرح ناراض نظر آرہا تھا۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے بینڈی پر نظریں جمادیں۔ اس کی آنکھوں میں سختی تھی اور منہ سوجا ہوا تھا۔ بینڈی کا دل اچھل کر حلق میں آگیا لیکن اس نے اپنی کیفیت کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ جو کچھ ہوا، وہ ماضی کا قصہ تھا اور کونارڈ کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ بے شک وہ سارا دن اسے دیکھتا رہے۔ جواباً اس نے بھی کونارڈ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

خاموشی کا ایک لمحہ آیا اور گزر گیا۔ بینڈی نے ایک گہری سانس لی اور اس کے دل میں خواہش ابھری کہ کاش کوئی زوردار لہر آئے اور کونارڈ کو اس کے پوتے کی لاش سمیت بہا کر لے جائے لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ اس کی زد میں اور لوگ بھی آجاتے جبکہ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ البتہ کونارڈ کو دیکھ کر اس کے ذہن میں بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں۔

رابر بیرون کے تین بیٹوں میں سب سے چھوٹا کونارڈ ہی باقی بچا تھا۔ اس کا بڑا بھائی ہیر الڈ، امریکا اور اسپین کی جنگ کے دوران کیوبا میں مر گیا تھا۔ لیکن اس کی موت لڑائی میں نہیں بلکہ زرد بخار کی وجہ سے ہوئی تھی۔ پھر بھی خاندان کے سب افراد اسے جنگ کے ہیرو کے نام سے یاد کرتے تھے۔ بیچ والا بھائی جیمس سترہ سال کی عمر میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا تھا اور ایک زوردار لہر اس کی لاش کو ساحل پر پھینک گئی تھی جو ایک ہفتے کے بعد کئی میل دور ملی۔ لوگوں کو اسے پہچاننے میں بڑی دقت ہوئی کیونکہ لاش بُری طرح پھول گئی تھی اور چہرے کا بڑا حصہ مچھلیوں نے کھالیا تھا۔ بعد میں سننے میں آیا کہ اس کی غم زدہ ماں نے اس روز کے بعد مچھلی کھانا چھوڑ دی۔

کونارڈ بہت چھوٹا تھا اور اس کے ذہن میں جیمس کی دھندلی سی یاد تھی لیکن اس نے وصیت کر دی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے پوتے کا نام جیمس رکھا جائے۔ شاید اس نے خاندان کے دوسرے لوگوں سے جیمس کے بارے میں کچھ کہانیاں سن رکھی ہوں جیسا کہ اکثر خاندانوں میں رواج ہے کہ وہ وقت سے پہلے مر جانے والوں کی خوبیاں بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ جیمس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ تینوں بھائیوں میں سب سے زیادہ ذہین اور خوب صورت تھا۔ اس کے ارادے بلند تھے اور وہ آگے بڑھنے کی خواہش رکھتا تھا۔ کونارڈ کو اپنے بھائی کی بے وقت موت کا بہت صدمہ تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں تلخی بڑھتی گئی۔ جب بینڈی اور جیمس کی پہلی ملاقات ہوئی تو اس وقت وہ پندرہ برس کی تھی۔ جیمس اسے پہلی نظر میں ہی بہت اچھا لگا۔ اونچا قد، مضبوط جبڑے اور موتیوں جیسے چمکتے سفید دانت۔ وہ خود بھی کسی سے کم نہ تھی۔ جوانی کی حدود میں قدم رکھنے سے پہلے ہی اس کا سراپا دلکش ہو گیا تھا۔ وہ خوب باتیں کرتی۔ دل کھول کر کھاتی اور لمبی تان کر سو جاتی۔ اس میں عقل نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور یہی بات اس کی ماں کو پریشان کیے رکھتی تھی۔

اس کی ماں کو دیر تک سونے کی عادت تھی لہٰذا یہ بینڈی کے فرائض میں شامل تھا کہ وہ صبح سویرے ساحل پر جا کر سیپیاں اور چپٹے گول پتھر تلاش کرے۔ وہ ان چیزوں کو بالٹی میں جمع کرتی پھر پانی سے دھو کر ان پر مختلف قسم کے رنگ کیا کرتی۔ وہ عموماً سورج نکلنے سے پہلے ہی ساحل پر چلی جاتی کیونکہ اس وقت وہاں اسے چھیڑنے یا تنگ کرنے کے لیے کوئی نہیں ہوتا تھا۔ صبح کی تازہ ہوا میں سانس لے کر اسے فرحت محسوس ہوتی۔ سورج کے نکلنے کا نظارہ بھی اسے مسحور کر دیتا۔

ساحل کے ساتھ ساتھ ایک باڑھ لگی ہوئی تھی جس کے دوسری طرف کا علاقہ والٹرز کی ملکیت تھا جہاں عام لوگوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کبھی کبھی بینڈی ٹیلوں کے پار جیمس اور اس کے دوستوں کو مختلف مشغلوں میں مصروف دیکھتی۔ وہ کشتی رانی، گھڑ سواری یا کتوں سے کھیل رہے ہوتے۔ سگریٹ اور شراب نوشی بھی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ امیروں

کے بچے سب کچھ کر سکتے ہیں اور انہیں کسی کی پروا نہیں ہوتی۔ وہ جب وہاں نہیں ہوتے تو بینڈی چپکے سے باڑھ کے اس پار جا کر سیپیاں تلاش کرنے لگتی کیونکہ وہ اپنی جانب کی جگہ سے پہلے ہی سیپیاں چُن چکی ہوتی تھی۔ البتہ اس کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ ان لڑکوں کی نظروں میں نہ آئے۔

اسکول میں وہ ہمیشہ ہی امیر لڑکوں کے مذاق کا نشانہ بنی رہتی تھی اور اسے یقین ہو چلا تھا کہ امیر لڑکے فطرتاً خراب ہوتے ہیں۔ یہ اس کا قصور نہیں تھا کہ وہ ایک غریب گھر میں پیدا ہوئی۔ نہ ہی باپ کے بھاگ جانے میں اس کی کوئی غلطی تھی۔ یہ اس کی قسمت میں لکھ دیا گیا تھا کہ اس کی ماں ساحل پر سیپیوں سے بنے ہوئے بُندے اور انگوٹھیاں بیچے اور ساری کمائی کچی شراب کی نذر کر دے۔

بینڈی ان حالات سے دلبرداشتہ نہیں تھی اور اپنے حالات بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے کچھ رقم پس انداز کرنا شروع کر دی تھی تاکہ اپنے لیے ایک اچھا سا لباس خرید سکے۔ کچھ نہیں تو اسے خادمہ کی ملازمت تو مل ہی جاتی۔ وہ یہ کام بہ آسانی کر سکتی تھی۔ اس ملازمت سے ہونے والی آمدنی وہ بینک میں جمع کرتی تاکہ ماں اسے بھی کچی شراب میں نہ اڑا دے۔ گزشتہ مہینے اس نے بمشکل ایک ڈالر جمع کیا تھا اور اسے ایسی جگہ چھپا دیا جہاں ماں کی نظر نہ پڑے۔ اگر وہ پیسے اس کے ہاتھ لگ جاتے تو اس پر چوری کا الزام لگ جاتا۔ یہ سچ تھا کہ کبھی کبھار اس نے ایک آدھ پینی کی ہیرا پھیری کی تھی لیکن زیادہ تر سکے اسے ساحل پر پڑے ہوئے ملے تھے جنہیں وہ اپنا حق سمجھتی تھی۔

اس روز بھی وہ معمول کے مطابق سیپیاں چننے ساحل پر گئی۔ باڑھ کے قریب پہنچ کر اس نے زمین پر نگاہ ڈالی پھر اس نے باڑھ کے اس پار دیکھا۔ وہاں کوئی لڑکا موجود نہیں تھا۔ پھر وہ باڑھ میں بنے ہوئے خلا میں سے اندر کی جانب رینگنے لگی۔ ابھی وہ باڑھ عبور بھی نہ کر پائی تھی کہ دہشت سے اس کا خون منجمد ہو گیا۔ جیمس والٹر اس سے بمشکل بیس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ ٹیلے سے باہر آکر رک گیا اور اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری اور اس نے دوستانہ انداز میں اپنا ہاتھ ہلایا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا کرے۔ اسکول کے لڑکوں نے کبھی اس کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جیمس ایک اچھے اسکول میں پڑھتا تھا اور ان دنوں یہاں گزارنے گھر آیا ہوا تھا...... اور اب وہ مسکراتا ہوا اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جیمس کو مسکراتا دیکھ کر جیسے اس کے ٹانگوں کی جان نکل گئی۔ وہ اس قصبے کا سب سے خوب صورت لڑکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچتا، وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی اور اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اس کے ہاتھ سے بالٹی چھوٹ گئی اور جمع کی ہوئی سیپیاں بکھر گئیں۔ وہ انہیں لیے بغیر گھر واپس نہیں جا سکتی تھی لیکن یہاں رکنا بھی خطرناک تھا کیونکہ جیمس والٹر اب اس کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔

"ہیلو، بیچ گرل۔" اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

اس نے بھی بڑبڑانے کے انداز میں ہیلو کہا لیکن اس کی آواز سمندر کی لہروں کے شور میں دب گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مزید کیا کہے۔ وہ لوگوں سے صرف اسی وقت بات کیا کرتی جب اسے اپنی سیپیاں بیچنی ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ اسے معلوم نہیں تھا کہ جیمس جیسے لوگوں سے کس طرح بات کی جاتی ہے کیونکہ اس کے گھر میں کبھی کوئی مہمان نہیں آیا اور نہ ہی وہ کہیں جاتی تھی۔

"تم ہمیشہ اتنی صبح یہاں آتی ہو؟" جیمس نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے بمشکل جواب دیا۔

"تم سیپیاں جمع کرتی ہو؟" یہ کہہ کر وہ جھکا اور اس کی گری ہوئی سیپیاں اٹھا کر بالٹی میں ڈالتے ہوئے بولا۔ "میرے ایک کزن کو بھی تتلیاں جمع کرنے کا شوق ہے۔"

"اچھا، وہ انہیں کیا کھلاتا ہے؟" بینڈی نے معصومانہ انداز میں کہا۔

جیمس کو ہنسی آگئی لیکن اس کے انداز سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ وہ کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"ابھی سیپیاں تمہاری طرف ہیں۔"

"تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے باڑھ کے پار سے دیکھا ہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم باڑھ پار کر کے اس طرف آتی رہی ہو۔"

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا لیکن وہ سچ بول کر بھی... اپنے آپ کو مشکل میں نہیں ڈال سکتی تھی چنانچہ اس نے جرح کے انداز میں کہا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے تمہیں اپنے گھر کی کھڑکی سے دیکھا ہے۔ میرے پاس ایک دوربین بھی ہے۔"

وہ اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ بینڈی کو اس کی عادت نہیں تھی لیکن جواب میں وہ بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ یہ ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی پہلی ملاقات تھی۔ اس نے بینڈی کو باڑھ کے پار آنے کی اجازت دے دی اور اس کے ساتھ مل کر سیپیاں جمع کیں۔ اس دوران میں وہ بہت سی باتیں کرتا رہا جو بینڈی نے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں اور ان میں سے بہت سی باتوں کا مفہوم بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن وہ ان سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا بالٹیاں اٹھائے ہوئے سیڑھیوں تک آ گیا۔

ساحل پر لوگوں کی آمدورفت شروع ہو چکی تھی لیکن کسی نے ان پر توجہ نہیں دی۔ بینڈی نے رسماً اسے اپنے گھر چلنے کے لیے کہا لیکن دل ہی دل میں ڈر رہی تھی کہ کہیں واقعی وہ تیار نہ ہو جائے۔ اس کی جان میں جان آئی جب جیمس نے کہا۔ ’’میں بھی چلوں گا۔ ناشتے کی میز پر میرا موجود ہونا ضروری ہے۔‘‘

یہ کہتے ہوئے اس نے بالٹیاں اسے تھما دیں۔ جیمس کی انگلیاں اس کے ہاتھ سے ٹکرائیں تو اس کے پورے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا۔ اس سے پہلے کسی مرد نے اسے نہیں چھوا تھا۔

’’ممکن ہے کل ہماری دوبارہ ملاقات ہو جائے۔‘‘ یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ بینڈی ریلنگ کے سہارے کھڑی اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی، جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات آنے لگے۔ وہ اس کا نام تک نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اس نے پوچھنے کی زحمت گوارا کی۔ اچھا ہی ہوا کہ اس نے نام نہیں پوچھا۔ پھر مزید سوالات نکلتے۔ ’’تمہارا باپ کون ہے..... وہ کیا کرتا ہے؟‘‘ وغیرہ وغیرہ..... اور اس کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے اسے بیچ گرل کہہ کر پکارا تھا جو اسے اچھا لگا۔ اگر وہ ساری عمر بھی اسے اسی نام سے پکارتا تو اسے بُرا نہ لگتا۔

☆☆☆

’’سوڈا پلیز۔‘‘ ایک مردانہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وردی میں ملبوس پولیس چیف اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ بینڈی نے ایک بڑا کپ نکالا اور اس میں سوڈے کے ساتھ برف ڈال کے اسے چیف کی طرف بڑھا دیا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب چیف نے اپنی جیب سے ایک سکہ نکالا اور اسے دیتے ہوئے بولا۔ ’’شکریہ۔‘‘

یہ پہلا موقع تھا جب کسی پولیس والے نے اسے مشروب کی قیمت ادا کی تھی۔ اسے نئے پولیس چیف کی یہ بات اچھی لگی۔ اس لیے جواب میں اس نے بھی سر خم کیا اور مسکرا دی۔

’’میرا خیال ہے کہ شاید تم سب سے پہلے اسٹال کھولتی ہو؟‘‘ چیف نے مشروب پینے والی نلکی اٹھاتے ہوئے کہا۔

’’بالکل۔‘‘ وہ فخریہ انداز میں بولی۔ ’’موسم خواہ کیسا بھی ہو۔ بارش ہو رہی ہو یا دھوپ نکلی ہو، میں ہمیشہ اپنے وقت پر ہی آ جاتی ہوں۔‘‘

’’آج صبح تم کس وقت آئی تھیں؟‘‘ چیف نے پوچھا۔

’’ہمیشہ کی طرح سورج نکلتے وقت۔ میرے پاس گھڑی نہیں ہے۔‘‘

’’کیا تم نے کسی کو راستے میں دیکھا تھا؟‘‘

’’میں تو کئی لوگوں کو دیکھتی ہوں۔ تم کس کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟‘‘

’’کوئی غیر معمولی بات محسوس کی؟‘‘

’’میں پندرہ سال کی عمر سے یہاں آ رہی ہوں اور میں نے آج تک کوئی غیر معمولی بات نہیں دیکھی۔ سب کچھ ویسا ہی ہے۔‘‘

چیف کے چہرے پر ایک مصنوعی مسکراہٹ ابھری اور وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ’’تمہیں تو اس علاقے کی ڈورتھی پار کر ہونا چاہیے تھا۔‘‘

بینڈی نے یوں کندھے اچکائے جیسے وہ ڈورتھی پار کر سے لاعلم ہو۔ حالانکہ وہ اس کے بارے میں جانتی تھی۔ بینڈی کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا تھا تو اس نے قصبے کی لائبریری جانا شروع کر دیا جہاں وہ رسالے پڑھتی اور وہ کتابیں گھر لے آتی جنہیں وہ دورانِ تعلیم نہیں پڑھ سکی تھی۔ اس لیے باقاعدہ ڈپلوما حاصل نہ کرنے کے باوجود اس کے علم میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا تھا لیکن وہ کسی پر ظاہر نہیں کرتی تھی کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

چیف نے وہی سوال دوبارہ پوچھا اور اس مرتبہ بھی بینڈی کا جواب نفی میں تھا۔ صبح سے اب تک اس نے یہاں کسی شخص کو نہیں دیکھا اور نہ ہی کوئی غیر معمولی بات نوٹ کی تھی۔ سوائے گریگ کے جس نے اسے لاش کے بارے میں بتایا تھا۔ چیف یہ سننے کے بعد گریگ کے اسٹال پر چلا گیا اور اس سے واقعے کی تفصیلات پوچھنے لگا۔ گریگ کے گھر میں گھڑی تھی اور وہ گھر سے نکلنے اور ساحل تک پہنچنے کا وقت بتا سکتا تھا۔

’’میں نے اسی وقت ایمبولینس کے لیے فون کر دیا تھا۔ وہ لوگ ہی بتا سکتے ہیں کہ جائے وقوعہ پر کب پہنچے ہوں گے۔‘‘

چیف نے اثبات میں سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا پھر اس

نے دوسرے اسٹال والوں سے بھی پوچھ گچھ کی لیکن کہیں سے کوئی تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔ جب وہ دور چلا گیا تو گریگ نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بینڈی سے کہا۔

’’چیف خود کیوں پوچھ گچھ کرتا پھر رہا ہے؟ اسے یہ کام کسی افسر کے سپرد کر دینا چاہیے تھا۔‘‘

’’اس لیے کہ اس معاملے کا تعلق والٹر خاندان سے ہے۔‘‘

’’اوہ، اب سمجھا۔ وہ انہیں مطمئن کرنے کے لیے یہ بھاگ دوڑ کر رہا ہے لیکن وہ بار بار یہ کیوں پوچھ رہا تھا کہ ہم نے کسی کو دیکھا تو نہیں؟ اس طرح کے سوالات تو قتل کے کیس میں کیے جاتے ہیں۔ میں نے جاسوسی کہانیوں میں یہی پڑھا ہے۔‘‘ بینڈی مسکرانے لگی۔ اسے گریگ کی یہی باتیں اچھی لگتی تھیں۔

بینڈی جانتی تھی کہ بوڑھے کونارڈ نے ہی چیف کو اس سے سوالات کرنے کے لیے بھیجا ہوگا۔ ممکن ہے کہ اسے وہ کہانیاں یاد آ گئی ہوں جو اس نے جیمس کی موت کے حوالے سے سنی تھیں اور اس کے ذہن میں وہ سرگوشیاں ابھر رہی ہوں جو بچپن میں اس کے کانوں تک پہنچی تھیں۔

☆☆☆

دوسری صبح جیمس وہاں پہلے سے موجود تھا اور ریلنگ پر جھکا سمندر کا نظارہ کر رہا تھا۔ یقیناً وہ اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی لیکن اس نے خود پر قابو پایا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے برابر کھڑے ہو کر سورج نکلنے کا نظارہ کرنے لگی۔ صبح کے وقت انہیں وہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور وہ آنے والے لمحوں کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔

’’صبح بخیر بیچ گرل۔‘‘ اس نے بے تکلفی سے کہا جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔ اس روز بھی وہ ننگے پاؤں تھا اور گیلی ہوئی پتلون کے پائنچے گھٹنوں تک اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ بینڈی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس امیر لڑکے کو پرانے کپڑے پہننے کا شوق کیوں ہے؟

’’آج کا دن کشتی رانی کے لیے بہت اچھا ہے۔‘‘ وہ آہستہ سے بولا۔

’’میرا بھی یہی خیال ہے۔‘‘ بینڈی نے اس کی تائید کی حالانکہ اسے کشتی رانی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

’’تم سیپیاں چننے آئی ہو، کیا میں تمہاری مدد کروں؟‘‘ یہ کہہ کر اس نے بالٹیاں اٹھائیں اور سیڑھیاں اترنے

مشہور ادیب مشتاق احمد یوسفی کہتے ہیں۔ ’’سانپ کا زہر کینچلی میں اور بچھو کا دم میں ہوتا ہے۔ بھڑ کا زہر ڈنک میں ہوتا ہے اور پاگل کتے کا زہر اس کی زبان میں۔ لیکن انسان واحد حیوان ہے جو اپنا زہر دل میں رکھتا ہے۔‘‘

لگا۔ وہ بھی اس کے پیچھے چل دی۔ وہ اسے اپنی کشتی کے بارے میں بتانے لگا۔ اس نے مچھلیاں پکڑنے اور تنہا کشتی چلاتے وقت سگار پینے کی دلچسپ کہانیاں سنائیں تو بینڈی بولی۔

’’میں نہیں سمجھتی کہ لوگ تمباکو نوشی کیوں کرتے ہیں۔ میری تو اس کے دھوئیں سے ہی طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔‘‘ وہ کبھی کشتی میں نہیں بیٹھی تھی لیکن اس نے ظاہر یہی کیا کہ وہ کشتی چلاتی رہی ہے۔

’’کیا تم نے کبھی چوری چھپے تمباکو نوشی کی ہے؟‘‘ جیمس نے پوچھا۔

بینڈی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

’’ایک ڈرنک کے بارے میں کیا خیال ہے؟‘‘

بینڈی ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ’’صرف ایک مرتبہ چکھی تھی، یہ جاننے کے لیے کہ اس کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے۔‘‘

وہ دونوں باتیں کرتے کرتے باڑھ تک پہنچ گئے۔ وہ اسے ہنسانے کے لیے دلچسپ باتیں کرتا رہا۔ سورج پوری طرح نکل آیا تھا۔ بینڈی گھبراتے ہوئے بولی۔

’’اب مجھے جانا چاہیے۔ گھر کے بہت سے کام کرنا ہیں۔‘‘

’’میں بھی چلوں گا۔ شاید تم سے کل ملاقات ہو۔‘‘

’’شاید۔‘‘ اس نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

وہ چلتے چلتے رک گیا اور پیچھے مڑ کر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ’’سنو۔‘‘

بینڈی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کہیں اس کا پروگرام بدل تو نہیں گیا؟ ممکن ہے کہ اس کے دوست آنے والے ہوں اور وہ کسی مصروفیت کا بہانہ بنا کر اس سے جان چھڑانا چاہ رہا ہو۔

’’میں تمہیں اپنے ساتھ کشتی کی سیر کے لیے لے جانا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے کہ تمہیں اس سے دلچسپی نہ ہو کیونکہ اکثر اوقات لڑکیاں پانی میں جانے سے ڈرتی ہیں۔ اس لیے سوچا کہ تم سے پوچھ لوں۔‘‘

وہ ڈر رہا تھا کہ بینڈی کہیں انکار نہ کر دے لیکن اس نے بہادر بنتے ہوئے کہا۔ ’’میں تمہارے ساتھ کشتی پر جانا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پسند کروں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم کل ملیں گے اور کشتی میں بیٹھ کر سورج کے نکلنے کا منظر دیکھیں گے۔"

بینڈی دن بھر اسی کے خیالوں میں کھوئی رہی۔ اس کی باتیں، مسکراہٹیں اور شوخیاں اس کے ذہن پر چھائی رہیں۔ رات کو بھی وہ بمشکل سو پائی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کی آنکھ دیر سے نہ کھلے۔ وہ سورج نکلنے سے بہت پہلے بیدار ہوگئی۔ اس نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیا۔ وہ جانتی تھی کہ جیمس کی نظر میں یہ بہت معمولی ہے لیکن اسے یقین تھا کہ وہ چیتھڑوں میں بھی اس کے لیے قابلِ قبول ہے۔

جیمس باڑھ کے اس پار کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ وہ مقررہ جگہ سے رینگتی ہوئی اس کے پاس چلی آئی۔ وہ اپنی بالٹیاں بھی ساتھ لے کر آئی تھی تاکہ واپسی میں سیپیاں چُن سکے ورنہ خالی ہاتھ گھر واپس لوٹنے پر ماں ہنگامہ کھڑا کر دیتی۔ جیمس کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"ہم پہلے سیپیاں دیکھ لیتے ہیں۔"

بینڈی نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ ایک لحہ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جیمس اس کی بے قراری دیکھ کر ہنس دیا اور بولا۔ "کیا تم واقعی کشتی کی سیر کرنا چاہتی ہو؟"

یہ کہہ کر اس نے اسے ہلکا سا دھکا دیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور ایک ٹیلے کے پیچھے نرم ریت پر جاگری۔ اس لمحے بینڈی کو شدید بے عزتی کا احساس ہوا۔ جیمس بھی دوسرے لڑکوں جیسا ہی نکلا۔ وہ سمجھ گئی کہ ان ٹیلوں کے پیچھے اس کے دوست چھپے ہوں گے اور چند ہی لمحوں بعد وہ باہر آکر اس کا مذاق اڑائیں گے۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ اس کے بجائے جیمس اس کے اوپر آن گرا۔ بینڈی نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی اور چلّانے لگی جس پر جیمس نے اسے زوردار تھپیڑ رسید کر دیا۔ بینڈی کی آنکھوں کے آگے دھند چھانے لگی پھر وہ کچھ ہو گیا جس کے بارے میں اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ جیمس کے ہاتھ اس کے جسم کے گرد رینگ رہے تھے اور وہ اسے روکنے سے قاصر تھی۔ پھر جب طوفان تھما تو اسے لگا کہ وہ اپنا سب کچھ لٹا بیٹھی ہے۔ اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکے۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ درد کی لہر اس کے سینے سے ابھری جس نے اس کے پورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ اسے جیمس سے اس حرکت کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ فاصلے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس کا منہ نوچ لے لیکن پہلے اسے اپنا حلیہ درست کرنا تھا۔ اس کا بہترین لباس خون آلود ہو گیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی اور بھاگتی ہوئی سمندر کی طرف چلی گئی۔ اس نے رگڑ رگڑ کر خون کے دھبے صاف کرنے کی کوشش کی۔ اس حالت میں وہ گھر نہیں جا سکتی تھی اور ابھی تک اس نے سیپیاں بھی جمع نہیں کی تھیں۔ خالی بالٹیاں لے کر گھر واپس جاتی تو اسے ماں کی ڈانٹ سننا پڑتی۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے اس جگہ کی جانب بڑھنے لگی جہاں اس کی بالٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔

"ہے بیچ گرل۔" جیمس اسے دیکھ کر خباثت سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم مجھے اچھی لگی ہو۔ چلو سیپیاں ڈھونڈتے ہیں۔"

بینڈی نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ ڈھیٹ بنا کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کے کوئی آثار نہیں تھے اور وہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اب بینڈی کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے اندر ایک عجیب سی خاموشی اتر گئی۔ جیمس بھی دوسرے مردوں سے مختلف نہیں تھا۔ اس نے وہی کیا جو کوئی بھی امیر لڑکا کسی غریب لڑکی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ وہ صرف غریب ہی نہیں بلکہ سادہ لوح بھی تھی اور زمانے کی چالاکیوں کو نہیں سمجھتی تھی۔ ماں نے اس کی عزت اور سادگی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ وہ لوگوں کے سامنے اس کی مظلومیت اور بے چارگی کا رونا روتی تاکہ وہ اس پر ترس کھا کر زیادہ سے زیادہ سیپیاں خریدیں۔

جیمس تک بھی یہ باتیں پہنچی ہوں گی۔ اس کے دوستوں نے اسے بینڈی کے بارے میں بتایا ہوگا۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے دوربین لگائے اسے دیکھتا رہتا ہوگا پھر اپنے منصوبے کے مطابق اس نے بینڈی سے راہ و رسم بڑھائی۔ اسے جھوٹی سچی کہانیاں اور لطیفے سنا کر اپنی جانب مائل کیا۔ اس کے ساتھ مل کر سیپیاں چننے میں مدد دی اور پھر موقع پا کر اسے ریت پر گرا دیا۔

سورج نکلنے کے ساتھ ہی بینڈی کے جسم میں بھی حدت بڑھنے لگی۔ اسے اپنے اندر ایک نئی قوت ابھرتی محسوس ہوئی۔ وہ جیمس سے چند قدم کے فاصلے پر تن کر کھڑی ہو گئی جو اپنے ہاتھ میں ایک سیپی لیے اس طرح کھڑا تھا جیسے کتّے کے آگے ہڈی ڈال رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

"بہت خوب صورت ہے۔" بینڈی نے للچائی ہوئی نظروں سے سیپی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ گو کہ یہ الفاظ اس نے بڑی مشکل سے ادا کیے تھے۔ یہ کہہ کر اس نے ایک بالٹی

اٹھالی۔

جیمس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ وہ یہی سمجھا کہ بینڈی نے اس واقعے کا کچھ زیادہ اثر نہیں لیا ہے اور وہ آئندہ بھی اس کے اشاروں پر چلتی رہے گی۔ وہ دوسری بالٹی میں سیپی ڈالنے کے لیے جھکا اور بولا۔ "ٹھیک ہے ہم......"

یہی وہ لمحہ تھا جب بینڈی اپنا وار کر سکتی تھی۔ اس نے بالٹی میں سے گھاس کھودنے والی کھرپی اٹھائی اور پوری قوت سے اس کی گردن پر وار کیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے پاس یہی ایک موقع ہے اور اگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو وہ اسے ہمیشہ تنگ کرتا رہے گا۔ جیمس کو اس کی توقع نہیں تھی۔ وہ اپنی جگہ پر لہرا کر رہ گیا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے گردن کے اس حصے تک پہنچے جہاں سے خون بہنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ غراتا ہوا اس کی طرف بڑھا لیکن بینڈی تیزی سے سمندر کی جانب دوڑ گئی۔ اس نے اسے پکڑنے کی کوشش کی اور وہ تقریباً اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ اس کے خون آلود ہاتھ بینڈی کے اسکرٹ تک پہنچے۔ وہ تھوڑا سا ہچکچایا اور اچانک ہی خوف زدہ نظر آنے لگا پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑا اور لڑکھڑاتا ہوا گھر کی جانب بڑھنے لگا۔

اس دوران بینڈی نے اپنے دفاع میں مٹھی بھر ریت اٹھائی اور اس کی آنکھوں میں جھونک دی۔ وہ زور سے چلّاتے ہوئے اپنی آنکھیں مسلنے لگا۔ بینڈی نے اپنی بالٹی اس کے پیروں پر دے ماری۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے لگا تو بینڈی نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس کے سر کا نشانہ لیا لیکن جیمس نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ وہ غرایا اور رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ پھر اس کے بازو جواب دے گئے اور وہ بے جان ہو گیا۔ بینڈی نے اس کا سر سیدھا کیا اور ایک اور پتھر اٹھا کر اتنی زور سے اس کی کنپٹی پر مارا کہ ہڈی چٹخنے کی آواز واضح طور پر سنائی دی۔

جب بینڈی کی سانس قابو میں آئی تو اسے پیاس محسوس ہونے لگی لیکن ابھی اسے بہت سا کام کرنا تھا۔ اس نے جیمس کی دونوں کلائیاں پکڑ لیں اور اس کے بے جان جسم کو سمندر کی جانب گھسیٹنے لگی۔ گو کہ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور اس کی لاش کو لے کر اتنی دور چلی گئی جہاں اس کے پاؤں بمشکل زمین کی سطح کو چھو سکتے تھے۔ جیمس کے منہ سے پانی کے بلبلے خارج ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن ان میں زندگی کی رمق نہیں تھی۔

اس نے لاش کو سمندر کی لہروں کی جانب دھکیل دیا

شوکت تھانوی ایک مرتبہ شدید مرض میں مبتلا ہو گئے۔ بیماری کے ردِعمل نے ان کے سر کے سارے بال بھسم کر دیے اور سر چٹیل میدان نظر آنے لگا تو بیماری سے کچھ افاقہ ہونے لگا۔ دوست احباب عیادت کو آنے لگے۔ گنجے سر کو دیکھ کر متعجب ہوئے۔ پوچھا۔ "شوکت صاحب یہ کیا اور کیسے ہوا؟" تو شوکت صاحب بڑے اعتماد سے گویا ہوئے۔ "ملک الموت آئے تھے۔ صورت دیکھ کر ترس کھا گئے۔ سر پر ایک چپت رسید کر کے واپس چلے گئے۔"

☆☆☆

ایک جوتا فروش نے نئی نئی دکان کھولی اور اکبر الٰہ آبادی کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا۔ "حضرت میں نے جوتوں کی دکان کھولی ہے، کوئی شعر عطا فرمایئے۔"

اکبر الٰہ آبادی نے فوراً یہ شعر لکھ کر دے دیا۔

شومیکری کی کھولی ہے ہم نے جو یہ دکان
روٹی کو ہم کمائیں گے جوتوں کے زور سے

لیکن وہ جانتی تھی کہ بپھری ہوئی موجیں اسے وسیع و عریض ساحل پر کہیں بھی پھینک سکتی ہیں۔ جس جگہ اس نے جیمس پر حملہ کیا تھا، وہاں اچھا خاصا خون بہہ گیا تھا۔ وہ بالٹیوں میں پانی بھر کر لائی اور وہاں بہا دیا پھر اس نے ٹیلے کی صاف ریت اس جگہ پر پھیلا دی تاکہ خون کے نشان چھپ جائیں۔ اسے امید تھی کہ دوسری صبح تک سب کچھ صاف ہو جائے گا۔

بینڈی نے بچی کھچی اشیا اپنی بالٹی میں ڈالیں اور جیمس کے گھر کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے دوسری منزل پر کوئی سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا اور اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹا بچہ وہاں سے جھانک رہا تھا۔ کوئی بھی یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ جیمس نے ٹیلے کے پیچھے کیا حرکت کی تھی۔ زیادہ سے زیادہ انہیں یہی نظر آتا کہ وہ ٹیلے پر نیلے لباس والی لڑکی کے ساتھ تھا لیکن دوربین کے بغیر اتنے فاصلے سے لڑکی کو پہچاننا مشکل تھا۔

اس نے بالٹیاں اٹھائیں اور وہاں سے چل دی۔ گھر پہنچ کر اس نے ماں سے کہہ دیا کہ آج سیپیاں نہیں ملیں۔ ماں نے اسے بے بھاؤ کی سنائیں اور وہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر ڈرتی رہی کہ اگر ماں کو آج کے واقعے کا علم ہو گیا تو قیامت ہی آ جائے گی۔ لیکن ماں کو کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ پولیس یا والٹر خاندان کو بھی کوئی شک نہ ہوا۔ جب اس کا دل رونے کو چاہتا تو وہ گھر کے پیچھے بنے ہوئے صحن میں چلی جاتی۔ اس نے اپنا نیلا لباس بھی چولہے میں جلا دیا تھا۔ وہ اس ہولناک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واقعے کی ہر یاد کو مٹا دینا چاہتی تھی۔

جیمس والٹر کی گمشدگی پر ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ طرح طرح کی باتیں سننے میں آرہی تھیں۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ بھی اپنے بھائی کی طرح فوج میں شامل ہونے کے لیے گھر سے بھاگ گیا ہے جبکہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہے تا کہ اس کے گھر والوں سے بھاری تاوان وصول کیا جا سکے۔ یہ تمام شبہات اور قیاس آرائیاں اس وقت دم توڑ گئیں جب ایک ہفتے بعد اس کی مسخ شدہ لاش ساحل پر پڑی ہوئی ملی۔

بینڈی نے پائی پائی جوڑ کر نیا لباس بنوایا اور اسے ایک ہوٹل میں صفائی کرنے کی ملازمت مل گئی۔ اس نے ماں سے یہ بات چھپائے رکھی لیکن اسے کسی نہ کسی طرح پتا چل گیا۔ ماں نے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی کمائی اس کے حوالے کر دے۔ بینڈی کے انکار کرنے پر ماں نے اسے تھپڑ مارا... جواب میں بینڈی نے بھی اس پر ہاتھ اٹھا دیا۔ ماں کو اس سلوک کی توقع نہیں تھی۔ اس نے بینڈی کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ بینڈی نے اپنا مختصر سامان اٹھایا اور گھر چھوڑ کر چلی گئی۔

اس نے ایک دوسرے قصبے میں رہائش اختیار کر لی اور اتنا کمانے لگی کہ اس کی گزر اوقات ہو سکے۔ یہ پہلا موسم سرما تھا جس میں اسے میز پر بیٹھ کر سیپیاں رنگنے کا کام نہیں کرنا پڑا۔ جب وہ موسم بہار کے آخر میں بورڈنگ ہاؤس واپس آئی تو مکان کی مالکن نے بتایا کہ اس کی ماں کسی سیلز مین کے ساتھ بھاگ گئی ہے جو خود بھی پکی شراب پینے کا شوقین تھا۔ جاتے وقت اس نے کوئی خط بھی نہیں چھوڑا تھا۔ مکان کی مالکن نے اسے پیشکش کی کہ وہ دوسرے شہر میں رہنے کے بجائے اسی گھر میں رہے۔ ماں کے جانے کے بعد بینڈی کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا، لہٰذا اس نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ اس نے پہلے کی طرح ساحل سے سیپیاں اور گول پتھر چن کر انہیں رنگنے کا کام شروع کر دیا۔ لوگ ابھی تک جیمس کو نہیں بھولے تھے۔ وہ اس کے ڈوبنے کا تذکرہ بڑے دردناک انداز میں کرتے تو وہ بھی سر ہلا کر اس کے گھر والوں سے اظہارِ ہمدردی کرنے لگتی۔

بینڈی نے موسم گرما میں ہوٹل کی ملازمت کے ساتھ ساتھ سیپیاں اور پتھر بیچنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ پھر اس ساحل کی طرف جانے والے راستے پر ایک اسٹال کرائے پر لے لیا اور اس میں مختلف مشروبات رکھ کر بیچنے لگی۔ اب وہ برسوں سے یہی کام کر رہی تھی۔

☆☆☆

"ایمبولینس آگئی ہے۔" گریگ نے اطلاع دی۔

لوگوں نے ایمبولینس کو دیکھ کر پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ اس میں سے دو افراد برآمد ہوئے۔ مجمع اتنا زیادہ تھا کہ بینڈی کو وہاں کا منظر نہیں دکھائی دے رہا تھا لیکن یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی ایسے کئی مناظر دیکھ چکی تھی۔

جمی کے لیے رونے والے بہت تھے۔ دو لڑکیاں ایک دوسرے سے لپٹ کر بے تحاشا رو رہی تھیں۔ بینڈی کی نظر ایک تیسری لڑکی پر گئی جو کچھ فاصلے پر اپنے دونوں بازو سینے پر باندھے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ گزشتہ شب وہ جمی کے ہمراہ اس کے اسٹال پر آئی تھی اور اس کے بازوؤں میں جھولتی ہوئی بات بات پر قہقہے لگا رہی تھی۔ بینڈی نے انہیں سوڈے کے کپ اور پاپ کارن کا پیکٹ دیا تھا اور وہ ٹہلتے ہوئے چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد بینڈی نے بھی اسٹال بند کیا اور گھر کی راہ لی۔

رات کے کھانے کے بعد وہ ایک بار پھر کاغذ کے کپ دیکھنے کے لیے اسٹال پر آئی۔ عام طور پر وہ دوسرے دن کے لیے مناسب تعداد میں ان ...... کا ذخیرہ رکھتی تھی اور کم ہونے کی صورت میں اسٹور بند ہونے سے پہلے مزید کپ خرید لیتی تھی۔ اس نے ایک نظر میں اسٹال کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر باہر جانے لگی کہ اچانک ہی اس نے کسی لڑکی کے چیخنے کی آواز سنی جو درد سے کراہ رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی کسی مرد کے غرانے کی آواز آئی جو شاید اس لڑکی پر جھپٹ رہا تھا۔

بینڈی کے جسم میں درد کی لہر ابھری اور پیٹ میں مروڑ پڑنے لگے۔ اس نے مضبوطی سے ریلنگ پکڑی۔ اس نے ہچکیاں لیتی ہوئی لڑکی کو دیکھا جو اپنا بچا کھچا لباس سنبھالے سمندر کی طرف بھاگی جا رہی تھی پھر اس نے سمندر میں چھلانگ لگا کر اپنے لباس کو رگڑ رگڑ کر پانی سے صاف کیا اور روتی ہوئی قصبے کی طرف جانے والے راستے پر چل دی۔

اسے جمی والٹر دکھائی دیا جو قہقہے لگا رہا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل سے ایک گھونٹ لیا۔ اس وقت وہ بالکل اپنے دادا کی طرح نظر آرہا تھا۔ جیمس والٹر اس کے دادا کا بھائی تھا۔ جب وہ اپنے گھر کی طرف جانے والے راستے پر مڑا تو بینڈی بھی اپنی جگہ سے اٹھی جہاں وہ جھکی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ بوڑھی ضرور تھی لیکن شدید غصے کے عالم میں اس میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اتنی طاقت آگئی تھی کہ وہ ایک نوجوان شرابی کا راستہ روک سکے۔ اس نے پوری قوت سے اسے دھکا دیا اور یہ دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ وہ کہاں جا کر گرا تھا۔

اس وقت بھی بینڈی کی نظریں اسی لڑکی پر جمی ہوئی تھیں جسے اس لڑکی نے بھی محسوس کیا۔ وہ بُری طرح گھبرا گئی۔ بینڈی نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا اور اسے ایک سوڈے کا کپ تھماتے ہوئے بولی۔ ''رات تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

لڑکی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ خوف زدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔ یہ میری طرف سے ہے۔'' بینڈی نے پیار سے کہا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''لِنڈا۔''

''اسی قصبے کی رہنے والی ہو؟''

''نہیں، میں بیل شور میں رہتی ہوں۔''

''وہ بھی اچھی جگہ ہے یا پہلے بھی ہوا کرتی تھی۔'' پھر وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ''وہاں کبھی لڑکیوں کا بہت بڑا ہاسٹل ہوا کرتا تھا۔''

''ہاں، مما کا کہنا ہے کہ وہاں بُری لڑکیاں اپنے بچوں کے ساتھ رہتی ہیں۔''

''وہ بُری لڑکیاں نہیں ہوتیں بلکہ ان کے ساتھ کسی نے زیادتی کی ہوتی ہے۔ اسی لیے وہاں کی انتظامیہ ان بچوں کے بارے میں پوچھ گچھ نہیں کرتی کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ اس میں لڑکی کا کوئی قصور نہیں۔ تم یہ بات یاد رکھو گی؟''

لڑکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اگر تمہیں کسی مدد کی ضرورت ہو تو وہاں چلی جانا۔ وہ اچھے لوگ ہیں۔ دوسروں کی طرح تمہیں الزام نہیں دیں گے۔ تم اسے بھی ذہن نشین کر لو۔''

''ٹھیک ہے میڈم۔'' یہ کہہ کر وہ لڑکی وہاں سے روانہ ہوگئی۔

گریگ اپنے کاؤنٹر پر جھکتے ہوئے بولا۔ ''تم نے یہ کبھی نہیں بتایا کہ بیل شور میں بھی رہ چکی ہو۔''

''یہ بہت پرانی بات ہے۔ مجھے تو یاد بھی نہیں رہی۔''

''میرا تعلق بھی بیل شور سے ہے۔'' گریگ نے کہا۔

''تمہارے خاندان کے باقی لوگ وہیں رہتے ہیں؟''

گریگ ایک دم ہی سنجیدہ ہو گیا۔ ''نہیں۔ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' ایک سیکنڈ کے لیے اس کے چہرے پر کونارڈ جیسی شباہت ابھری پھر اس نے کہا۔ ''میں حادثاتی طور پر یہاں نہیں آیا۔''

بینڈی کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ''میرا بھی یہی اندازہ تھا۔''

گریگ نے کوئی جواب نہیں دیا اور بینڈی سوڈے کا گھونٹ لیتے ہوئے سوچنے لگی کہ کونارڈ بھی گریگ کو دیکھ کر..... شک نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اپنی ماں پر گیا تھا، البتہ اس کے دانت جیمس کی طرح سیدھے تھے۔ بینڈی نے اس کی ولدیت کے خانے میں کسی کا نام نہیں لکھوایا تھا لہٰذا گریگ کو کبھی یہ معلوم نہ ہوتا کہ اس کا حقیقی باپ کون ہے۔ ہاسٹل کی انتظامیہ نے بینڈی پر زور دیا کہ وہ بچے کو اپنے پاس رکھے لیکن بینڈی جانتی تھی کہ وہ اچھی ماں ثابت نہیں ہوگی اور جب لوگ اس سے بچے کے باپ کا نام پوچھیں گے تو وہ کیا جواب دے گی چنانچہ وہ اسے ہاسٹل میں چھوڑ کر اپنے قصبے واپس چلی آئی۔

کونارڈ نے اگر اسے جیمس کے ساتھ دیکھا ہوگا، تب بھی وہ اس کے خلاف کچھ ثابت نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی گزشتہ شب جمی کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا، اس کا کوئی عینی گواہ موجود تھا۔ لِنڈا نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا اور اگر دیکھا بھی ہوتا تو وہ صاف مکر جاتی اور یہی کہتی کہ وہ اسے سوڈا دینے کے بعد اسٹال بند کر کے گھر چلی گئی تھی۔ جیمس ہو یا جمی، سب کی فطرت ایک جیسی تھی۔ ان کی رگوں میں گندا خون دوڑ رہا تھا لیکن گریگ کے بارے میں وہ ایسا نہیں سوچ سکتی تھی کیونکہ وہ اس کا اپنا بیٹا تھا لیکن وہ یہ راز کسی پر ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔

بینڈی نے گلا کھول کر اس میں سے ایک ڈالر کا نوٹ نکالا اور گریگ سے بولی۔ ''میرے پاس کپ ختم ہو گئے ہیں۔ کیا تم ہاٹ ڈاگ کے اسٹال سے کچھ کپ لا سکتے ہو؟''

گریگ نے اس کے ہاتھ سے نوٹ لیا اور چند منٹوں بعد ہی خالی کپ کا بنڈل لے کر آ گیا جو دن بھر کے لیے کافی تھے۔

''بہت بہت شکریہ۔ تم واقعی اچھے لڑکے ہو۔'' وہ گریگ کو پیار سے دیکھتے ہوئے بولی۔

گریگ مسکرا دیا۔ عین اسی وقت ایمبولینس کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ بینڈی نے گہری سانس لی اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اس نے سانپ کے بعد سپنو لیے کا سر بھی کچل دیا تھا۔ البتہ گریگ کو وہ ایسا نہیں سمجھتی تھی کیونکہ وہ تو اس کے وجود کا حصہ تھا۔

عزتِ نفس

مریم کے خان

اونچے خواب ہر شخص دیکھنا پسند کرتا ہے... لیکن ان خوابوں کی تعبیر ہر ایک کے حصے میں نہیں آتی... ایک ایسے ہی شخص کا قصّہ... جو جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے کا عادی تھا... اور اپنے ان خوابوں کو حقیقت میں پالینا چاہتا تھا...

ثابت قدمی اور عزم و حوصلے سے ہر رکاوٹ عبور کر لینے والے فاتح کا قصہ

نیو ایگری بینک کے صدر مارٹن شیلڈ نے اپنی سیکریٹری مسز رینالڈ کو اپنے دفتر میں طلب کیا۔ مسز رینالڈ گزشتہ دسمبر میں پچاس کی ہو چکی تھی اور اسے مارٹن شیلڈ کے ساتھ کام کرتے ہوئے بیس سال ہو چکے تھے۔ بیس سال پہلے وہ اس کی سیکریٹری مقرر ہوئی تھی اور اب تک اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دے رہی تھی۔ طویل عرصے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے وہ اس کی تمام ضرورتوں اور عادتوں سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واقف ہو چکی تھی اور اس کی مزاج آشنا تھی۔ کمرے میں آتے ہی اس نے محسوس کیا کہ اس کا باس کسی وجہ سے پریشان ہے اور شاید اسی پریشانی کے سلسلے میں اسے طلب کیا ہے۔ مارٹن شیلڈ اپنی کرسی پر مستعد انداز میں بیٹھا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ میز پر رکھے تھے۔ اس کے .... ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ مسز رینالڈ نے دیکھ لیا کہ لفافہ سادہ ہے اور اس کے ایک کونے پر ڈاک کی مہر لگی ہے۔ مارٹن شیلڈ کا سگار ایش ٹرے میں احتیاط سے ٹکا ہوا تھا اور اس کا سرا بجھنے کے قریب تھا۔

مسز رینالڈ اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ کھڑکی سے شام کی ہلکی دھوپ اندر آ رہی تھی۔ لندن کے باسی ایسی دھوپ کے لیے ترستے ہیں۔ مسز رینالڈ نے کھڑکی کا پردہ ممکنہ حد تک سرکا دیا۔ دوپہر میں دھوپ دیکھ کر مارٹن کا موڈ خوش گوار تھا لیکن اس وقت اس کے چہرے پر تفکر کی پرچھائیاں تھیں۔ مسز رینالڈ جانتی تھی کہ وہ خود ہی موضوع کی طرف آئے گا اس لیے اس نے مارٹن کو متوجہ کرنے کی کوشش نہیں کی اور خاموش کھڑی رہی۔ کچھ دیر بعد مارٹن نے میز پر سے ہاتھ ہٹا لیے اور کرسی کا رخ مسز رینالڈ کی طرف کیا۔

"تم جانتی ہو ہماری سرے برانچ کو ان دنوں کون دیکھ رہا ہے؟"

"بالکل جانتی ہوں سر۔" مسز رینالڈ نے مستعدی سے کہا۔ اگرچہ برانچ منیجرز کے بارے میں واقفیت رکھنا اس کے فرائض میں شامل نہیں تھا لیکن سرے برانچ کا معاملہ مختلف تھا۔ ایک سال پہلے اس برانچ کے منیجر مسٹر ولیم کارپ کا اچانک انتقال ہو گیا۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور اس سے پہلے کہ انہیں کوئی طبی مدد پہنچائی جاتی، وہ اس دنیا سے گزر گئے۔ سرے برانچ کا شمار بینک کی چند اہم برانچوں میں ہوتا تھا کیونکہ اس کاؤنٹی کے کئی دولت مند کاشت کاروں نے اپنے کھاتے ان کے بینک میں کھلوا رکھے تھے۔ اس برانچ کی اہمیت کے پیشِ نظر مسٹر ولیم کارپ کو خاص طور سے لندن سے بھیجا گیا تھا اور ان کے انتقال کے بعد بینک کو ابھی تک اس برانچ کے لیے کوئی موزوں منیجر نہیں مل سکا تھا۔

انیسویں صدی میں بینکاری بہت خفیہ اور چھپا کر کھیلا جانے والا کھیل سمجھا جاتا تھا۔ بینکوں کے معاملات میں رازداری کو اولین حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ کسی بینک کے اندرونی راز افشا ہونے کا مطلب ہوتا تھا کہ بینک دوالیا ہونے والا ہے۔ رازداری کی یہ رسم اب بھی برقرار ہے لیکن اس کی نوعیت بدل گئی ہے۔ پہلے بینک کے معاملات میں درمیانی درجے کے افسران کو باخبر رکھا جاتا تھا، گویا وہ محرم راز ہوتے تھے۔ اس لیے اہم عہدوں پر صرف انہی لوگوں کو تعینات کیا جاتا تھا جن کی بینک سے وابستگی غیر متزلزل ہوتی تھی۔ لوگ نیچے سے ترقی کر کے بینک کے افسران میں شامل ہوتے تھے اور باہر سے براہِ راست افسر بھرتی کرنے کا رواج نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بینک اب تک مسٹر ولیم کارپ کا متبادل تلاش نہیں کر سکا تھا۔

"چارلس گریم کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟"

"چارلس گریم گزشتہ بیس سال سے سرے برانچ کے کیشیر کے طور پر کام کر رہا ہے۔ اس کے بارے میں آج تک کوئی شکایت سننے میں نہیں آئی اس لیے سرِدست چارلس کو سرے برانچ کے عارضی منیجر کے فرائض سونپ دیے گئے ہیں۔ وہ گزشتہ ایک سال سے یہ فرض بھی بہ خوبی انجام دے رہا ہے۔"

"یعنی اب تک ہمیں سرے برانچ کے لیے ایک موزوں منیجر نہیں مل سکا ہے۔" مارٹن نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "کہیں یہ وجہ تو نہیں ہے کہ اب وہاں کے معاملات اتنے تسلی بخش بھی نہیں رہے ہیں، جتنے یہاں ہیڈ آفس میں سمجھے جا رہے ہیں؟"

"اس خیال کی وجہ؟" مسز رینالڈ نے پوچھا۔

"ابھی دوپہر کی ڈاک سے مجھے ایک خط موصول ہوا ہے۔ بھیجنے والے نے اپنا نام اور پتا نہیں لکھا ہے لیکن یہ سرے کے اسی ڈاک خانے سے پوسٹ ہوا ہے جہاں ہماری سرے برانچ ہے۔" مارٹن شیلڈ نے کہا اور میز پر رکھا سادہ لفافہ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ "اس خط میں سرے برانچ کے بارے میں کیا لکھا ہے، تم خود دیکھ لو۔"

مسز رینالڈ نے لفافہ کھولا۔ اندر سے ایک ٹائپ شدہ رقعہ نکلا۔ بھیجنے والے نے براہِ راست بینک کے صدر کو مخاطب کر کے لکھا تھا۔

"جناب صدر نیوا انگری بینک!

میں ایک نہایت اہم معاملے کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، آپ کے بینک کی سرے برانچ میں یہاں کے کسانوں نے اپنی رقم .... جمع کرا رکھی ہے۔ میں بھی ایک کسان ہوں اور میرا سارا اثاثہ اس بینک میں موجود ہے۔ معاف کیجیے گا، میں غلط لفظ استعمال کر گیا ہوں۔ میرا اثاثہ اس بینک میں موجود تھا کیونکہ اب وہاں کچھ نہیں ہے۔ پچھلے دنوں میں اپنی جمع شدہ کچھ رقم نکلوانے گیا تو مسٹر چارلس گریم نے نہایت شائستگی سے مجھے بتایا کہ بینک کے کھاتوں میں اب کوئی رقم نہیں ہے اور بینک

دوالیا ہو گیا ہے۔ میری آپ سے استدعا ہے کہ بینک کے معاملات کی چھان بین کرائی جائے اور ہم کسانوں کی رقم واپس دلائی جائے۔ بعض مجبوریوں کی بنا پر میں اپنا نام ظاہر نہیں کر سکتا۔

فقط ایک کھاتے دار۔"

مسز رینالڈ نے رقعہ پڑھ کر مارٹن شیلڈ کی طرف واپس بڑھا دیا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، معاملات اتنے اچھے نہیں ہیں۔ ورنہ اس شخص کو رقعہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"دوسری طرف اس نے اپنا نام بھی نہیں لکھا ہے۔" مارٹن نے کہا۔ "اس صورت میں اس رقعے کی کوئی قانونی حیثیت ہوتی ہے؟"

"آپ کا مطلب ہے، صرف یہ رقعہ ایک بینک برانچ کے خلاف چھان بین کرانے کے لیے کافی نہیں ہے؟"

"بالکل درست ہے۔" مارٹن نے کہا۔ "چارلس گریم گزشتہ بیس سال سے بینک سے منسلک ہے اور اس کا مطلب ہے وہ ہمارا ایک نہایت معزز ملازم ہے۔ اس کے خلاف کبھی کوئی شکایت نہیں ملی ہے۔ وہ بینک کا عارضی منیجر ہے اور یہ منصب اسے مانگے بغیر دیا گیا ہے۔ اس صورت میں صرف ایک رقعے کی بنیاد پر اس کے خلاف چھان بین کرانا مجھے درست نہیں لگ رہا ہے۔ اس سے نہ صرف اس کی عزتِ نفس مجروح ہو گی بلکہ ممکن ہے کہ بینک کی ساکھ بھی متاثر ہو۔ سرے جیسے چھوٹے سے علاقے میں اگر کوئی بات معمول سے ہٹ کر ہو تو سب کو فوراً پتا چل جاتا ہے۔"

مسز رینالڈ، مارٹن کی مشکل سمجھ رہی تھی۔ وہ ایک دیرینہ بینک ملازم کے خلاف کارروائی کرنا نہیں چاہتا تھا تو دوسری طرف وہ اس رقعے کو سرے سے نظرانداز بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کی ذمے داری تھی کہ بینک کے تمام معاملات سو فیصد درست رہیں اور کہیں شک و شبے کی معمولی سی گنجائش بھی نہ ہو۔ مسز رینالڈ غور سے اپنے باس کو دیکھ رہی تھی جس کے چہرے پر گہری فکر تھی۔ مسز رینالڈ نے مشورہ دیا۔

"آپ کسی کو معمول کا آڈٹ ظاہر کر کے بھی بھیج سکتے ہیں۔"

"سالانہ آڈٹ دو ہفتے پہلے ہی ہوا ہے اور اس کی رپورٹ اس وقت بھی میری میز پر موجود ہے۔ اس رپورٹ میں سرے برانچ کو مکمل طور پر شفاف قرار دیا گیا ہے جبکہ بعض دوسری برانچز میں چھوٹی موٹی بے قاعدگیاں سامنے آئی ہیں۔ اس صورت میں، میں فوری طور پر دوسری بار آڈٹ افسر کو کیسے بھیج سکتا ہوں؟"

"مرکزی برانچ سالانہ جائزے کے علاوہ جب چاہے آڈٹ کرا سکتا ہے۔" مسز رینالڈ نے اصرار کیا۔ "برانچ انتظامیہ انکار کرنے کی مجاز نہیں ہے اور نہ ہی وہ شک کر سکتی ہے۔"

مارٹن کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو، مجھے ایسا ہی کرنا ہوگا۔ ایسا کرو، آڈٹ انسپکٹر مسٹر جورڈن بریگ کو بھیج دو۔"

مسز رینالڈ سر ہلاتی ہوئی کمرے سے رخصت ہو گئی اور دس منٹ بعد برانچ آڈٹ انسپکٹر جورڈن بریگ، مارٹن کے سامنے تھا۔ مارٹن نے معاملہ اس کے سامنے رکھا۔ "رقعہ گمنام ہے اور ہمارے ایک نہایت اہم برانچ کے خلاف بھیجا گیا ہے مگر تم جانتے ہو، اس قسم کی کسی بھی شکایت کی صورت میں چھان بین کرنا بینک کی ذمے داری ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس برانچ میں جا کر تمام معاملات دیکھو اور پھر مجھے رپورٹ کرو۔"

"میں آج ہی روانہ ہو جاتا ہوں۔"

"دوسرے، تم اس دورے کو معمول کا قرار دو گے اور تمہارا رویّہ بھی اسی لحاظ سے ہونا چاہیے۔ مسٹر چارلس گریم یا اس کے عملے کو کسی موقع پر احساس نہ ہو کہ انہیں مشکوک سمجھا جا رہا ہے۔"

"میں خیال رکھوں گا جناب۔" جورڈن نے کھڑے ہو کر کہا۔ "مجھے اجازت ہے؟"

"بالکل۔" مارٹن خود کھڑے ہو کر اسے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ "جو میں نے کہا ہے اس کا خیال رکھنا۔"

☆☆☆

جورڈن بریگ کی عمر پچپن سال تھی اور اسے بینک میں ملازمت کرتے ہوئے تیس سال ہو چکے تھے۔ پانچ سال بعد وہ ریٹائر ہو جاتا۔ تیس سال پہلے وہ جونیئر کلرک ملازم تھا۔ رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے وہ آج سینئر آڈٹ انسپکٹر بن چکا تھا۔ پورے انگلینڈ میں پھیلی بینک کی برانچوں کے حساب کتاب کو دیکھنا اس کی ذمے داری تھی۔ اس نے کئی بار فراڈ بھی پکڑے تھے اور کئی خورد برد اس کی باریک بیں نظروں سے چھپے نہ رہ سکے تھے۔ بینکوں میں رقم ہوتی ہے اور جہاں رقم ہوتی ہے، وہاں فراڈ اور خورد برد کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

جورڈن سرے برانچ کی عمارت میں داخل ہوا تو اس کی چھٹی حس نے بتایا کہ وہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ عملہ خاموش لیکن پورے سکون اور اعتماد کے ساتھ اپنے کام میں مصروف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ چند صارفین بھی بینک میں آئے ہوئے تھے اور اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ کیونکہ چارلس گریم عارضی منیجر تھا اس لیے کیشیئر کا کام ایک کلرک کے سپرد تھا۔ بینک کی عمارت دیہاتی طرز کی اور پتھروں سے بنی ہوئی تھی لیکن اس کی مضبوطی اور صفائی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ جورڈن کو کہیں ایک کاغذ کا ٹکڑا بھی نظر نہیں آیا۔ اندر داخل ہو کر وہ سیدھا .... منیجر کے کمرے کی طرف بڑھا۔۔۔ کیونکہ یہ مقامی برانچ تھی اس لیے منیجر کو سیکریٹری کی سہولت میسر نہیں تھی۔ جورڈن نے دروازے پر دستک دی اور ''یس'' سن کر اندر داخل ہو گیا۔

چارلس تقریباً پینتالیس برس کا نرم خو، شریف اور معزز نظر آنے والا شخص تھا۔ چونکہ اس سے پہلے جورڈن تین سال پہلے اس برانچ میں آیا تھا اس لیے چارلس اسے پہچان نہیں سکا۔ جورڈن نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''مسٹر گریم! مجھے آڈٹ انسپکٹر جورڈن بریگ کہتے ہیں اور میں مرکزی برانچ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں۔''

چارلس کا اس کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکا لیکن فوراً ہی اس نے جورڈن کا ہاتھ تھام لیا۔ ''مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر بریگ۔۔۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' چارلس نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے برانچ کی چھان بین کے لیے بھیجا گیا ہے۔'' جورڈن نے کوشش کی کہ اس کا انداز معمول کے مطابق ہو۔

''چھان بین!'' چارلس گریم کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ ''مگر ابھی صرف سولہ دن پہلے تو برانچ کا مکمل آڈٹ ہوا ہے؟''

''اچھا۔'' جورڈن نے کسی قدر حیرانی کا مظاہرہ کیا۔ ''مجھے اس بارے میں نہیں معلوم۔۔۔ لیکن مجھے حکم دیا گیا ہے کہ برانچ کی بکس کو دیکھا جائے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرے ساتھ مکمل تعاون کریں گے۔''

چارلس سوچ میں پڑ گیا، اس نے سوال کیا۔ ''مسٹر بریگ! کیا آپ کو کوئی خاص ہدف دیا گیا ہے؟''

''نہیں، مجھے صرف بینک کی بکس دیکھنے کا حکم ملا ہے۔''

چارلس گریم نے گہری سانس لی۔ ''ٹھیک ہے، میں آپ کے ساتھ مکمل تعاون کروں گا۔ لیکن کیا ایک آڈٹ کے فوراً بعد دوسرا آڈٹ مناسب ہے؟''

''اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔ بینکنگ کونسل کی طرف سے کمرشل بینکوں کو ہدایت ہے کہ وہ سال میں ایک سے زیادہ آڈٹ کریں۔''

چارلس اب بھی فکر مند تھا۔ ''پھر بھی اتنی جلدی۔۔۔ خیر، اب تو آپ سے تعاون کرنا ہے۔ لیکن یہ مناسب نہیں ہوگا کہ بینک کا وقت ختم ہونے کے بعد آپ اپنا کام شروع کریں؟ ابھی یہاں کچھ صارفین ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ سالانہ آڈٹ ہو چکا ہے کیونکہ اس دن بینک بند رہا تھا۔ اب دوبارہ آڈٹ کی خبر سن کر وہ چونک سکتے ہیں اور یہ بات برانچ کے لیے کاروباری لحاظ سے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا مسٹر بریگ؟''

جورڈن نے سر ہلایا۔ ''جی میں سمجھ رہا ہوں اور آپ سے بالکل متفق ہوں۔ مرکزی برانچ کو بھی آپ کی نیک نامی عزیز ہے۔ اس لیے جیسے آپ فرمائیں، اسی لحاظ سے کام کیا جائے گا۔''

چارلس نے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''ابھی بینک بند ہونے میں دو گھنٹے ہیں۔ اس دوران میں آپ چاہیں تو میں کافی پیش کرتا ہوں۔''

''میں شکر گزار ہوں گا۔'' جورڈن نے کونے میں رکھے صوفے کی طرف جاتے ہوئے کہا اور اپنے بیگ سے لندن ٹائمز کا تازہ شمارہ نکال لیا جو وہ آتے ہوئے ساتھ لیتا آیا تھا۔ پیون کچھ دیر بعد اس کے لیے کافی لے آیا۔ کافی اور اخبار سے شغل کرتے دو گھنٹے یوں گزر گئے کہ اسے پتا ہی نہیں چلا۔ چارلس نے اسے بتایا کہ بینک بند ہو گیا ہے اور وہ چاہے تو اب اپنا کام شروع کر سکتا ہے۔ چارلس نے بینک کی تمام بکس اس کے سامنے رکھ دیں۔ جورڈن ان کی جانچ میں لگ گیا۔ یہ خاصا دشوار گزار کام تھا۔ بینک بند ہوتے ہی دوسرا عملہ چلا گیا لیکن چارلس نے کیشیئر اور چپراسی کو روک لیا، وہ اس کام میں مددگار ہوتے۔ رات بارہ بجے تک وہ مصروف رہے۔ تمام کتابیں چیک کرنے کے بعد جورڈن نے آخر میں بینک کی تحویل میں موجود کیش چیک کیا اور اسے پینی کی حد تک درست پایا۔ برانچ میں کہیں کسی قسم کا معمولی سا فراڈ بھی نہیں ہوا تھا۔

چارلس اس کے ساتھ لگا رہا تھا لیکن وہ خوش تھا کہ آڈٹ ایک بار پھر مکمل شفاف نکلا تھا۔ رات بارہ بجے وہ بینک سے نکلے تو جورڈن کے ذہن میں سوال تھا کہ وہ اب رات کہاں گزارے گا؟ کسی ہوٹل میں اس وقت جگہ ملنا دشوار تھا۔ ہاں وہ ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں رات گزار سکتا تھا لیکن چارلس نے اس سے کہا۔ ''مسٹر بریگ! آپ ایک بہت شریف اور اچھے انسان ہیں۔ اگر آج رات آپ مجھے میزبانی کا شرف بخشیں تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جورڈن کو خوش گوار حیرت ہوئی۔ اس کا کام پولیس کی طرح تفتیش کرنا تھا۔ اس لیے جیسے پولیس کی تفتیش کو کوئی پسند نہیں کرتا، بالکل اسی طرح اس کی تفتیش کو بھی کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ اپنی برانچ میں اسے پا کر بینک افسران کے موڈ خراب ہو جاتے تھے مگر چارلس واقعی نیک نفس شخص تھا جو تقریباً بے عزتی کے بعد بھی اس کے ساتھ مہربانی سے پیش آ رہا تھا۔

جورڈن نے اس کی پیش کش قبول کر لی۔ چارلس کا گھر بینک سے کچھ ہی دور تھا اور وہ آرام سے پیدل وہاں پہنچ گئے۔ راستے میں چارلس نے اسے بتایا کہ وہ شادی شدہ ہے اور اس کے دو بچے بھی ہیں جو ابھی اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ وہ اسی قصبے میں پیدا ہوا ہے اور ساری عمر یہیں رہا ہے۔ اس کا یہاں کافی نام اور عزت ہے۔ قصبے کے لوگ اس کی تکریم کرتے ہیں کیونکہ اس کا کردار بے داغ ہے۔

چارلس کا مکان چھوٹا سا لیکن بہت خوب صورت تھا۔ پتھر سے بنے اس دو منزلہ مکان کے چاروں طرف فرانسیسی طرز کا باغیچہ تھا جس میں موسم کی مناسبت سے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اندر جاتے ہوئے چارلس نے بتایا کہ اس کی بیوی کو باغبانی کا شوق ہے اور یہ باغ اسی کی محنت کا نتیجہ ہے۔ جورڈن بہت متاثر ہوا کیونکہ باغ کی تراش خراش اور نفاست میں کسی پیشہ ور مالی کا ہاتھ محسوس ہو رہا تھا۔ جورڈن نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے مسز گریم ہنر مند ہیں اور ان کو سلیقہ بھی ہے۔''

''بہت زیادہ۔'' چارلس نے دروازے پر دستک دے کر کہا۔ ''میری زندگی کو خوب صورت اور پُرسکون بنانے کا سارا کریڈٹ سارا کو جاتا ہے۔ اسی کی وجہ سے میں بینک میں اپنی ذمے داریاں احسن طریقے سے نبھا رہا ہوں۔''

دروازہ ایک خوب صورت عورت نے کھولا۔ اس کی عمر تقریباً پینتیس برس تھی۔ یعنی وہ اپنے شوہر سے پورے دس برس چھوٹی تھی۔ چارلس نے جورڈن کا اس سے تعارف کرایا تو اس نے گرم جوشی سے جورڈن سے ہاتھ ملایا۔ ''مجھے تم سے مل کر خوشی ہوئی اور اس بات کی خوشی بھی ہے کہ تم نے ہمیں شرفِ میزبانی بخشا ہے۔''

مکان اندر سے گرم اور تمام ضروری آسائشوں سے مزین تھا۔ اس کی سجاوٹ بھی قابلِ دید تھی۔ جورڈن کو چارلس کی قسمت پر رشک آیا۔ وہ درست کہہ رہا تھا، ایسی عورت آدمی کی زندگی بنا دیتی ہے۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے لیکن اس نے شوہر کے انتظار میں ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا البتہ بچوں کو کھلا کر سونے کے لیے بھیج دیا تھا۔ جب تک جورڈن اور چارلس کھانے کی میز پر آتے، وہ کھانا لگانا شروع کر چکی تھی اور چند منٹ بعد وہ گرم گرم کھانا کھا رہے تھے۔

جورڈن کے اندازے کے عین مطابق کھانا بھی لذیذ ثابت ہوا۔ مسز گریم ہر فن مولا لگ رہی تھی۔ کھانے کے بعد اس نے انہیں لاجواب قسم کی کافی پلائی اور جب تک وہ کافی ختم کرتے، وہ اوپر جورڈن کے لیے گیسٹ روم کھول چکی تھی۔

یہ رات جورڈن نے نہایت سکون سے گزاری۔ اگلے دن چارلس نے اسے بینک جانے سے پہلے اٹھا دیا۔

''میں معذرت خواہ مسٹر بریگ لیکن لندن جانے والی ٹرین دس بج کر پندرہ منٹ پر یہاں سے گزرتی ہے۔''

چارلس گریم روزانہ ٹھیک آٹھ بجے بینک چلا جاتا تھا اس لیے وہ رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد سارا نے جورڈن کو ناشتا کرایا اور اسے چھوڑنے اسٹیشن تک گئی۔ جورڈن دونوں میاں بیوی کے اخلاق سے بہت متاثر ہوا۔ راستے میں اس کے پاس کافی ---- وقت تھا۔ اس دوران میں وہ اپنی رپورٹ تیار کر سکتا تھا۔

☆☆☆

مارٹن نے سکون کا ایک طویل سانس لیا۔ جورڈن کی دی ہوئی رپورٹ اس نے ابھی پڑھی تھی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا، آج موسم معمول کے مطابق سرمئی تھا۔ لندن عام طور سے سرمئی ہوتا ہے لیکن پھر بھی مارٹن خوش تھا۔ گزشتہ چار دن سے وہ پریشان تھا۔ اگرچہ وہ اپنی پریشانی چھپا رہا تھا لیکن مسز رینالڈ نے بھانپ لیا تھا اور وہ اسے تسلی دینے کی کوشش بھی کر رہی تھی لیکن مارٹن کو سکون آڈٹ انسپکٹر جورڈن کی رپورٹ پڑھ کر ہی آیا۔ اس نے نہ صرف سرے برانچ کو سو فیصد شفاف برانچ قرار دیا تھا بلکہ بینک کے انتظامات اور عارضی منیجر چارلس کے رویّے کی تعریف بھی کی تھی جس نے اس غیر متوقع آڈٹ کو برداشت کرتے ہوئے اس سے پورا تعاون کیا تھا اور خود بھی اس کے ساتھ مصروف رہا تھا۔

مارٹن نے مسز رینالڈ سے کافی لانے کو کہا۔ مارٹن کے لیے کافی وہ خود بناتی تھی۔ وہ صرف مسز رینالڈ کے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی پسند کرتا تھا۔ جب مسز رینالڈ کافی لے کر آئی تو باس کی صورت دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ اس کا موڈ خوش گوار ہے اور شاید وہ مسئلہ باقی نہیں رہا ہے جس نے اسے چار دن سے پریشان کر رکھا تھا۔ مارٹن نے اسے دیکھتے ہی خوش گوار لہجے میں کہا۔ ''معاملہ حل ہو گیا ہے، وہ خط ایک بکواس تھا اور جورڈن نے رپورٹ دی ہے کہ برانچ میں کسی قسم کا کوئی دھوکا نہیں ہوا ہے اور نہ ہی ایک پینی کی رقم کم ہے۔''

مسز رینالڈ نے کافی مارٹن کے سامنے رکھی اور مسکرا کر بولی۔ ''جس وقت یہ خط آیا تھا، مجھے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا۔ چارلس ایک صاف ستھرا آدمی ہے اور اس بات کی گواہی اس کا بیس سال کا سروس ریکارڈ بھی دیتا ہے۔''

''جورڈن نے صرف آڈٹ رپورٹ ہی نہیں دی ہے بلکہ چارلس کے رویّے اور بینک میں اس کی انتظامی صلاحیتوں کو بھی سراہا ہے۔ وہ بالکل کسی پروفیشنل اور منجھے ہوئے منیجر کی طرح اس برانچ کو چلا رہا ہے۔''

مسز رینالڈ ---- کسی قدر ہچکچا کر بولی۔ ''تب آپ چارلس کو ہی برانچ منیجر کیوں نہیں بنا دیتے؟''

مارٹن نے کافی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بھی یہ خیال آیا تھا لیکن چارلس کے پاس مطلوبہ تعلیمی صلاحیت نہیں ہے۔''

''اس کے باوجود وہ سرے برانچ کو بہ خوبی چلا رہا ہے۔''

مارٹن نے سر ہلایا۔ ''یہ بات تو تم یا میں جانتے ہیں، بینک کے ڈائریکٹرز کو اس کا علم نہیں ہے۔ اگر میں چارلس کو سرے برانچ کا منیجر بنا دیتا ہوں تو ڈائریکٹرز کی طرف سے اس پر اعتراض ہو سکتا ہے۔''

مسز رینالڈ اپنے باس کو اس کے کام میں مشورے دینے کی قائل نہیں تھی لیکن اسے چارلس سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی اس لیے اس نے نہ صرف مشورہ دے دیا بلکہ اس پر اصرار بھی کیا۔ ''آپ بینک ڈائریکٹرز سے بات کر سکتے ہیں کیونکہ ایسا کوئی فیصلہ آپ بینک کے مفاد میں کریں گے۔''

مارٹن نے صرف سر ہلایا مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ مسز رینالڈ سمجھ گئی کہ اب اس کا باس تنہائی چاہتا ہے اس لیے وہ اس کے کمرے سے نکل آئی۔ مارٹن نے فی الحال چارلس گریم کے منیجر بنانے کے مسئلے کو ایک طرف ڈال دیا تھا کیونکہ اس نے آنے والے دنوں میں مسز رینالڈ سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ لندن میں موسمِ سرما کا آغاز تھا۔ اکتوبر کے آخر میں پہلی برف باری شروع ہوئی اور نومبر میں تو ریکارڈ برف گری۔ گلیاں اور سڑکیں کئی فٹ تک برف میں غائب ہو گئی تھیں۔ مارٹن کی رہائش بینک سے خاصے فاصلے پر تھی لیکن ان خراب موسمی حالات کے باوجود وہ باقاعدگی سے بینک آتا رہا۔ دسمبر بھی خراب گزرا۔ جنوری اور فروری بھی حد سے زیادہ سرد گزرے تھے لیکن مارچ میں موسم نے غیر متوقع کروٹ لی اور اچانک پڑنے والی گرمی سے برف پگھل گئی۔ مارچ کے آخر تک درختوں اور پودوں پر سبز پتے آ چکے تھے۔

یہ مارچ کی آخری تاریخ تھی جب مارٹن نے مسز رینالڈ کو طلب کیا اور وہ اس کے کمرے میں آئی تو اسے باس اسی طرح پریشان نظر آیا جیسے آج سے چھ مہینے پہلے تھا۔ اس بار بھی اس کے ہاتھ میز پر رکھے تھے اور ہاتھوں تلے ویسا ہی سفید سادہ لفافہ دبا ہوا تھا۔ لفافے کے کونے پر ڈاک کی مہر صاف نظر آ رہی تھی۔ مارٹن مستعد انداز میں بیٹھا تھا۔ مارٹن نے سگار اٹھا کر ایک گہرا کش لیا اور مسز رینالڈ سے کہا۔

''آج پھر سرے برانچ کے بارے میں خط آیا ہے۔''

''اسی نامعلوم شخص کی طرف سے؟''

''ہاں، ٹائپ رائٹر وہی ہے۔ اس میں ایس کا نچلا دائرہ گھسا ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے الٹا سوالیہ نشان بنا دیا ہو۔ میں نے تصدیق کر لی ہے۔ پرانا خط میرے پاس محفوظ ہے۔''

مارٹن نے خط کو بینک کے سرکاری ریکارڈ کا حصہ نہیں بنایا تھا۔ اس نے اسے اپنی ذاتی فائل میں محفوظ کیا تھا۔ اس نے تازہ آنے والا خط مع لفافے کے مسز رینالڈ کی طرف بڑھا دیا۔ ''اس میں وہی الزام ہے اور اس بار زور بھی دیا گیا ہے۔''

مسز رینالڈ نے خط لیا۔ ''اگر یہ شخص اپنے الزام میں سچا ہے تو سامنے کیوں نہیں آتا؟''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ یہ شخص جھوٹا ہے، یہ صرف بینک انتظامیہ اور چارلس گریم کو تنگ کر رہا ہے لیکن ----''

مسز رینالڈ جانتی تھی کہ اس لیکن کے بعد مارٹن کی وہی مجبوری تھی۔ وہ معمول سے ہٹی ہر بات اور بینک کے امور سے متعلق ہر شکایت کا نوٹس لینے پر مجبور تھا، چاہے یہ شکایت کسی نامعلوم شخص نے کی ہو۔ مسز رینالڈ نے لفافہ کھولا اور رقعہ نکالا۔ مارٹن کا کہنا ٹھیک تھا۔ یہ رقعہ اسی ٹائپ رائٹر سے ٹائپ کیا گیا تھا۔ تحریر تقریباً پہلے جیسی تھی۔

''جنابِ صدر نیو انگلری بینک!

مجھے افسوس ہے میرے پچھلے خط پر کوئی توجہ نہیں دی گئی اور بینک نے معمول کا انسپکشن کر کے سمجھ لیا کہ سب ٹھیک ہے۔ آپ کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ چارلس کتنا شاطر اور مکار شخص ہے۔ یہ حقیقت ہے، وہ ہم کھاتے داروں کی رقم ہڑپ کر چکا ہے۔ لیکن دوسری طرف وہ نہایت چالاکی سے آڈٹ کرنے والوں کو بھی مطمئن کر رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انسپکٹروں کی ایک پوری ٹیم بھیجی جائے جو پوری طرح چھان بین کرے اور پتا چلائے کہ چارلس گریم نے کسانوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی جمع پونجی کا کیا کیا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بینک میں اب کوئی رقم نہیں ہے اور وہاں جو کسان اپنی رقم نکلوانے جاتا ہے، اسے یہی بتایا جاتا ہے کہ بینک دِوالیا ہو چکا ہے۔

فقط کھاتے دار۔''

مسز رینالڈ نے رقعہ واپس لفافے میں رکھ دیا اور سوالیہ نظروں سے مارٹن کی طرف دیکھا۔ ''اب آپ کیا کریں گے؟''

مارٹن نے گہری سانس لی اور کسی قدر بے بسی سے بولا۔ ''بہت مشکل مرحلہ ہے۔ مجھے یقین ہے جورڈن نے اپنا کام بہترین طریقے سے کیا ہے اور اس نے پوری باریک بینی سے سرے برانچ کے کھاتوں کی جانچ پڑتال کی ہوگی۔ وہاں کوئی دھوکا یا خورد برد کا معاملہ نہیں ہے۔ مگر مجھے اس رقعے پر ایکشن لینا ہوگا۔''

''اس بار بھی آپ جورڈن کو بھیجیں گے؟''

''نہیں، اس بار میں مختلف انسپکٹرز کو بھیجوں گا اور اسے بھی معمول کی چھان بین قرار دیا جائے گا۔''

''یہ شخص... چارلس گریم اتنا بے وقوف نہیں ہے سر۔ وہ سمجھ جائے گا کہ برانچ پر کسی قسم کا شک کیا جارہا ہے اور اسی لیے بار بار چھان بین کی جارہی ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' مارٹن نے سر ہلایا۔ ''لیکن یہ کام کرنا میری مجبوری اور ذمے داری ہے۔ کم سے کم ایک بار مجھے برانچ کی مکمل چھان بین کرانی ہوگی۔ اس کے بعد اگر معاملات درست نکلے تو میں یقیناً اس بے نام شخص کا اگلا خط ردی میں پھینک دوں گا۔''

مسز رینالڈ جانتی تھی کہ بینکوں میں ایسے کام بحالتِ مجبوری ہوتے ہیں۔ وہ جس شخص کو برسوں سے ایمان دار سمجھتے آرہے ہوں، ذرا سی بات پر اس کے خلاف چھان بین شروع ہو جاتی ہے۔ اسے چارلس گریم سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس بار وہ اپنی بے عزتی کو بہت زیادہ محسوس کرے گا۔ مارٹن کے احساسات بھی اس سے الگ نہیں تھے۔ وہ ایک بینک کا صدر تھا اور اس منصب کے لوگ عام طور سے اپنے ماتحتوں کی عزتِ نفس کی پروا کم ہی کرتے ہیں۔ مگر مارٹن ان لوگوں سے مختلف تھا، اسے اپنے ماتحتوں کا خیال رہتا تھا۔

مارٹن نے اس بار سرے برانچ کا حساب کتاب چیک کرنے کے لیے بینک کے دو تیز طرار اور اپنا کام مکمل طریقے سے کرنے والے آڈٹ انسپکٹرز کا انتخاب کیا۔ جارج کرمیل اور ہنری فالکن کو بھیجنے سے پہلے مارٹن نے خاص طور سے ملاقات کے لیے بلایا۔ انہیں برانچ انسپکشن کے پس منظر سے آگاہ کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنا کام ہر ممکن نرمی اور شائستگی سے کریں۔ وہ کسی موقع پر عارضی منیجر چارلس گریم یا اس کے عملے کو شک کا موقع نہ دیں کہ وہ بینک میں کسی ممکنہ خورد برد کی چھان بین کر رہے ہیں۔ جارج اور ہنری نے مارٹن کو یقین دلایا کہ وہ اس کی ہدایات کا پوری طرح خیال رکھیں گے لیکن ساتھ ہی وہ حساب کی باریک بینی سے چھان بین بھی کریں گے۔

☆☆☆

جارج کرمیل اور ہنری فالکن سرے برانچ کی عمارت میں داخل ہوئے تو وہاں پر معمول کے مطابق کام جاری تھا۔ ایک طویل ہال میں دونوں طرف لگی میزوں پر عملہ اپنا کام کر رہا تھا۔ انتظار گاہ میں چند صارفین اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ یقیناً رقم نکلوانے یا جمع کرانے آئے تھے۔ برانچ کا پُرسکون ماحول، عملے اور صارفین کے چہروں سے جھلکتا اعتماد بتا رہا تھا کہ وہاں کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ جہاں خورد برد ہو وہاں اطمینان نہیں ہوتا۔ یہ بات ان سے زیادہ کون جانتا تھا۔ ان کا کام یہی تھا۔ کسی ایسی برانچ میں داخل ہوتے ہی جہاں خورد برد ہوا ہو، ان کو اندازہ ہو جاتا تھا۔ عملہ انہیں دیکھتے ہی خوف زدہ ہو جاتا تھا۔

وہ دونوں برانچ منیجر کے کمرے کی طرف بڑھے، تب بھی عملے نے انہیں توجہ سے نہیں دیکھا۔ البتہ جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو چارلس گریم انہیں دیکھتے ہی سمجھ گیا۔ وہ اس سے پہلے بھی اس برانچ میں آچکے تھے۔ چارلس کے چہرے کا رنگ بدلا لیکن یہ کسی خوف کی وجہ سے نہیں تھا۔ اسے یقیناً غصہ آرہا تھا اور وہ اس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جارج اور ہنری نے اپنا تعارف کرایا تو اس کا انداز سرد ہو گیا مگر اس نے شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''ہمیں مرکزی برانچ سے اس برانچ کے حسابات کی جانچ کے لیے بھیجا گیا ہے۔'' جارج نے آمد کی وجہ بیان کی۔

''لیکن ابھی کچھ مہینے پہلے سالانہ انسپکشن ہو چکا ہے۔ اس کے بعد ایک آڈٹ انسپکٹر نے دو مہینے بعد دوبارہ چھان بین کی تھی۔ پھر مرکزی برانچ کو تیسری بار چھان بین کی کیا ضرورت پیش آگئی ہے؟''

''یہ تو ہم نہیں بتا سکتے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ معمول کا ایک انسپکشن ہے۔''

''معمول کا۔'' چارلس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''سال

میں تیسری بار معمول کا انسپکشن... آخر یہاں ایسا کون سا مسئلہ ہے؟ تمام کام معمول کے مطابق جاری ہیں۔ کسی صارف کو ہم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ بینک کے کھاتوں اور کیش میں ایک پینی کا فرق بھی نہیں ہے۔''

''ممکن ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔'' اس بار ہنری نے کہا۔ ''لیکن یہ ہماری ذمے داری ہے اور ہمیں مرکزی برانچ سے اسی لیے بھیجا گیا ہے۔ امید ہے مسٹر گریم... آپ ہم سے مکمل تعاون کریں گے۔''

جارج اور ہنری صبح کے وقت آئے تھے کیونکہ انہیں اپنا کام مکمل کر کے شام کی ٹرین سے واپس لندن جانا تھا اور اگلی صبح اپنی رپورٹ مارٹن کو پیش کرنی تھی۔ چارلس سمجھتا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''ظاہر ہے، میں آپ سے مکمل تعاون کروں گا۔''

کیونکہ وقت نہیں تھا اس لیے چارلس کی ہدایت پر ایڈمن آفیسر نے بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر برانچ کو صارفین کے لیے بند کرنے کا اعلان کیا اور صارفین سے استدعا کی کہ وہ اپنے کام کے سلسلے میں کل تشریف لائیں۔ اس اعلان پر صارفین نے بُرا منایا لیکن کیش کاؤنٹر بند کیا جا چکا تھا اس لیے وہ جانے پر مجبور ہو گئے۔ بینک کے غیر ضروری عملے کو چھٹی دے دی گئی اور صرف ان لوگوں کو روکا گیا جن سے کام پڑ سکتا تھا۔ جارج اور ہنری فوری طور پر اپنے کام میں لگ گئے۔ انہوں نے اصلی کھاتے اور ان کی نقول اپنے قبضے میں کر لیں اور کیش سارا کاؤنٹر پر جمع کر لیا۔ اس کے بعد وہ آنے والے چھ گھنٹے تک ایک ایک چیز کو دیکھتے رہے۔ انہوں نے تمام کھاتوں کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ تمام اندراجات دیکھے اور پھر کیش سے ان سب کو ملا کر دیکھا۔

چھ گھنٹے بعد یہ نتیجہ سامنے آیا کہ کسی ایک کھاتے میں بھی کوئی معمولی سی گڑبڑ نہیں تھی۔ کیش مکمل تھا اور خاص بات یہ تھی کہ تقریباً تیس فیصد صارفین باقاعدگی سے اپنا کھاتہ استعمال کرتے تھے۔ وہ رقم نکلواتے اور جمع کراتے تھے اور پچھلے چار مہینے میں یہ کام باقاعدگی سے ہوا تھا۔ شک کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ انہوں نے سرکاری رپورٹ تیار کی اور اس کی ایک نقل چارلس گریم کو دی اور اصل پر اس کے دستخط لے لیے۔ اگرچہ انسپکشن ایک بار پھر کامیاب رہا تھا اور اس کے خلاف کوئی ذرا سی بات بھی سامنے نہیں آئی تھی لیکن اس کے باوجود چارلس کے چہرے پر اپنی توہین کا غصہ صاف نظر آرہا تھا۔ دونوں انسپکٹرز اس کے سامنے شرمندہ تھے اور انہوں نے واپسی کے لیے روانہ ہونے سے پہلے اس سے ڈھکے چھپے الفاظ میں معذرت بھی کی تھی لیکن چارلس کا رویہ بتا رہا تھا کہ اس نے معذرت قبول نہیں کی تھی۔

جارج اور ہنری شام والی ٹرین سے لندن کے لیے روانہ ہو گئے۔ اگلی صبح انہوں نے بینک کے صدر مارٹن کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کی۔ مارٹن نے ان کی موجودگی میں رپورٹ کا معائنہ کیا اور گہری سانس لے کر جارج سے پوچھا۔ ''مسٹر چارلس گریم کا ردِ عمل کیا تھا؟''

''بہت ہی خراب۔'' جارج نے کہا اور پھر جلدی سے وضاحت کی۔ ''ویسے اس نے ہمارے ساتھ مکمل تعاون کیا۔ ہر چیز معائنے کے لیے پیش کر دی اور ہمارے تمام سوالوں کے جوابات بھی تسلی بخش دیے۔ لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ اس سے یہ تیسرا انسپکشن ہضم نہیں ہو رہا ہے اور اس نے درخواست کی ہے کہ اگر مرکزی برانچ کو سرے برانچ سے کوئی شکایت ہے تو اسے واضح کیا جائے اور یہ بھی بتایا جائے کہ شکایت کسے ہے؟''

مارٹن نے ان دونوں انسپکٹرز کا شکریہ ادا کر کے انہیں رخصت کیا اور مسز رینالڈ کو طلب کر لیا۔ وہ خود بھی بے تابی سے انسپکٹرز کے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ مارٹن کے چہرے پر اطمینان تو تھا لیکن ساتھ ہی کسی قدر فکر بھی تھی۔ مسز رینالڈ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ''رپورٹ جورڈن کی رپورٹ سے مختلف نہیں ہے۔ برانچ کے تمام معاملات بالکل کلیئر ہیں۔''

''شکر ہے۔'' مسز رینالڈ نے سکون کا سانس لیا۔ ''ورنہ میں ڈر رہی تھی کہ کوئی گڑبڑ نہ نکل آئے۔ لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کچھ فکر مند ہیں؟''

مارٹن شیلڈ نے اپنی سیکریٹری کی بات پر غور کیا اور بولا۔ ''گڑبڑ برانچ میں تو نہیں ہے لیکن چارلس گریم کے رویّے میں ہے... اور اس نے اس بار جانچ پڑتال کا بہت بُرا منایا ہے۔''

''فطری بات ہے سر۔'' مسز رینالڈ نے چارلس کی طرف داری کی۔ ''اگر میرے ساتھ ایسا سلوک ہو تو میں بھی بہت بُرا مناؤں گی۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ کوئی شرارتی اور بدفطرت شخص ہے جو بینک والوں کو اس طرح پریشان کر رہا ہے۔'' مارٹن نے دونوں خطوط نکالے۔

مسز رینالڈ نے تجویز پیش کی۔ ''ان کو اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سپرد نہ کر دیا جائے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں کیونکہ اس میں کسی قسم کا جرم شامل نہیں ہے۔ البتہ میں بینک کے ریکارڈ میں یہ دونوں خطوط مع دونوں آڈٹ رپورٹس کے شامل کررہا ہوں تاکہ ایک مثال سامنے رہے کہ اس قسم کی صورتِ حال میں کیا کرنا ہے۔"

مسز رینالڈ کو بدستور چارلس کی فکر کھائے جارہی تھی۔ "مسٹر چارلس کی جو توہین ہوئی ہے، اس کا ازالہ کس طرح سے ہوگا؟"

"پہلے میں نے سوچا تھا کہ ایک معذرتی خط برانچ روانہ کردیا جائے لیکن پھر میں نے سوچا کہ اس معاملے کو دبا دینا ہی بہتر ہوگا۔ کچھ عرصے بعد مسٹر گریم بھی اس توہین کو بھول جائے گا۔"

مسز رینالڈ کے خیال میں یہ چارلس کے ساتھ زیادتی تھی اور وہ ایک معذرتی خط کا مستحق ضرور تھا۔ مگر باس مارٹن تھا اور وہی فیصلہ کرنے کا مجاز تھا۔ مارٹن نے مسز رینالڈ کو دونوں خطوط اور آڈٹ رپورٹس حوالے کیں۔ "ان کو ایک مکمل کیس کی صورت میں تحریر کرکے بینک کے سینٹرل ریکارڈ میں شامل کردیا جائے۔"

"میں ابھی یہ کام کرتی ہوں۔" مسز رینالڈ نے بے دلی سے کہا اور کمرے سے چلی گئی۔ اس نے کیس فائل بنائی اور یہ ساری چیزیں اس میں لگا کر سینٹرل ریکارڈ آفس میں بھیج دیں۔ اگلے دن وہ اپنے معمول کے کاموں میں مصروف تھی کہ ایک نفیس اور شریف نظر آنے والا آدمی کمرے میں دستک دے کر داخل ہوا۔ مسز رینالڈ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے اپنا ہیٹ اتار کر شائستگی سے کہا۔

"میرا نام چارلس گریم ہے۔ میں بینک کی سرے برانچ کا عارضی منیجر ہوں اور بینک کے صدر مسٹر مارٹن شیلڈ سے ملنے آیا ہوں۔"

مسز رینالڈ اس کا نام سنتے ہی کھڑی ہوگئی، اس نے بے ساختہ اپنا تعارف کرادیا۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی میز پر موجود تختی پر اس کا نام اور عہدہ لکھا ہوا تھا۔ "مجھے مسز رینالڈ کہتے ہیں۔ مسٹر گریم! تم سے مل کر خوشی ہوئی۔"

چارلس نے سر ہلایا لیکن اس کے تاثرات خوشی والے نہیں تھے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "کیا میں پہلے سے اپائنٹ منٹ کے بغیر مسٹر مارٹن سے مل سکتا ہوں؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، یہ ملاقات نہایت ضروری ہے۔"

"کیوں نہیں مسٹر گریم... تم اس ملاقات کے مستحق ہو کیونکہ تم نے ایک اہم برانچ کو بہت خوبی سے سنبھال رکھا ہے۔ ایک منٹ... میں باس کو اطلاع کردوں۔"

مسز رینالڈ نے کہا اور نہایت پھرتی سے مارٹن کے کمرے میں داخل ہوئی۔ مارے جوش کے اس کا سانس تیز ہو رہا تھا اور چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ مارٹن نے اسے غور سے دیکھا۔

"کیا ہوا ہے مسز رینالڈ... کیا کسی نے تمہیں پروپوز کردیا ہے؟"

مارٹن جب اچھے موڈ میں ہوتا تو اپنی سیکریٹری سے ہلکا پھلکا مذاق کرلیتا تھا۔ مسز رینالڈ اس کے مذاق سے لطف اندوز ہوتی تھی لیکن اس وقت اس نے توجہ نہیں دی اور مارٹن کے کان میں تقریباً گھس کر کہا۔ "باہر سرے برانچ کا عارضی منیجر چارلس گریم آیا ہے اور وہ آپ سے ملاقات کا متمنی ہے۔"

خلافِ توقع مارٹن کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "چارلس گریم...... وہ کیوں آیا ہے؟"

"یہ تو وہی بتا سکتا ہے۔" اپنے باس کا ردِعمل دیکھ کر مسز رینالڈ کا جوش وخروش کچھ دھیما پڑ گیا۔

مارٹن نے کہا۔ "وہ بغیر اپائنٹ منٹ کے آیا ہے۔"

"لیکن وہ آپ سے ملاقات کا مستحق ہے سر۔" مسز رینالڈ نے اصرار کیا۔ مارٹن کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے، اسے اندر بھیج دو۔"

مسز رینالڈ کو چارلس سے کچھ زیادہ ہی ہمدردی ہورہی تھی۔ اس نے تجویز پیش کی۔ "اگر آپ خود دروازے پر اس کا استقبال کریں تو میرا خیال ہے اس کا اچھا اثر پڑے گا۔"

مارٹن نے مجبوراً اس سے اتفاق کیا کیونکہ اس نے آج تک کسی برانچ منیجر کا اپنے کمرے کے دروازے پر استقبال نہیں کیا تھا اور چارلس گریم تو عارضی برانچ منیجر تھا۔ وہ اٹھ کر دروازے تک آیا اور اسے کھول کر نہایت گرم جوشی سے چارلس سے ملا۔ اس کا خیال تھا کہ چارلس اس کے رویّے کے جواب میں ویسی ہی گرم جوشی دکھائے گا لیکن اس کا رویّہ سپاٹ رہا۔ اس نے درخواست کی۔ "سر! میں آپ سے ایک اہم معاملے کے سلسلے میں ملنے آیا ہوں اور میں آپ کا چند منٹ سے زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

"وقت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" مارٹن نے فراخ دلی سے کہا اور مسز رینالڈ سے کہا۔ "ہمارے معزز مہمان کے لیے بہترین کافی لے کر آؤ۔"

چارلس، مارٹن کے ساتھ کمرے میں آیا اور اس کے

اشارے پر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ مضطرب تھا اور اس نے بیٹھتے ہی کہنا شروع کردیا۔ "جنابِ صدر! میں سرے برانچ میں گزشتہ بیس سال سے کیشیر کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ میں اسی قصبے میں پیدا ہوا اور یہیں مقیم ہوں۔ علاقے میں میری عزت ہے اور لوگ مجھے شریف آدمی خیال کرتے ہیں۔"

"یقیناً لوگ ٹھیک خیال کرتے ہیں مسٹر گریم۔"

"لیکن گزشتہ چھ ماہ میں میری اس ساکھ پر بہت بُرا اثر پڑا ہے۔ آپ جانتے ہیں، یہ ایک چھوٹا سا دیہاتی علاقہ ہے اور یہاں کوئی بات کسی دوسرے سے چھپی نہیں رہ سکتی۔ برانچ کی سالانہ انسپکشن ہوئی تو سب کو اس کا پتا چل گیا لیکن یہ معمول کی بات تھی۔ لیکن اس کے دو مہینے بعد پھر مرکزی برانچ کی جانب سے ایک آڈٹ انسپکٹر بھیجا گیا اور اس نے بینک کی تمام بکس کی دوبارہ سے چھان بین کی۔ اسے کوئی گڑبڑ نہیں ملی لیکن لوگ چونک گئے۔"

"میں واقف ہوں۔" مارٹن نے افسوس سے کہا۔ "میں نے ہی دونوں بار انسپکٹرز کو بھیجا تھا۔"

"پہلی چھان بین سے اتنا اثر نہیں ہوا کیونکہ کبھی کبھار کوئی بے قاعدگی سامنے آتی ہے تو مرکزی برانچ، انسپکٹر بھیجتی ہے۔ بہرحال لوگوں نے دیکھا کہ میں بدستور اپنے عہدے پر کام کررہا ہوں تو وہ مطمئن ہوگئے اور میری عزت پر جو ممکنہ دھبا آیا تھا، وہ صاف ہوگیا۔ لیکن جناب! اس بار کی چھان بین سے میری عزت کو ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔ حالانکہ انسپکٹرز کو کچھ نہیں ملا اور برانچ کے تمام معاملات صاف ہیں۔ اس کے باوجود لوگ مجھے یوں دیکھتے ہیں جیسے میں غبن کا مرتکب ہوا ہوں۔ گزشتہ روز بینک کھلتے ہی تین صارفین اپنا کھاتہ بند کرانے اور اپنی رقم واپس لینے کے لیے بینک میں موجود تھے۔"

"مجھے افسوس ہے۔" مارٹن نے کہا۔

"میں جانتا ہوں سر! آپ نے کسی وجہ سے ہی انسپکٹرز کو بھیجا ہوگا۔ یہ آپ کی ذمے داری ہے لیکن اب میں مزید بینک کے لیے کام نہیں کرسکتا۔" چارلس نے ایک لفافہ مارٹن کی طرف بڑھایا۔ یہ بینک کے مخصوص مونوگرام والا لفافہ تھا۔ "مہربانی فرما کر میرا استعفا قبول کریں۔"

مارٹن اضطراری طور پر اپنی نشست سے کھڑا ہوگیا۔ "نہیں... نہیں، مسٹر گریم! پلیز، آپ اپنا استعفا واپس لیں۔ بینک آپ جیسے پرانے ملازم سے کسی صورت دست بردار نہیں ہوسکتا۔"

"مجھے خود بھی اس بینک سے ایسا لگاؤ ہے جیسے کسی شخص کو اپنے خاندان سے ہوتا ہے۔" چارلس نے مغموم لہجے میں کہا۔ "لیکن جناب! میرے نزدیک عزتِ نفس کی بہت زیادہ قیمت ہے۔ میں اس کے بدلے بینک میں کام نہیں کرسکتا۔ لوگوں کی نظروں میں اپنی عزت بحال کرنے کا میرے نزدیک ایک ہی طریقہ ہے کہ میں ملازمت سے استعفا دے دوں۔"

"ایک منٹ مسٹر گریم! آپ عجلت سے کام لے رہے ہیں۔"

"نہیں جناب! میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور میں اپنے ارادے پر قائم ہوں۔ کیونکہ آپ نے مجھے سرے برانچ کا عارضی منیجر بنایا تھا اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ بذریعہ ڈاک استعفا بھیجنے کے بجائے خود آپ کے پاس آکر پیش کروں۔"

مارٹن کا ذہن تیزی سے اس معاملے پر سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "مسٹر گریم! آپ کے خیال میں مرکزی برانچ کی طرف سے دوبارا انسپکٹرز بھیجنے کی وجہ سے قصبے میں آپ کی ساکھ متاثر ہوئی ہے؟"

"ایسا ہی ہے جناب۔"

"اگر اس صورت میں بینک آپ کی عزت بحال کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھائے تو لوگ یقیناً آپ کی عزت کرنے پر مجبور ہوجائیں گے؟"

"میں سمجھا نہیں جناب!"

"دیکھیں مسٹر گریم! آپ سرے برانچ کے عارضی منیجر ہیں اور اگر بینک انتظامیہ کو آپ پر کوئی شک ہو تو وہ یقیناً آپ کو مستقل منیجر نہیں بنائے گی۔"

"درست ہے جناب!"

"تب اگر میں آپ کو سرے برانچ کا مستقل منیجر مقرر کردوں تو لوگوں میں یہ بات خود بہ خود واضح ہوجائے گی کہ بینک کو آپ پر کسی قسم کا شبہ نہیں ہے بلکہ آپ کی اہلیت پر اعتماد ہے... اسی لیے آپ کو مستقل منیجر مقرر کیا جارہا ہے۔"

چارلس ہچکچایا۔ "کیا واقعی اس سے لوگوں میں میری ساکھ اور عزت بحال ہوجائے گی؟"

"کیوں نہیں مسٹر گریم! بلکہ وہ آپ کی پہلے سے زیادہ عزت کرنے لگیں گے۔"

"لیکن میرے پاس مطلوبہ تعلیمی قابلیت نہیں ہے۔" چارلس نے ایک نکتہ اور اٹھایا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ آپ گزشتہ ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سال سے منیجر کی پوسٹ پر نہایت خوبی سے کام کر رہے ہیں اور اس دوران میں برانچ کے کاروبار نے ترقی کی ہے۔ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ آپ میں منیجر شپ کی صلاحیت ہے۔ جہاں تک بینک ڈائریکٹرز کی بات ہے تو اس کے لیے میں مکمل ذمے دار ہوں۔ ان کی طرف سے آپ پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

چارلس نے سر ہلایا۔ "اس صورت میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

مارٹن خوش ہوگیا۔ "میں آپ کا شکر گزار ہوں مسٹر گریم کہ آپ نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نقصان میں نہیں رہیں گے۔ میں آپ کو سرے برانچ کا مستقل منیجر مقرر کرتا ہوں اور آپ کو ایک سال کی مکمل منیجر کی تنخواہ دی جائے گی۔ یہ آپ کی موجودہ تنخواہ سے کم سے کم چالیس فیصد زیادہ ہوگی۔"

پہلی بار چارلس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "میں آپ کا شکر گزار ہوں جنابِ صدر! آپ نے میرے استعفے کو ایک نہایت معقول اور بہترین حل میں بدل دیا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ بینک کی خدمت کرتا رہوں گا۔"

"مجھے بھی یقین ہے۔" مارٹن نے گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس دوران میں مسز رینالڈ کافی لے آئی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ مارٹن معاملہ سلجھانے میں کامیاب رہا ہے۔ اس نے دونوں کو کافی سرو کی۔ مارٹن نے اس سے کہا۔ "مسز رینالڈ! آپ فوری طور پر مسٹر چارلس گریم کا سرے برانچ کے مستقل منیجر کا اپائنٹ منٹ لیٹر ٹائپ کر کے لے آئیں۔"

یہ سن کر مسز رینالڈ بھی خوش ہوگئی، اس نے چہک کر کہا۔ "میں ابھی لائی سر۔"

اس کے جانے کے بعد وہ دونوں کافی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مارٹن نے اپنا کپ اٹھا کر کہا۔ "آپ کی نئی پوسٹ کے نام... مسٹر گریم!"

☆☆☆

چارلس قصبے کے ریل اسٹیشن پر اترا۔ وہاں سے اس کے گھر تک کا فاصلہ کچھ زیادہ تھا لیکن وہ آرام سے پہنچ سکتا تھا۔ راستے میں لوگوں سے ہیلو ہائے کرتے ہوئے وہ پندرہ منٹ بعد گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ سارا بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ لپک کر آئی اور اس کا چرمی بیگ تھام لیا۔ "کیا ہوا، کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟"

چارلس تھکا ہوا تھا کیونکہ وہ صبح پہلی ٹرین سے لندن روانہ ہوا تھا اور آخری ٹرین سے اس کی واپسی ہوئی تھی۔ کوئی سات گھنٹے سفر میں گزرے تھے اس لیے تھکاوٹ لازمی تھی لیکن ساتھ ہی اس کے چہرے پر کامیابی کی مسکراہٹ بھی تھی۔ چارلس نے اپنا اوور کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔ "کوئی مسئلہ نہیں ہوا، اس نے حسبِ توقع میرا استعفا نامنظور کر دیا۔"

سارا نے سکون کا سانس لیا۔ "شکر ہے خدا کا... اور منیجر والے معاملے کا کیا بنا؟"

چارلس کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ "وہ بھی ہماری توقع کے عین مطابق حل ہوگیا۔" چارلس نے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکال کر ہوا میں لہرایا۔ "اس میں سرے برانچ کے مستقل منیجر کی حیثیت سے میرا تقرر نامہ موجود ہے۔"

اس بار سارا خوشی سے بے قابو ہوگئی۔ اس نے تیزی سے لفافہ چارلس کے ہاتھ سے اچک لیا اور اسے کھول کر اندر سے تقرر نامہ نکالا۔ اس نے کاغذ چوم لیا۔ "یقیناً تمہاری تنخواہ بھی بڑھی ہوگی؟"

"تقریباً چالیس فیصد اور گزشتہ ایک سال جو میں نے عارضی منیجر کی جاب کی ہے، اسے بھی مستقل شمار کرتے ہوئے مجھے ایک سال کی جو اضافی تنخواہ بنتی ہے، وہ بھی دی جائے گی۔ چیک ایک ہفتے میں بن کر آجائے گا۔"

سارا کی خوشی بڑھتی جا رہی تھی۔ "اب میں اپنے گھر کے لیے نئے پردے لوں گی اور صوفے بھی تبدیل کرنے والے ہو رہے ہیں۔"

چارلس نے محبت سے اپنی بیوی کو دیکھا۔ "یقیناً ڈیئر... اور اس سے ہم اپنے مستقبل کے لیے کچھ نہ کچھ بچا بھی سکتے ہیں۔ یہ بتاؤ کھانے میں کیا ہے؟"

"آج میں نے تمہاری پسندیدہ ڈش اسٹو بنائی ہے۔" سارا نے کچن کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ چارلس آج کی ڈاک دیکھنے لگا۔ ایک خط سارا کی آنٹی کا بھی آیا تھا۔ وہ ناٹنگھم میں رہتی تھیں۔ چارلس نے بلند آواز سے سارا کو اس خط کے بارے میں بتایا تو وہ کچن سے بولی۔ "مجھے اس کا جواب دینا ہوگا لیکن ہمارے ٹائپ رائٹر کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ خاص طور سے "ایس" گھس گیا ہے۔ اس کا نچلا دائرہ تو بنتا ہی نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کسی نے الٹا سوالیہ نشان بنا دیا ہے۔"

"تم فکر مت کرو ڈیئر... چیک آتے ہی نیا ٹائپ رائٹر بھی آجائے گا۔" چارلس نے اوپر جاتے ہوئے جواب دیا۔

فریبی

تنویر ریاض

وفا کے راستے پر پہلا قدم رکھنا ہی مشکل ہوتا ہے ...اس کے بعد پیچ دار راستے اور کٹھنائیاں آسان تر ہوتی چلی جاتی ہیں... لیکن کچھ لوگوں کی فطرت میں مشکل پسندی اور جفا پسندی کے عناصر اس حد تک بڑھ جاتے ہیں...کہ وہ جہاں سے بھی گزرتے ہیں ...اپنے پیچھے ایک داستان چھوڑتے چلے جاتے ہیں...

ویب کو پولیس اسٹیشن پہنچے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اسے ٹیلی فون پر ایک لاش کی موجودگی کی اطلاع ملی۔ اس وقت دن کے بارہ بج رہے تھے۔ لاش ایک شراب خانے کی دیوار کے عقب میں پڑی ہوئی تھی۔ یہ شراب خانہ جھیل کے کنارے واقع تھا جہاں ملاحوں اور ساحل پر کام کرنے والوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ اس علاقے میں منشیات کا کاروبار بھی خوب ہوتا تھا اور چھوٹے موٹے جھگڑوں میں چاقو بھی چل جاتے تھے لیکن مقتول کو چاقو سے نہیں بلکہ گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ ویب جائے وقوعہ پر پہنچا تو پولیس نے پہلے ہی اس جگہ کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ ویب ان کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا لاش تک پہنچا۔ مقتول ایک دراز قد، درمیانی عمر کا شخص تھا۔ اس نے ایک قیمتی کوٹ پہنا ہوا تھا اور پیروں میں اطالوی جوتے تھے جن میں سے بائیں جوتے کی ایڑی پر

اندھیروں سے نکل کر اجالوں کا رخ کرنے والوں کی خواہشِ ناتمام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھوڑی سی مٹی لگی ہوئی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ زمین پر پھیلا ہوا تھا جس میں سونے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ اوندھے منہ پڑے ہونے کی وجہ سے اس کے چہرے کے نقوش واضح نہیں تھے۔ سورج گہرے بادلوں میں چھپا ہوا تھا جس کی وجہ سے روشنی بہت کم تھی۔ ویب نے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے اور جھک کر مقتول کی پشت پر ہاتھ رکھا۔ پھر اس نے قریب کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کیا کوئی اسے جانتا ہے؟"

جیسے ہی اس نے جھک کر مقتول کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو احساس ہوا کہ اسے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ اس شخص کو جانتا تھا۔ وہ ٹام جانسن تھا جو تینتیس برس بعد گھر واپس آیا تھا۔

☆☆☆

ٹام جانسن سے اس کی پہلی ملاقات اسکول کے زمانے میں ہوئی تھی۔ وہ کلاس کے سب لڑکوں میں اسمارٹ تھا۔ سیاہ بال، مسکراتا چہرہ، چوڑے کندھے اور تیکھے نقوش صرف لڑکیاں ہی نہیں بلکہ لڑکے بھی اسے پسند کرتے تھے۔ ویب بھی اس کی کرشماتی شخصیت سے متاثر ہو گیا اور دونوں میں گہری دوستی ہو گئی۔ لیکن بہت جلد ٹام کی شخصیت کا سحر ٹوٹ گیا اور ساتھ ہی اس کے مستقبل پر بھی تاریک سائے لہرانے لگے۔ جینا ہیسٹنگ سے اس کے تعلقات استوار ہو گئے جس کے نتیجے میں وہ حاملہ ہو گئی۔ امتحانات ختم ہونے کے دو دن بعد انہوں نے شادی کر لی تھی۔ اس کے بعد ویب سے اس کا ملنا جلنا بہت کم ہو گیا تھا۔ ٹام نے تعلیم ترک کر کے ایک بجلی کمپنی میں ملازمت کر لی تھی۔ اب وہ کبھی کبھار بازار سے سودا خریدتے یا کمپنی کے ٹرک میں آتے جاتے نظر آتا تھا۔ ویب نے کالج میں داخلہ لے لیا اور دونوں کے راستے جدا ہو گئے۔

پانچ سال بعد اس نے ٹام کو ایک مقامی بینڈ کے ساتھ گٹار بجاتے دیکھا..... ویب کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور وہ پولیس اکیڈمی میں جانے والا تھا۔ ٹام اسٹیج کے وسط میں کھڑا تھا اور لڑکیوں نے اسے اس طرح گھیر رکھا تھا جیسے وہ ایلوس پریسلے ہو لیکن ان میں جینا کہیں نظر نہیں آئی۔ ویب سوچ رہا تھا کہ کہیں ٹام نے جینا کو طلاق تو نہیں دے دی..... لیکن طلاق اس کے بہت بعد میں ہوئی جب ٹام ایک اور اسکینڈل میں ملوث ہو گیا اور اس کے ریکارڈ میں ایک اور غلطی کا اضافہ ہوا۔ پھر اس نے فوج میں ملازمت اختیار کر لی اور جرمنی چلا گیا۔ اس نے دوبارہ شادی کر لی اور کامیاب رہا۔ اب وہ باقاعدگی سے اپنے والدین کو پیسے بھیج رہا تھا۔ ہر سال وہ گھر آنے کا وعدہ کرتا لیکن پھر کوئی مجبوری آڑے آجاتی۔ وہ کبھی گھر نہ آسکا۔ اس کے دادا اور دادی انتقال کر گئے۔ بہن اور بیٹے کی شادی ہو گئی لیکن وہ کسی موقع پر موجود نہیں تھا۔ ایک عرصے بعد اس کی واپسی ہوئی تو موت اس کے استقبال کے لیے پہلے سے موجود تھی۔

☆☆☆

"میں تمہیں اس کیس سے علیحدہ کر رہا ہوں۔" چیف برنارڈ نے میز پر رکھی فائل پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" ویب نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"اس لیے کہ تم ہائی اسکول میں اس کے ساتھ پڑھ چکے ہو اور تمہاری بہن فلورنس....."

"صرف میں ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگ اس کے ساتھ ہائی اسکول میں پڑھ چکے ہیں۔" ویب اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس معاملے میں اس کی بہن کا ذکر بھی آئے۔ "اس قصبے کا ہر شخص کسی نہ کسی انداز میں ٹام سے جڑا ہوا ہے۔ تم خود اس کے پڑوس میں چھ سال تک رہ چکے ہو۔"

"میں جانتا ہوں۔" برنارڈ مطمئن انداز میں بولا۔ "اسی لیے میں یہ کیس ڈیرسی کو دینا چاہتا ہوں۔"

"ڈیرسی؟" ویب حیران ہوتے ہوئے بولا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس تجویز کی مخالفت کس انداز میں کرے کیونکہ اسی نے ڈیرسی کی تقرری کی سب سے زیادہ حمایت کی تھی جبکہ دوسرے لوگ نہیں چاہتے تھے کہ قصبے سے باہر کی کوئی لیڈی پولیس آفیسر یہاں تعینات کی جائے..... جبکہ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ قابل اور تجربہ کار تھی۔

"وہ اس قصبے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" ویب نے کمزور سی آواز میں کہا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈیرسی کی تعیناتی کے وقت برنارڈ نے بھی یہی اعتراض اٹھایا تھا لیکن اس وقت ویب نے ڈیرسی کے پانچ سالہ تجربے کا حوالہ دے کر برنارڈ کو قائل کر لیا تھا۔

"وہ بہت کچھ جانتی ہے اور اپنی تحقیقات کا دائرہ وہاں تک بڑھا سکتی ہے جہاں ہم نہیں جا سکتے۔"

"میں بھی بہت آگے تک جا سکتا ہوں۔" ویب نے دعویٰ کیا۔

"چاہے بیچ میں فلورنس ہی کیوں نہ آجائے؟" برنارڈ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

ویب نے آنکھیں بند کر لیں۔ بہن کا چہرہ اس کے سامنے آگیا۔ وہ اس رات کو کیسے بھول سکتا تھا جب وہ آنسوؤں سے بھیگا چہرہ لیے مظلومیت کی تصویر بنی اس کے سامنے آئی تھی۔ تب سے ہی یہ تصویر اس کے ذہن کے

پردے پر نقش ہو گئی تھی۔

"ہاں۔" اس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

☆☆☆

اس کے باوجود برنارڈ نے اسے موقع نہیں دیا۔ وہ مایوسی کے عالم میں اس کے دفتر سے باہر آگیا۔ یہ اس کے لیے دوسرا بڑا جذباتی صدمہ تھا۔ اس سے پہلے ٹام جانسن کی موت کا دکھ برداشت کیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اس کیس کی تحقیقات کرتا۔ شاید اس طرح گزرے ہوئے تینتیس برسوں کی اذیت کا کچھ ازالہ ہو جاتا۔

ڈیرسی اپنی میز کے پاس کھڑی ایک فائل کے مطالعے میں مصروف تھی۔ چالیس سال کی عمر میں بھی وہ اپنی عمر سے کم نظر آتی تھی۔ اس کے بال کانوں تک ترشے ہوئے تھے اور دور سے دیکھنے پر وہ لڑکا لگتی تھی۔

ویب سیدھا اس کے پاس چلا گیا اور بولا۔ "میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں، شکریہ۔" اس نے اپنے تمباکو زدہ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ وہ بے تحاشا سگریٹ پیتی تھی۔ شاید دن میں دو پیکٹ یا اس سے بھی زیادہ۔ "برنارڈ نے تمہیں اس کیس سے الگ کر دیا ہے۔"

"پھر بھی تمہیں ایک مقامی شخص کی ضرورت پڑے گی۔"

"میں کسی نہ کسی کو تلاش کر لوں گی۔"

"شاید تم جانسن کے ماضی کے بارے میں نہیں جانتیں۔"

ڈیرسی فائل بند کرتے ہوئے بولی۔ "میرے پاس اس کے بارے میں مکمل معلومات ہیں۔ وہ اپنی بیوی اور چار بچوں کو چھوڑ کر ایک دوسری لڑکی کے ساتھ جرمنی چلا گیا تھا اور اپنی پہلی بیوی کو طلاق دیے بغیر اس نے دوسری شادی کر لی جو میرے خیال میں غیر قانونی ہے۔"

"یہ معلومات سطحی نوعیت کی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ڈیرسی کے ہاتھ سے فائل لے لی لیکن یہ کسی اور کیس سے متعلق تھی۔ اس نے وہ فائل میز پر رکھ دی اور بولا۔ "اس شراب خانے میں ہمیشہ چاقو زنی کی وارداتیں ہی ہوتی ہیں۔"

"کیا ٹام جانسن کے بینڈ کی موجودگی کے دوران میں بھی کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش آیا؟"

"اس شراب خانے میں کبھی کسی بینڈ نے اپنے فن کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جب چاقو زنی کا یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت بینڈ کے کچھ ارکان وہاں شراب نوشی میں مشغول تھے جبکہ

> ایک صاحب کی بیوی کو سکتہ طاری ہو گیا۔ لوگ اسے مردہ سمجھ کر دفنانے کے لیے قبرستان لے جا رہے تھے۔ اچانک میت سڑک کے کنارے لگے بجلی کے ایک کھمبے سے ٹکرا گئی۔ وہ عورت فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لوگ اسے واپس گھر لے آئے لیکن چند دن کے بعد وہ پھر مر گئی۔ سبھی لوگ اسے دفنانے کے لیے جا رہے تھے اور کلمہ پڑھتے جا رہے تھے مگر اس کا شوہر بار بار کہتا جاتا تھا۔ "کھمبا بچا کر کھمبا بچا کر۔"

جانسن اور اس کی محبوبہ سنڈی واٹرز پہلے ہی ہوائی جہاز کے ذریعے مینا پولس جا چکے تھے۔"

"تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

"اسے تم مقامی معلومات کہہ سکتی ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "کیا اب بھی تمہارا یہی خیال ہے کہ تمہیں میری ضرورت نہیں؟"

ڈیرسی اسے غور سے دیکھنے لگی پھر بولی۔ "تم اس وقت کہاں تھے جب جانسن کو گولی ماری گئی؟"

"ابھی تک مجھے اس کی موت کا وقت معلوم نہیں ہوا۔"

"یہ واقعہ تقریباً ساڑھے دس بجے پیش آیا۔ اس میں تم چند منٹ آگے پیچھے کر سکتے ہو۔ ویسے ڈاکٹر کی رپورٹ آنے پر ہی صحیح وقت کا تعین ہو سکے گا۔"

ویب نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "اس وقت میں اپنی کار میں بیٹھا میوزک سن رہا تھا اور لنچ کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"تنہا؟"

"اس قصبے میں سراغ رسانوں کے ساتھ پارٹنر نہیں ہوتے۔"

وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ "کیا کوئی شخص جائے واردات سے تمہاری غیر موجودگی کی گواہی دے سکتا ہے؟"

"کیا اس کی ضرورت ہے؟" ایسا کہتے ہوئے اس کی آواز خود بخود اونچی ہو گئی۔

"شاید اس سے کچھ مدد مل سکے۔" وہ فائل اٹھاتے ہوئے بولی۔ "میں نے سنا ہے کہ جانسن نے تمہاری بہن کو پریشان کر رکھا تھا۔"

"تم نے غلط سنا ہے۔" ویب نے کہا۔ "اس نے میری بہن کو پریشان نہیں کیا بلکہ اس کی زندگی برباد کر دی۔"

☆☆☆

ویب کی بہن فلورنس بہت زیادہ خوب صورت نہیں تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن اسے بدصورت بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش متناسب تھے۔ بیضوی آنکھیں، لمبی ستواں ناک، گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں اور کمان کی شکل کے ہونٹ..... اگر ان سب کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو لگتا تھا یہ کسی بچے کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کوئی تصویر ہے۔ اس سے بھی زیادہ خراب بات یہ تھی کہ وہ خوب صورت نظر آنا چاہتی تھی اور جانسن کا ساتھ پا کر وہ اپنے آپ کو دنیا کی حسین ترین لڑکی سمجھنے لگی تھی۔ اس وقت وہ اکیس سال کی تھی۔ اس کے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں کو دیکھ کر ویب نے بھی سوچنا شروع کر دیا کہ اب وہ جوان ہوگئی ہے۔

جمعرات کی ایک سہ پہر وہ گھر آیا تو اس نے جانسن کو فلورنس کے بیڈ روم میں بیٹھے دیکھا۔ فلورنس اس وقت باتھ روم میں تھی اور ویب کو پانی گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جانسن اسے دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ ''تمہاری بہن بڑی مہمان نواز ہے۔''

ویب نے غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ وہ والدین کے گھر میں کوئی جھگڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''مت بھولو کہ تمہارے گھر پر بھی ایک عورت ہے۔''

''اب شاید وہ زیادہ عرصے میرے ساتھ نہ رہے۔'' جانسن قمیص پہنتے ہوئے بولا۔

''کیا تم فلورنس کو بھی پٹی پڑھا رہے تھے؟''

''شاید۔''

''بہتر ہوگا کہ تم اسے حقیقت بتا دو۔'' ویب نے کہا۔ ''ورنہ میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔''

''مجھے یقین ہے کہ تم ایسا ہی کرو گے۔'' جانسن نے جوتے پہنے اور کھڑکی سے باہر کود گیا۔ شاید وہ ہمیشہ اسی راستے سے آتا جاتا تھا۔

یہ گفتگو کافی عرصے تک ویب کے ذہن میں گونجتی رہی۔ جانسن میں ایک خوبی یہ تھی کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اس نے کبھی فلورنس سے یہ وعدہ نہیں کیا کہ وہ یہاں سے جاتے وقت اسے بھی ساتھ لے کر جائے گا لیکن اس دیانت داری کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ اس نے فلورنس کے ساتھ جو کچھ کیا، اس کے لیے اسے معاف کر دیا جائے۔ اس نے فلورنس کا انتخاب اس لیے کیا کہ وہ محبت کی بھوکی تھی اور وہ اس کی محبت میں اتنی دور چلی گئی کہ دوبارہ اس نے کسی دوسرے مرد کے بارے میں نہیں سوچا۔ ویب کے لیے اتنا ہی کافی تھا لیکن اصل حقیقت کچھ اور تھی۔

جانسن کی نظریں فلورنس کی جمع پونجی پر تھیں۔ اس نے گزشتہ برس ہائی اسکول میں دو سائنسی انعامات جیتے تھے اور اسے تین ہزار ڈالرز ملے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے گزشتہ چار سالوں میں گھر پر مختلف نوعیت کے کام کر کے دو ہزار ڈالرز جمع کیے تھے۔ اس طرح اس کے اکاؤنٹ میں پانچ ہزار ڈالرز سے زیادہ جمع ہو گئے تھے۔ 1962ء میں یہ ایک بڑی رقم سمجھی جاتی تھی اور اس سے ایک مکان خریدا جا سکتا تھا۔ ایک روز جانسن اپنے منصوبے کے مطابق فلورنس کو لے کر بینک گیا اور اس کے اکاؤنٹ سے ساری رقم نکلوا لی۔ اس نے فلورنس کو یقین دلایا تھا کہ وہ ان پیسوں سے ہوائی جہاز کے ٹکٹ خریدے گا تاکہ اپنی نئی بیوی کے ساتھ یہاں سے کہیں دور جا کر ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکے..... لیکن اس نے کھل کر نہیں بتایا کہ اس کی نئی بیوی کون ہوگی۔ فلورنس اسی غلط فہمی میں مبتلا رہی کہ جانسن کا اشارہ اسی کی جانب ہے۔ وہ اپنا بہترین لباس زیب تن کیے گھر کے لیونگ روم میں جانسن کی دستک کا انتظار کرتی رہی جو پھر کبھی سنائی نہیں دی۔

فلورنس نے اخبار والوں کے سامنے جانسن کو موردِ الزام ٹھہرانے کے بجائے اسے اپنی غلطی تسلیم کیا جبکہ اس کے گھر والے چاہ رہے تھے کہ وہ جانسن پر دھوکا دہی کا الزام عائد کرے۔ اس نے کالج جانا چھوڑ دیا اور گھر پر رہ کر ہی اپنا کام کرنے لگی۔ اس واقعے کے بعد اس نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا اور نہ ہی اس نے دوبارہ کسی سے محبت کی۔ اس نے اپنے ارمانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گہری نیند سلا دیا۔

کبھی کبھی ویب سوچتا کہ ساری غلطی اسی کی تھی۔ اسے چاہیے تھا کہ جانسن کی اسی وقت ٹھکائی لگا دیتا جب اس نے اسے فلورنس کے بیڈ روم میں دیکھا تھا تاکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فلورنس کی زندگی سے نکل جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کی بہن کی زندگی برباد ہوگئی۔

فلورنس اب بھی اپنے والدین کے گھر... میں رہ رہی تھی۔ وہ تین کمروں پر مشتمل ایک ہزار فٹ پر بنا ہوا قدیم طرز کا مکان تھا۔ ان کے والدین کا دس سال قبل انتقال ہو چکا تھا اور فلورنس ابھی تک اسی کمرے میں سوتی تھی جہاں جانسن اس سے ملنے آیا کرتا تھا۔

ویب دستک دیے بغیر اندر چلا گیا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح ٹی وی بند کیا اور لیونگ روم سے گزرتا ہوا کچن کی طرف بڑھ گیا جہاں فلورنس ایک پرانی سی میز پر بیٹھی تاش کے پتوں سے کھیل رہی تھی اور اس کے سامنے ایک مگ میں کافی رکھی ہوئی تھی۔

''تم نے کچھ سنا؟'' ویب نے پوچھا۔

''اس قصبے کا ہر بے وقوف مجھے فون کر رہا ہے۔'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''ان کا خیال ہے کہ مجھے اس خبر سے خوشی ہوئی ہوگی۔''

''کیا واقعی تمہیں خوشی ہوئی؟''

''میں نہیں جانتی۔'' اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ ویب کو ہمیشہ یہ شبہ رہا کہ فلورنس اب بھی جانسن کی واپسی کی امید لگائے بیٹھی ہے لیکن اب یہ امید بھی ٹوٹ چکی تھی۔

ویب نے اپنے لیے کافی بنائی اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ فلورنس نے کارڈز میز پر رکھ دیے اور اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی پھر بولی۔ ''وہ یہاں کیا کرنے آیا تھا؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''یہ تو معلوم ہوگا کہ وہ کب سے یہاں آیا ہوا تھا؟''

''میں یہ بھی نہیں جانتا۔''

''جانتے نہیں یا بتانا نہیں چاہ رہے؟'' فلورنس نے قدرے تیز آواز میں کہا۔

''میں واقعی کچھ نہیں جانتا۔'' اس نے اپنے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے بھی مجھے اس کیس سے الگ کر دیا گیا ہے۔''

''میری وجہ سے؟''

وہ فلورنس کو حقیقت بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ سمجھتی کہ شاید وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ لہٰذا ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، تمہاری وجہ سے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ بات تو تینتیس سال پرانی ہو چکی۔ تم کیا سمجھتے ہو؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' وہ بے دلی سے بولا۔

☆☆☆

ویب کے پاس جانسن کے بارے میں جو معلومات تھیں، ان کے مطابق اس نے فوج میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور سنڈی واٹرز کے ہمراہ مغربی جرمنی چلا گیا تھا۔ وہاں ان دونوں نے شادی کر لی پھر فوج کی ملازمت ختم ہونے کے بعد وہ کسی مغربی ریاست میں چلا گیا جہاں وہ کسی کمپیوٹر فرم کے لیے کام کرتا رہا۔ اس کے بارے میں کئی افواہیں سنی گئیں..... کبھی سننے میں آیا کہ وہ منشیات کے معاملات میں ملوث ہو چکا ہے اور کبھی معلوم ہوا کہ وہ کمپنی میں رہ کر بدعنوانی کا مرتکب ہو چکا ہے۔ بہر حال، اس نے خوب پیسا کمایا۔ اپنے والدین اور دادا کے مکانوں کی قسطیں ادا کیں اور وقفے وقفے سے اپنے بچوں کی خبر گیری بھی کرتا رہا لیکن اس دوران میں ایک بار بھی گھر لوٹ کر نہیں آیا۔

یہی وہ نکتہ تھا جہاں سے ویب کو اپنی تحقیقات شروع کرنا تھیں۔ گو کہ اسے اس کیس سے الگ کیا جا چکا تھا اور ڈیرسی ابھی تک اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی، لہٰذا اس کے لیے بہترین موقع تھا کہ وہ اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوالوں کے جواب تلاش کرے۔ یہ سوچنا بعد کا کام تھا کہ جانسن کو کس نے مارا؟ اس سے پہلے یہ جاننا ضروری تھا کہ جانسن کو اتنے طویل عرصے بعد گھر واپس آنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اگر ویب اس سوال کا جواب تلاش کر لیتا تو پھر اسے قاتل تک پہنچنے میں بھی آسانی ہو جاتی۔

ویب کو فوری طور پر اپنے کام کا آغاز کرنا تھا۔ اگر برنارڈ کو پتا چل جاتا تو وہ اسے معطل بھی کر سکتا تھا۔ لہٰذا اسے بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ اس نے سب سے پہلے جانسن کے متعلقین سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے والدین اب بھی وہیں رہائش پذیر تھے۔ ویب اسکول کے زمانے میں کئی مرتبہ اس گھر میں جا چکا تھا لیکن اب اس کی حالت کافی خستہ ہو چکی تھی۔ ڈور بیل پر دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا شخص باہر آیا جو یقیناً ٹام کا باپ فل جانسن تھا۔

''مسٹر جانسن!'' ویب نے اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''میں سراغ رساں ویبسٹر کونک ہوں اور تمہارے بیٹے کے بارے میں بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔''

''زیادہ تکلف کرنے کی ضرورت نہیں۔'' بوڑھا اسے پہچانتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے والدین کے انتقال کا افسوس ہوا۔ گلیڈی نے دونوں کی موت پر تعزیتی کارڈ بھیجا تھا۔''

''جانتا ہوں۔'' ویب نے کہا۔ ''میں اور فلورنس تمہارے جذبے کی قدر کرتے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ اس کے ساتھ اندر چلا آیا۔ گلیڈی کچن کے دروازے پر کھڑی تھی، اسے دیکھتے ہی بولی۔

''مجھے امید تھی کہ تم ضرور آؤ گے۔''

''مسز جانسن۔'' وہ بولا۔ ''مجھے تمہارے بیٹے کے مرنے کا افسوس ہے۔''

گلیڈی نے نتھنے پھلائے اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ''کچن میں آجاؤ۔ کافی دنوں سے کسی لڑکے نے ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھایا۔''

ویب ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''کیا کسی اور نے بھی تم سے اس موضوع پر بات کی ہے؟''

''صرف انہی لڑکوں سے بات ہوئی تھی جو یہ خبر لے کر آئے تھے۔'' فل نے جواب دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈیرسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ابھی یہاں نہیں پہنچی لیکن وہ کسی بھی وقت آسکتی تھی۔

''ٹام نے تمہیں کب بتایا تھا کہ وہ گھر واپس آرہا ہے؟''

''ہمیں اس کی آمد کا علم پولیس والوں سے ہوا جو اس کی موت کی اطلاع دینے آئے تھے۔'' فل نے کہا۔ ''تم کیا سمجھ رہے ہو کہ اس نے ہمیں اپنی آمد کی اطلاع دی ہوگی؟''

''گویا تمہیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ آنے والا ہے؟''

''مجھے معلوم تھا۔'' گلیڈی نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''اس نے دو دن پہلے مجھے فون کر کے بتایا تھا کہ وہ آج رات یہاں ہوگا..... لیکن میں نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی کیونکہ میرا خیال تھا کہ وہ پہلے کی طرح اب بھی نہیں آئے گا۔''

''تم مجھے تو بتا سکتی تھیں۔'' فل اپنی کرسی پیچھے کھسکاتے ہوئے بولا۔

''اس لیے نہیں بتایا کہ تمہیں مایوسی ہوگی۔''

''میں مر نہیں جاتا۔'' وہ غصے سے اٹھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

گلیڈی نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا اور بولی۔ ''میں نہیں چاہتی تھی کہ فل کو کوئی تکلیف پہنچے۔ گزشتہ بار جب ٹام اطلاع دینے کے باوجود نہیں آیا تو فل ایک ہفتے تک بستر پر پڑا رہا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس مرتبہ بھی ایسا ہو۔''

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ٹام اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ اطلاع دینے کے باوجود نہیں آیا؟''

اس نے سر ہلاتے ہوئے ٹشو پیپر سے اپنی ناک صاف کی اور بولی۔ ''ہر تین سال بعد وہ ایسا ہی کرتا تھا لیکن اس نے کبھی اپنے کہے پر عمل نہیں کیا۔ شاید وہ قصبے کے لوگوں کے سامنے آنے سے گھبراتا تھا۔ حالانکہ میں اسے کہتی رہتی تھی کہ فلورنس کے والدین نے اسے معاف کر دیا ہے لیکن وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں جانتی ہوں وہ اچھا لڑکا تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میرے ذہن میں اس کا ایک مختلف تاثر ہے۔'' ویب نے سرد مہری سے کہا۔

گلیڈی نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا اور دونوں انگوٹھے مسلتے ہوئے بولی۔ ''مجھے فلورنس کا بہت دکھ ہے۔''

ویب نے کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ وہ خاموش رہا۔ کچھ بھی ہو، وہ یہ بھی نہیں بھول سکتا تھا کہ ٹام نے اس کی بہن کی زندگی برباد کی تھی۔

''اس سے کہہ دینا کہ اس کی رقم میرے پاس محفوظ ہے۔'' گلیڈی نے کہا۔

ویب اپنی جگہ ساکت ہوکر رہ گیا۔ معاملہ صرف پیسوں کا نہیں بلکہ اس عہد شکنی کا تھا جو ٹام نے فلورنس کے ساتھ کی تھی۔ کسی لڑکی کو جھوٹے خواب دکھانا ایک جرم تھا اور ٹام اس کا مرتکب ہوا تھا اسی لیے وہ اپنی حیرت نہ چھپا سکا۔

گلیڈی اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنے لیے پانی کا گلاس بھرتے ہوئے بولی۔ ''یقین کرو۔ وہ اچھا لڑکا تھا۔ بس وہ یہ بھول گیا کہ جو کچھ کر رہا ہے، اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ جیسے وہ کبھی پلٹ کر گھر نہیں آیا۔ بچے اس کی صورت دیکھنا چاہتے تھے۔ انہیں قدم قدم پر اس کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ کیا تمہارے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟''

''اسے کس نے قتل کیا مسز جانسن؟''

''اس سوال کا جواب تو میں بھی جاننا چاہتی ہوں۔''

☆☆☆

وہ جانتا تھا کہ جانسن فیملی نے فلورنس کو اس کے پانچ ہزار ڈالرز واپس کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا تو انہوں نے اس کے نام سے بینک میں اکاؤنٹ کھول کر وہ پیسے اس میں جمع کروا دیے۔ ویب اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی اس رقم کو وصول کرنے کے بعد فلورنس کی زندگی میں کیا تبدیلی آجاتی۔ فل جانسن کے گھر سے واپس آتے ہوئے اس کا رخ ٹام کے سب سے چھوٹے بھائی اسکاٹ جانسن کے گھر کی جانب تھا جس کے پانچ بچے تھے اور ان دنوں وہ بے روزگار تھا۔ وہ گاڑی سے باہر آیا۔ گھر میں سے کسی مرد اور عورت کے بولنے کی تیز تیز آوازیں آرہی تھیں لیکن جب ویب نے دروازے پر دستک دی تو خاموشی چھا گئی۔ دروازے کے پیچھے ایک لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔

''مجھے اسکاٹ جانسن سے ملنا ہے۔'' اس نے شائستگی سے کہا۔

''تم پولیس والے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

ویب نے سر ہلایا اور اپنا کارڈ نکالنے لگا لیکن اس عورت نے انتظار کی زحمت گوارا نہیں کی اور چلاتے ہوئے بولی۔

''ڈیڈی ..... ایک اور آگیا۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے ویب کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اسکاٹ جانسن ایک کمرے میں نیم دراز ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ بھڑک اٹھا اور بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے تمہیں اس کیس پر کیوں لگا دیا؟''

''ڈیڈی!'' وہ لڑکی اندر آتے ہوئے بولی۔

اسکاٹ نے کندھے اچکائے اور ٹی وی کا ریموٹ برابر والی میز پر پٹختے ہوئے بولا۔ ''میرا سوال جائز ہے۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ ویب میرے بھائی سے کتنی نفرت کرتا تھا۔''

''میں تو یہاں اس کی تعزیت کے لیے آیا تھا۔'' ویب آہستہ سے بولا۔

''بھاڑ میں گئی تمہاری تعزیت۔'' وہ غصے سے بولا۔ ''کیا تم یہ معلوم کرنے آئے ہو کہ کہیں میں نے تو اسے نہیں مارا؟''

''کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟''

''مجھے یہ کام اسی وقت کر دینا چاہیے تھا جب وہ ممی، ڈیڈی اور بچوں کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ اپنے باپ پر جان چھڑکتے تھے لیکن اس کے پاس ان کے لیے وقت نہیں تھا۔ میں نے جان کے ساتھ مل کر ان کی خبر گیری کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کافی نہیں تھا۔ ٹام انہیں بہلانے کا فن جانتا تھا۔ وہ اپنے بارے میں اس صفائی سے جھوٹ بولتا کہ لوگ اس پر یقین کر لیتے تھے۔''

''کس طرح کا جھوٹ؟''

''مثلاً وہ یہ ظاہر کرتا کہ کسی کمپنی میں اچھے عہدے پر کام کر رہا ہے جہاں سے اسے معقول پیسے ملتے ہیں۔ میری اس سے ڈائریکٹ نمبر پر بات ہوتی تھی پھر وہ نمبر مجھ سے گم ہو گیا۔ میں نے اس کی کمپنی فون کیا تو استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی نے بتایا کہ اس نے یہ نام کبھی نہیں سنا..... لیکن جب میں نے اصرار کیا تو اس نے دفتر والوں سے میری بات کروا دی۔ انہوں نے بتایا کہ ٹام جانسن نامی شخص کئی سال پہلے یہ کمپنی چھوڑ کر جا چکا ہے۔ یہ 1979ء کی بات ہے۔ جب بعد میں اس سے پوچھا تو وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''اسکاٹ! یہ بزنس ہے اور یہاں ایسا ہوتا رہتا ہے۔''

''کیا تم نے کبھی اسے یہاں کا چکر لگاتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ یہاں آیا کرتا تھا؟''

''میں نے تمہاری باتوں سے اندازہ لگایا ہے۔'' ویب نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

''اس روز میں ماما کے گھر سے واپس آرہا تھا۔ اس نے انہیں فون پر اپنے آنے کی اطلاع دی تھی اور وہ اس کا انتظار کر رہی تھیں لیکن وہ گھر نہیں پہنچا۔ راستے میں مجھے طلب محسوس ہوئی تو میں کلب میں اپنے مخصوص کونے میں جا کر بیٹھ گیا جہاں سے اندر کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کسی موٹے شخص سے باتیں کر رہا تھا جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' ویب نے پوچھا۔

''میں شراب پینے میں لگا ہوا تھا اس لیے اس بارے میں نہیں سوچا۔ پھر میں نے اس کا نام لے کر پکارا لیکن اس وقت تک وہ اور اس کا ساتھی وہاں سے جا چکے تھے۔''

''تمہیں یقین ہے کہ وہ ٹام ہی تھا؟''

''میں شراب ضرور پی رہا تھا لیکن مدہوش نہیں تھا۔ بعد میں اس نے معذرت کے طور پر مجھے کچھ رقم بھیجی اور کہا کہ اس کے بارے میں ماما کو کچھ نہ بتایا جائے۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے ڈیڈی کو اس کے آنے کے بارے میں بتا دیا۔ انہوں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی اور جب کامیاب نہ ہوئے تو تقریباً ایک سال تک اس امید پر کلب جاتے رہے کہ شاید وہ دوبارہ آجائے لیکن وہ نہیں آیا۔''

''تم جانتے ہو کہ ٹام یہاں کیوں آیا تھا؟''

''نہیں اور شاید ڈیڈی کو بھی اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ کہتا کچھ تھا، کرتا کچھ تھا۔''

ویب خود بھی یہ بات اچھی طرح جانتا تھا پھر بھی اس نے پوچھ ہی لیا۔ ''تمہارے خیال میں ٹام کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا؟''

''میرا خیال ہے کہ کسی نے اس کے مسلسل جھوٹ بولنے سے تنگ آکر اس کی زبان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر دی۔''

''کچھ اندازہ ہے کہ وہ شخص کون ہو سکتا ہے؟''

''نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی کی آواز اتنی بڑھا دی کہ ویب کھڑا ہو گیا اور بولا۔

''مجھے یقین ہے کہ تم کسی مشتبہ شخص کا نام لینا نہیں چاہتے۔''

☆☆☆

جب وہ باہر آیا تو سردیوں کا اندھیرا پھیل چکا تھا جس سے ویب کو ہمیشہ نفرت رہی تھی۔ اب اس کا رخ جان جانسن کے گھر کی طرف تھا جو جینا ہیسٹنگ کے گھر کے قریب ہی تھا۔ اس کا مکان ساڑھے تین ہزار مربع فٹ پر بنا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ جان کی یہاں پندرہ ایکڑ زمین بھی تھی اور قصبے میں بھی اس کی کافی جائداد تھی اور اگر ٹام کے پاس غیر متوقع طور پر اتنی دولت نہ آجاتی تو جان ہی اپنے بھائیوں میں سب سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زیادہ امیر کہلایا جاتا۔ ویب نے اپنی گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی کی اور آگے بڑھ کر دروازے پر لگی ڈور بیل بجادی۔ جان کی بیوی ایوی نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھتے ہی بولی۔ ”وہ گھر پر نہیں ہے۔“

”میں تم دونوں سے ہی بات کرنا چاہ رہا تھا۔“ ویب نے کہا۔

ایوی کے ہونٹوں پر ایک کمزور سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بولی۔ ”تم جانتے ہو کہ میں جان کے بغیر کچھ نہیں کرسکتی۔“

جان نے شروع سے ہی کبھی اس بات کو پسند نہیں کیا۔ ایوی اس کی غیر موجودگی میں کسی دوسرے مرد سے بات نہیں کرسکتی تھی۔ گو کہ جان نے کبھی اپنی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھایا لیکن اس کے گھر سے چیخنے چلانے کی آوازیں سن کر پڑوسی ضرور خوف زدہ ہوجاتے تھے اور انہوں نے ایک سے زائد مرتبہ فون کرکے پولیس کو اس کی اطلاع بھی دی تھی۔

ویب نے صورتِ حال کو محسوس کرتے ہوئے اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور بس اتنا ہی پوچھا۔ ”وہ اس وقت کہاں ہوگا؟“

”وہ تجہیز و تکفین کے انتظامات کے لیے گیا ہے۔“ ایوی نے اپنے چہرے پر آئی بالوں کی لٹ کو ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”میں تو ٹام کے گھر والوں کو فون کرنے کی کوشش کررہی ہوں لیکن سنڈی فون ہی نہیں اٹھا رہی۔“

”ممکن ہے وہاں کی پولیس کے ذریعے اسے اطلاع ہوجائے۔“

”شاید۔“ پھر وہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ”میں جان کو فون کرکے تمہاری آمد کے بارے میں بتادوں گی۔ میں جانتی ہوں کہ وہ تم سے بات کرنا چاہے گا کیونکہ اسے اپنے بھائی کی موت کا بہت صدمہ ہے۔“

☆☆☆

جینا ہیسٹنگ اپنے دوسرے شوہر اسٹیو کونز کے ساتھ جس مکان میں رہتی تھی، وہ جان کے گھر سے ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ جب تک اسٹیو پولیس کی ملازمت میں رہا، ویب اکثر ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ ٹام کے چاروں لڑکے اور اسٹیو کی دونوں بیٹیاں اسے بہت اچھی لگتی تھیں اور وہ کافی دیر تک ان سے بیٹھا باتیں کرتا رہتا تھا۔ اس کے باوجود وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ جینا اب بھی کبھی کبھی بے چین نظر آنے لگتی ہے۔ شاید وہ ٹام کو پوری طرح بھلا نہ پائی تھی۔

ویب جب وہاں پہنچا تو اسٹیو کے گھر کے سامنے پولیس کی گاڑیاں کھڑی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسٹیو ایک پولیس والے کے سامنے کھڑا چلا رہا تھا جس نے اسٹیو کو گھر کی طرف جانے سے روک دیا تھا۔ دوسرے پولیس افسران گھر کے اطراف میں چکر لگا رہے تھے۔ وہ اپنی کار سے باہر آیا اور آہستہ آہستہ جینا کے گھر کی طرف بڑھنے لگا جو سفید چہرہ لیے کھڑکی سے ٹیک لگائے اپنے شوہر کو پولیس والوں سے بحث کرتا دیکھ رہی تھی۔

ویب نے ایک لیڈی پولیس آفیسر کا بازو تھاما۔ وہ کیلی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”یہ سب کیا ہورہا ہے؟“

”اس پر قتل کا الزام ہے۔“ وہ اپنا بازو چھڑاتے ہوئے بولی۔ ”پولیس کو ایک ریوالور ملا ہے۔“

ویب نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ریوالور ملنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس سے قتل بھی کیا گیا ہو۔ اس نے لیڈی پولیس آفیسر سے پوچھا۔ ”ریوالور کے بارے میں کیا معلومات ہیں؟“

”یہ اسٹیو کا پرانا سروس ریوالور ہے جو کلب کے باہر کھڑی ہوئی ایک کار سے ملا ہے۔ اسٹیو کا کہنا ہے کہ یہ ریوالور اس رات چوری ہوا تھا جب وہ کلب گیا ہوا تھا۔“

ویب نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔ اس نے کئی سال پہلے اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروادی تھی۔“ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ”اس قتل کا شبہ جینا پر کیوں کیا جارہا ہے..... اسٹیو پر کیوں نہیں؟“

”اس لیے کہ اسٹیو کے پاس ٹام کو قتل کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ اس سے کبھی نہیں ملا تھا جبکہ جینا کے پاس اسے قتل کرنے کا جواز موجود تھا۔“

”یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے تینتیس سال بعد ٹام کو قتل کرنے کا خیال آیا ہو؟“

”میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ بہتر ہوگا کہ تم خود اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کرلو۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ ویب نے جینا کی طرف دیکھا۔ اس کا وزن پہلے سے بڑھ گیا تھا۔ عین اسی وقت جینا کی نظر بھی اس پر پڑی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ویب کو قریب آنے سے منع کردیا۔ ویب اپنے کندھے اچکا کر رہ گیا پھر اس نے اپنی کار کا رخ کیا اور پولیس اسٹیشن کی جانب چل دیا۔

☆☆☆

ڈیرسی اپنی میز پر بیٹھی کچھ کاغذات دیکھ رہی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا اور دور سے دیکھنے پر یوں لگا جیسے وہ غصے کی حالت میں ہو۔

”کیا تمہیں بھی شک ہے کہ جینا نے یہ قتل کیا ہے؟ یہ حرکت اسٹیو کی بھی ہوسکتی ہے۔“ ویب نے تلخی سے کہا۔

”وہ پولیس میں رہ چکا ہے اور اس کا ایک بھائی اب بھی پولیس میں ہے۔ کیا اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی؟“

”پھر تو تمہیں جینا کو گرفتار کرلینا چاہیے۔“

”نہیں، ہم اسے گرفتار کرنا نہیں چاہتے لیکن اس کی نگرانی ہوتی رہے گی۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک فائل نکالی اور بولی۔ ”یہ ٹام جانسن کا جیل ریکارڈ ہے۔ اس پر منشیات اور اسمگلنگ کے الزامات لگتے رہے لیکن ایک بار بھی جرم ثابت نہیں ہوسکا۔ یہاں تک کہ وہ ایک رات کے لیے بھی جیل میں نہیں رکا کیونکہ وہ ہمیشہ بڑی رقم خرچ کرکے بڑے بڑے وکیلوں کی خدمات حاصل کرلیتا تھا۔“

”اور تم سمجھتی ہو کہ اسے مارنے والا اسی قصبے سے تعلق رکھتا ہے؟“

”اگر ماضی کے واقعات پر نظر دوڑائی جائے تو یہی نتیجہ سامنے آتا ہے۔“

ویب نے تائید میں گردن ہلائی۔ ڈیرسی کے تجزیے میں وزن تھا۔ ٹام جانسن نے اپنی بیوی کو دھوکا دیا۔ لہٰذا اس نے موقع ملتے ہی اسے قتل کردیا اور اس کے لیے اسے تینتیس سال تک انتظار کرنا پڑا..... لیکن مسئلہ یہ تھا کہ یہ منطق تو فلورنس پر بھی لاگو ہوسکتی تھی۔ ٹام نے اسے بھی تو دھوکا دیا تھا۔

اس نے فوراً ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور بولا۔ ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ یہاں آیا کرتا تھا؟“

”ہاں، وہ ہر تین سال بعد یہاں آیا کرتا تھا۔“ ڈیرسی بولی۔ ”ان کشتیوں کی نگرانی کے لیے جن پر خاص مال لدا ہوتا تھا۔“

”تمہاری مراد منشیات سے ہے؟“

ڈیرسی نے سر ہلایا اور بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ پہلے وہ یہی کام کیا کرتا تھا لیکن بعد میں ممنوعہ اشیا کی اسمگلنگ بھی کرنے لگا۔ اوتاہ کی کمپنی سے اس کا لین دین چلتا تھا لیکن گزشتہ برس خفیہ ایجنسی کے چھاپے سے پہلے ہی وہ دفتر بند کردیا گیا۔“

”گویا تم سمجھتی ہو کہ وہ اسی وجہ سے مارا گیا؟“

”مجھے پورا یقین ہے۔“ ڈیرسی بولی۔ ”وہ گھیرے میں آگیا تھا۔ خفیہ ادارے اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اسی لیے اوتاہ کا دفتر بھی بند کردیا گیا۔ اس کے دوستوں کو خطرہ محسوس ہوا چنانچہ انہوں نے اسے قتل کروادیا۔“

”یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔“

”دلیل!“ ڈیرسی نے اپنا ہاتھ فضا میں لہراتے ہوئے کہا۔ ”اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ قتل انتہائی پیشہ ورانہ انداز میں کیا گیا۔ کوئی نشان نہیں، کوئی گواہی نہیں، ریوالور کا سیریل نمبر مٹا ہوا ہے۔ جائے واردات سے صرف ایک ہتھیار ملا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے یہاں اسے مارا تو اس کے قتل کا شبہ کئی لوگوں پر کیا جائے گا۔“

”کیا میں یہ فائل دیکھ سکتا ہوں؟“ ویب نے پوچھا۔

”ضرور۔“ وہ فائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”اسے پڑھ کر تم مزید پریشان ہوجاؤ گے۔“

”مجھے تو یہ سارا معاملہ ہی پریشان کن لگ رہا ہے۔ ٹام ایک ذہین شخص تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مال کی ڈیلیوری کے لیے یہاں کیوں آیا جبکہ جانتا تھا کہ اس کے اپنے آدمی گزشتہ سال کے چھاپے کے لیے اسے ذمے دار سمجھتے ہیں۔“

”پیسوں کے لیے۔“ ڈیرسی نے طنزاً کہا۔

”اس کے پاس پیسے کمانے کے اور بھی طریقے تھے۔“

ویب نے فائل کھول کر اسے دیکھنا شروع کیا۔ اس

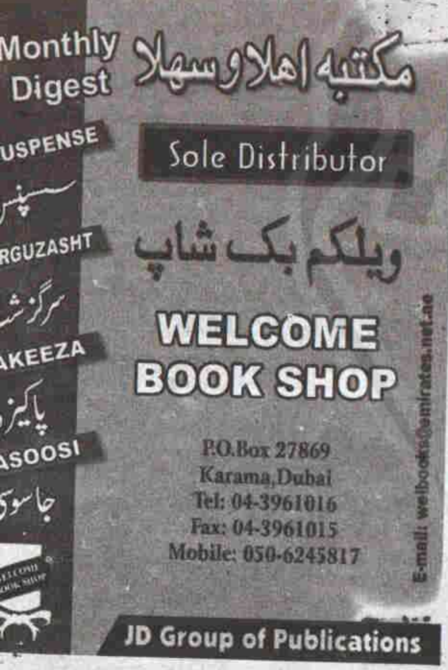

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے کئی صفحات بوسیدہ ہو چکے تھے۔ گرفتاری کے ریکارڈ والے صفحات ٹائپ شدہ تھے اور ان کی اتنی بار نقل تیار کی گئی تھی کہ بہت سے حروف دھندلا گئے تھے۔ کئی تصویریں غائب تھیں اور فنگر پرنٹ بھی واضح نہیں تھا۔ اس نے مزید صفحات پلٹے۔ بعد کا ریکارڈ کمپیوٹر پرنٹ کی صورت میں موجود تھا لیکن اس میں گرفتاری سے متعلق کوئی اصل دستاویز نہیں تھی بلکہ ایف بی آئی کی کسی فائل کا حوالہ دیا گیا تھا۔

''اس میں کافی مواد موجود ہے لیکن اہم کاغذات غائب ہیں۔''

ڈیرسی نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ کمپیوٹر جانتا تھا۔ اس لیے تفصیلات ضائع کر سکتا ہے۔''

ویب نے فائل بند کر کے ڈیرسی کو واپس کر دی اور بولا۔ ''لاش کا پوسٹ مارٹم کس نے کیا تھا؟''

''کیرینو نے۔ گولی کا زخم واضح تھا اس لیے اس نے ابھی تفصیلی معائنہ نہیں کیا اور فی الحال صرف موت کے وقت کا تعین ہی کیا ہے۔ باقی کام وہ کل کرے گی۔''

''بہتر ہو گا کہ اس کے فنگر پرنٹس لے کر سرکاری ریکارڈ سے ان کا موازنہ کر لیا جائے۔''

''مجھے شبہ ہے کہ اس کے فنگر پرنٹس کا کوئی ریکارڈ ہو گا۔'' ڈیرسی بولی۔ ''میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہ ریکارڈ غائب کرنا جانتا تھا..... بالکل اسی طرح جیسے وہ خود اتنا عرصہ غائب رہا۔''

''مجھے یقین ہے کہ اس بار بھی اس نے اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے اوجھل کرنے کے لیے کوئی کھیل کھیلا ہے۔''

''کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ ٹام جانسن کی لاش نہیں تھی؟ لیکن تم نے تو خود اسے شناخت کیا تھا۔''

''میں نے اسے 1962ء سے نہیں دیکھا۔''

''لیکن اس کا بھائی تو اسے پہچانتا ہو گا؟'' ڈیرسی بولی۔

ویب نے میز پر رکھا ہوا ٹیلی فون اپنی جانب کھسکایا اور کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''ایوی! دوبارہ زحمت دینے پر معذرت۔ کیا جان گھر پر موجود ہے؟''

''نہیں، وہ اپنے والدین کی طرف گیا ہے۔ تم چاہو تو اس سے وہیں مل سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے، مل لوں گا۔ یہ بتاؤ کہ جان اور ٹام کی آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟''

''میرا خیال ہے کہ پندرہ سال ہو گئے..... جب ہم اس سے ملنے اوتاہ گئے تھے۔''

''پندرہ سال!'' ویب نے دہرایا۔ ''ٹھیک ہے۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

''میں نہیں سمجھتی کہ کوئی شخص اتنا پیچیدہ ہو سکتا ہے۔'' ڈیرسی بولی۔

''تم ٹام کو نہیں جانتیں۔''

''لیکن اس کے والدین تو لاش کو شناخت کر سکتے تھے؟''

''ٹام جانتا تھا کہ وہ بھی اسے نہیں پہچان پائیں گے۔'' ویب نے تلخی سے کہا۔ ''اسے یہاں کے حالات کا بخوبی علم تھا۔ وہ ہمارے طریقۂ کار سے بھی واقف تھا اور جانتا تھا کہ ہم لوگ بھی اس کی لاش کی شناخت کے لیے جان کو ہی فون کریں گے۔''

''اگر تمہارا مفروضہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس نے اپنی جگہ کسی دوسرے کو قتل کر دیا اور خود غائب ہو گیا، تب بھی یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ اس نے وہ ریوالور کہاں سے حاصل کیا؟''

''یہ ریوالور کلب سے چرایا گیا تھا۔ اگر تم غور کرو تو تمہاری سمجھ میں یہ بات آ جائے گی کہ ٹام اس وقت قصبے میں موجود تھا جب یہ ریوالور گم ہوا۔''

''تمہارا خیال ہے کہ وہ بہت پہلے یہ منصوبہ تیار کر چکا تھا۔''

''ٹام ہمیشہ محفوظ منصوبہ بندی کیا کرتا تھا۔'' ویب مسکراتے ہوئے بولا۔

ڈیرسی نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں انہی خطوط پر کام کروں گی۔''

☆☆☆

ویب کا شبہ درست ثابت ہوا۔ ریکارڈ کے مطابق لاش سے ملنے والے انگلیوں کے نشانات کیلی فورنیا کے ایک کمپیوٹر کے ماہر میک گور کے تھے جو شکل و صورت اور قد و قامت میں ٹام سے حیرت انگیز مشابہت رکھتا تھا۔ وہ تین دن پہلے اپنی بیوی سے یہ کہہ کر گھر سے نکلا کہ وہ ایک ڈیل کے سلسلے میں اپنے کلائنٹ سے ملنے جا رہا ہے جو بہت دولت مند اور اثر رسوخ والا ہے۔ اگر یہ ڈیل کامیاب ہو گئی تو اس کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔

ایف بی آئی کے ایجنٹ فوراً ہی حرکت میں آ گئے اور میک گور کی تلاش شروع ہو گئی۔ ائرپورٹ کے ریکارڈ سے

معلوم ہوا کہ اپنی موت کے تین گھنٹے بعد میک گور نے مینا پولس سے براہِ راست پرواز کے ذریعے میامی جانے کی کوشش کی تھی لیکن نشست نہ ملنے کی وجہ سے اسے پہلے نیویارک جانا پڑا جہاں برف باری کی وجہ سے اسے مزید چار گھنٹے رکنا پڑا۔ جب وہ ڈیڈ کاؤنٹی ائرپورٹ پر اترا تو ایف بی آئی کے ایجنٹ اس کے منتظر تھے۔ انہیں یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ ڈرائیونگ لائسنس پر میک گور کے جو کوائف درج تھے، ان کے مقابلے میں اس کا قد دو انچ اور وزن پچاس پاؤنڈ سے زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ اس نے آنکھوں پر نظر کا چشمہ بھی نہیں لگایا ہوا تھا۔ اس کے بعد ایف بی آئی والوں کے لیے یہ ثابت کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ میک گور نہیں بلکہ ٹام جانسن ہے۔

''ایف بی آئی کی پوچھ گچھ کے بعد ہم اسے اپنی تحویل میں لے لیں گے کیونکہ یہ قتل ہماری حدود میں ہوا ہے۔'' ڈیرسی نے پُرجوش انداز میں کہا۔

''ہاں، یہ کیس تو ہمارا ہی ہے۔'' ویب نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں اسے خراب نہیں کرنا چاہتا، یہ تمہارا کیس ہے۔''

''تم نے تو اس کیس کو حل کیا ہے۔ خراب کرنے والی بات کہاں سے آ گئی؟'' ڈیرسی مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ صرف مقامی معلومات کے سہارے آگے بڑھتا گیا۔''

''یہی معلومات تو ہمارے کام آئیں۔ اگر تم بروقت لوگوں سے نہ ملتے تو ہمارے لیے اسے دورانِ سفر پکڑنا ممکن نہ ہوتا.....''

ویب نے اس کی بات کاٹی اور بولا۔ ''مت بھولو ڈیرسی! اس نے میری بہن کی زندگی برباد کی تھی۔''

''یقیناً۔ یہ نکتہ بھی جیوری کے لیے قابلِ غور ہو گا۔''

☆☆☆

کئی سالوں کے طویل انتظار کے بعد وہ اپنی بہن کے مجرم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اس کا کریڈٹ نہیں لے سکتا تھا اور نہ ہی اسے اس کی خواہش تھی۔ اسے اب بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اپنی بہن کی نظروں میں ہیرو بن سکتا ہے۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹوں کی تھکن اس پر حاوی ہونے لگی تھی۔ اس نے سوچا کہ غسل اور ناشتا کرنے کے بعد وہ فلورنس سے ملنے جائے گا۔ اب اس کے لیے اسے سنبھالنے کا اہم مرحلہ درپیش تھا۔ وہ مزید امیدوں کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ اسے عدالت میں ٹام کے خلاف گواہی دینے پر آمادہ کرتا۔

اس نے ڈیرسی سے بھی جھوٹ بولا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ لاش کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ وہ ٹام جانسن نہیں ہے لیکن قصبے میں کوئی بھی اس کی بات کا یقین نہ کرتا۔ ویسے بھی سرکاری طور پر اسے اس کیس کی تحقیقات سے الگ کر دیا گیا تھا اس لیے وہ کھل کر سامنے نہیں آ سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے درپردہ رہ کر ڈیرسی کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس بار ٹام جانسن نے اونچا کھیل کھیلا ہے۔ اس سے پہلے وہ اپنی بیوی، بچوں اور فلورنس کو دھوکا دے کر غائب ہو گیا تھا۔ اس بار اس نے پورے خاندان اور قصبے کو چکما دے کر دھوئیں کے پردے کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی تھی۔ دشمنوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے موت کا ناٹک رچایا تاکہ ہمیشہ کے لیے ٹام جانسن دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو جائے اور وہ میک گور کے نام سے کسی اجنبی شہر میں اپنی زندگی شروع کر سکے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے خاندان اور قصبے کے لوگوں نے اسے کئی سالوں سے نہیں دیکھا لہٰذا وہ انہیں آسانی سے بے وقوف بنا سکے گا اور وہ میک گور کو ٹام جانسن سمجھ کر صبر کر لیں گے۔ یہ میک گور کی بدنصیبی تھی کہ وہ ٹام جانسن سے حیرت انگیز طور پر مشابہ تھا۔

اس ساری منصوبہ بندی میں وہ ویب کو بھول بیٹھا تھا جو پچھلے تینتیس سال سے انتقام کی آگ میں سلگ رہا تھا۔ وہ ٹام جانسن کی رگ رگ سے اچھی طرح واقف تھا اور جیسے ہی اس کی نظر لاش پر پڑی، تینتیس سال پہلے کے مناظر اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ وہ یہاں کے لوگوں، ماحول اور حالات سے اچھی طرح واقف تھا اور انہی معلومات کے سہارے وہ چوبیس گھنٹے سے بھی کم وقت میں ٹام جانسن تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن یہ بات وہ ڈیرسی یا برنارڈ سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ کسی کیس کی تفتیش کے لیے مقامی معلومات کی کتنی اہمیت ہے اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کے لیے یہی کافی تھا کہ اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔

جوش نے پاکستان میں ایک وزیر کو اردو میں خط لکھا لیکن اس کا جواب انہوں نے انگریزی میں ارسال کیا۔
جواب الجواب میں جوش صاحب نے انہیں لکھا۔
''جنابِ والا! میں نے تو آپ کو مادری زبان میں خط لکھا تھا، لیکن آپ نے اس کا جواب اپنی پدری زبان میں تحریر فرمایا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

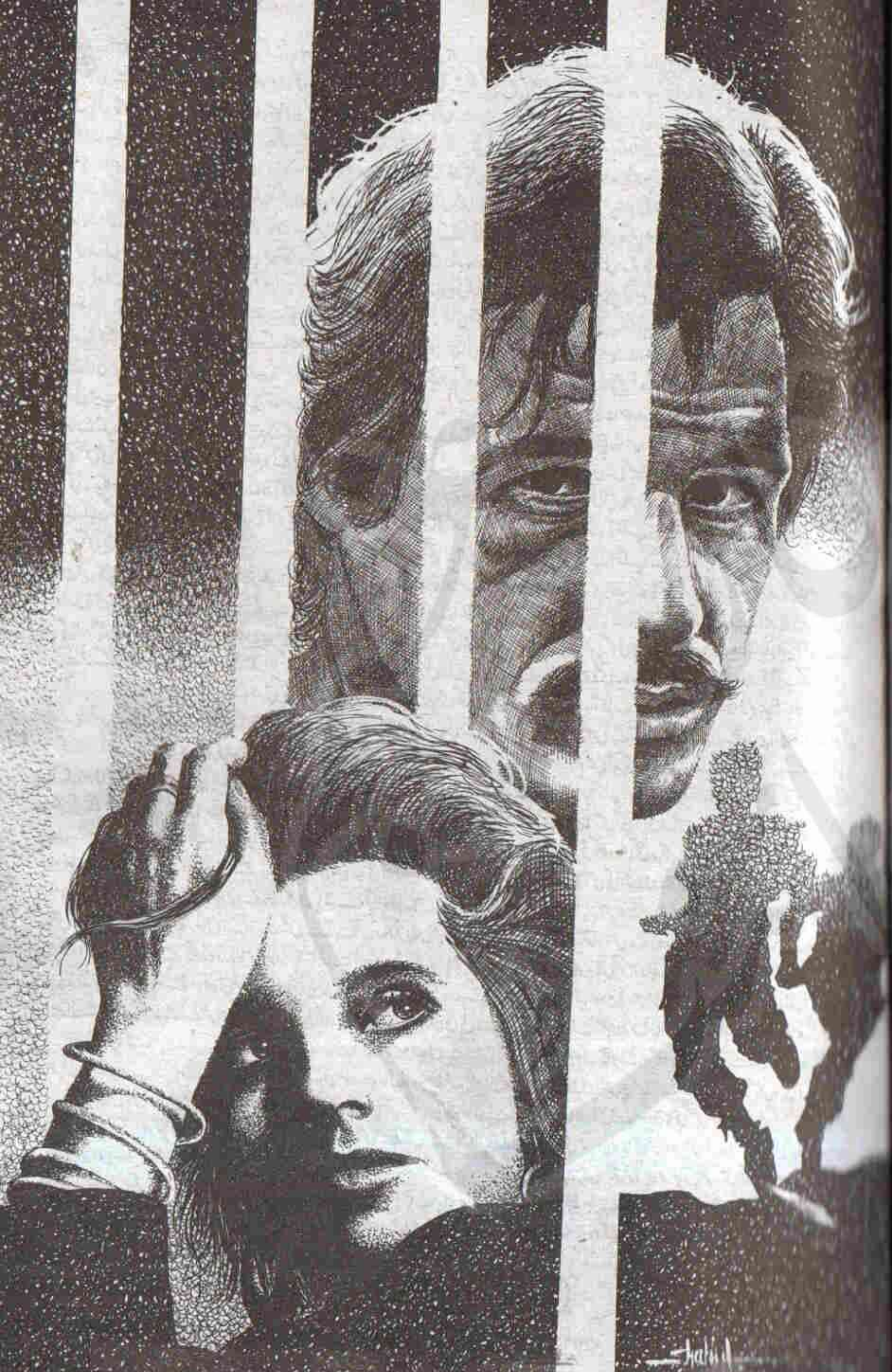

للکار

طاہر جاوید مغل

چھبیسویں قسط

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبار
خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔
خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار
کے طواف میں محو رہتا ہے... مگر آج عشق کی اقدار
میں تبدیلی ... وقت کی ضرورت اور حالات کا
تقاضا ہے... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے ...
کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے ... سر پھرے عاشق نے اب
ایسے شخص کا روپ دھارا ہے جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر
محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیشِ
نظر رکھتا ہے ... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان محبت
جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے ... عشق میں اس کی زندگی کی
سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے ... جبکہ دوسرے عاشق کا
مطمح نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس
کے قلب و نظر ... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں
کشادگی کو بھر دیا ہے ... کائنات کا ہر مسئلہ
اس کے پیشِ نظر ... ایک للکار ہے۔

ان عاشق پروانوں کا ماجرائے خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار کر رہے تھے لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا... جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ میڈم صفورا کی چھوٹی بہن نادیہ عمران پر بُری طرح فریفتہ ہو گئی۔ عمران کے ہاتھوں نادیہ کی موت کے بعد میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے میں اوجھل ہو گیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیرے نے میری والدہ کو مجبور کر دیا کہ وہ موت کو گلے لگا لیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اترپردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور جل پانی۔ بعدازاں مجھے زرگاں میں پگوڈا پہنچا دیا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کر دیا گیا۔ یہاں میری میڈم صفورا سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے پگوڈا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا۔ ہمیں ایک عجیب و

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ بعد ازاں ہمیں پتا چلا کہ وہ جوڈو کراٹے کا نامی چیمپئن ہے۔ ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ میں ساتھیوں سے الگ ہو گیا اور بارونداجنکی تک جا پہنچا۔ مجھے اور جنکی کو نل پانی چھوٹے سرکار کے دیوان میں پہنچا دیا گیا۔ سلطانہ ایک دن خاموشی سے دیوان سے نکل گئی۔ سلطانہ کی تلاش کے دوران ہم شکنتلا تک پہنچ گئے۔ شکنتلا کو دیوان لے آیا گیا۔ جنکی کی حالت خراب تھی۔ جنکی نے دم توڑ دیا۔ ادھر زرگاں میں تین بندے قتل ہونے پر سلطانہ کو پکڑ لیا گیا۔ میں ایک ہندو فیملی کے گھر چلا گیا۔ رام پرشاد کے بیٹے ستیش کا تعلق انتہا پسند ہندو تنظیم سے تھا۔ پھر ایک روز ستیش نے بتایا کہ سلطانہ کو سزا دینے کا وقت آن پہنچا ہے۔ ستیش کے مطابق سلطانہ کو زندہ جلایا جانا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ وہاں عمران کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس نے کہا کہ ہم سلطانہ کو وہاں سے نکال لیں گے۔ عمران اکیلا نہیں تھا بلکہ اقبال بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم وہاں سے فرار ہوئے اور ایک چھوٹی سی بستی میں جا پہنچے۔ میرا آپریشن ہو گیا اور میری گردن سے وہ منحوس چپ نکال دی گئی۔ میں اور عمران میڈم صفورا کے پاس پہنچ گئے۔ میڈم کا رویہ فی الحال ہمارے ساتھ ٹھیک ہو گیا۔ پھر میں نے جارج گورا کو سامبر کا چیلنج کر ڈالا۔ سامبر کی تاریخ دے دی گئی۔ میں نے ایک روز عمران کو اپنی کہانی سنانے کو کہا۔ عمران کی کہانی نے مجھے افسردہ کر دیا۔ پریوں کے چناؤ کے بعد عمران نے وہاں بونکوں پر کھڑا ہونے کا کرتب دکھایا اور مقابلہ جیت لیا۔ رتنا دیوی عمران سے متاثر ہوئی اور انعام میں ایک جرمن جیپ دی۔ پھر سامبر مقابلے والا دن آ گیا۔ میں نے جارج کو جہنم واصل کر دیا۔ زخمی ہونے کے باعث مجھے زرگاں کے سرکاری اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ عمران نے راہزنی کی واردات کا ڈراما کر کے انعام میں ملنے والی جیپ غائب کر دی پھر ہمیں حمیدہ سمیت زرگاں سے نکلنے کا راستہ دیا گیا۔ مگر حکم کے سپاہی ہمارے پیچھے آنے لگے۔ تاہم اس موقع پر عمران کی چھپائی ہوئی جیپ ہمارے کام آئی اور ہم اپنے تعاقب میں آتے والوں کو جل دینے میں کامیاب ہو گئے اور بخیریت مندر کے تہ خانے میں پہنچ گئے۔ پھر وہاں رہتے ہوئے میں نے سلطانہ کو آفتاب سے چوری چھپے ملتے دیکھا۔ میں نے سلطانہ اور آفتاب کا پیچھا کیا۔ سلطانہ ایک مندر میں چلی گئی۔ ہم نے آفتاب سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ بھاگ نکلا۔ اچانک مندر کے باہر گولی چلنے کی آواز گونجی۔ میں نے لپک کر کسی کو گھوڑا گاڑی میں گھستے دیکھا۔ گھوڑا گاڑی ایک احاطے میں رک گئی۔ یہ گاؤں کا شفاخانہ تھا۔ یہ سلطانہ اور آفتاب تھے۔ انہوں نے وہاں موجود مریضوں اور اسٹاف کو یرغمال بنا لیا اور اپنی باتیں منوانے کے لیے آفتاب نے ایک ایک کر کے یرغمالیوں کو مارنا شروع کر دیا۔ حکم کے سپاہیوں نے اسپتال کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ آفتاب، ہاشم رازی کو رہا کروانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر لی وان بھی یرغمالیوں میں شامل تھا اور آفتاب کے بات نہ ماننے کی وجہ یہ تھی کہ اس جگہ ماریا موجود تھی جو اب آفتاب کے قبضے میں تھی۔ ہاشم رازی کو بحفاظت اسپتال پہنچا دیا گیا۔ ہمیں کھیت میں بھرت نامی نوجوان ملا جو ہمیں اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ پھر عمران نے بھرت کے ہاتھ انگریز افسر کو ملاقات کا پیغام بھیجا اور ہماری اس سے ملاقات ہوئی۔ عمران نے اسے اپنی باتوں سے قائل کر لیا کہ وہ سلطانہ کے بدلے ماریا کو وہاں سے بحفاظت نکال سکتا ہے۔ انگریز افسر راضی ہو گیا اور ہمیں خاموشی سے اسپتال کے قریب ایک گھر میں پہنچا دیا گیا۔ یہ فیصلہ کن لمحے تھے۔ عمران نے ہاشم پر گولی چلا دی۔ ہاشم مارا گیا تاہم عمران آفتاب سے بات کر کے اس سے مذاکرات کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سلطانہ بھی چھوٹی نال والی رائفل کے ساتھ موجود تھی۔ اچانک کہیں سے فائر ہوا۔ آفتاب کو گولی لگی۔ آفتاب نے بھی فائر کھول دیا اور ماریا ماری گئی۔ درجنوں مسلح کمانڈوز نے بھی گولیوں کی برسات کر دی۔ آفتاب بھی مارا گیا۔ ہم سلطانہ کو بچانا چاہتے تھے مگر انگریز افسر نے دھوکے سے سلطانہ کو باہر بلا کر اسے بھی مار ڈالا۔ ہمیں زرگاں کی جیل میں پہنچا دیا گیا۔ زرگاں کے حالات ٹھیک نہیں تھے۔ یہاں بغاوت ہو گئی تھی اور زوروں کی لڑائی ہو رہی تھی۔ پھر انور خاں بھی زخمی حالت میں پکڑا گیا۔ بھرت بھی جھوٹے الزام میں قید تھا۔ ہمیں جیل سے قاسمیہ چوک لے جایا گیا۔ ہمیں سولی چڑھایا جانا تھا۔ اچانک طلال فائرنگ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ ہم بھی حرکت میں آ گئے۔ خیارڈ اور اسٹیل مارے گئے۔ ہم وہاں سے نکل کر پرانے قلعے میں آ گئے۔ یہاں کے لوگوں نے مورچے بنا لیے تھے۔ ستیش اور مالا بھی قلعے میں پہنچ گئے۔ پھر وہاں گیتا مکھی بھی آ گئی۔ اس نے عمران کو کوئی خاص جانکاری دی۔ معلومات کے مطابق قلعے کی فصیل ایک جگہ سے کمزور تھی۔ اس اہم معلومات کے بعد وہاں ایک خندق کھود دی گئی۔ ہم پر حکم کے فوجیوں کی طرف سے حملہ ہو گیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر لڑائی قلعے کے قریب پہنچ گئی۔ اسی دوران میں قلعے کے برآمدے سے گیتا مکھی کی تشدد زدہ لاش ملی۔ یہ کوئی اندرونی سازش تھی۔ ہم لوگ شفاخانے گئے تو وہاں زخمیوں کے بیچ رنجیت پانڈے موجود تھا۔ اس نے ہمیں گن پوائنٹ پر لے لیا۔ اس نے مزاحمت کرنے والے زخمیوں اور چوہان کو بھی گولی مار دی اور ہمیں انور خاں کے کمرے میں لے آیا۔ اس سازش میں عبدالرحیم اس کا دستِ راست تھا۔ اس نے انور خاں کے گلے میں کڑا ڈال دیا جو کہ بم ڈیوائس تھی۔ وہ ہم سے قلعے کا دروازہ کھلوانا چاہتا تھا۔ تاہم ہم نے رنجیت پانڈے کو ہلاک کر دیا۔ پھر وہاں موجود قیدی انگریزوں سے ڈیوائس کا کوڈ لگا کر اسے بند کیا گیا۔ پھر چھوٹے سرکار کی طرف سے ہمیں کمک مل گئی اور ہم لڑائی جیت گئے۔ حکم کو گرفتار کر لیا گیا اور ایڈرسن مارا گیا۔ بھرت اس لڑائی میں زخمی ہو کر اسپتال میں داخل تھا۔ مالا نے عمران کو بتایا کہ اس کی دادی ساس تین عورتوں کی بلی دے کر ایک خطرناک رسم ادا کرنا چاہتی ہے تاہم عمران اور ہم موقع پر پہنچ گئے اور یہ خطرناک کام ہونے سے رک گیا لیکن اس دوران بڑی ماتا سیڑھیوں سے گر کر ہلاک ہو گئی۔ ہم لوگ چھوٹے سرکار کے تعاون سے زرگاں سے نکلے اور طویل سفر کے بعد اللہ آباد پہنچ گئے مگر وہاں ہمیں ایک نئی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ مجھے اور عمران کو ڈی ایس پی سجاد نے گرفتار کر لیا اور ہمیں اپنی رہائش گاہ پر لے گیا جہاں اس نے نجی ٹارچر سیل بنایا ہوا تھا۔ ہم پر تشدد بھی کیا گیا۔ عمران کچھ سال پہلے یہاں آیا تھا اور اس نے منوج نامی شخص کو گولیاں مار کر زخمی کر دیا تھا جو بعد ازاں ہلاک ہو گیا تھا۔ عمران وہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ اسی سلسلے میں ہمیں پکڑا گیا تھا۔ سجاد کی بیوی عمران کو جانتی تھی اور اس کی مدد کرنا چاہتی تھی مگر عمران نے اسے اس معاملے سے دور رہنے کی ہدایت کی۔ عمران کی گمشدگی کے حوالے سے ایک انگریزی اخبار میں اشتہار دیکھ کر سجاد تفتیش میں لگ گیا اور ہمیں اجنبی لوگوں کے حوالے کر دیا گیا۔ ہمارا سفر ایک بند کنٹینر میں شروع ہوا۔ پانچویں روز یہ سفر ختم ہوا۔ ہمیں ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ابھی ہم یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہم کہاں ہیں۔ عمران نے کمرے میں موجود ایگزاسٹ فین کی جالی سے باہر دیکھا۔ وہ دنگ رہ گیا۔ میں بھی وہاں کا منظر دیکھنے پہنچ گیا اور حیران رہ گیا۔ یہ لاہور کا جانا پہچانا آسمان تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

عمران نے کھوپڑی سہلاتے ہوئے کہا۔ ''یار تابی! پاکستان لاہور سے چل کر کھٹمنڈو کیسے پہنچ گیا؟''

میں کیا جواب دیتا۔ میں خود حیرت کے دریا میں بہہ رہا تھا۔ ہماری نگاہیں ایگزاسٹ فین کی جالی سے باہر مینارِ پاکستان کے بالائی حصے پر لگی ہوئی تھیں۔ یہ بالائی حصہ سرسبز درختوں کی ہریالی کے درمیان سے باہر نکلا ہوا تھا۔ ہم منٹو پارک کے آس پاس کہیں موجود تھے۔

میں نے گہری سانس لی... اور مجھے اس سانس میں اپنے پاکستان اور اپنے لاہور کی جانی پہچانی خوشبو صاف محسوس ہوئی۔ یہ خوشبو سینے میں اتری اور پورے جسم میں پھیل گئی۔ میں حیران ہوا کہ اس جاں فزا خوشبو کی طرف میرا دھیان پہلے کیوں نہیں گیا۔ بے شک ہمیں ائرٹائٹ اور تقریباً ساؤنڈ پروف کنٹینر سے نکال کر لایا گیا تھا اور ہماری آنکھوں پر پٹی بھی بندھی ہوئی تھی مگر ہوا تو ہمارے سینوں میں آ جا رہی تھی۔ تب یہ پتا کیوں نہ چلا کہ یہ اپنی دھرتی کی ہوا ہے۔

عمران بولا۔ ''چلو اب الماری سے نیچے آؤ اور میرے ہاتھ پر چٹکی کاٹ کر بتاؤ کہ میں کہیں جاگتی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہا؟''

میں نیچے آ گیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ حیرت اور خوشی کی ملی جلی عجیب سی کیفیت تھی۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''دیکھو، کیسا عجیب تماشا ہوا ہے۔ ہم لاہور آنا چاہتے تھے... اور ہمیں پکڑ کر زبردستی جس جگہ لایا گیا ہے، وہ بھی لاہور ہی ہے۔''

''فرق صرف اتنا ہے کہ ہمارے ساتھ باقی لوگ نہیں ہیں۔ اقبال، میڈم اور بالو وغیرہ۔''

بالو کے ذکر نے مجھے ایک بار پھر پریشان کر دیا۔ کچھ پتا نہیں تھا وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

اچانک کہیں فاصلے سے رکشے کی جانی پہچانی پھٹ پھٹ ابھری اور اس کے چند ہی سیکنڈ بعد کسی چھت سے ''بوکاٹا'' کی بلند آواز سنائی دی۔ چھت پر چڑھی ہوئی کسی پتنگ باز ٹولی نے کوئی پتنگ کاٹی تھی۔ ان دو آوازوں نے ایک دم لاہور کا سارا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھیلا دیا۔ اس شہر ہزار رنگ کے سارے رنگ نگاہوں کے سامنے کھلتے چلے گئے۔ جانی پہچانی گلیاں، بازار، ریستوران، چوراہے، تفریح گاہیں... اور شام گہری ہو رہی تھی... روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ ایک اور جگمگاتی شب زندہ دلوں کے اس شہر پر وارد ہو رہی تھی۔ میرا دھیان ایک دم اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کی طرف چلا گیا۔ وہ بھی اس شہر کی کسی چار دیواری میں موجود تھے۔ انہی فضاؤں میں سانس لے رہے تھے۔

عمران میرا چہرہ دیکھ رہا تھا، وہ بولا۔ ''فرح اور عاطف کے بارے میں سوچ رہے ہو نا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور میری آنکھوں میں نمی چمک گئی۔

عمران نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تسلی آمیز انداز میں بولا۔ ''میں نے تم سے کچھ غلط نہیں کہا تھا، وہ دونوں یہاں بالکل خیریت سے ہوں گے۔ انشاء اللہ۔''

''میں... انہیں ابھی دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

''تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔''

''یار! میں نے بہت صبر کیا ہے۔ پچھلے تین سالوں کا ایک ایک پل گن گن کر گزارا ہے۔ اب ان کے بالکل پاس آ کر ان سے دور نہیں رہا جاتا۔ جی چاہتا ہے کہ یہ دروازے توڑ کر یہاں سے نکل جاؤں۔ اڑتا ہوا ان کے پاس پہنچ جاؤں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، یہ لوگ اس طرح ہمیں یہاں سے نکلنے دیں گے؟ انہوں نے بہت بڑی رقمیں خرچ کی ہیں ہم پر۔''

''مگر پتا تو چلے کہ یہ ہیں کون؟ کیا چاہتے ہیں ہم سے؟''

''دیکھو، تم پھر خود کو ایڈیٹ ثابت کر رہے ہو۔ کیا پتا ہمارے ان مہربانوں نے اس کمرے میں ہماری باتیں سننے کا انتظام کر رکھا ہو۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے پروا نہیں۔''

''ٹھیک ہے اگر تمہیں نہیں تو پھر مجھے بھی نہیں۔'' اس نے کہا اور بلند آواز میں بولا۔ ''مہربانو، قدردانو! اگر ہماری آواز سن رہے ہو تو ازراہِ مہربانی سامنے آؤ۔ ہمیں بتاؤ کہ ہم اس زبردست مہمان نوازی کے بدلے آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟''

شاید عمران کو بھی توقع نہیں تھی کہ اس کی پکار کا جواب اتنی جلدی مل جائے گا۔ یکایک کمرے کے دروازے سے باہر آہٹیں سنائی دیں اور وہ سلائڈ کر کے کھل گیا۔ ایک درمیانی عمر کا خوش پوش شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی، ساتھ قیمتی کپڑے کا کوٹ تھا اور گلے میں مفلر کو اسکارف کی طرح باندھ رکھا تھا۔

اس شخص کو دیکھ کر عمران کے تاثرات بدل گئے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی اور گرم جوشی کی چمک نمودار ہوئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسری طرف، اندر آنے والا شخص بھی ایک دم جذباتی نظر آنے لگا۔ وہ آگے بڑھا اور عمران سے لپٹ گیا۔ عمران نے کہا۔ ''امید نہیں تھی انکل کہ آپ سے اتنی جلدی ملاقات ہو جائے گی۔''

دونوں کچھ دیر گلے..... لگے رہے اور ایک دوسرے کے کندھے تھپکتے رہے۔ تب عمران نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تابی! ان سے ملو، یہ ہیں انکل جان محمد۔ اور انکل، یہ تابش ہے۔ یہ سرکس میں تین چار بار میرے ساتھ آیا تھا مگر آپ سے ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔''

میں پُرتجسس نظروں سے جان محمد صاحب کو دیکھتا چلا گیا۔ زرگاں میں جشن کی رات، عمران نے مجھے جو اپنی طویل روداد سنائی تھی، اس میں جان صاحب کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا تھا۔ یہ اسٹار سرکس کے مالک جان صاحب ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے عمران کی خداداد صلاحیتیں پہچانی تھیں اور اس کی قدر کی تھی۔ انہوں نے عمران کو ''راجا'' کے چکر سے نکال کر اپنی سرکس کمپنی میں معقول مشاہرے پر ملازمت دی تھی اور قدم قدم پر اسے سہارا دیا تھا۔ بعدازاں عمران نے بھی اپنے محسن کی خیرخواہی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ اس کی کوششوں سے اس سرکس کمپنی نے ترقی کی کئی منزلیں طے کی تھیں۔

جان صاحب مجھ سے بھی بغل گیر ہوئے اور میرے سر پر دستِ شفقت رکھا۔ انہوں نے کہا۔ ''تابش! تم کسی تعارف کے محتاج نہیں ہو۔ تمہاری خاطر عمران ایک سال سے زیادہ عرصے تک ہماری نظروں سے غائب رہا ہے۔ خوشی کی بات ایک ہی ہے... اور وہ یہ کہ اس کی تلاش بیکار نہیں گئی۔ تم اس کے ساتھ ہو۔''

رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد ہم آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جان صاحب نے عمران سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''کہنے اور سننے کو تو بہت کچھ ہے عمران... اور ہم دونوں کے ذہنوں میں بہت سے سوال بھی ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں، تمہارے ذہن میں جو سب سے اہم سوال ہے، وہ یہی ہوگا کہ تمہیں اس طرح یہاں پاکستان لانے والا کون ہے اور کیوں لایا ہے؟''

''ہمیشہ کی طرح آپ کا خیال درست ہے انکل۔'' عمران نے جواب دیا۔ ''لیکن اس سے بھی پہلے مجھے یہ بتائیں کہ آنٹی کیسی ہیں اور کہاں ہیں؟''

''وہیں خوشاب میں ہے اور میری طرح وہ بھی تمہیں بے حد بے حد مس کرتی رہی ہے۔ تم بھی تو گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہوئے۔ کوئی اتا پتا نہ خیر خبر۔ یہ کوئی پرانا دور تو نہیں ہے کہ بندہ اپنے بارے میں ایک اطلاع بھی نہ دے سکے...''

عمران دلکش انداز میں مسکرایا۔ ''جہاں ہم تھے، وہ پرانا دور ہی تھا انکل۔ سمجھ لیں کہ آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے انگریزوں کا دور تھا۔ خچر، گھوڑا گاڑیاں، لالٹینیں اور تلواریں۔ ایک ایسی جزیرے جیسی جگہ تھی جہاں سے ہم باہر نہیں آسکتے تھے اور نہ ہماری خبر آسکتی تھی۔ یہ لمبی کہانی ہے، آپ کو آرام سے سنائیں گے۔''

''تم اللہ آباد جیسے جدید شہر کو پرانے دور کا جزیرہ کہہ رہے ہو؟'' جان صاحب نے پوچھا۔

''اللہ آباد اس کے مقابلے میں پیرس ہے جناب۔ میں کسی اور جگہ کی بات کر رہا ہوں... اللہ آباد تو ہم بس آٹھ دس روز پہلے پہنچے تھے۔ وہاں پہنچ کر ٹھیک سے کمر بھی سیدھی نہیں کی تھی کہ اٹھا لیے گئے۔''

جان محمد صاحب کے تاثرات سے پتا چلتا تھا کہ ان کے اندر تجسس بڑھتا جارہا ہے، تاہم اس موقع پر وہ بات کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے کرسی کی آرام دہ نشست سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''عمران! میں تو پچھلے قریباً ایک سال ہی سے تمہیں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر زور و شور سے تمہاری تلاش کوئی تین مہینے پہلے شروع ہوئی تھی۔ اس تلاش کو شروع کرنے والا ایک ایسا شخص ہے جسے تم جانتے نہیں ہو۔ وہ پاکستانی بھی نہیں ہے۔ اس سے مل کر تمہیں ضرور حیرت ہوگی۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پہنچنے والا ہے۔''

''کوئی تھوڑا بہت اشارہ تو دیں؟''

''وہ بہت مال دار برطانوی باشندہ ہے لیکن وہ شکل سے تمہیں برطانوی نظر آئے گا اور نہ ہی مال دار... بلکہ اس کے بارے میں کوئی بھی اندازہ لگانا تمہارے لیے بہت مشکل ہوگا۔ اسے تمہاری بہت سخت ضرورت ہے اور یہ ضرورت ہی ہے جس کی وجہ سے اس نے پچھلے چند مہینوں میں تمہاری تلاش پر پانی کی طرح پیسا بہایا ہے۔ انڈیا کوئی چھوٹا ملک نہیں ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کونے کونے میں تمہاری تلاش ہوئی ہے۔ پولیس اور انٹرپول کے علاوہ پرائیویٹ اداروں سے مدد لی گئی ہے۔ اخباروں میں بڑے بڑے اشتہار دیے گئے ہیں۔ ہر ممکن ذریعہ استعمال کیا گیا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اب بھی اللہ آباد کی اس پارٹی کو قریباً پچاس لاکھ روپیا دیا گیا ہے جس کی تحویل میں تم دونوں

تھے۔''

''اوہ گاڈ!'' عمران نے دیدے پھاڑے۔ ''یعنی اس کھڑوس اللہ آبادی ڈی ایس پی اور اس کے مچھندر یاروں کو میرے لیے پچاس لاکھ روپیا دے دیا گیا؟''

''مجھے زیادہ نہیں معلوم۔ بس اتنا پتا ہے کہ وہ کوئی مقامی پولیس والا تھا اور اس نے تم دونوں کو پکڑ کر کسی نجی جگہ پر رکھا ہوا تھا۔ ابھی گرفتاری وغیرہ نہیں ڈالی تھی تمہاری۔ اس نے جو مانگا، اسے دے دیا گیا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ڈبل بھی مانگتا تو دے دیا جاتا۔''

''اوہ گاڈ! یہ بالکل بیکار کا خرچہ کردیا آپ لوگوں نے۔ ہم نے تو لاہور ہی پہنچنا تھا۔ اب نہ آتے تو دس پندرہ روز یا ایک مہینے بعد آجاتے۔'' عمران نے تاسف سے سر ہلایا اور کسی اداس بکرے کی طرح گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔

جان صاحب نے شفقت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور بولے۔ ''اصل قیمت تو ضرورت کی ہوتی ہے عمران... اور ریان صاحب کو تمہاری ضرورت ہے۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے کہ پچھلے مہینے کے شروع میں وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر انڈیا گئے تھے۔ ہم کوئی دو ہفتے تک امرتسر، جالندھر اور چندی گڑھ کے علاقوں میں گھومتے رہے۔ کسی نے ریان صاحب تک یہ غلط اطلاع پہنچائی تھی کہ تمہیں اور اقبال کو وہاں دیکھا گیا ہے... پورے دو ہفتے... اور ریان ولیم وہ شخص ہیں جن کے لیے اپنے کام میں سے دو گھنٹے کا وقت نکالنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔''

''اچھا تو ان کا اسمِ مبارک ریان ولیم ہے۔ میں نے پہلی بار سنا ہے۔''

''تمہیں بتایا تو ہے کہ تم انہیں پہلے سے نہیں جانتے لیکن ان کے ساتھ جو دوسرا بندہ ہے، اسے تم ضرور جانتے ہو۔''

''کون ہے؟''

''وہی پروفیسر رچی جس نے تمہارا ٹیسٹ لیا تھا۔ اپنے بڑے کتے سے تمہاری ملاقات کرائی تھی۔ تمہارا لمبا انٹرویو بھی لیا تھا اور تمہاری ویڈیو بھی بنائی تھی۔''

''وہ کیا چاہتا ہے؟''

جان صاحب بولے۔ ''رچی صاحب تو کچھ نہیں لیکن ان کے کہنے پر یہ ریان ولیم بہت کچھ چاہنے لگا ہے۔ اسے ''لک'' کی تلاش ہے اور یہ ''لک'' اسے تم میں نظر آیا ہے۔ وہ ایک بہت بڑا داؤ لگانا چاہتا ہے اور اس داؤ کے لیے اسے تمہاری ''خوش قسمتی'' کی ضرورت ہے۔''

''آپ پہیلیوں میں بات کر رہے ہیں۔'' عمران نے کہا۔

جان صاحب نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر بولے۔ ''میرا خیال ہے کہ میں تابش کے سامنے ہر طرح کی بات کرسکتا ہوں۔''

''یہ میرا ہم زاد بن چکا ہے جناب... بلکہ ہم زاد سے بھی آگے کی چیز ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں فارسی میں... رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی... غالباً یہ مولانا رومی کا مقولہ ہے نا؟''

میں نے کہا۔ ''یہ مولانا رومی کا نہیں ہے اور نہ ہی فارسی کا ہے اور یہ مقولہ بھی نہیں ہے۔ یہ مصرع ہے۔''

جان صاحب نے میری اور عمران کی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر ریان یورپ اور امریکا میں کیسینوز کی ایک بہت بڑی ''چین'' کا مالک ہے۔ ارب پتی شخص ہے لیکن دیکھنے میں وہ تمہیں ایسا نہیں لگے گا۔ جوا خانوں کے کچھ مالکان نے پچھلے دنوں ایک بڑا گیم کھیلنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس گیم کے دو شوز اس سے پہلے ہوچکے ہیں اور خاص حلقوں میں بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ ان شوز کو اسپیشل ٹرانسمیشن کے ذریعے یورپ اور امریکا کے کئی علاقوں میں دکھایا بھی گیا تھا۔ مسٹر ریان ولیم ان شوز میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ نہ صرف انتظامیہ میں شامل ہیں بلکہ ان کے چھوٹے بھتیجے گیری نے پچھلے دنوں دوسرے شو میں حصہ بھی لیا تھا۔ وہ گیم کے پہلے تین مرحلے کامیابی سے طے کرنے کے بعد چوتھے مرحلے میں آچکا ہے۔ یہ فائنل مرحلہ ہے۔ اس مرحلے میں ہر سوال کے ساتھ انعامی رقم دگنی ہوجاتی ہے اور اگر کھیلنے والا صرف تین سوالوں کے درست جواب دے دیتا ہے تو وہ ایک بہت بڑا انعام جیتنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔''

''کچھ اندازہ تو بتائیں؟'' عمران نے ذرا دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

جان صاحب مسکرائے اور تھوڑا سا توقف کر کے بولے۔ ''اس وقت یہ گیم دو ملین ڈالرز پر رکا ہوا ہے۔ پاکستانی کرنسی کے مطابق یہ قریباً پندرہ کروڑ روپیا بنتا ہے۔ بنتا ہے یا نہیں؟''

''بالکل بنتا ہے۔'' عمران نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔

''اب پہلے سوال کا درست جواب دینے سے یہ رقم دگنی یعنی قریباً تیس کروڑ روپے ہوجائے گی... اور صرف دو مزید درست جواب اسے کہاں پہنچائیں گے اس کا اندازہ تم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آسانی سے لگا سکتے ہو۔"

عمران کی آنکھیں ذرا پھیل گئیں۔ "... یعنی ایک سو بیس کروڑ؟"

"بالکل... اور یہ انعام اس سے پہلے بھی ایک بار دیا جا چکا ہے۔ پچھلے سال ہونے والے پہلے گرینڈ شو میں یہ آخری انعام فلپائن کے ایک انیس سالہ لڑکے نے حاصل کیا تھا۔ دوسرے شو میں دو امیدوار تیس کروڑ کے انعام تک پہنچے لیکن اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس سے آگے بڑھنے کے لیے بہت سی ہمت بھی درکار ہوتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" عمران نے پوچھا۔

"اگر بندہ تیس کروڑ سے آگے بڑھنا چاہتا ہے تو پھر اسے ساٹھ کروڑ والے سوال کا جواب دینا ہوگا۔ لیکن اگر یہ جواب غلط ہوا تو پھر اسے تیس کروڑ سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ ایسی صورت میں اسے صرف BASIC انعام ہی ملتا ہے۔ یعنی پچاس لاکھ روپیا... قریباً 65000 امریکی ڈالرز۔ اس گیم کا "فارمیٹ" وہی ہے جو اکثر ٹی وی چینلز پر بھی دیکھا جاتا ہے۔ اس میں انوکھی بات بس ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ آخری انعام نقد رقم کی صورت میں نہیں ہے۔"

"تو کس صورت میں ہے؟"

جان صاحب ذرا سا مسکرائے اور بولے۔ "ایک خوب صورت ائرہوسٹس کی شکل میں... آپ کی خدمت کے لیے چوکس۔ ہر بات پر یس سر کہنے والی..."

"شاید آپ مذاق کر رہے ہیں۔ ایک ارب بیس کروڑ روپے میں ایک ائرہوسٹس۔"

وہ پھر مسکرائے۔ "تم نے ابھی پوری بات نہیں سنی۔ وہ ائرہوسٹس جس لگژری جہاز میں سروس فراہم کرتی ہے وہ جہاز بھی آپ کو ملے گا۔ ایک شاندار فیلکن 900 سی... بڑا کمال کا پرائیویٹ طیارہ ہے۔ قریباً 12 مسافروں کی گنجائش والا۔ اس کو مزید لگژری بنانے کے لیے اس کے انٹیریئر میں کئی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ایک بیڈ روم جس میں زبردست آسائشیں موجود ہیں۔ جدید سہولتوں سے آراستہ ایک نشست گاہ۔ کئی طرح کی اِن ڈور تفریحات۔"

"زبردست... کون دے گا یہ لگژری جہاز؟" عمران کو ابھی تک پورا یقین نہیں آ رہا تھا۔

"وہی لوگ جو میگا شو کرا رہے ہیں۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ یہ کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ دنیا کے "معزز" اور مال دار ترین جواری ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کے پاس اپنے پرائیویٹ طیارے اور تفریحی بجرے ہیں۔ ان لوگوں نے گیم کے گرینڈ پرائز کے لیے ایسے تین جہاز تیار کروائے ہیں۔ ان میں سے ایک تو سب سے پہلے شو میں ہینڈ اوور کیا جا چکا ہے۔ فلپائنی لڑکا اس کا مالک ہے۔ دو جہاز ابھی باقی ہیں۔ ان پر بہت سوں کی رال ٹپک رہی ہے۔ اپنے ریان ولیم صاحب بھی ان میں سے ایک ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کا بھتیجا گیری نہ صرف گیم میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے بلکہ پہلے تین مرحلے کامیابی سے طے کر چکا ہے۔ وہ پاکستانی کرنسی کے مطابق تقریباً پندرہ کروڑ جیت چکا ہے۔"

عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اس سلسلے میں، میں ان لوگوں کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"مسٹر رچی اور مسٹر ریان کا خیال ہے کہ تم کر سکتے ہو۔"

"یعنی آپ مجھے ارسطو اور بقراط کا ہم پلہ سمجھ رہے ہیں۔ میں نے دنیا بھر کا جنرل نالج گھول کر پیا ہوا ہے۔ لہٰذا ٹھکا ٹھک تین جواب دے کر رئیس زادے گیری کو فائنل انعام تک پہنچا دوں گا۔ اگر آپ ایسا سوچ رہے ہیں تو یہ بھول ہے۔ میرے جیسے بندے تو کسی عام سے کوئز شو میں جائیں تو انہیں انعام ملنے کے بجائے جرمانہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ ہماری خاندانی "صلاحیت" ہے۔ ایک دفعہ میرے دادا جی طارق عزیز کے نیلام گھر میں گئے تھے، شرمندگی کے باعث آج تک گھر واپس نہیں آئے۔"

جان محمد صاحب نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "ان لوگوں کو تمہارا جنرل نالج یا ذہانت درکار نہیں... تمہاری خوش قسمتی درکار ہے۔"

"وہ کس طرح؟" عمران نے پوچھا۔

جان محمد صاحب نے مہنگے برانڈ کے سگریٹ کا طویل کش لیا اور بولے۔ "شاید تم نے اس طرح کا کوئی ٹی وی شو دیکھا نہیں۔ ان میں سے اکثر شو ایسے ہوتے ہیں جن میں سوالوں جوابوں کا سلسلہ بس رسمی طور پر رکھا جاتا ہے۔ ان "سوالوں جوابوں" کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ جنرل نالج کا پروگرام نظر آئے اور اسے جوئے بازی سے منسوب نہ کیا جا سکے۔ ہر سوال کے جواب کے چار آپشن دیے جاتے ہیں اور دراصل یہی قسمت آزمائی ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جان صاحب پچھلے دنوں الٰہ آباد کے ہوٹل میں، میں نے ایک ٹی وی چینل پر ایسا شو دیکھا تھا۔ بے معنی سے سوال تھے۔ مثلاً دیے گئے مریض کیا کھائے گا تو بیمار ہو جائے گا۔ آپشن نمبر 1...... دال پراٹھا... آپشن 2... اچار پراٹھا... آپشن 3... انڈا پراٹھا... آپشن 4... ٹھنڈا پراٹھا۔"

"بالکل ٹھیک۔" جان محمد صاحب نے کہا۔ "ایسے پروگراموں میں اکثر سوال تو صرف خانہ پُری کے لیے ہوتے ہیں۔ اصل چیز قسمت آزمائی ہی ہوتی ہے۔ اسے عام زبان میں تکا لگانا کہتے ہیں۔ جس میگا شو کی میں بات کر رہا ہوں، اس میں بھی اصل چیز قسمت آزمائی ہی ہے۔ مثلاً پچھلے میگا شو میں جس سوال پر ایک ڈچ خاتون نے تقریباً تیس کروڑ جیتے، وہ یوں تھا۔ مختلف پیش گوئیوں کے مطابق قیامت 2012ء میں آسکتی ہے۔ آپ کے خیال میں قیامت کب آئے گی؟ 2012 میں؟ 2013ء میں؟ 2090ء میں؟ 2113 میں؟ یہ سراسر قسمت آزمائی کا سوال تھا۔ مگر یہ بڑی اعصاب شکن قسمت آزمائی ہے۔ اندازہ اس بات سے لگا لو کہ اس کھیل کے ایک "پارٹی سی پینٹ" اور تین تماشائیوں کو باقاعدہ ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے۔"

"تو آپ کا کہنا ہے کہ مسٹر رچی اور مسٹر ریان یہ قسمت آزمائی مجھ سے کرانا چاہتے ہیں؟"

"بالکل ایسا ہی ہے۔ اسی لیے پچھلے تین ماہ سے تمہاری تلاش زور و شور سے جاری ہے۔ مسٹر ریان کا یقین ہے کہ کچھ لوگ پیدائشی طور پر بہت "لکی" ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں کرامات ہوتی ہیں۔ وہ جو پانسا پھینکتے ہیں، وہ سیدھا پڑتا ہے... یا امکان ہوتا ہے کہ وہ سیدھا پڑے گا۔ مسٹر رچی یہاں تم سے پاکستان میں مل چکے تھے۔ انہوں نے سرکس میں تمہارے اسپیشل شوز کے بارے میں بھی سب کچھ سن رکھا تھا۔ پستول اپنے اوپر تان کر تم جو دو چھ اور تین چھ والا دیوانہ کھیل کرتے ہو، اس کے بارے میں بھی انہیں ساری معلومات حاصل تھیں۔ انہوں نے مسٹر ریان ولیم کو تمہارے بارے میں بتایا اور وہ تمہاری تلاش میں لگ گئے۔ دوسرے اور تیسرے شو کے درمیان تقریباً چھ سات مہینے کا وقفہ موجود تھا اور مسٹر ریان کو یقین تھا کہ وہ اس عرصے میں تمہیں ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان کی یہ توقع پوری ہوئی بلکہ بالکل آخری وقت میں پوری ہوئی۔"

"عجیب کہانی سنا رہے ہیں آپ۔" عمران نے کھوپڑی سہلائی۔ "یا تو یہ ریان نامی بندہ سنکی ہے یا بہت پہنچا ہوا لگتا ہے۔ ایک انجان شخص کی "لک" پر اتنا زیادہ یقین... اسے کیا پتا کہ میں خوش قسمتی اور بدقسمتی کا کتنا بڑا ... ہوں..."

میں نے اس کی بات اُچکتے ہوئے کہا۔ "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی جان صاحب! کیا عمران اس گیری نامی نوجوان کی جگہ یہ گیم کھیلے گا؟"

"نہیں... گیم تو گیری ہی کھیلے گا۔ عمران اس کی ہیلپ کر سکے گا۔ ایسے گیمز میں تین لائف لائنز ہوتی ہیں۔ اس میں بھی تین لائف لائنز ہیں۔ لیکن یہ تینوں لائف لائنز ایک ہی طرح کی ہیں۔ وہ یہ کہ کھیلنے والا تین بار اپنے کسی دوست سے ٹیلی فونک رابطہ کر کے اس سے مدد لے سکتا ہے۔ اس کے ذریعے سوال کا جواب دے سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تُکّا لگا سکتا ہے۔ اب ریان ولیم صاحب یہ چاہتے ہیں کہ یہ تُکّا لگانے والی قسمت آزمائی عمران کرے۔"

"اور اس کے لیے انہوں نے میری تلاش پر لاکھوں لٹا دیے۔ پچاس لاکھ انڈین روپیا تو اس جنونی الٰہ آبادی ڈی ایس پی کو ہی دے دیا گیا۔" عمران نے کہا۔

"یہ ریان صاحب کے لیے ہرگز مہنگا سودا نہیں تھا۔ وہ پولیس والے تمہارے لیے دگنا یا سہ گنا بھی مانگتے تو ریان صاحب دے دیتے۔ انہیں جب کسی بات کا یقین ہو جاتا ہے تو پھر وہ اس یقین سے پیچھے نہیں ہٹتے... اور پروفیسر رچی انہیں یقین دلا چکے ہیں کہ تمہاری شان دار "لک" اس کھیل میں کام دکھا سکتی ہے۔"

"اور اگر اس نے کام نہ دکھایا تو پھر؟" عمران نے پوچھا۔

"ایسے کاموں میں یہ "اگر" ہی تو اصل تھرل ہوتا ہے۔ تم سرکس میں کیا کرتے رہے ہو عمران؟" جان صاحب نے پوچھا پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولے۔ "میرے بار بار منع کرنے کے باوجود تم ان اسپیشل شوز میں حصہ لیتے رہے ہو جن میں کسی بھی وقت جان کے لالے پڑ سکتے تھے... میں نے ایک حد تک تمہیں روکا پھر خاموش ہو گیا۔ میں جانتا تھا اور اب بھی جانتا ہوں کہ تم باز نہیں آؤ گے۔ تم یہ سب کچھ میرے سرکس میں نہیں کرو گے تو کسی اور جگہ کر لو گے... اور ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ خطرناک تماشے کرو۔ ان سب تماشوں میں "اگر" کے لفظ کی خاص اہمیت ہوتی ہے... دیکھنے والا سوچتا ہے اگر یہ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ اگر وہ ہو گیا تو کیا ہوگا... یہاں اس گیم میں بھی یہ "اگر" ہی سب سے بڑا تھرل ہے۔"

ابھی جان محمد صاحب کی بات مکمل ہوئی ہی تھی کہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر جدید دروازے نے بے آواز سلائڈ کیا اور مسلح محافظ کے ہمراہ ایک شخص اندر داخل ہوا۔ وہ گوشت کے پہاڑ جیسا تھا۔ تاہم بہت فربہ لوگوں کی طرح اس میں سستی نظر نہیں آتی تھی... وہ تھری پیس سوٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ملبوس بڑی سہولت سے قدم اٹھاتا ہوا اندر آ گیا۔ اس کی صورت دیکھ کر تھوڑا بہت اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ برٹش ہے۔ وہ بالکل عام سے خدوخال کا شخص تھا۔ اگر اسے اس کے قیمتی لباس سے علیحدہ کر دیا جاتا تو اسے کسی ہوٹل کا ہیڈ خانساماں یا پھر کوئی ٹرک ڈرائیور سمجھا جا سکتا تھا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی مسکراتی آنکھوں سے اس نے بغور عمران کو دیکھا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس کے انداز میں گرم جوشی تھی۔ عمران کے بعد مجھ سے مصافحہ کیا گیا۔ ''میں ریان ولیم ہوں۔'' اس نے خود اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ میرا دوست اور میرا گارڈ یوراج سنگھ ہے۔''

یوراج سنگھ نے بھی ہم سے مصافحہ کیا۔ وہ ایک مضبوط جسم اور عقابی آنکھوں والا پچیس چھبیس سالہ نوجوان تھا۔ ہم سب لوگ نشستوں پر بیٹھ گئے۔ مصروف کاروباری لوگوں کی طرح ریان ولیم نے ایک اچٹتی سی نظر اپنی کلائی کی گھڑی پر ڈالی اور عمران سے مخاطب ہو کر برٹش اسٹائل کی انگریزی میں بولا۔ ''تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی مسٹر ایمران۔ میرے دماغ میں اس بارے میں بہت تجسس ہے کہ تم اچانک پاکستان سے غائب کیوں ہوئے اور اتنا عرصہ کہاں رہے۔ بہرحال، یہ تمہارے ذاتی معاملات ہیں اور میں اپنے تجسس کی خاطر تمہارا اور اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ میرے لیے خوشی کی بات بس یہ ہے کہ تم ہمیں مل گئے ہو اور ہمارے سامنے بیٹھے ہو۔''

''میرے لیے بھی خوشی کی بات ہے کہ آپ مجھ ناچیز کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں۔'' عمران نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔

''مجھے امید ہے کہ مسٹر جان محمد نے تمہیں کافی کچھ بتا دیا ہوگا اور تم نے سمجھ بھی لیا ہوگا... مسٹر ایمران! دراصل میں ان لوگوں میں سے ہوں جو تدبیر سے زیادہ ''لک'' پر یقین رکھتے ہیں اور آج اس چالیس سال کی عمر میں، میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنے اس یقین کی وجہ سے میں نے زندگی میں بہت سی کامیابیاں سمیٹی ہیں۔ میرا اس بات پر ایمان ہے کہ قدرت نے اس دنیا میں کچھ لوگوں کو دوسرے لوگوں سے زیادہ خوش قسمت بنایا ہوتا ہے۔ اپنے اس خداداد وصف کی بدولت وہ بدترین خطرات سے بچ نکلتے ہیں۔ مشکل ترین حالات میں رستے ڈھونڈ لیتے ہیں اور کامیابیوں کو اپنی طرف کشش کرتے ہیں۔ اس مہینے کی اٹھائیس تاریخ کو یہاں اس شہر میں جو میگا شو ہونے جا رہا ہے، اس میں بھی سارا کھیل خوش بختی کا ہے۔ جو سوال پوچھے جانے والے ہیں، وہ اتنے مشکل ہوں گے کہ فہم و فراست سے ان کا جواب دینا شاید ناممکن ہو گا۔ وہ صرف چانس ہوگی اور دیکھنا یہ ہوگا کہ بہترین چانس کون کرتا ہے۔''

''کیا اس گیم میں کوئی اور بھی حصہ لے رہا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

مسٹر ریان نے اپنا بڑا سر اثبات میں ہلایا۔ ''پچھلا شو قریباً سات ماہ پہلے ہوا تھا۔ اس میں میرا بھتیجا گیری کھیل رہا تھا جب شو کا مقررہ وقت ختم ہو گیا تھا۔ اب اٹھائیس تاریخ کو جو شو ہونے جا رہا ہے، اس میں سلسلہ وہیں سے جڑے گا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ یعنی گیم کا چوتھا مرحلہ شروع ہو گا۔ اس مرحلے میں اگر تین سوالوں کے جواب درست ہو گئے تو ہم فائنل انعام تک پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد جس کھلاڑی کی باری آئے گی، وہ ایک امریکن لڑکی ہے۔ میرے کاروباری حریف مسٹر بفیلو کی اکلوتی بیٹی ماریانی۔ بہت ہوشیار، بہت ذہین اور قسمت کی دھنی بھی۔ اس نے ہوٹلنگ اور کیسینوز کے کاروبار میں کئی ڈپلومے لے رکھے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے مقابلے میں میرا بھتیجا کچھ زیادہ لکی نہیں ہے۔ حالانکہ وہ بھی پڑھا لکھا ہے اور اچھی ملازمت کرتا ہے لیکن لکی ہونا بالکل اور بات ہے۔''

''اور یقیناً آپ چاہتے ہوں گے کہ آپ کے کاروباری حریف کی بیٹی آپ کے بھتیجے سے آگے نہ نکل جائے۔''

''بالکل، میں اس حقیقت کو چھپا نہیں رہا۔ ایک طرح سے یہ گیم میرے لیے دُہری اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ ایک اہمیت تو سولہ ملین امریکی ڈالرز کی ہے اور دوسری اپنے کاروباری حریف کو نیچا دکھانے کی۔''

عمران نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے مجھے بہت فکرمند کر دیا ہے جناب۔ اگر میں آپ کی توقعات پر پورا نہ اتر سکا تو کیا ہوگا؟''

''تم اترو گے۔ ضرور اترو گے۔ مجھے یقین ہے۔'' ریان ولیم نے عجیب ہیجانی لہجے میں کہا۔ ''لک کا ہونا ایک بہت سالڈ چیز ہے۔ یہ کوئی خیالی بات نہیں۔''

جان محمد صاحب نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر ریان! عمران اور تابش ایک طویل عرصے کے بعد پاکستان آئے ہیں۔ تابش اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے بے چین ہوگا۔ کیا وہ ان سے ملنے کے لیے جا سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں۔'' ریان ولیم نے کہا۔ ''ان دونوں پر کوئی پابندی نہیں۔ خاص طور سے تابش پر تو بالکل بھی نہیں۔

آپ اسے جہاں چاہے لے جا سکتے ہیں۔ ہاں، آپ نے کہا تھا کہ ان کی دشمنی وغیرہ ہے۔ اگر کوئی سیکیورٹی کا مسئلہ ہے تو پھر آپ ذرا احتیاط کریں۔ میں نہیں چاہتا کہ اٹھائیس تاریخ تک کسی بھی طرح کی گڑبڑ سامنے آئے۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ میں اس کی ذمے داری لیتا ہوں۔'' جان محمد صاحب نے کہا۔

☆☆☆

لاہور سے ملنا... لاہور کے گلی کوچوں سے ملنا اور پھر عاطف اور فرح سے ملنا میرے لیے جاگتی آنکھوں کے خواب جیسا تھا۔ مجھے بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ یہ بے بہا خوشی میرے حصے میں آ رہی ہے۔ میں ایک طویل مدت تک اپنے دیس کی فضاؤں اور خوشبو کے لیے تڑپا تھا۔ میں نے اپنے پنجرے میں پھڑپھڑا کر اپنے پر زخمی کر لیے تھے۔ خود کو لہولہان کر لیا تھا اور آخر اپنے دوست عمران کی مدد سے یہ پنجرہ توڑنے میں کامیاب رہا تھا۔ میں جان صاحب اور عمران کے ساتھ ایک بند اسٹیشن ویگن میں سوار تھا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ اسکول سے چھٹی کرنے والے بچے مختلف گاڑیوں میں یا پھر پیدل گھروں کا رخ کر رہے تھے۔ بازاروں میں رونق تھی۔ سڑکوں پر زندگی رواں تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا، میں گاڑی سے اتر جاؤں۔ ان جانے پہچانے کوچوں میں پاپیادہ چلوں۔ شاہراہِ قائداعظم، میکلوڈ روڈ اور نسبت روڈ کی رواں دواں گہما گہمی میں گم ہو جاؤں۔ یوں اس زندگی کا حصہ بنوں کہ جان صاحب اور عمران مجھے ڈھونڈتے رہ جائیں۔

ہم لوئر مال روڈ سے گزرے۔ کچھ بھولے بسرے نظارے نگاہوں میں تازہ ہو گئے۔ مجھے لگا میرا بدترین دشمن، میری ماں کا قاتل، میری ہنستی بستی زندگی تاراج کرنے والا سیٹھ سراج یہیں کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔ ان فضاؤں میں سانس لے رہا ہے۔ اور وہ راشی تھانے دار اشرف اور ان کا سرپرست ایم این اے گورایا۔ میرے بدن میں چنگاریاں سی پھیل گئیں۔ بائیں طرف مڑنے والی یہی وہ سڑک تھی جو دو تین کلومیٹر آگے ایک چلڈرن پارک تک پہنچتی تھی۔ ساڑھے تین چار برس پہلے اسی چلڈرن پارک میں وہ واقعہ ہوا تھا جس نے میری زندگی کا رخ بدلا اور مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس چلڈرن پارک میں سیٹھ سراج اور اس کے غنڈوں نے ایک شریف کمزور نوجوان کو بیدردی سے مارا تھا۔ اسے نیم برہنہ کیا تھا، زمین پر گھسیٹا تھا اور وہ شرمیلا سا بے چارہ سا نوجوان اس بے عزتی کو برداشت نہیں کر پایا تھا۔ گھر واپس نہیں گیا تھا۔ ریلوے لائن کی طرف چلا گیا تھا... اپنا سر ریل کے پہیوں کے نیچے رکھنے کے لیے۔ پھر وہ ریل کے پہیوں سے تو بچ گیا تھا مگر گردشِ دوراں سے نہیں بچ پایا تھا۔ ہواؤں میں تنکے کی طرح اڑتا کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اس کی ماں بچھڑی، بہن اور بھائی بچھڑے اور وہ عزیز ہستی بچھڑی جو اس کی رگِ جاں میں بستی تھی۔ وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ بس آنکھوں میں آنسو لے کر ٹک ٹک دیکھتا رہا۔ اپنی بربادی کا نوحہ کرتا رہا... لیکن آج... آج وہ نوجوان کمزور اور بے بس نہیں تھا۔ وہ بدل چکا تھا۔ حالات کی بے رحم بھٹی نے اسے پگھلا کر ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ وہ مرنا اور مارنا سیکھ گیا تھا۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتا تھا۔ اور اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ اس کے پاس عمران جیسا بے مثل ساتھی اور غم خوار تھا۔ وہ اس کے کندھے سے کندھا ملا کر بڑی سے بڑی مصیبت کا رخ بدل سکتا تھا۔

میرا جی مچل اٹھا۔ میرا دل چاہا آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے میرا سامنا سیٹھ سراج سے ہو جائے۔ اس کی تنی ہوئی گردن، اس کی مغرور پیشانی، اس کی کینے سے بھری ہوئی آنکھیں، سب کچھ میرے سامنے آئے۔ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالوں اور کہوں۔ ''میں آ گیا ہوں سراج! میرا نام تابش ہے اور میں ایک بیٹا ہوں۔''

عمران نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے تھپکا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو۔ ''حوصلہ رکھو جگر... وہ سب کچھ ہوگا جو تم سوچ رہے ہو۔''

بھانڈیل اسٹیٹ میں عمران نے مجھے بتایا تھا کہ میری والدہ کے قتل کے بعد اس نے عاطف اور فرح کو راولپنڈی میں رکھا تھا لیکن اب وہ ہمیں ان سے ملانے کے لیے لاہور ہی کے کسی علاقے میں لے جا رہا تھا۔ وہ ہمیں شہر کے جنوبی علاقے میں ایک جدید رہائشی بستی میں لے آیا۔ باؤنڈری وال اور سیکیورٹی انتظامات والی اس وسیع بستی میں بیشتر گھر دو اور چار کینال کے تھے۔ ہم دو کینال کے ایک خوب صورت گھر میں داخل ہوئے۔ یہاں باقاعدہ گارڈ موجود تھا۔ رہائشی حصے کے چاروں طرف خوب صورت ہریالی تھی۔ اس ہریالی کی تراش خراش دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہاں فرح موجود ہے۔ وہ ایسے ہی پودوں کی دیکھ بھال کا خاص شوق رکھتی تھی۔

پروگرام کے مطابق عمران نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اس نے ابھی تک فرح اور عاطف کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگر میں اچانک ان کے سامنے آتا تو انہیں شدید ذہنی شاک لگتا۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا۔ جان صاحب باہر لان میں دھوپ سینکتے رہے۔ قریباً دس منٹ بعد ڈرائنگ روم کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دروازہ کھلا۔ مجھے اپنی پیاری بہن فرح اور بھائی عاطف کی صورتیں نظر آئیں۔ ان دونوں کے چہروں پر ہیجانی کیفیت تھی۔ پھر فرح چلاتی ہوئی بھاگی اور آ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ عاطف نے بھی آگے بڑھ کر مجھے دیوانہ وار بانہوں میں جکڑ لیا۔

ملاپ کا وہ منظر دیدنی تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو کھو کر پایا تھا اور درمیان میں بے یقینی کا ایک بہت طویل وقفہ تھا۔ یہ خوشی اور غم کی ایک ملی جلی یادگار کیفیت تھی۔ میں فرح اور عاطف کی پیشانیاں چومتا چلا گیا۔ ان کو اپنے ساتھ بھینچتا رہا۔

''بھائی! امی چلی گئیں۔ ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئیں۔'' فرح روتے ہوئے بولی۔

عاطف بھی ہچکیوں سے رونے لگا۔ ہم کتنی ہی دیر اسی طرح ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ پھر آمنے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے کو نظروں میں بھرتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ ایک گھنٹا گزر گیا۔ عمران کی مسکراتی صورت دروازے میں نظر آئی۔ ''چار بج گئے ہیں۔ چائے کا وقت ہو گیا ہے حاضرین۔'' اس نے کہا اور خود ہی چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر لے آیا۔

فرح جلدی سے اٹھی۔ ''بھائی! آپ خود کیوں لے آئے؟ عبدل سے کہا ہوتا۔''

عمران نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''میں آج اتنا خوش ہوں کہ ٹی ٹرالی تو کیا ریت والی ٹرالی بھی آسانی سے دھکیل سکتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ خوشی سے الٹی قلابازیاں لگاؤں... بلکہ اگر تم کہو تو لگا کر دکھا بھی دیتا ہوں۔''

پھر اس نے ہمارے کہنے سے پہلے ہی دو قدم پیچھے ہٹ کر الٹی قلابازی لگائی۔ یہ دُہری قلابازی تھی لیکن وہ پاؤں کے بل گرنے کے بجائے کمر کے بل ایک صوفے کے ہتھے پر گرا اور کمر پکڑ کر ''اُف ہائے'' کرنے لگا۔

فرح کی اشک بار آنکھوں میں آنسو مسکرانے لگے۔ عاطف کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ جانتے تھے کہ عمران نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے ورنہ دُہری قلابازی اس کے لیے چنداں مشکل نہیں تھی۔ وہ مسخرہ پن کر رہا تھا۔

عمران نے عاطف کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عاطف نے آگے بڑھ کر اسے اٹھنے میں مدد دی۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''لگتا ہے پریکٹس ختم ہو گئی ہے۔ ویسے بھی تمہارے بھائی کے ساتھ رہ رہ کر میری صلاحیتوں کا کباڑا ہو گیا ہے۔''

اس نے سیدھا ہونے کی کوشش کی مگر کمر دُہری ہی رہی۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے سیدھا ہونے کی کوشش کر رہا ہے مگر سیدھا نہیں ہو پا رہا۔ وہ کراہا۔ ''اُف یہ کیا ہو گیا ہے۔ اب میں اپنی ریما جی کو کیا کمر دکھاؤں گا۔''

میں نے بیزار لہجے میں کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ وہ کبڑا عاشق فلم بنائیں اور اس میں تمہیں ہیرو لے لیں۔''

عاطف آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''تابش بھائی جان! اگر عمران بھائی نہ ہوتے تو شاید ہم بھی اس وقت آپ کو یہاں صحیح سلامت نظر نہ آتے۔ انہوں نے ہمارے لیے وہ سب کچھ کیا جو ہم سوچ سکتے تھے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ آپ کی گمشدگی اور امی جی کی وفات کے بعد سیٹھ سراج کے بندے ہمیں بُوگیر کتوں کی طرح ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ ہم کبھی ایک جگہ چھپتے کبھی دوسری جگہ۔ عمران بھائی ہماری مصیبتوں کے سامنے دیوار بن گئے۔'' عاطف کی آواز بھرا گئی۔

''مجھے سب پتا ہے عاطف۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''لیکن ایک بات کا تجھے پتا نہیں۔'' عمران پھر چہکا۔ ''میں نے اپنی اور تیری اس بہن کے لیے بڑا اچھا بر بھی ڈھونڈ رکھا ہے۔ اگر مجھے تیری تلاش میں انڈیا نہ جانا پڑتا تو اب تک اس کے ہاتھ بھی پیلے ہو چکے ہوتے۔ بس بھانڈیل اسٹیٹ کے اس چکر نے سب کچھ لیٹ کیا ہے۔''

فرح کے چہرے پر شرم کا رنگ لہرا گیا۔ عاطف نے پوچھا۔ ''یہ بھانڈیل اسٹیٹ ہے کیا؟''

''یہ یونائیٹڈ اسٹیٹس کی چھوٹی بہن ہے۔ تمہارے بھائی جان کھیلتے کھیلتے ادھر نکل گئے اور راستہ بھول گئے۔ اسٹیٹ کے ایک خداترس بزرگ نے انہیں گلیوں میں روتے ہوئے دیکھ لیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ مسجدوں میں اعلان کرایا کہ ایک بچہ ملا ہے ''جن کا بچہ'' ہے آ کر لے جائیں۔ وہاں کے لوگ ڈر گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ ''جن'' کا بچہ ہے۔ انہوں نے خداترس بزرگ کو تمہارے بھائی سمیت ایک تہ خانے میں بند کر دیا۔ اس کے آگے لمبی کہانی ہے۔''

عمران نے ایک بار بولنا شروع کیا تو بولتا چلا گیا۔ فضا کی سوگوار سنجیدگی کسی حد تک کم ہو گئی۔ فرح اور عاطف میرے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتے تھے مگر اس کے لیے وقت درکار تھا۔ میں ان کے چیدہ چیدہ سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ ماں کی یاد ہم تینوں کی آنکھوں کو بار بار نم کرتی رہی۔ وہ منظر میں زندگی کی آخری سانس تک نہیں بھول سکتا تھا۔ سراج کے غنڈے شیرے اور اس کے ساتھیوں نے ماں جی کے درد سے بھرے ہوئے ''فروزن'' کندھوں کو بے رحم

طریقے سے جھنجوڑا تھا۔ وہ انہیں بار بار جھنجوڑتے رہے تھے، یہاں تک کہ ماجی نے برداشت کی آخری حدوں کو چھو لیا تھا۔ اس ڈر سے کہ میں ان کی بے پناہ اذیت کو دیکھ کر حوصلہ نہ ہار جاؤں، عاطف اور فرح کے بارے میں نہ بتا دوں، انہوں نے خود کو دوسری منزل کی کھڑکی سے نیچے لڑھکا دیا تھا۔ ان کا پختہ فرش پر گرنا، ان کے سفید بالوں میں کھلا ہوا خون کا سرخ پھول۔ وہ سب کچھ میری تلخ ترین یادوں کا حصہ تھا۔ بھانڈیل اسٹیٹ کی صعوبتوں میں اور زرگاں کے قاتل اندھیروں میں بھی میں ان مناظر کو بھول نہیں پایا تھا۔

ہم سب ماں جی کی قبر پر پہنچے۔ اس سفر کے لیے وہی تاریک شیشوں والی اسٹیشن وین استعمال کی گئی۔ میں قریباً ایک گھنٹا اپنی ماں کی قبر پر رہا اور اس کی مٹی اشکوں سے بھگوتا رہا۔ لوگوں کی نگاہ میں اور قانون کے کاغذوں میں میری بیمار ماں حادثاتی طور پر کھڑکی میں سے گرنے سے مری تھی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کیسے مری تھی۔ جلتی آنکھوں اور سلگتے سینے کے ساتھ میں وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میری آنکھوں میں سیٹھ سراج کی ''دید'' کی پیاس بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ رات، عمران اور میں نے اس گھر میں عاطف اور فرح کے ساتھ گزاری۔ جان محمد صاحب ہمیں چھوڑ کر واپس جا چکے تھے۔ اس گھر میں ڈرائیور اور خانساماں وغیرہ بھی موجود تھے، تاہم فرح نے ہمارے لیے خود کھانا پکایا۔ اس نے میری پسندیدہ ڈش قیمہ کریلے اور شاشلک اپنے ہاتھوں سے تیار کیے۔ ہم ایک مزے دار کھانا کھا چکے اور پھر باتیں کرنے لگے۔ فرح مسلسل میرے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ گاہے گاہے میرا کندھا چوم لیتی تھی اور میرے بازوؤں پر ہاتھ پھیرنے لگتی تھی۔ میرے ہاتھ پہلے سے بہت سخت ہو چکے تھے۔ مارشل آرٹ کی نہایت کرخت مشقوں نے ان پر ...یاں سی ڈال دی تھیں۔ وہ اپنی ملائم انگلیاں میرے ہاتھ کی پشت پر چلاتے ہوئے بولی۔ ''بھائی جان! آپ کے ہاتھ ایسے کیوں ہیں؟ اور آپ کے پاؤں بھی ایک دم کھردرے نظر آتے ہیں؟''

''برف باری کی وجہ سے۔'' عمران نے جھٹ جواب دیا۔ ''سخت ٹھنڈ میں ایسا ہو جاتا ہے۔''

''لیکن آپ نے تو بتایا تھا کہ بھانڈیل اسٹیٹ میدانی علاقہ ہے۔'' فرح نے فوراً نکتہ اٹھایا۔

''مگر وہاں کا موسم عجیب سا ہے۔ گرمیوں میں برف باری شروع ہو جاتی ہے۔ سردیوں میں ایک دم لو چلنے لگتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اور اس لُو کی وجہ سے عمران کو سرسام ہو گیا تھا۔ اب یہ الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔''

فرح نے ہماری نوک جھوک کو نظر انداز کیا اور میرے ہاتھوں کا معائنہ جاری رکھا، وہ بولی۔ ''بہت سخت ہو گئے ہیں آپ کے ہاتھ... بلکہ آپ پورے کے پورے بہت بدلے ہوئے لگتے ہیں۔''

عمران مسکرایا۔ ''تم اور عاطف ٹھیک اندازے لگا رہے ہو۔ تابش میں بہت تبدیلیاں آئی ہیں۔ شاید تمہیں بھروسا نہ ہو۔ اب تمہارا بھائی بھانڈیل اسٹیٹ کا ہردلعزیز ہیرو ہے۔ ایک موقع پر اس نے بھانڈیل اسٹیٹ کے سب سے کڑک شخص کو دوبدو مقابلے کا چیلنج دیا اور نہ صرف چیلنج دیا بلکہ اسے ہرایا بھی۔ اگر اس نے یہ کارنامہ انڈیا یا پاکستان کے کسی بڑے شہر میں میڈیا کے سامنے انجام دیا ہوتا تو آج اس کے نام کا ڈنکا پورے ایشیا میں بج رہا ہوتا۔''

پھر عمران اس واقعے کی دیگر تفصیلات سے عاطف اور فرح کو آگاہ کرنے لگا۔ اس نے باروندا جیکی کا تذکرہ بھی کیا اور بتایا کہ کس طرح اس جاں بلب شخص نے مہینوں تک مجھے تربیت دی اور ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا۔

یہ ساری روداد فرح اور عاطف کے لیے بے حد تعجب خیز تھی۔ عمران یہ سب کچھ تفصیل سے شاید اس لیے بھی بتا رہا تھا کہ وہ فرح اور عاطف میں حوصلہ جگانا چاہتا تھا۔ ان کو بتانا چاہتا تھا کہ بے شک انہیں بڑے بھائی کی چار سالہ جدائی سہنا پڑی ہے لیکن اب اس بھائی کی صورت میں انہیں ایک مضبوط اور ناقابلِ شکست سہارا میسر ہے۔

عاطف نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''بھائی جان! باروندا جیکی کا نام تو کہیں میں نے بھی سنا ہوا ہے۔ وہ شروع میں ایکٹنگ وغیرہ کرتا تھا؟''

''شروع میں نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ شروع سے ہی فائٹر تھا۔ ایکٹنگ وغیرہ میں تو اسے لوگوں نے بعد میں گھسیٹا۔ اور یقیناً اس نے دونوں میدانوں میں بڑا نام کمانا تھا مگر وقت اور زندگی نے اس سے وفا نہ کی۔''

''آپ نے ہمیں ایک دردناک کہانی سنائی ہے۔'' عاطف نے جیکی اور شکنتلا کی پوری روداد سننے کے بعد کہا۔

عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ایک اور دردناک کہانی بھی ہے۔ لیکن وہ پھر کبھی سہی۔''

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ یقیناً عمران کا اشارہ سلطانہ والے اندوہناک واقعے کی طرف تھا... سلطانہ کا خیال آتے ہی بالو کی چھوٹی چھوٹی گول آنکھیں بھی میری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نگاہوں میں گھومنے لگیں۔

فرح کے معصوم چہرے پر اندیشے سے تھے۔ وہ عمران سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”بھائی! آپ کہہ رہے ہیں کہ جارج گورا بہت بڑا بدمعاش تھا۔ اس کے ساتھی اور رشتے دار بھی ایسے ہی ہوں گے۔ سنا ہے کہ وہ لوگ ایسی دشمنیوں کو بھولتے نہیں۔ کہیں کوئی خطرہ تو نہیں؟“

”کس بات کا؟“

”وہ جارج گورا بھائی کے پیچھے یہاں آجائے؟“

عمران نے جارج گورا والی روداد میں فرح اور عاطف کو یہ نہیں بتایا تھا کہ سامبر مقابلے میں جارج گورا کی انتڑیاں اکھاڑے میں بکھر گئی تھیں اور وہ ہلاک ہو گیا تھا۔ عمران نے فقط اس کے زخمی ہونے کا ذکر کیا تھا۔ فرح بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ جارج گورا ہی نہیں اور کئی افراد بھی میرے ہاتھوں راہیِ عدم ہو چکے ہیں۔ اور تو اور قاسمیہ کی خوں ریز لڑائی کا نقشہ ہی ہم کھینچ دیتے تو فرح اور عاطف ہکا بکا رہ جاتے۔ اب وہ ساری باتیں ایک خونچکاں افسانے کی طرح لگتی تھیں۔

عمران نے فرح کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں بھئی۔ تابش اور جارج کے درمیان کوئی دنگا فساد نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک مقابلہ تھا۔ اس کے لیے باقاعدہ شرطیں لکھی گئی تھیں اور مقابلے میں کسی کی بھی ہار جیت ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی وہ باب اب بند ہو چکا ہے۔ اب بھانڈیل اسٹیٹ میں بھی چودہ اگست ہو چکا ہے۔“

”چودہ اگست؟“ فرح نے پوچھا۔

”بھئی، یومِ آزادی۔ گورے بوریا بستر سمیٹ کر بھاگ لیے ہیں وہاں سے۔“

فرح اور عاطف ہم سے سوال کرتے رہے.... ہم جواب دیتے رہے۔ وہ تعجب میں ڈوب کر سنتے رہے۔ یہ سب کچھ ان کے لیے کسی قدیم کہانی جیسا تھا۔ ہیٹر روشن تھا۔ ہم سبز چائے پی رہے تھے اور کھڑکیوں سے باہر لاہور کی وسعت کو گہری دھند ڈھانپتی جا رہی تھی۔ ہم سب کچھ فرح اور عاطف کو نہیں بتا سکتے تھے۔ میں نے انہیں اپنی چار سالہ طویل کہانی کے مختلف ٹکڑوں سے آگاہ کیا۔ میرا ڈیفنس کی کوٹھی میں سیڑھیوں سے گرنا، اپنے ہوش وحواس کھونا اور اسی حالت میں بھانڈیل اسٹیٹ پہنچ جانا۔ میں نے سب کچھ فرح اور عاطف کو بتایا۔ وہ یہ سن کر حیرت کے سمندر میں ڈوب گئے کہ یہاں سے اوجھل ہونے کے بعد میں قریباً ڈھائی سال تک اپنے ہوش وحواس میں ہی نہیں رہا۔ یعنی مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور کون ہوں۔ میں نے بھانڈیل اسٹیٹ کے حالات بھی ان دونوں کو بتائے۔ وہاں کی کہنہ رسمیں، وہاں کے تنازعے، انگریزوں اور مقامی لوگوں کی کشمکش۔ وہاں کے فرسودہ عقیدے اور مار دھاڑ۔ میں نے بہت کچھ فرح اور عاطف کے گوش گزار کیا۔ وہ حیرت کے سمندر میں ڈوب ڈوب کر ابھرتے رہے۔

رات گئے گفتگو کا رخ ایک بار پھر ماں جی اور ثروت کی طرف چلا گیا۔ شروع میں پولیس نے ماں جی کی موت کو حادثہ قرار دیا تھا مگر بعدازاں عمران کی کوشش سے مقامی تھانے میں ایف آئی آر درج ہوئی تھی۔ اس میں سیٹھ سراج، اس کے کارندے شیرے اور اکبر کے نام شامل تھے۔ تفتیش شروع ہوئی تھی تو سیٹھ سراج کے کئی اور جرائم بھی سامنے آئے جن میں نوادرات کی ہیرا پھیری، ڈکیتی اور اغوا کے الزامات تھے۔ اس پر تین چار اور پرچے کٹ گئے۔ پرچوں کی بھرمار اور عمران کے بڑھتے ہوئے خوف سے وہ ایک دم زیرِ زمین چلا گیا تھا۔ شیرا اور اس کے دو چار قریبی ساتھی بھی روپوش ہو گئے تھے۔ اس سارے معاملے کا ایک اہم کردار سراج کا لفنڈر بیٹا واجد تھا۔ یہ واجد عرف واجی ہی تھا جس نے اس المناک کہانی کا آغاز کیا تھا۔ اس نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اپنی غنڈا گردی کا نشانہ بنایا تھا۔ اسے سڑک سے اٹھا کر لے گیا تھا اور پھر دھیرے دھیرے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔ واجی کے بارے میں عمران نے بتایا تھا کہ سیٹھ سراج نے روپوش ہونے سے پہلے ہی بیٹے کو بیرونِ ملک فرار کرا دیا تھا۔ وہ یورپ ہی کے کسی ملک میں تھا۔

میں نے فرح اور عاطف سے پوچھا۔ ”تم دونوں کے پاس ثروت کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟“

ثروت کے نام پر دونوں کے چہروں پر غم کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔ فرح نے کہا۔ ”اس بارے میں بھی آپ کو عمران بھائی ہی کچھ بتا سکتے ہیں۔“

”یہ تو کچھ بھی نہیں بتاتا۔ بس یہی کہتا ہے کہ ڈیڑھ دو سال پہلے تک وہ جرمنی میں تھی۔ یوسف نامی ایک لڑکے سے اس کی منگنی ہوئی تھی۔ شادی ہو چکی ہے یا نہیں، اس بارے میں یہ کچھ نہیں بتاتا۔“

”مجھے معلوم ہی نہیں تو کیا بتاؤں۔ اب ہم آ گئے ہیں۔ جرمنی بھی ہم سے کون سا دور ہے۔ دیکھ لیتے ہیں کہ وہاں کے حالات ہیں۔“ عمران بولا۔

پتا نہیں کیوں وہ جب بھی ثروت کے بارے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات کرتا تھا، مجھے لگتا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ ہماری گفتگو کو اچانک بریک لگ گئے۔ عمران کے موبائل پر کال آگئی تھی۔ یہ جان محمد صاحب کی کال تھی۔ جان محمد صاحب کی مدبر اور ہمدرد شخصیت نے مجھے متاثر کیا تھا۔ عمران کی روداد سننے کے بعد میں نے ایک بڑی سرکس کمپنی کے اس کرتا دھرتا کے بارے میں جو تصور قائم کیا تھا، وہ اس پر پورے اترے تھے۔ انہوں نے فون پر عمران کو بتایا کہ مسٹر ریان ولیم کا بھتیجا گیری بات کرنا چاہ رہا ہے۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے آٹھ دس روز بعد ایک زبردست ایونٹ میں حصہ لینا تھا۔ عمران اس سے باتیں کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ میں، فرح اور عاطف پھر اپنی گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ فرح کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ اسے میرے ملنے کی بے انتہا خوشی بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک فکر بھی گھیرتی جا رہی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اب میں ماں جی کے قاتلوں سے بدلہ لینے کے لیے خطرے مول لوں گا۔

وہ بار بار کہہ رہی تھی کہ اگر مجھے کچھ کرنا ہی ہے تو قانونی طریقے سے کروں۔ عاطف ایک بڑے وکیل کا پتا بتا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس کے ایک دوست کا والد ہے اور معقول فیس پر یہ کیس بڑے اچھے طریقے سے لڑ سکتا ہے۔

ان دونوں کی سنجیدہ گفتگو سے پتا چلتا تھا کہ گزرے ہوئے ساڑھے تین چار برسوں میں وہ دونوں کافی میچور ہو گئے ہیں۔ ان دونوں کی طبیعت کا لاابالی پن اور شوخی اب ان کے اندر کہیں دب چکی تھی۔ ان کی اس تبدیلی نے نہ جانے کیوں مجھے آزردہ کیا۔ میں ان دونوں کی باتیں سنتا رہا اور اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ میرے اندر کچھ اور طرح کی آگ جل رہی تھی۔

☆☆☆

سیٹھ سراج اور شیرا ابھی تک منظر سے اوجھل تھے۔ عمران نے اپنے ذرائع سے پتا کرایا۔ معلوم ہوا کہ آٹھ دس ماہ پہلے سیٹھ سراج کراچی میں دیکھا گیا تھا۔ وہاں اس نے ایک سیاسی شخصیت کے بیٹے کی شادی میں شرکت کی تھی۔ ایک خوب صورت تھائی خاتون بھی اس کے ساتھ تھی۔ قیافہ تھا کہ وہ تھائی لینڈ سے آیا تھا اور وہیں واپس چلا گیا تھا۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے پس پردہ رہ کر کراچی میں ہی اپنی جائز اور ناجائز سرگرمیاں جاری رکھی ہوئی ہوں۔ میرے اور عمران کے درمیان طے تھا کہ ہم جلد سے جلد سیٹھ سراج اور شیرے کا کھوج لگائیں گے لیکن اس سے پہلے عمران کو وہ کام بھی سرانجام دینا تھا جس کے لیے مجھے اور اسے آناً فاناً الٰہ آباد سے اٹھا کر یہاں لاہور پہنچا دیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ عجیب ڈرامائی طریقے سے ہوا تھا۔ ہم وہیں پہنچے تھے جہاں ہمیں پہنچنا تھا لیکن کسی اور ڈھنگ سے۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ اقبال، میڈم صفورا اور بالو وغیرہ ابھی تک انڈیا میں ہی تھے۔ مسٹر ریان ولیم نے عمران سے وعدہ کیا تھا کہ ان پر کوئی آنچ نہیں آئے گی اور وہ جہاں بھی ہوئے، انہیں جلد از جلد پاکستان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سلسلے میں ریان ولیم نے اتر پردیش میں بہت سے مقامی لوگوں کو متحرک کر دیا تھا اور امید تھی کہ دو چار دن کے اندر اس سلسلے میں کوئی اچھی خبر مل جائے گی۔ جہاں تک میرا اندازہ تھا، عمران بھی اس حوالے سے لاتعلق نہیں تھا، وہ اپنے طور پر بھی کوشش کر رہا تھا۔

اٹھائیس تاریخ سر پر تھی۔ وہ دن قریب آ رہا تھا جب عمران کو ایک بڑی آزمائش سے گزرنا تھا۔ ریان ولیم نے عمران کو وی آئی پی مہمان کی حیثیت دے رکھی تھی۔ وہ اسی شاندار ولا میں رہ رہا تھا جہاں ہم لاہور پہنچتے ہی اترے تھے۔ یہ جگہ مشہور منٹو پارک کے قریب واقع تھی۔ قریباً آٹھ کینال پر پھیلی ہوئی اس قدیم کوٹھی کی اندرونی آرائش زبردست تھی۔ بلند و بالا ستون، محرابی دروازے، اونچی چھتیں اور چاروں طرف احاطے میں اونچے درخت۔ یہ انگریزوں کے دور کی رہائش گاہ تھی۔ کبھی یہاں کوئی بڑا انگریز لارڈ رہائش پذیر تھا۔ اس نے گرم دوپہریں گزارنے کے لیے کمروں کے اندر ہی چھوٹے چھوٹے حوض بنائے ہوئے تھے۔

پچھلے دو روز سے میں بھی عمران کے ساتھ ہی تھا اور اس غیر معمولی مہمان نوازی کا تجربہ کر رہا تھا جو یہاں عمران کے حصے میں آئی تھی۔ یہ حد سے بڑھی ہوئی عزت افزائی کبھی کبھی عمران کو بھی پریشان کر دیتی تھی۔ چھبیس تاریخ کی شام کو چند نہایت خوش پوش افراد عمران سے ملنے کے لیے آئے۔ ان کے چہرے ہی بتا رہے تھے کہ وہ مال و دولت کے انبار پر بیٹھے ہوئے لوگ ہیں۔ ان میں سے دو سفید فام تھے جن میں سے ایک کی ناک بالکل ٹماٹر کی طرح سرخ تھی۔ دو جاپانی تھے، ایک عربی اور ایک کا تعلق ملائیشیا یا سنگاپور وغیرہ سے تھا۔ ان کی توجہ کا مرکز عمران ہی تھا۔ انہوں نے گھل مل کر عمران سے باتیں کیں۔ ان کی دلچسپی ریوالور کے اس کھیل میں تھی جسے عمران کئی بار کامیابی سے کھیل چکا تھا۔ ایک چھ... دو چھ... اور تین چھ کا کھیل۔ ان افراد میں سے کئی ایک کے دل میں یہ خواہش دبی ہوئی تھی کہ عمران منہ مانگے

معاوضے پر انہیں اس کھیل کی کوئی جھلک دکھائے مگر یہ خواہش کسی کی زبان پر نہیں آئی۔ وہ سب جانتے تھے کہ صرف دو دن بعد عمران کو ایک بہت بڑے شو کا حصہ بننا ہے۔ ایک بہت بڑا انعامی گیم۔ اس گیم میں شمولیت کی خاطر پچھلے مہینوں میں عمران کو انڈیا اور پاکستان کے طول و عرض میں دیوانہ وار ڈھونڈا گیا تھا اور اب ریان صاحب کی خوش قسمتی سے وہ یہاں موجود تھا۔

یہ لوگ واپس گئے تو عمران سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! میں تو پریشان ہو گیا ہوں۔ مجھے ضرورت سے زیادہ بانس پر چڑھا رہے ہیں یہ لوگ۔ اگر بے عزتی خراب ہو گئی تو پھر؟ جی چاہتا ہے کہیں بھاگ جاؤں۔''

''بھاگ جاؤ گے تو بے عزتی خراب نہیں ہو گی؟''

''چلو، آنکھوں کے سامنے تو نہیں ہو گی۔ پیٹھ پیچھے تو بڑے بڑے لوگ بے عزت ہو جاتے ہیں۔''

''مگر تم تو میڈیا کے بندے ہو۔ تم تو بے عزتی کرنے والے طبقے سے ہو۔ بے عزتی ''کروانے'' کا تو کوئی تجربہ ہی نہیں ہے تمہیں؟''

''ہاں، یہ بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ جب بے عزتی ہو رہی ہو تو کس طرح کا منہ بناتے ہیں۔ بے عزتی کے بعد کس طرح نیچے نیچے ہو کر کھسکتے ہیں اور پھر کیسے دوبارہ سے ڈھیٹ بن کر دکھاتے ہیں۔ کیا تم اس سلسلے میں میری کچھ راہنمائی فرما سکتے ہو؟''

میں مسکرایا۔ ''تم ہاتھ دھو کر اپنی بے عزتی کے پیچھے ہی کیوں پڑ گئے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ واقعی تمہیں عزت مل جائے، جس سے تم پیدائشی طور پر محروم ہو۔ یار! صرف تین سوالوں کے درست جواب اور ایک بہت بھاری رقم ریان ولیم کے اکاؤنٹ میں۔ اس میں سے کچھ نہ کچھ تو تمہیں بھی ملے گا۔''

''میں اس میں سے آدھا تمہیں دے دوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ اگر بے عزتی ہوئی تو پھر آدھی تم کراؤ گے۔ دس دھکے پڑے تو پانچ تمہارے، پانچ میرے۔ بیس کلمہ ہائے لعنت و پھٹکار سننے پڑے تو آٹھ میرے، بارہ تمہارے۔''

''بھئی! یہ لعنتوں کے کھاتے میں ڈنڈی کیوں مار رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے پتا تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے۔ تمہارے ان سوالوں کی وجہ سے ہی میرا دماغ پلپلا ہوا ہے۔ اب جو ناکامی بھی حصے میں آئے گی، اس پلپلے دماغ کی وجہ سے ہی آئے گی۔ تمہیں اس کی سزا تو ملنی چاہیے۔''

''سزا تو مل رہی ہے مجھے۔ رات دن تمہارے ساتھ رہ رہا ہوں۔''

''تو ٹھیک ہے، چلے جاؤ۔ میں نے تمہیں پکڑ رکھا ہے۔''

میں واقعی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھا خدا حافظ۔''

''کبھی کبھی خط لکھتے رہنا۔'' وہ پکارا۔

''اس کی بھی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

''او تیری تو ایسی کم تیسی... بھاگڑ بلے... میری زندگی تباہ کر کے، مجھے ودھوا بنا کر جانا چاہتے ہو؟''

اس نے جست لگا کر مجھے عقب سے چھاپ لیا۔ ہم دونوں اوپر نیچے قالین پر گرے۔ میں نے اس کی گدی پر گھونسا جڑا۔ جواباً اس نے میرے پیٹ میں گھٹنا رسید کیا۔ ہم باقاعدہ کشتی لڑنے لگے۔ ڈرائنگ روم کی کئی بیش قیمت چیزیں ٹوٹ گئیں۔ باوردی ملازمین ہکا بکا ہمیں دیکھ رہے تھے۔ پہلے تو دو گارڈز نے ہمیں چھڑانے کی کوشش کی پھر وہ سمجھ گئے کہ یہ دوستانہ لڑائی ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو نپی تلی ضربیں لگائیں۔ یہ ایسی چوٹیں تھیں جن سے شدید نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ سب کچھ ایک طرح سے لہو گرم رکھنے کا بہانہ بھی تھا۔ ہم جب بھی اس طرح گتھم گتھا ہوتے تھے، یہ ایک طرح سے عمران کی مہارت اور میری برداشت کا مقابلہ ہوتا تھا۔ اچانک عمران کی گردن میرے بازو میں آگئی۔ اس نے عورتوں جیسی باریک آواز میں چلانا شروع کر دیا۔

''بچاؤ... بچاؤ... اس غنڈے سے بچاؤ۔''

''تم تو فرما رہے تھے، میں تمہارا شوہر ہوں؟''

''تو کیا شوہر زبردستی نہیں کر سکتے۔'' اس نے ترت جواب دیا اور ایک بار پھر چلانے لگا۔ ''بچاؤ... بچاؤ... مردانہ پولیس کو بلاؤ۔''

''مردانہ کو کیوں؟'' میں نے ہانپی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''زنانہ پولیس کا بڑا شوق ہے تمہیں۔'' اس نے کہا اور پھر اچانک مجھے اڑنگا لگا کر پیچھے کی طرف گرا دیا۔ اب میں اس کے شکنجے میں تھا۔ اس نے مجھے جوڈو کی تکنیک سے فرشی داؤ لگایا اور تقریباً بے بس کر دیا۔

''کیسا ہے؟'' اس نے پوچھا پھر خود ہی بولا۔ ''شوہر ہونے کا جھانسا دے کر کسی کو بھی اس طرح بے دست و پا کیا جا سکتا ہے۔ اب لگاؤ کانوں کو ہاتھ۔''

میں نے اس کے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بڑے کھوچل ہوتم۔'' اس نے کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔ ملازمین اس تفریح سے لطف اندوز ہوئے تھے۔

عمران کپڑے جھاڑ کر بولا۔ ''یہ مشرقی اور مغربی عورتیں اسی طرح پہلے اپنے شوہروں کو بانس پر چڑھاتی ہیں پھر چاروں شانے چت کر دیتی ہیں۔ ایسا فرشی داؤ لگاتی ہیں کہ بے چارہ ہل بھی نہیں سکتا... یہ جارج پنجم کا نام سنا ہوا ہے نا تم نے؟''

''ہاں، سنا ہے۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''وہ ایک ایسے ہی داؤ کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔ بے چارہ خود بھی ساری عمر عورتوں سے ڈرتا رہا۔''

ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف تین چار منٹ کی دھینگا مشتی میں ہم نے اس کمرے میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا نقصان تو کر ہی دیا تھا۔ دو نہایت قیمتی گل دان، ایک امپورٹڈ ٹیلی فون سیٹ اور شیشے کی ایک بڑی تپائی چکنا چور ہو گئے تھے۔

اسی دوران میں جان محمد صاحب اور مسٹر ریان ولیم بھی آن وارد ہوئے۔ شاندار ڈرائنگ روم کی حالت دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے۔ پھر ان کی نگاہیں ہمارے حلیے پر پڑیں۔ وہ سمجھ گئے کہ یہاں دھینگا مشتی ہوئی ہے۔

''کیا ہوا ایمران (عمران)۔'' ولیم صاحب نے پریشان ہو کر کہا۔

''میں تھوڑی سی مشق کر رہا تھا جی... مار کھانے کی۔''

''کیا مطلب؟''

وہ مسکرایا۔ ''اگر میں آپ کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکا تو مجھے پتا ہے جان انکل نے میری بڑی درگت بنانی ہے۔''

''تم بہادر آدمی ہو۔ تمہیں منفی انداز میں نہیں سوچنا چاہیے۔'' ریان ولیم نے کہا۔ ''اس کے علاوہ میں نہیں سمجھتا کہ جان صاحب تمہارے ساتھ کسی طرح کا بُرا سلوک کر سکتے ہیں۔ یہ تو تمہارے بہت بڑے مداح ہیں۔''

''مداح ہی درگت بھی بناتے ہیں جناب! آپ نے کرکٹرز کی شامت آتے نہیں دیکھی؟''

''تم دلچسپ آدمی ہو ایمران۔'' ولیم مسکرایا۔

''شکریہ جناب! مگر اس ٹوٹ پھوٹ کا مجھے واقعی افسوس ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''تم ہمارے قابلِ قدر مہمان ہو اور اس مقابلے کے بعد بھی رہو گے۔ رہی نقصان کی بات تو اس سے دس گنا بھی ہو جاتا تو پروا نہیں۔''

اس کے بعد سنجیدہ گفتگو شروع ہوئی۔ ولیم اور جان محمد صاحب نے عمران کو تفصیل سے آگاہ کیا کہ یہ کھیل کس طرح ہو گا۔ رول کیا ہیں اور کھیل کی ٹائمنگ وغیرہ کس طرح ہو گی... انہوں نے بتایا کہ امریکا، جنوبی امریکا، جاپان، انڈیا اور یورپ کے کئی ممالک میں یہ گرینڈ شو مخصوص ٹی وی چینلز پر دکھایا جائے گا۔ موقع پر بھی کافی لوگ موجود ہوں گے۔ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق کیسینو کے کاروبار سے ہو گا۔

عمران نے پوچھا۔ ''جناب! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ امریکا یا یورپ کے کسی بڑے شہر میں ہونے کے بجائے یہ شو پاکستان میں ہو رہا ہے... اور لاہور میں ہو رہا ہے؟''

''یہ اچھا سوال کیا ہے تم نے۔'' ولیم صاحب نے کہا۔ ''...دراصل اس شو کے لیے شہر کے انتخاب کا طریقہ دلچسپ ہے۔ قرعہ اندازی سے پانچ شہر منتخب کیے جاتے ہیں۔ یہ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہو سکتے ہیں۔ بعدازاں ان پانچ شہروں کے بارے میں ''فزیبلٹی'' رپورٹ تیار ہوتی ہے اور ایک کمیٹی ان میں سے ایک شہر کا انتخاب کثرتِ رائے سے کر لیتی ہے۔ اس دفعہ پانچ شہروں کی لسٹ میں صرف دو ہی نمایاں شہر تھے۔ کولمبو اور لاہور۔ لہٰذا لاہور کا انتخاب ہو گیا۔''

''یہ شو کس جگہ منعقد ہو گا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کو ابھی راز ہی رہنے دیا جائے تو اچھا ہے۔'' فربہ اندام ریان ولیم نے مسکرا کر کہا۔ مسکراتے ہوئے اس کے گالوں کا گوشت اوپر کی طرف سفر کرتا تھا اور اس کی آنکھوں کو مزید چھوٹا کر دیتا تھا۔

☆☆☆

شام سات بجے کے قریب ہمیں سیکیورٹی گارڈز نے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ یہ بڑے چاق و چوبند... تربیت یافتہ اور شائستہ لوگ تھے۔ نہایت معتبر سیکیورٹی ایجنسی سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک بار پھر بڑی معذرت کے ساتھ ہماری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی گئی اور ہمیں ایک بڑی اسٹیشن وین میں بٹھا دیا گیا۔ جان صاحب نے ہمیں اس صورتِ حال کے بارے میں پہلے ہی مطلع کر دیا تھا۔

لاہور کی مختلف سڑکوں پر سفر کرنے کے بعد ہم ایک نسبتاً کشادہ علاقے میں نکل آئے۔ آوازوں کے ذریعے شہر کی گہما گہمی ہم تک پہنچ رہی تھی۔ ہم ایک خاص ایونٹ میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ اس ایونٹ کے حوالے سے کئی طرح کا تجسس ذہن میں موجود تھا۔ ایونٹ میں حصہ لینے والے گیری گرانٹ کے حوالے سے عمران کو جو معلومات

ہوئی تھیں، ان کے مطابق گیری... ریان ولیم کا سگا بھتیجا تھا۔ ایک سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور یہ کسی فیملی تھی۔ اس انعامی مقابلے کے حوالے سے ریان کی نظرِ انتخاب گیری پر پڑی تھی۔ عمران کی معلومات کے مطابق گیری ''جلدی بیماری برص'' میں بھی مبتلا تھا۔

قریباً پندرہ منٹ کے مزید سفر کے بعد ہم ایک زمین دوز پارکنگ لاٹ میں رک گئے۔ ہماری آنکھوں پر اب بھی پٹیاں تھیں۔ ہمیں کسی نیم گرم کوریڈور سے گزار کر ایک وسیع ہال تک پہنچایا گیا۔ اندازہ ہوا کہ یہاں کافی لوگ موجود ہیں۔ ہماری آنکھوں سے پٹیاں ہٹائی گئیں۔ ہم نے خود کو ایک آرام دہ کیبن میں پایا۔ یہاں صوفے تھے۔ میز پر سافٹ ڈرنکس اور وہسکی وغیرہ موجود تھی۔ ایک طرف دو فون سیٹ بھی پڑے تھے۔ ایک سرخ، ایک سبز۔ کیبن میں سامنے کی طرف تقریباً آٹھ ضرب بارہ فٹ کا شیشہ لگا ہوا تھا۔

ہم نے ایک نیچی چھت والا گول ہال دیکھا۔ اس جدید ہال کے چاروں طرف آرام دہ نشستوں پر دو ڈھائی سو کے قریب افراد موجود تھے۔ یہ سب کے سب ایلیٹ کلاس کے خوش پوش لوگ تھے۔ دو درجن کے قریب خواتین بھی ان میں شامل تھیں۔ ان میں ہر رنگ کے افراد نظر آتے تھے۔ جاپانی، یورپین، مشرقِ وسطیٰ کے باشندے اور رشین وغیرہ۔ اس گول ہال کے بیچوں بیچ شیشے کا ایک شاندار چیمبر تھا۔ یہ چیمبر بھی گولائی میں تھا اور اس کے اندر دو نشستیں موجود تھیں۔ اس چیمبر کی اونچائی ہال کے فرش سے آٹھ دس فٹ زیادہ تھی۔ اس گول چیمبر کی لائٹنگ اس طرح سے کی گئی تھی کہ یہ ایک جاذبِ نظر روشنی میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا۔ چیمبر کے اندر ایک ایسا اسکور بورڈ تھا جسے چاروں طرف سے بہ آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔

ہمارے کیبن میں جان محمد صاحب پہلے سے موجود تھے۔ عمران نے پوچھا۔ ''جان انکل! آپ کو بھی پٹی باندھ کر لایا گیا ہے؟''

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہاں موجود سارے تماشائی اسی طرح لائے گئے ہیں۔''

''وجہ؟'' عمران نے پوچھا۔

''وجہ تو یہی لوگ بتا سکتے ہیں اور وہ بتائیں گے نہیں۔'' جان محمد صاحب نے کہا۔

موقع پر موجود لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ ایک عجیب سی سنسنی نے ہر شخص کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ جدید قسم کے ٹی وی کیمرے ان تمام مناظر کی کوریج کر رہے تھے۔ تاہم ان کیمروں کو اس طرح ''انسٹال'' کیا گیا تھا کہ وہ منظر کی مجموعی دلکشی پر اثر انداز نہیں ہوتے تھے۔ موسیقی کی دھنیں دلوں کو گرما رہی تھیں۔ اسی دوران میں فربہ اندام ریان ولیم اور اس کے دو خوش پوش دوست بھی کیبن میں آ گئے اور نشستوں پر بیٹھ گئے۔ ان میں ٹماٹر کی ناک والا چالیس بیالیس سالہ شخص بھی تھا... اور پھر فل لائٹس کے ساتھ شو کا آغاز ہو گیا۔ ایک لمبا تڑنگا خوش لباس سفید فام، شیشے کے چیمبر میں داخل ہوا اور ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

جان صاحب نے سرگوشی میں بتایا۔ ''یہ مشہور امریکی چینل سی این این کا ایک سابق ہوسٹ ہے۔''

''ہاں، شکل کچھ کچھ پہچانی ہوئی لگ رہی ہے۔'' عمران نے کہا۔

امریکن کمپیئر اپنی خوب صورت پاٹ دار آواز میں بولا۔ ''خواتین و حضرات! آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ ہم اس کا شو کا آغاز کرتے ہیں جس کے لیے آپ کی نگاہیں اور سماعتیں قریباً آٹھ ماہ سے منتظر تھیں۔ دنیا بھر میں موجود اپنے اَن گنت ناظرین تک میرا اسلام پہنچے۔''

اس تمہید کے بعد کمپیئر نے کہا۔ ''پچھلے شو کے آخر میں آپ نے دیکھا تھا کہ ہمارے ذہین و خوش قسمت دوست مسٹر گیری گرانٹ نے کامیابی سے کھیل کے پہلے تین مرحلے طے کر لیے تھے۔ بغیر کوئی لائف لائن استعمال کیے، وہ چوتھے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں۔ اب تک کے اعصاب شکن مقابلے میں انہوں نے جو انعامی رقم اپنے نام کی ہے، اس کی مالیت دو ملین ڈالرز ہے۔ اب میں انہیں تشریف لانے اور پھر سے ''ہاٹ سیٹ'' پر بیٹھنے کی دعوت دیتا ہوں۔''

مسٹر ریان ولیم کا مبینہ بھتیجا گیری گرانٹ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا چیمبر میں داخل ہوا۔ اپنے تایا کی طرح اس کا جسم بھی فربہی کی طرف مائل تھا۔ اس نے فرنچ کٹ داڑھی رکھی ہوئی تھی، عینک لگا رکھی تھی اور تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ مجموعی طور پر وہ ایک شائستہ نوجوان دکھائی دیتا تھا۔ اس کی شخصیت کی نمایاں بات اس کے چہرے کے سفید داغ تھے۔ بظاہر ہی کے یہ داغ زیادہ پھیلے ہوئے تو نہیں تھے پھر بھی اس کی شباہت کو داغ دار کرتے تھے۔

گیری ہاٹ سیٹ پر براجمان ہوا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

ہینڈسم کمپیئر نے رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد گیری کا حال چال پوچھا۔ اس کے دل کی دھڑکن اور سانسوں کی ہلچل کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ پھر اس سنسنی خیزی کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آگے بڑھاتے ہوئے وہ گیری کے سامنے آبیٹھا اور اناؤنسمنٹ کے انداز میں بولا۔ ”تو حاضرین! ہم اس سنسنی خیز مقابلے کا آغاز کرتے ہیں۔ اب مسٹر گیری کے سامنے صرف اور صرف تین سوال ہیں۔ ہر سوال کے صحیح جواب کے بعد ان کی انعامی رقم دگنی ہو جائے گی اور تیسرے سوال کے جواب کے بعد یہ پہنچ جائیں گے گرینڈ پرائز یعنی سولہ ملین ڈالرز تک۔ جی ناظرین! سولہ ملین ڈالرز۔ مقامی کرنسی میں قریباً ایک سو بیس کروڑ۔“

ہال ایک بار پھر زوردار تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس میگا شو کے حاضرین میں کئی اہم شخصیات موجود تھیں۔ فٹ بال کے ایک انٹرنیشنل کھلاڑی اور ہالی وڈ کے ایک ایکٹر کو ہم دور سے بھی پہچان سکتے تھے۔

کمپیئر نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اگر کھیل کے کسی بھی مرحلے میں مسٹر گیری کو سوال مشکل محسوس ہو اور انہیں جواب دینے میں خطرہ نظر آئے تو وہ اس کھیل کو چھوڑ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ جیتی ہوئی رقم کے حق دار ہوں گے۔ لیکن اگر وہ غلطی سے غلط جواب دے بیٹھے تو پھر انہیں اکتفا کرنا ہوگا ابتدائی انعامی رقم یعنی صرف پینسٹھ ہزار ڈالرز پر۔ اور یہی اس کھیل کی ساری خوب صورتی ہے۔“

ہال میں ایک بار پھر تالیاں گونجیں۔

کچھ دیر بعد کھیل کے اس اہم مرحلے کا پہلا سوال اسکرین پر نمودار ہوا۔ سوال کچھ یوں تھا۔ ”نیلا رومال، ایک معروف فن پارے کا نام ہے۔ اس کا تعلق دوسری جنگِ عظیم سے ہے۔ یہ فن پارہ کیا ہے؟“

آپشن نمبر ایک ناول... آپشن نمبر دو پینٹنگ... آپشن نمبر تین گیت... آپشن نمبر چار فلم۔“

ہال میں سناٹا چھا گیا۔ ہر نگاہ پچیس چھبیس سالہ گیری پر مرکوز تھی۔ اس کا اترا ہوا چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ اس مشکل مرحلے کا پہلا سوال ہی اس کی سمجھ سے باہر کا نکلا ہے۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ کیبن میں ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے فربہ اندام ریان ولیم اور اس کے دونوں دوستوں کے چہروں پر بھی اضطراب صاف نظر آیا۔ ان دونوں دوستوں میں ایک تو وہی ٹماٹر کی ناک والا غصیلا سا شخص تھا۔ دوسرا کوئی پروفیسر ٹائپ نظر آتا تھا۔

عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”لگتا ہے کہ سر منڈواتے ہی اولے پڑ گئے ہیں۔“

”جی مسٹر گیری!“ کمپیئر کی پاٹ دار آواز گونجی۔ ”آپ کے ذہن میں کیا جواب آرہا ہے؟ آپ اگر چاہیں تو بلند آواز میں بھی سوچ سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہمارے لیے دلچسپ ہوگا۔“

گیری ایک بار پھر پریشان انداز میں مسکرایا۔ اس نے ”ہاٹ سیٹ“ پر پہلو بدلا اور اپنی فرنچ کٹ داڑھی سہلاتے ہوئے بولا۔ ”خاصا مشکل سوال ہے۔“

”انعام بھی تو بہت بڑا ہے مسٹر گیری! آپ کا انعام دگنا ہونے جارہا ہے۔ دو ملین ڈالرز سے چار ملین ڈالرز۔ آپ کے پاس چار آپشنز ہیں اور آپ کی تینوں لائف لائنز (فون کالز) آپ کے پاس محفوظ ہیں۔ آپ اچھی پوزیشن میں ہیں۔ آپ اپنا وقت لیں اور تحمل سے غور کریں۔ آپ کے ذہن میں کیا آرہا ہے؟“

گیری ذرا ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”نیلا رومال... یہ بظاہر تو کسی ناول یا افسانے کا عنوان لگتا ہے۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ کسی ناول کا نام ہو... فکشن پڑھنے میں مجھے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رہی... جہاں تک فلم کا تعلق ہے... کم از کم میری نظر سے تو اس طرح کی کوئی فلم نہیں گزری۔ ایک فلم شاید سرخ رومال کے نام سے میں نے دیکھی تھی...“

”پینٹنگز کی طرف آپ کا دھیان جاتا ہے؟“ کمپیئر نے پوچھا۔ ”کیونکہ اکثر مصور اپنی پینٹنگز کو عنوانات بھی دیتے ہیں۔“

”جی ہاں، دھیان تو جارہا ہے۔“ گیری نے اپنا بڑا سا سر ہلایا۔ ”عنوان میں رنگ کو خاص اہمیت دی گئی ہے... اور پینٹنگز میں رنگ ہی سب کچھ ہوتے ہیں لیکن...“ وہ گڑبڑا کر چپ ہوگیا۔

گھڑی کی سوئیاں مسلسل حرکت میں تھیں۔ تقریباً پندرہ کروڑ یعنی دو ملین ڈالرز کے اس سوال کے لیے گیری کے پاس کُل آٹھ منٹ تھے۔ بے شک یہ ایک مشکل سوال تھا۔ ہمارے کیبن میں موجود کسی فرد کے چہرے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس سوال کے جواب کے بارے میں کوئی قوی امکان ذہن میں رکھتا ہے۔ گیری کے لیے ایک آسانی موجود تھی۔ اسے کُل تین سوالوں کے جواب دینے تھے اور اس کے پاس تینوں لائف لائنز موجود تھیں... یعنی وہ تین فون کالز کرسکتا تھا۔

قریباً چار منٹ گزر گئے تو اس نے کمپیئر کو بتایا کہ وہ فون کال کرنا چاہتا ہے۔ چند سیکنڈ بعد ہمارے کیبن میں رکھے ہوئے سرخ فون سیٹ کی مترنم گھنٹی بج اٹھی۔ پروگرام کے مطابق عمران نے ریسیور اٹھایا۔ گیری نے برٹش لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے کہا۔ ”ایمران! سوال تم نے دیکھ ہی لیا

ہوگا۔ نیلا رومال ایک فن پارے کا نام ہے... اس کا تعلق دوسری جنگِ عظیم سے ہے۔ ہمیں بتانا ہے کہ یہ فن پارہ کیا ہے.. ناول؟ پینٹنگ؟ گیت یا فلم؟“

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میں ناول اور فلم کو تو رد کرتا ہوں کیونکہ اگر یہ ایک مشہور فن پارہ ہے اور ناول یا فلم کی صورت میں ہے تو پھر اس ہال میں موجود کچھ نہ کچھ لوگوں کو ضرور اس کا پتا ہونا چاہیے۔ مگر جہاں تک میں جج کررہا ہوں، میرے اردگرد موجود کسی شخص کا چہرہ یہ ظاہر نہیں کررہا کہ وہ اس سوال کا حتمی جواب جانتا ہے۔ اب دو آپشن رہ جاتے ہیں۔ نیلا رومال کسی پینٹنگ کا عنوان ہے یا گیت کا عنوان ہے۔ میرے خیال میں یہ ففٹی ففٹی کا چانس بنتا ہے۔“

”تم کیا چانس لوگے ایمران؟“ گیری نے پوچھا۔

عمران نے چند سیکنڈ کی خاموشی اختیار کی۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر نمودار ہوا۔ مجھے یاد آیا، یہ وہی تاثر تھا جو ایک چھ اور دو چھ کا کھیل کھیلتے ہوئے اس کے چہرے پر آتا تھا۔ ریوالور کے ایک خانے میں گولی اور پانچ خانے خالی یا پھر دو میں گولی اور چار خانے خالی۔ ایک وجدانی سی کیفیت۔ اس نے کہا۔ ”میں آپشن نمبر تین کی طرف جاؤں گا۔ نیلا رومال ایک گیت ہے۔“

فون کال کا وقت صرف دو منٹ کا تھا اور یہ وقت ختم ہو چکا تھا۔ لائن منقطع ہوگئی۔ اب گیری کو جواب دینا تھا۔ اس نے چند گہری سانسیں لیں۔ کمپیئر نے گیری کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اور سنسنی کو بڑھاوا دیتے ہوئے کہا۔

”ہاں مسٹر گیری! آپ کیا جواب دینا چاہتے ہیں؟ میں آپ کو گیم کا رول ایک بار پھر بتا دیتا ہوں۔ آپ دو ملین ڈالرز جیت چکے ہیں۔ آپ درست جواب دیں گے تو آپ کی انعامی رقم ہو جائے گی چار ملین ڈالرز... مقامی کرنسی میں یہ قریباً تیس کروڑ روپیا بنتا ہے۔ اگر آپ کا جواب غلط ہو گیا تو پھر آپ کو بنیادی انعام یعنی پینسٹھ ہزار ڈالرز پر جانا ہوگا۔ اگر آپ تذبذب میں ہیں اور رسک لینا نہیں چاہتے تو پھر یہ کھیل یہیں پر چھوڑ سکتے ہیں۔ اس صورت میں آپ اپنا جیتا ہوا انعام یعنی دو ملین ڈالرز یہاں سے لے جاسکیں گے اور یقیناً یہ ایک خاصی معقول رقم ہے۔“

گیری نے چند لمحے توقف کیا پھر اس نے جواب دیا۔ ”میں کھیلنا چاہتا ہوں اور میرا جواب ہے، آپشن نمبر تین۔ نیلا رومال ایک گیت کا عنوان ہے۔“

ہال میں سناٹا تھا۔ کمپیئر نے سسپنس کو بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تو آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ کے جواب کو ”سیف“ کرلیا جائے؟“

”جی ہاں۔“

کمپیئر نے اناؤنسمنٹ کے انداز میں کہا۔ ”مسٹر گیری کے جواب کو محفوظ کیا جائے۔ آپشن نمبر تین۔“ الیکٹرانک اسکرین پر آپشن نمبر تین سیف ہوگیا۔

ہال میں مکمل خاموشی تھی۔ دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ کمپیئر جان بوجھ کر وقفے کو طول دے رہا تھا۔ اس کی نگاہیں نوجوان گیری کی اضطرابی کیفیت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر اس نے اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ پر نگاہ ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا اور ڈرامائی انداز میں بولا۔ ”مسٹر گیری... چار ملین ڈالرز۔ آپ کا جواب درست ہے۔“

ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ بہت سے لوگ کھڑے ہو گئے۔ ریان ولیم بھی جوش کے عالم میں اپنی نشست سے اٹھا اور اس نے عمران کو گلے لگایا۔ ”مجھے یقین ہے... مجھے یقین ہے۔ تمہاری خوش بختی ضرور اپنا زور مارے گی۔“

گیری بھی شیشے کے چیمبر میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اس نے ناظرین کے پُرجوش ردِعمل کا جواب دیا۔ پھر اپنے تایا اور عمران وغیرہ کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔

کمپیئر نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”نیلا رومال ایک گیت ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں یہ گیت روس میں بہت مقبول ہوا تھا اور آج بھی یہ گایا جاتا ہے۔ لوگ اسے سن کر روتے تھے اور دل ہی دل میں گنگناتے تھے۔ یہ ایک ایسے سپاہی کا واقعہ ہے جو لڑائی پر روانہ ہوتے ہوئے، اپنی محبوبہ کو ایک نیلے رومال کا تحفہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اسے یاد رکھے۔ وہ لڑکی برسوں اس رومال کو سینے سے لگائے رکھتی ہے اور اس خوب صورت چمکیلے دن کی منتظر رہتی ہے جب اس کا محبوب واپس آئے گا مگر وہ نہیں آتا۔ وہ کبھی نہیں آتا۔ وہ مر چکا ہے۔“

کمپیئر نے چار ملین ڈالرز کا چیک گیری کو دیا اور بولا۔ ”مسٹر گیری! یہ ایک کافی بڑی رقم ہے۔ آپ اس کے مالک ہیں اور ابھی امید ہے کہ آپ کی ملکیت میں اضافہ ہوگا۔ آپ اس خطیر رقم کو کس طرح استعمال کرنا چاہیں گے؟“

گیری کچھ کھویا کھویا نظر آیا۔ تب اس نے اپنے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور بولا۔ ”جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے، مجھے یہ ظاہر کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں عالی جناب ریان ولیم صاحب کا ایک دور کا رشتے دار ہوں اور میری مالی حیثیت انکل ریان ولیم سے کہیں... کہیں کم ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ انکل کی عنایت ہے کہ انہوں نے اس انعامی رقم کا کچھ پورشن مجھے دینے کا وعدہ کیا ہے... اور مجھے اس قابل سمجھا ہے کہ میں ان کی طرف سے اس میگا ایونٹ میں حصہ لوں۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ میں برص میں مبتلا ہوں۔ میری ایک بہن بھی برص کی مریضہ تھی۔ اس نے محبت میں ناکامی کے بعد زیادہ مقدار میں ٹرنکولائزر لے کر اپنی جان دے دی تھی۔ خیر، یہ تو اب ماضی کا قصہ ہے۔ اگر میں ایک بڑی رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو میں آسٹریا میں اپنا علاج کرواؤں گا اور اس کے علاوہ برص کے علاج پر تحقیق کرنے والے عالمی ادارے کو ''ڈونیشن'' دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ خدا آپ کو اپنے ارادے میں کامیاب کرے۔ اب ہم آتے ہیں اس اہم ترین مرحلے کے دوسرے سوال کی طرف۔ کیا آپ تیار ہیں؟'' کمپیئر نے پوچھا۔

''جی، میں تیار ہوں۔'' گیری نے جواب دیا اور ہاٹ سیٹ پر پہلو بدلا۔

کمپیئر بولا۔ ''ایک ہوسٹ اور کمپیئر ہونے کی حیثیت سے میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ جواب دینے سے پہلے اپنا پورا وقت لیں۔ چار ملین ڈالرز کافی بڑی رقم ہے۔ اگر کسی مرحلے پر آپ کو محسوس ہو کہ آپ ایک بہت ''رسکی'' جواب دینے جا رہے ہیں تو آپ گیم چھوڑ دیں۔''

گیری نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اثبات میں سر ہلایا۔

کمپیئر نے کہا۔ ''لیجیے ناظرین! اس مرحلے کا دوسرا سوال آپ کے سامنے اسکرین پر آرہا ہے۔ اس سوال کا درست جواب ہمارے دوست مسٹر گیری گرانٹ کی انعامی رقم کو ڈبل کرے گا، یعنی وہ چار ملین ڈالرز سے آٹھ ملین ڈالرز ہو جائے گی۔ سوال یہ ہے۔'' سوال اسکرین پر نمودار ہوا۔ کمپیئر نے پڑھ کر سنایا۔ ''9 اگست 1945ء وہ المناک تاریخی دن ہے جب امریکن بمبار جہاز نے جاپانی شہر ناگاساکی پر ایٹم بم گرایا... لیکن اصل میں یہ بم ایک اور شہر پر گرایا جانا تھا۔ اس شہر کا نام کیا ہے؟ آپشن نمبر ایک ہیپو... آپشن نمبر دو یوکوہاما... آپشن تین اوساکا... آپشن چار کوکورا۔''

ہال میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ یہ ایک اور مشکل سوال آ گیا تھا۔ ناگاساکی کا نام تو ہر کوئی جانتا ہے لیکن وہ شہر کون سا تھا جس پر اصل میں ایٹم بم گرائے جانے کا امریکی پروگرام تھا۔ اس بار گیری گرانٹ کے چہرے پر ہلکی سی کرن نظر آرہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ مکمل طور پر اندھیرے میں نہیں ہے۔ اس نے ہاٹ سیٹ پر پہلو بدلا اور ایک بار پھر سوال کو نہایت توجہ سے پڑھا۔ تناؤ کی کیفیت ناظرین میں بڑھتی جا رہی تھی۔

''جی جناب... مسٹر گیری گرانٹ! آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ کیا ذہن میں کچھ آرہا ہے؟''

گیری نے دبے دبے جوش سے کہا۔ ''جہاں تک میرا خیال ہے، آپشن نمبر دو اور تین تو ہرگز نہیں کیونکہ یہ دونوں شہر ناگاساکی سے ذرا فاصلے پر ہیں... اور میرے خیال میں اس شہر کو ناگاساکی سے زیادہ دور نہیں ہونا چاہیے۔''

''اس خیال کی وجہ؟'' کمپیئر نے دریافت کیا۔

''جہاں تک میری معلومات ہیں، اس دوسرے شہر پر بم اس لیے نہیں گرایا جا سکا تھا کہ وہاں بادل چھائے ہوئے تھے، ان بادلوں کی وجہ سے ہی امریکی بمباروں نے ایک قریبی ہدف یعنی ناگاساکی کا انتخاب کر لیا تھا۔''

کمپیئر بولا۔ ''اگر آپ کے ذہن میں اتنا کچھ آرہا ہے تو پھر اس شہر کا نام بھی آپ کے ذہن میں آنا چاہیے۔''

گیری نے بے چینی سے اپنی انگلیوں کے پٹاخے نکالے۔ نشست پر پہلے آگے جھکا پھر پیچھے کی طرف گیا۔ ''میرے اندازے کے مطابق یہ شہر ہیپو ہوگا یا پھر کوکورا۔ لیکن ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''یعنی آپ کا خیال ہے کہ ابھی آپ کو چاروں آپشن ذہن میں رکھنے چاہئیں۔'' کمپیئر نے اسے مزید الجھانے کی کوشش کی۔

گیری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس الیکٹرانک اسکرین کو دیکھتا رہا اور اپنی سوچ کے گھوڑے کو دوڑاتا رہا۔ ہال میں پن ڈراپ سائیلنس تھا۔

قریب ایک منٹ کے غور و فکر کے بعد اس نے اپنی دوسری لائف لائن استعمال کرنے کے لیے عمران سے رابطہ کیا۔ ''ہیلو ایمران... تم کیا مشورہ دیتے ہو؟''

عمران نے کہا۔ ''میرے ذہن میں بھی وہی کچھ آرہا ہے جو تمہارے ذہن میں آرہا ہے۔ آپشن نمبر ایک یا آپشن نمبر چار... اور تھوڑا بہت آپشن نمبر دو بھی۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟''

''میرا خیال ہے کہ آپشن ایک اور آپشن چار پر ہی توجہ رکھنی چاہیے۔'' عمران نے کہا اور پھر کیبن میں موجود باقی افراد کی طرف دیکھا۔

مجھ سمیت کیبن میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اس مشکل

سوال کے حوالے سے عمران اور گیری کی کوئی مدد کر سکتا۔ مسٹر ریان ولیم نے اپنے بھاری بھرکم کندھے اچکا کر اپنی لاعلمی اور بے بسی کا اظہار کیا۔ ان کے دونوں دوستوں کے تاثرات بھی یہی تھے۔

کمپیئر کی آواز گونجی۔ ''ہاں مسٹر گیری... آپ کے پاس وقت کم ہو رہا ہے۔ فون کال کے حوالے سے آپ کے پاس اب صرف چالیس سیکنڈ بچے ہیں۔''

''بتاؤ ایمران... تمہاری چوائس کیا ہے؟'' گیری نے بے قراری سے کہا۔

''میری چوائس... کوکورا ہے۔'' عمران نے ذرا توقف کے بعد نہایت مضبوط اور دوٹوک انداز میں کہا۔

شاید اس کا یہی دوٹوک انداز ہوتا تھا جو اس کی خوش بختی کا وسیلہ بنتا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ یہاں بھی یہ انداز کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے یا نہیں۔

یہ تھرل اور سسپنس سے بھرپور لمحے تھے۔ گیری کے چہرے سے اضطراب مترشح تھا...

''ہاں مسٹر گیری!'' کمپیئر نے اپنی آواز سے گیری کو ٹہوکا دیا۔ ''یہ بہت اہم مرحلہ ہے۔ آپ کا درست جواب آپ کو پہنچا سکتا ہے آٹھ ملین ڈالرز کے خطیر انعام تک۔ غلط جواب کی صورت میں آپ آ جائیں گے بنیادی انعام صرف پینسٹھ ہزار ڈالرز پر... اگر آپ کھیل چھوڑنا چاہیں تو یہاں چار ملین ڈالرز کے انعام پر چھوڑ سکتے ہیں۔''

گیری کی پیشانی پر نمی چمکنے لگی۔ ایک طرف چار ملین ڈالرز یعنی تقریباً تیس کروڑ پاکستانی روپیا تھا اور دوسری طرف صرف انچاس لاکھ روپے کے لگ بھگ۔

گیری نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا اپنا ذہن تو آپشن نمبر ایک یعنی ہیپو کی طرف جا رہا ہے لیکن میں اپنے دوست کے ساتھ جانا چاہوں گا۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی ''لک'' میری مددگار ہوگی۔ میرا جواب ہے آپشن نمبر چار کوکورا...''

''کوکورا۔'' سی این این کے کمپیئر نے معنی خیز انداز میں دہرایا پھر بولا۔ ''مسٹر گیری! کیا یہ آپ کا حتمی جواب ہے؟''

''جی ہاں۔''

''کیا ہم اسے ''سیو'' کر لیں؟''

''جی ہاں۔''

''آپ کے پاس ابھی پچاس سیکنڈ ہیں۔ اگر آپ مزید سوچنا چاہتے ہیں تو سوچ لیں۔''

''سوچ لیا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے جی... آٹھ ملین یو ایس ڈالرز کے لیے مسٹر گیری کے جواب کو ''سیو'' کیا جائے۔''

اسکرین پر آپشن نمبر چار کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ کمپیئر نے اگلے تین چار منٹ میں اس جواب کے حوالے سے ہزاروں لاکھوں ناظرین کے تجسس کو خوب ابھارا۔ تجسس اور سنسنی کو یوں ابھارا جانا ان شوز کا خاصہ ہوتا ہے۔ کمپیئر کے چہرے اور باتوں سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ اپنی ساری ہمدردیاں گیری کے ساتھ بتا رہا تھا اور کبھی کبھی اسے تاسف کی نظروں سے بھی دیکھنے لگتا تھا۔ ٹی وی کیمرے ناظرین کے ہجوم میں سے بار بار گیری کی والدہ اور چھوٹی بہن کو دکھا رہے تھے۔ وہ آنکھیں بند کیے بیٹھی تھیں اور ان کے ہونٹ بے ساختہ، دعائیہ انداز میں ہل رہے تھے...

آخر کمپیئر اپنی نشست سے کھڑا ہوا اور اس نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ''مسٹر گیری! ہمیں خوش قسمتی پر یقین رکھنا چاہیے اور خوش بختی اکثر لوگوں کی مدد بھی کرتی ہے۔ مگر... خوش قسمتی نے اس دفعہ آپ کی مدد نہیں کی... بلکہ آپ کو... باقاعدہ اپنے کندھوں پر اٹھا کر منزل تک پہنچایا ہے۔'' کمپیئر نے آخری چند الفاظ بے حد جوش کے عالم میں اور ڈرامائی انداز سے کہے۔

پورا ہال اپنے پنجوں پر کھڑا ہو گیا۔ حاضرین نے ایک پُرجوش آوازہ بلند کیا... گیری نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے اور خوشی سے چلّا اٹھا۔ قیامت کے شور میں کمپیئر کی آواز گونجی۔ ''آپ کا جواب درست ہے مسٹر گیری۔ آپ اٹھ ملین ڈالرز جیت چکے ہیں۔ آپ اس رقم کے مالک ہیں۔''

گیری نے فون سیٹ کو چوما اور پکارا۔ ''تھینک یو ایمران... تھینک یو...'' گیری کی والدہ اور چھوٹی بہن کو بڑے جذباتی انداز میں ایک دوسرے سے بغل گیر دکھایا گیا۔

قریباً ایک منٹ تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔ پھر کمپیئر کی آواز گونجی۔ اس نے جواب کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''کوکورا وہ شہر تھا جہاں امریکیوں نے دوسرا ایٹم بم گرانے کی پلاننگ کی تھی۔ امریکی بمبار جہاز کوکورا کے لیے ہی روانہ ہوئے تھے لیکن کوکورا والوں کی خوش قسمتی کہ اس روز شہر پر بادل چھائے ہوئے تھے اور بہت دھواں بھی تھا جس کی وجہ سے بمبار، شہر کے تین چکر لگانے کے باوجود اپنا ٹارگٹ نہ ڈھونڈ سکے۔ یوں ایک بہت بڑے اسلحے کے ڈپو اور کارخانے والا یہ شہر بچ گیا۔ اس کے حصے کی موت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ناگاساکی پر برس گئی۔ 9 اگست 1945ء ... گیارہ بج کر دو منٹ۔ کوکورا کی جگہ ناگاساکی موت کے منہ میں چلا گیا۔"

شو اپنے کلائمیکس پر پہنچ گیا تھا۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز تر ہورہی تھیں۔ گیری پاکستانی کرنسی کے مطابق تقریباً ساٹھ کروڑ کا انعام جیت چکا تھا۔ اب صرف ایک سوال کے عوض اس کی انعامی رقم ایک بہت بڑا جمپ لے سکتی تھی۔ سولہ ملین ڈالرز یعنی تقریباً ایک ارب بیس کروڑ روپے۔ یہ انعام ایک لگژری جہاز کی صورت میں تھا۔ اسے سپنوں کا جہاز کہا جاسکتا تھا۔ نہایت قیمتی، نہایت آرام دہ اور جدید ترین سہولتوں سے آراستہ۔ بتانے والے بتارہے تھے کہ "فیلکن 900 سی" نامی اس جہاز کو کسی بھی وقت سولہ ملین بلکہ اس سے بھی زیادہ رقم پر فروخت کیا جاسکتا تھا۔ صرف ایک سوال کے جواب کی قیمت ساٹھ کروڑ روپے تھی اور یہ سوال گیری کے سامنے آنے والا تھا۔

آخر کمپیئر نے پروگرام کو اس فائنل مرحلے کی طرف بڑھایا۔ اس نے کہا۔ "ناظرین! دل تھام کر بیٹھیں۔ مسٹر گیری اس مقابلے کی بلند ترین سطح پر پہنچ چکے ہیں۔ وہ آٹھ ملین ڈالرز جیت چکے ہیں اور اس رقم کا چیک انہیں دیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ یہ چیک واپس کرنا چاہیں اور آگے بڑھنا چاہیں تو ہم آگے بڑھنے کے لیے تیار ہیں۔"

طے شدہ پروگرام کے مطابق گیری آگے بڑھنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ اس نے چیک کمپیئر کی طرف واپس بڑھا دیا جو پہلے کی طرح شیشے کے ایک باکس میں رکھ لیا گیا۔ کمپیئر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "مسٹر گیری! آپ کے دل کی دھڑکن کیا کہہ رہی ہے؟"

گیری کوشش کرکے مسکرایا۔ مسکراتے ہوئے اس کے برص زدہ ہونٹ کچھ اور نمایاں ہو جاتے تھے۔ وہ بولا۔ "جناب... دھڑکن سولہ سولہ کی رٹ لگا رہی ہے۔ سولہ ملین۔"

کمپیئر نے کہا۔ "آٹھ ملین بھی تو معمولی رقم نہیں ہے۔ کیا آپ اسے داؤ پر لگانے کو تیار ہیں؟"

"اس کا فیصلہ سوال آنے کے بعد کرتے ہیں۔" گیری پھر نروس انداز میں مسکرایا۔

"سوال خاصا مشکل ہے مسٹر گیری۔ میں آپ کو پھر مشورہ دوں گا کہ جواب کے حوالے سے اگر آپ کے ذہن میں شکوک زیادہ ہیں تو پھر آپ جواب مت دیں۔ آپ ایک خطیر رقم کے مالک بن چکے ہیں۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ اب یہ رقم آپ سے دور نہ ہو۔"

"میری بھی یہی خواہش ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی خواہش ہے کہ میں گرینڈ پرائز حاصل کروں۔"

"تو ٹھیک ہے جی۔ اب تیسرا اور آخری سوال آپ کے سامنے آرہا ہے اسکرین پر۔" کمپیئر نے کہا۔

اسکرین پر سوال جگمگایا۔ "اب تک کی سائنسی تحقیق کے مطابق طاعون کا مرض پیدا کرنے والے جرثومے FLEAS کی کتنی اقسام سامنے آچکی ہیں... 1000... 1400...2400 یا پھر 850۔"

اسکرین پر سوال پڑھنے کے بعد گیری کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔ یہ ایک نہایت مشکل سوال تھا یا شاید یہ ترتیب ہی اس لیے دیا گیا تھا کہ اس کا جواب دیتے ہوئے صرف اور صرف اندازے سے کام لیا جاسکے۔ یعنی اس سوال کے حوالے سے یہ سراسر قسمت کا کھیل بن گیا تھا۔ بس ایک تُکّا لگایا جانا تھا اور یہ تُکّا کامیاب بھی ہوسکتا تھا اور ناکام بھی۔

کمپیئر نے متجسس نظروں سے گیری کے برص زدہ چہرے کو دیکھا۔ "جی مسٹر گیری! سولہ ملین ڈالرز کا سوال آپ کی خدمت میں پیش کیا جاچکا ہے۔ آپ کے ذہن میں کیا آرہا ہے؟"

"یہ بہت کٹھن سوال ہے۔" گیری پھیکے انداز میں مسکرایا۔

"انعام بھی تو بہت بڑا ہے۔ آپ اپنے ذہن کو سوال پر مرکوز کریں اور پھر یہ بھی سوچیں کہ یہاں کوئی دس پندرہ یا بیس آپشن نہیں ہیں۔ صرف چار آپشن ہیں اور ان میں سے ایک درست ہے۔"

گیری کی پیشانی پر پسینا چمکنے لگا۔ یقیناً وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ ایک سوال کے بدلے میں اس کی انعامی رقم تقریباً ساٹھ کروڑ سے قریباً ایک سو بیس کروڑ ہونے والی تھی۔ صرف ایک سوال کا درست جواب اور وہ جواب ان چار آپشنز میں موجود تھا۔ یہی اس کھیل کی خوب صورتی تھی۔ اب یہ بس ہمت کا کھیل تھا۔ درست جواب پر ساٹھ کروڑ روپے کا اضافہ اور غلط جواب پر جیتی ہوئی رقم سے بھی محرومی۔ اس صورت میں گیری کو فقط پینسٹھ ہزار ڈالرز یعنی تقریباً انچاس لاکھ روپے ملنے تھے۔ تیسری صورت یہ تھی کہ گیری اپنی انعامی رقم کو ڈبل کرنے کی بے پناہ کشش سے ہاتھ کھینچ لیتا اور اس کھیل کو یہیں پر چھوڑ دیتا۔

اگلے دو تین منٹ بے حد اعصابی تناؤ اور کشیدگی کے تھے۔ کمپیئر اس تناؤ اور سنسنی میں اضافے کے لیے مسلسل چھوٹے چھوٹے فقرے بول رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "مسٹر

گیری! یقیناً کوئی ایک آپشن تو ایسا ہوگا جسے آپ دوسرے آپشنز سے بہتر سمجھتے ہوں گے۔"

گیری پھیکے انداز میں مسکرایا اور طویل سانس لے کر بولا۔ "نہیں۔ یہ پہلا سوال ہے جس کے حوالے سے میرا ذہن بالکل "بلینک" ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں کوئی بھی اندازہ قائم کرنے سے قاصر ہوں۔"

ہمارے کیبن میں ریان ولیم نے سوالیہ نظروں سے عمران کی طرف دیکھا۔ عمران کا چہرہ بھی سپاٹ تھا اور لگ یہی رہا تھا کہ اس بھرے پُرے ہال میں شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو اس سوال کا جواب جانتا ہو۔

"تو کیا آپ کھیل یہیں پر چھوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" کمپیئر نے گیری سے پوچھا۔

"جی... میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اپنی آخری لائف لائن استعمال کروں گا۔" گیری نے پیشانی سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

"مسٹر گیری کے دوست کو فون لگایا جائے۔" کمپیئر نے آرڈر جاری کیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ "اور ہم امید کرتے ہیں کہ گیری کا یہ دوست ان کے لیے پہلے کی طرح بخت آور ثابت ہوگا۔"

چند سیکنڈ بعد ہمارے کیبن میں رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ عمران نے ریسیور اٹھایا۔ گیری نے کہا۔ "ہیلو ایمران ڈیئر! تمہارا کیا مشورہ ہے؟"

عمران نے کہا۔ "اس سوال کے حوالے سے میری پوزیشن بھی وہی ہے جو تمہاری ہے... اور شاید اس ہال میں موجود تمام لوگوں کی ہے۔ اب یہ سراسر قیافے اور "لک" کا کھیل بن گیا ہے۔ یہ ففٹی کا نہیں سیونٹی فائیو اور ٹوئنٹی فائیو کا رسک ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ کسی ریوالور میں آٹھ خانے ہیں۔ چھ خانوں میں گولیاں ہیں اور دو خانے خالی ہیں۔ آپ کو چرخی گھما کر اپنی کنپٹی پر ٹریگر دبانا ہے۔"

"شاید تم نے ٹھیک مثال دی ہے۔" گیری نے ٹھنڈی سانس بھری۔

چیمبر میں ایک بیل کی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی برٹش کمپیئر نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "ناظرین! جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ اس فائنل مرحلے میں ہم اپنے معزز PARTICIPANT کو سوچ بچار کے لیے جو وقت دیتے ہیں، وہ پانچ منٹ کے بجائے دس منٹ کا ہوتا ہے۔ فون کال بھی دو منٹ کے بجائے چار منٹ کی ہوتی ہے۔ مسٹر گیری! آپ اپنا پورا ٹائم لیں اور جو فیصلہ کریں، سوچ سمجھ کر کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ یہاں سے ایک بڑی اماؤنٹ لے کر جائیں۔ آپ نے اپنے علاج اور دوسروں کی صحت وتندرستی کے لیے جو ارادے ظاہر کیے ہیں، وہ پورے ہوں۔"

ناظرین بہت شور مچا رہے تھے اور ہاتھوں کے اشارے سے گیری کو مشورہ دے رہے تھے کہ وہ کھیل یہیں پر ختم کردے کیونکہ ایک خطیر رقم اس کے حصے میں آچکی ہے۔ ٹی وی کیمروں نے گیری کی والدہ اور چھوٹی بہن کو دکھایا۔ وہ بھی زبردست کشیدگی کا شکار تھیں۔ گیری کی چھوٹی بہن بھی اشاروں سے بھائی کو کھیل QUIT کرنے کا مشورہ دے رہی تھی۔

ہمارے کیبن میں عمران نے فون کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور ریان ولیم سے پوچھا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں جناب؟"

"میں صرف جیتنا چاہتا ہوں۔"

"یعنی آپ چاہتے ہیں کہ رسک لیا جائے؟"

"بالکل لیا جائے... لیکن یہ رسک تم لو۔"

"میں آپ کو پھر بتادوں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ریوالور کے چھ خانوں میں گولیاں ہوں اور صرف دو خانے خالی ہوں۔"

"میں نے زندگی میں کبھی خانے نہیں گنے مسٹر ایمران! میں یہ داؤ کھیلنا چاہتا ہوں اور... تمہارے ذریعے کھیلنا چاہتا ہوں۔"

"آپ کا فیصلہ حتمی ہے؟"

"ہاں حتمی ہے۔" ریان ولیم نے ٹھوس آواز میں کہا۔ "تخت یا تختہ۔"

عمران کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے فون سیٹ کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹایا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ "گیری! میری رائے میں آپشن نمبر 2۔"

چند سیکنڈ کے بعد فون کال کا وقت ختم ہوگیا۔

اب سب کچھ گیری گرانٹ پر تھا۔ کمپیئر نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ "جی مسٹر گیری! آپ جواب دیجیے۔ اب تک کی سائنسی تحقیق کے مطابق طاعون کا مرض پیدا کرنے والے جرثومے FLEAS کی کتنی اقسام سامنے آچکی ہیں۔ 1000...1400...2400 یا پھر 850۔"

گیری خاموش رہا۔ اتنے بڑے چیلنج کے سامنے وہ سکتہ زدہ نظر آرہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمپیئر نے دہرایا۔ ”جی مسٹر گیری! آپ کے پاس وقت کم ہو رہا ہے۔ آپ کے درست جواب کا مطلب ہے، سولہ ملین ڈالرز سے زیادہ مالیت کا بے مثال لگژری طیارہ۔ ایک سپنوں کا جہاز۔ آپ کے غلط جواب کا مطلب ہے، قریباً آٹھ ملین ڈالرز سے محرومی۔ آپ اب بھی کھیل چھوڑ سکتے ہیں۔“

گیری نے آخری بار ہمارے کیبن کی طرف دیکھا۔ ریان ولیم نے اپنا..... بڑا سر اثبات میں ہلایا۔ گیری نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ”میں آپشن نمبر 2 کے ساتھ جانا چاہوں گا... 1400۔“

ہال میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ سب نگاہیں شیشے کے گول چیمبر پر اور الیکٹرانک اسکرین پر مرکوز تھیں۔

کمپیئر سنسنی خیز نظروں سے کبھی گیری کی طرف اور کبھی اپنے لیپ ٹاپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”مسٹر گیری! ابھی آپ کا جواب ”سیو“ نہیں کیا گیا۔ کوئز شوز کی تاریخ کے اس سب سے بڑے شو میں، میں آپ کو ایک موقع اور دیتا ہوں۔ اگر اب بھی آپ اپنا جواب بدلنا چاہیں تو بدل سکتے ہیں۔“

گیری نے متوحش نظروں سے کمپیئر کو دیکھا پھر ہمارے کیبن کی طرف نگاہ دوڑائی۔ عمران خاموش تھا اور ریان ولیم بھی۔ ریان ولیم کے دونوں دوست بھی یکسر خاموش تھے۔ ایسے شوز میں کمپیئرز اور ہوسٹ اپنے کھلاڑی کو اس طرح کی آفرز دیتے ہیں۔ ان آفرز کا مطلب کھلاڑی کے اعصاب ٹیسٹ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ آفر کبھی سودمند ہوتی ہے اور کبھی نقصان دہ۔ ریان ولیم نے گیری کی طرف دیکھا۔ پھر کھڑے ہو کر ایک بار پھر اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ مطلب یہی تھا کہ وہ جواب دے اور آپشن نمبر 2 کے ساتھ رہے۔

گیری نے حتمی لہجے میں کہا۔ ”میرا جواب آپشن نمبر 2 ہی ہے۔“

آپشن نمبر 2 کو ”سیو“ کر لیا گیا۔

سینوں میں دھڑکنیں نقاروں کی طرح گونج رہی تھیں۔ ہر نگاہ الیکٹرانک اسکرین پر تھی۔ اگر جواب درست ہوتا تو اسکرین پر سبز رنگ نمودار ہونا تھا... دوسری صورت میں سرخ رنگ۔ شاید کوئی بھی نگاہ سرخ رنگ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ ان فیصلہ کن گھڑیوں میں یہ سرخ رنگ خوف کی علامت بن گیا تھا۔ سبز رنگ خوشی اور جوش سے منسلک ہو گیا تھا۔ ہال میں پن ڈراپ خاموشی تھی۔ گیری آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔

... اور پھر ایک زوردار چھناکے کی آواز آئی۔ اس خاص قسم کے چھناکے کے ساتھ ہی الیکٹرانک اسکرین پر سرخ رنگ ابھرا۔ وقت کی گردش جیسے تھم گئی۔ گیری کا جواب غلط ہو چکا تھا...

ٹی وی کیمروں نے بار بار چہروں کے ردِ عمل دکھائے۔ گیری سکتہ زدہ بیٹھا تھا۔ اس کی والدہ اور بہن نے اپنے سر گھٹنوں میں دے رکھے تھے۔ کمپیئر خاموش تھا۔ ریان ولیم خاموش تھا۔ دو سو سے زیادہ ناظرین خاموش تھے اور کچھ صدا ہائے تاسف بلند کر رہے تھے۔ کئی سیکنڈ بعد کمپیئر کی نہایت گمبھیر آواز ابھری۔ ”مجھے افسوس ہے مسٹر گیری! آپ کا جواب غلط ہے۔ لیکن جو کچھ بھی ہے، آپ نے بہت دلیری سے مقابلہ کیا۔ آپ کے پاس کھیل سے پسپا ہونے کا آپشن موجود تھا مگر آپ نے اور آپ کے دوست نے فائٹ کرنے اور خطرہ مول لینے کو ترجیح دی۔ اس کے لیے آپ کی تعریف کرنا پڑے گی۔ زندگی خطرے مول لینے کا نام ہی تو ہے۔“

کمپیئر نے تالیاں بجائیں۔ آڈینز نے بھی مرے مرے انداز میں اس کا ساتھ دیا۔ کمپیئر نے کمپیوٹر سے کہا کہ اس سوال کا درست جواب بتایا جائے۔ جو جواب اسکرین پر آیا، وہ آپشن نمبر تین تھا... یعنی 2400۔

کمپیئر نے قاعدے کے مطابق جواب کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”سائنسی تحقیق کی تازہ رپورٹ کے مطابق طاعون کے جرثومے کی کم و بیش 2400 اقسام سامنے آ چکی ہیں۔ تاہم ان میں سے صرف 120 اقسام ایسی ہیں جو طاعون کا جرثومہ انسان میں منتقل کر سکتی ہیں۔ ان 120 اقسام میں سے تقریباً بیس بائیس قسمیں ایسی ہیں جو چوہوں کے ذریعے طاعون کے پھیلاؤ کا باعث بنتی ہیں۔ عالمی ادارۂ صحت کے مطابق ترقی پذیر ممالک میں طاعون جیسی خطرناک بیماری پھیلنے کے امکانات ہمہ وقت موجود ہیں۔“

ہال میں ویسی ہی خاموشی طاری تھی جو طاعون سے برباد شدہ کسی بستی میں ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اب تک کے کھیل میں اپنے رویّے سے گیری نے قریباً سو فیصد ناظرین کی ہمدردیاں حاصل کر لی تھیں۔ صدمے کی شدت سے گیری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اس کی والدہ اور چھوٹی بہن بھی ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ خاموش بیٹھی تھیں۔

کمپیئر نے گیری کو گلے سے لگایا اور تسلی دی۔ اس کے ساتھ ہی پینسٹھ ہزار ڈالرز کا چیک بھی اسے دیا گیا۔ یہ ایک

دل ہلا دینے والا اینٹی کلائمکس تھا۔

... قریباً دس منٹ بعد کھیل کا اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ کھیل کا سارا پیٹرن وہی پہلے والا تھا... پہلے ایک ہاؤس وائف کھیلنے کے لیے آئی۔ اس کا تعلق انڈیا سے تھا۔ یہ بھی چند دیگر امیدواروں کی طرح پہلے مرحلے میں منتخب ہوئی تھی۔ یہ پچیس چھبیس سالہ خاتون صرف دوسرے مرحلے تک پہنچ سکی۔ اس نے فقط دس ہزار ڈالرز جیتے۔ پھر ایک جاپانی آیا۔ یہ بھی زیادہ آگے نہیں جا سکا۔ اگلے قریباً پون گھنٹے میں چار امیدوار ابتدائی مرحلوں میں فارغ ہو کر واپس گئے۔ صرف ایک شخص پانچ لاکھ ڈالرز یعنی قریباً تین کروڑ پچھتر لاکھ روپے کے انعام تک پہنچ سکا۔

چھٹے نمبر پر جو کھلاڑی شیشے کے چیمبر میں داخل ہوئی اور ہاٹ سیٹ پر بیٹھی، یہ وہی امریکن لڑکی تھی جس کا باپ ریان ولیم کا کاروباری حریف بھی تھا۔ اس لڑکی کا نام ماریانی اور اس کے باپ کا نام مسٹر بفیلو بتایا گیا تھا۔ لڑکی دیکھنے میں پُرکشش تھی اور کسی ماڈل ہی کی طرح نظر آتی تھی۔ اس نے نہایت ٹائٹ جینز پہن رکھی تھی۔ بالائی جسم کا لباس بھی ایسا تھا جو چھپا کم رہا تھا اور دکھا زیادہ۔ ریان ولیم نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ ”کہتے ہیں کہ خوب صورتی اور ذہانت عورتوں میں کم کم ہی اکٹھی ہوتی ہے لیکن اس خبیث میں یہ دونوں چیزیں اکٹھی آ گئی ہیں۔“

یہ فقرہ بولنے کے فوراً بعد ریان ولیم اپنے بھاری بھرکم جسم کو ہلکورا دیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ غالباً وہ اس لڑکی کو کھیلتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے دونوں دوست بھی بیزاری کے عالم میں کھڑے ہو گئے۔

ریان ولیم کی ناپسندیدگی کو دیکھتے ہوئے ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ جس وقت ہم اس میگا شو میں سے باہر نکل رہے تھے، کمپیئر کی خوب صورت آواز ہال میں گونج رہی تھی۔ ”... تو جی ناظرین! اب کچھ اور نہایت سنسنی خیز لمحے آپ کے منتظر ہیں۔ مس ماریانی وہ ہونہار امیدوار ہیں... یا کہہ لیں کہ PARTICIPANT ہیں جن سے لوگوں نے مسٹر گیری ہی کی طرح بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ مس ماریانی اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطح تک بڑی کامیابی سے کوئز شوز میں حصہ لیتی رہی ہیں... اور آج وہ اس میگا ایونٹ میں موجود ہیں جس میں یہ قریباً ایک گھنٹے کے اندر اندر گرینڈ پرائز سولہ ملین ڈالرز تک پہنچ سکتی ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، پچھلے میگا شو میں مس ماریانی نے تین مرحلے حیران کن تیزی سے پار کر لیے تھے۔ اب تک وہ دو ملین یو ایس ڈالرز جیت چکی ہیں اور چوتھے مرحلے میں ہیں...“

کمپیئر کی آواز معدوم ہوتی چلی گئی۔ ہم ایک بند کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ یہاں حسبِ سابق میری اور عمران کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی گئیں اور ہمیں ایک نیم گرم کوریڈور میں سے گزار کر اسٹیشن وین میں پہنچا دیا گیا۔

ہم واپس اسی رہائش گاہ میں پہنچ گئے جہاں سے ہمیں میگا شو میں حصہ لینے کے لیے لے جایا گیا تھا۔ یہاں ہمارا خدمت گار عملہ پہلے سے موجود تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ اب ان لوگوں میں پہلے سی گرم جوشی موجود نہیں ہے۔ کچھ دیر بعد پتا چلا کہ مسٹر ریان ولیم اور ان کے دونوں دوست بھی اسی کوٹھی میں موجود ہیں مگر انہوں نے عمران کو یکسر نظر انداز کر دیا اور اپنے پورشن تک محدود رہے۔

جان محمد صاحب ہمارے پاس آئے۔ وہ بھی افسردہ تھے۔ انہوں نے بتایا۔ ”ریان ولیم صاحب دوستوں کے ساتھ مل کر غم غلط کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وِسکی پی رہے ہیں۔“

”میرے بارے میں کچھ فرمایا ہے انہوں نے؟“ عمران نے پوچھا۔

”ابھی وہ فرمانے کی پوزیشن میں نہیں۔“ جان صاحب نے کہا۔

دس پندرہ منٹ بعد ایک اور اطلاع پہنچی اور یہ بھی پریشان کن تھی۔ وہی ہوا تھا جس کا ریان ولیم کو ڈر تھا۔ میگا کوئز شو کے حوالے سے یہ خبر غیر متوقع نہیں تھی۔ جان محمد صاحب کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ انہوں نے کال ریسیو کی اور ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی مایوسی گہری ہو گئی۔ انہوں نے فون پر پوچھا۔ ”یہ کنفرم اطلاع ہے؟“ دوسری طرف سے غالباً اثبات میں جواب دیا گیا تھا۔

جان محمد صاحب نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ”امریکن ماریانی گرینڈ پرائز جیت گئی ہے۔ سولہ ملین ڈالرز کا لگژری پلین۔“

”اب تو ریان صاحب کا حال اور بھی بُرا ہو جائے گا۔ کہیں پریشر کی وجہ سے ان کا بھاری بھرکم جسم پھٹ ہی نہ جائے۔“ عمران نے تشویش ظاہر کی۔

ریان صاحب تو نہیں پھٹے لیکن ان کا ایک دوست ضرور پھٹ گیا۔ قریباً دس منٹ بعد وہ نشے میں ڈولتا ہوا دروازے پر نمودار ہوا۔ یہ وہی ٹماٹر کی ناک والا تھا۔ وہ بالکل ٹُن ہو رہا تھا۔ اس نے عمران کو گھورا اور کرخت انگلش میں بولا۔ ”واہ... واہ بڑے خوش قسمت ثابت ہوئے ہو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمارے لیے۔ ہمیں تو نہال کر دیا تم نے اور مالا مال کر دیا۔ تمہارا تھوبڑا چومنے کو دل چاہتا ہے... اور دل چاہتا ہے کہ تمہیں گائے کے گوبر میں تولا جائے اور یہ سارا گوبر گٹھڑی میں باندھ کر تمہارے سر پر رکھ دیا جائے۔ واہ... کہاں چھپے ہوئے تھے تم اب تک؟ کہاں سے ڈھونڈا ہے تمہیں ہمارے پیارے ریان نے؟"

"تمہارے گھر میں چھپا ہوا تھا۔ تمہاری وائف کے بستر کے نیچے۔" عمران نے مدھم آواز میں کہا۔

"کیا بکا تم نے؟" ریان کے شرابی دوست نے آگے کو جھکتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ میری صفائی تو آپ نے خود ہی پیش کر دی ہے۔ میں خود نہیں آیا بلکہ مجھے ڈھونڈ کر لایا گیا ہے اور بعد میں جو کچھ بھی ہوا ہے، وہ آپ لوگوں کے... اصرار پر ہوا ہے۔ باقی قسمت کے کھیل میں تو کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

اس نے شرابی انداز میں ہاتھ لہرایا۔ "ہاں، قسمت کے کھیل میں کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اب اگر میں تمہیں کوئی چیز اٹھا کر مارتا ہوں تو وہ تمہیں لگ سکتی ہے اور نہیں بھی لگ سکتی۔ قسمت کا کھیل ہی ہے نا؟" اس کے ساتھ ہی اس نے پتھر کا ایک چھوٹا گل دان اٹھایا اور طاقت سے عمران کے سر کو نشانہ بنایا۔ عمران نے جھک کر خود کو گل دان کی ضرب سے بچایا۔ گل دان اڑتا ہوا ایک قدِ آدم آئینے سے ٹکرایا اور اسے چکنا چور کر گیا۔

"واقعی قسمت کا کھیل ہے۔" ٹماٹر کی ناک والے نے سر اوپر نیچے ہلایا... "اس شیشے کی قسمت میں موت لکھی تھی۔ چچ چچ... کتنا قیمتی شیشہ تھا... میڈ اِن فرانس۔" اس نے کہا اور تاسف انگیز انداز میں جھک کر شیشے کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔ یہ ٹکڑا عمران کے قدموں کے پاس پڑا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ بہت برق رفتار تھا۔ اس شخص نے آئینے کے ایک بڑے ٹکڑے سے یکا یک عمران کی رانوں کو نشانہ بنایا۔ یہ اتنا غیر متوقع حملہ تھا کہ عمران کی جگہ کوئی اور ہوتا تو خود کو بچا نہ سکتا۔ پھر بھی نکیلا ٹکڑا اس کی ناف کے قریب لکیر ڈالتا ہوا نکل گیا۔

ٹُن حملہ آور سخت اشتعال میں تھا۔ شاید وہ مزید حملے کرتا مگر عمران نے اس کی کلائی دبوچ لی پھر اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر طاقت سے دھکا دیا۔ وہ اڑتا ہوا سا دیوار سے ٹکرایا اور ایک چھ فٹ اونچے آرائشی لیمپ پر گر کر اسے چکنا چور کر گیا۔ لیمپ کی روشن ٹیوب لائٹ ایک چھوٹے سے دھماکے سے چکنا چور ہو گئی۔ عمران نے ٹماٹر کی ناک والے کی فربہ گردن اپنے آہنی بازو میں جکڑ لی اور ٹوٹ جانے والے لیمپ کا الیکٹرک تار اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ امکان تھا کہ اس تار میں ابھی تک کرنٹ دوڑ رہا ہوگا۔ عمران نے تار کے ننگے سرے حملہ آور کے چہرے سے قریب کیے۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ تاہم اس کی چربی دار گردن پر عمران کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اس کا بالائی دھڑ بس مچل کر رہ گیا۔

عمران الیکٹرک تار اس کے چہرے کے بالکل قریب لے گیا۔ پھر فلم شعلے کے گبر سنگھ کی نقل اتارتے ہوئے بولا۔ "ہم کو کچھ پتا نا ہیں ٹھاکر... کہ اس میں کرنٹ ہے یا نا ہیں... ہم کو کچھ پتا نا ہیں۔ یہ سارا قسمت کا کھیل ہے۔ اگر کرنٹ نا ہیں ہوا تو تمہیں جندگی مل جائے گی۔ اگر ہوا تو پھر ناک کی طرح تمہارا باقی کا تھوبڑا بھی بندر کی پیٹھ جیسا ہو جائے گا۔"

سرخ ناک والے حملہ آور کو اب اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کس آفت میں آ گیا ہے۔ نہایت زوردار اور جسیم ہونے کے باوجود وہ اپنے بالائی جسم کو حرکت تک نہیں دے سکتا تھا۔ اس کا نشہ یقیناً ہرن ہو چکا تھا۔ یہی وقت تھا جب ریان ولیم اپنے پہاڑ جیسے جسم کے ساتھ تیزی سے اندر داخل ہوا...

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" ریان چنگھاڑا۔

عمران نے چند لمحے توقف کیا پھر حملہ آور کی گردن چھوڑ دی۔ وہ بُری طرح کھانستا اور ابکائیاں لیتا ہوا گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اتنے میں مسلح گارڈز بھی اندر داخل ہو گئے۔ وہ خطرناک ارادوں سے عمران کی طرف بڑھے مگر ریان ولیم نے گرج کر انہیں روک دیا۔

اس کے اشارے پر دو گارڈز، ابکائیاں لیتے اور گالیاں بکتے ہوئے سرخ ناک والے کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے سنبھالتے ہوئے باہر لے گئے۔ وہ بُری طرح ڈول رہا تھا۔ ریان ولیم نے خشمگیں نظروں سے عمران کو گھورا اور بولا۔ "یہ کیا حماقت ہے؟ تمہیں پتا ہے اس کا نتیجہ کیا نکل سکتا تھا؟"

"میں نے کچھ نہیں کیا جناب... اور میرے خیال میں آپ کے معزز دوست نے بھی کچھ نہیں کیا۔ یہ سب کچھ نشے کی زیادتی کی وجہ سے ہوا ہے۔ انہوں نے زیادہ پی رکھی تھی۔"

عمران کے اس ڈپلومیٹک جواب نے ریان ولیم کا طیش قدرے کم کیا۔ وہ کچھ دیر عمران کو گھورتا رہا پھر کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ اس کے چلنے کا انداز اور اس کا لب و لہجہ دونوں بتا رہے تھے کہ وہ خود بھی کافی سے زیادہ پیے ہوئے

ناکامی کا افسوس تو یقیناً سب کو ہوا تھا... اور باریابی کی ناکامی بھی یقیناً ریان اور اس کے ساتھیوں کو بہت کھلی تھی مگر اپنے جذبات کا ایسا بھونڈا اظہار سراسر غلط تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ریان ولیم بروقت آ گیا ورنہ بات بہت بڑھ سکتی تھی۔

☆☆☆

اسی روز رات بارہ بجے کے لگ بھگ ہم نے ریان ولیم کی مہمان نوازی کو خیر آباد کہا اور عاطف وغیرہ کے پاس واپس آ گئے۔ اگلے دن صبح جان محمد صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے رات والے واقعے پر افسوس کا اظہار کیا۔ انہوں نے فورڈ (سرخ ناک والے) پر غائبانہ لعنت ملامت بھی کی۔

میں بہت پریشان تھا۔ اقبال، میڈم صفورا اور دیگر ساتھیوں کا ابھی تک کوئی پتا نہیں تھا۔ میری پریشانی اور بے چینی کا اصل مرکز بالو تھا۔ وہ پتا نہیں کس حال میں تھا۔ اگر مجھے تسلی تھی تو صرف ایک بات کی۔ صفیہ اس کے ساتھ تھی۔ پچھلے چند ماہ میں وہ اس کے ساتھ بہت مانوس ہو چکا تھا۔

میں نے جان محمد صاحب سے پوچھا۔ "ریان صاحب سے کوئی بات ہوئی، ہمارے ساتھیوں کے بارے میں؟"

"پرسوں ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ان کا رابطہ اللہ آباد میں موجود انٹرپول کے ایک اعلیٰ افسر سے ہے۔ کچھ سراغ ملے ہیں۔ ان پر پیش رفت ہو رہی ہے۔"

"اس کے بعد بات نہیں ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے بعد تو یہ شو والا ہلا گلا شروع ہو گیا تھا۔ اور اب ویسے ہی ریان صاحب اور اس کے ساتھی بڑے خراب موڈ میں ہیں۔"

عمران نے کہا۔ "جان انکل! یہ تو ساری وقت گزاری والی باتیں لگتی ہیں۔ سراغ مل گئے ہیں... پیش رفت ہو رہی ہے... ٹارگٹ کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ یہ تو وہی گھسے پٹے جملے ہیں جو ہر سنگین واقعے کے بعد اربابِ اختیار کی طرف سے بولے جاتے ہیں۔"

"تو پھر تم ہی بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" جان محمد صاحب نے پوچھا۔

"اس کا تو مطلب ہے کہ اب تک ہم نے وقت ہی ضائع کیا ہے... اور وقت بھی ایسا جو بڑا قیمتی تھا۔" عمران بولا۔

"خیر، ایسی بات بھی نہیں۔ ریان صاحب نے جس طرح ذمے داری لی تھی مجھے یقین ہے کہ انہوں نے کچھ نہ کچھ کیا ہے۔"

"آپ ابھی اس سے رابطہ کریں اور صحیح صورتِ حال کا پتا کریں۔" عمران کا لہجہ دوٹوک تھا۔

جان محمد صاحب نے چند سیکنڈ تک تذبذب میں رہنے کے بعد موبائل پر نمبر ملایا اور انتظار کرنے لگے۔ چند لمحے بعد رابطہ ہو گیا۔ "ہیلو کون؟... ریان صاحب کہاں ہیں... کیا؟... لاہور سے چلے گئے... کب؟... لیکن انہوں نے انفارم ہی نہیں کیا۔ اچھا اچھا... چلو ٹھیک ہے... میں دیکھتا ہوں۔" جان محمد صاحب نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ جان محمد صاحب کی انگریزی بس واجبی سی تھی۔

ان کے چہرے پر مایوسی تھی۔ "کیا ہوا؟" عمران نے پوچھا۔

"ریان اور اس کے ساتھی آج صبح سویرے لاہور سے چلے گئے ہیں۔"

"کہاں گئے ہیں؟"

"شاید اسلام آباد۔ میں دوسرے نمبر پر کوشش کرتا ہوں۔" جان محمد صاحب نے کہا اور دوسرا نمبر ملانے لگے۔ دوسری طرف بیل ہوتی رہی لیکن کسی نے کال ریسیو کرنے کی زحمت نہیں کی۔

عمران گہری سانس لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "جو کچھ کرنا ہوگا، ہمیں خود کرنا ہوگا۔ اس گورے میں اتنا ظرف نہیں ہے کہ کوئز شو میں ہارنے کے بعد بھی اپنی کمٹ منٹ پوری کرے۔ وہ اب کچھ نہیں کرے گا ہمارے لیے۔"

عمران ایک یار باش شخص تھا۔ ہر جگہ اس کے دوست اور پرستار موجود تھے... وہ جہاں جاتا تھا، اپنی کچھ اچھی نشانیاں چھوڑ جاتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بمبئی اور لکھنؤ وغیرہ میں بھی اس کے جاننے والے موجود ہیں۔ عمران نے لکھنؤ میں اپنے ایک شناسا سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس شخص کا تعلق سید گھرانے سے تھا اور یہ انڈیا کی وزارتِ خارجہ میں ایک اہم عہدے پر فائز تھا۔

عمران ٹیلی فون پر مصروف ہو گیا۔ پہلی کوشش میں حبیب شاہ نامی اس شخص سے رابطہ نہیں ہو پایا لیکن دوسری کوشش میں ہو گیا۔ اس بندے سے عمران کی پُرتپاک گفتگو ہوئی اور عمران نے اسے اپنے مسئلے کے بارے میں ابتدائی معلومات فراہم کیں۔ ظاہر ہے کہ فون پر تفصیلی گفتگو ٹھیک نہیں تھی۔ رات کو انٹرنیٹ پر تبادلہ خیال کرنے کے بارے میں فیصلہ ہوا۔

میں نے عمران سے پوچھا۔ "کیا ہمیں دوبارہ انڈیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانا پڑے گا؟"

"اگر جانا بھی پڑا تو تم نہیں، میں جاؤں گا۔"

"تم نے خطرے مول لینے کا ٹھیکا لے رکھا ہے؟"

"ٹھیکیدار تو میں ہوں... اور تمہیں پتا ہے کہ بہت عرصے سے ہوں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس میں میرا اپنا لالچ بھی شامل ہے۔ یار! ادھر جاؤں گا تو عاصمہ سے پھر ملاقات ہونے کا موقع پیدا ہو جائے گا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ وہ ایک بے کس پری ہے اور ایک جابر دیو کی قید میں ہے۔ یہ ڈی ایس پی سجاد موہل کسی دیو یا جن سے کم تو نہیں۔ ان جنات کی جان عام طور پر طوطوں میں ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں وہ طوطا ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاؤں جس میں سجاد کی جان ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ عاصمہ سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ تم صرف بے پَر کی اڑاتے ہو..."

"یہ تو تم کہہ رہے ہو نا۔ اپنے دل کا حال تو مجھے معلوم ہے۔ آہ... اس میں جب مجھے شبانہ کی جھلک نظر آتی ہے تو لگتا ہے کہ ماضی کی کھڑکیاں کھل گئی ہیں اور "گردشِ صیام" پیچھے کی طرف دوڑ رہی ہے۔"

"گردشِ صیام نہیں گردشِ ایام ہوتا ہے۔"

"اب تم بھی غلطی کر رہے ہو گردش ہوتا نہیں بلکہ ہوتی ہے۔ لیکن ہوتا یا ہوتی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ میں وہ طوطا پکڑ سکتا ہوں یا نہیں جس کی ٹانگ توڑنے سے ڈی ایس پی سجاد کی ٹانگ ٹوٹ سکتی ہے..."

"اور فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ ہم اقبال، صفورا، نوری اور بالو وغیرہ کو واپس لا سکتے ہیں یا نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔

میرے اس فقرے نے اسے پھر سے سنجیدہ کر دیا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور لمبے کش لینے لگا۔ میں نے کہا۔ "سچ پوچھو عمران، تو کبھی کبھی تم پر غصہ آنے لگتا ہے۔ کئی معاملوں میں تم حد سے گزر جاتے ہو۔ میں مانتا ہوں کہ تمہیں خطروں میں رہنا پسند ہے اور یہ بھی مانتا ہوں کہ تم اپنی زندگی موت کی طرف سے بہت بے پروا ہو... اور یہ بے پروائی اب تمہارے مزاج کا حصہ بن چکی ہے۔ پھر بھی عاصمہ جیسے معاملات سمجھ سے بالاتر ہیں۔ مانا کہ اس کا شوہر مرنے کی حد تک مایوس ہو چکا تھا... لیکن اس کی مایوسی دور کرنے کے لیے تم نے خود کو اس کے لیے چارا بنا لیا۔ اور ایک بار نہیں دو بار۔"

"یار! دوسری بار تو میں نے صرف اپنی قسم پوری کی تھی... اور بات صرف موہل کی مایوسی کی نہیں تھی، وہ جنونی اپنی نقد جان دے رہا تھا۔ باقاعدہ راہیِ عدم ہو رہا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ دو سال پہلے میں نے جس رات اسے گرفتاری دی تھی، اگر نہ دیتا تو وہ شراب میں دس پندرہ نشہ آور گولیاں ڈال کر مرحوم ہو جاتا... یا پھر اپنے سرکاری پستول سے اپنی کنپٹی میں سوراخ کر لیتا۔ میں نے ایک انسان کی جان بچائی... اور ایک عورت کو بیوگی سے بچایا... بس... اور مجھے یہ کرنے میں کوئی پچھتاوا نہیں۔"

"اور اس کا صلہ کیا ملا ہمیں... ہمیں مارا پیٹا گیا۔ ڈیزل انجن کی دھونی دی گئی۔ ہمارے ساتھی دربدر ہوئے۔ بالو دربدر ہوا۔ اب وہ پتا نہیں کہاں اور کس حال میں ہیں؟"

اس نے میرا ہاتھ تھاما اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ "جگر! فکر نہ کرو۔ انہیں بہ خیریت یہاں لانا میری ذمے داری ہے۔ اور میں یہ پوری کروں گا۔"

اس کی آواز میں وہی یقین تھا جو سننے والے کی سماعت میں جذب ہوتا تھا اور اسے گہرائی تک متاثر کرتا تھا۔

ہم اس حوالے سے گفتگو کرتے رہے، تب عمران ایک بار پھر ٹیلی فون پر مصروف ہو گیا۔ وہ اپنی ڈوریاں ہلا رہا تھا۔ اس نے جہاں بھی فون کیا، وہاں سے گرم جوشی کے ساتھ جواب ملا۔ یہ فروری کی آخری تاریخیں تھیں لیکن سردی کا زور پوری طرح ٹوٹا نہیں تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ یہ ایک شفاف چمکیلی دوپہر تھی۔ کوٹھی کے خوب صورت لان میں پھول جھوم رہے تھے۔ تتلیاں منڈلا رہی تھیں اور پرندوں کی چہچہاہٹ تھی۔ یہ میری جانی پہچانی فضا تھی۔ یہ میرا جانا پہچانا لاہور تھا۔ میرے بچپن اور لڑکپن کی اَن گنت یادیں ایسی ہی سہانی دوپہروں اور شاموں سے وابستہ تھیں۔

اچانک وہ ہوا جس کا ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ مایوسی اور پریشانی کی گھٹن میں یکا یک ایسی ہوا چلی جس نے سارے منظر ہی بدل دیے۔ میں دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ ہماری بائیں جانب والا دروازہ کھلا اور جانے پہچانے چہرے نظر آئے۔ میڈم صفورا، اقبال، نوری، صفیہ اور اس کی گود میں بالو۔

عمران ریسیور چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور میری طرح مجسم حیرت ان لوگوں کو دیکھنے لگا۔ پھر ان سب کے پیچھے عمران کے ساتھی جیلانی کا مسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔ یقیناً یہ لوگ جیلانی کے ساتھ ہی یہاں تک پہنچے تھے۔ میں لپکا اور آگے بڑھ کر بالو کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ عمران اور اقبال ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ اقبال کے بعد عمران اور میڈم صفورا ایک دوسرے کے گلے ملے۔ اقبال مجھ سے آچمٹا۔ یہ ایک جذباتی منظر تھا۔ صفیہ اور نوری بھی آنکھوں میں آنسو لیے کھڑی تھیں۔ نوری کی کلائی پر پلاسٹر نظر آ رہا تھا۔

"یہ سب کیسے ہوا؟ کیسے پہنچے آپ لوگ یہاں؟" میں نے حیران لہجے میں پوچھا۔

"یہ سب ان کی مہربانی ہے۔" میڈم صفورا نے دروازے میں کھڑے ایک گندمی سے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نوجوان اچھی شکل وصورت کا تھا۔ اس نے جرسی اور پتلون پہن رکھی تھی۔ اس نے ہمیں سلام کیا۔ اس کے سلام کے انداز سے ہی پتا چل گیا کہ وہ انڈیا سے آیا ہے۔ میڈم صفورا نے کہا۔ "اس کا نام عطاالرحمان ہے۔ ائر انڈیا میں سروس کرتا ہے۔ یہ اپنی اسٹوری خود ہی سنائے گا تو زیادہ اچھی طرح تم لوگوں کی سمجھ میں آئے گی۔"

ہم نے عطاالرحمان سے مصافحہ کیا۔ اس سے گلے ملے۔ "آپ سب لوگ خیریت سے تو ہیں نا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل خیریت سے ہیں..." اقبال نے کہا۔

"سوائے نوری کے۔" عمران نے فقرہ مکمل کیا۔ "اس کے بازو پر چوٹ لگی ہے۔"

نوری کے چہرے پر تاریک سایہ سا لہرا گیا۔ اقبال بھی چپ ہو گیا۔ میڈم صفورا نے کہا۔ "ہمیں بیٹھنے کے لیے بھی کہا جائے گا یا کھڑے کھڑے ہی سب کچھ پوچھ لیا جائے گا؟"

ہم سب نشستوں پر بیٹھ گئے۔ بالو بدستور میری بانہوں میں تھا۔ اس کا معصوم لمس مجھے سلطانہ کی یاد دلانے لگا۔ وہ بھی دو چار منٹ کے اندر ہی میری گود سے مانوس سا ہو گیا۔ بالو اس لباس میں نہیں تھا جس میں بیس بائیس دن پہلے ہم نے اسے الٰہ آباد میں چھوڑا تھا۔ باقی سب کے لباس بھی وہ نہیں تھے۔

معلوم ہوا کہ یہ سب لوگ آج صبح ہی عطاالرحمان کے ساتھ نیو دہلی سے لاہور پہنچے ہیں۔ اقبال کو بھی ٹھیک سے پتا نہیں تھا کہ عمران سے کہاں اور کیسے رابطہ کیا جائے۔ ہاں، اپنے ساتھی جیلانی کا فون نمبر اسے معلوم تھا۔ اس نے جیلانی سے رابطہ کیا اور پھر یہ سب لوگ ایک زبردست سرپرائز کے طور پر ہمارے پاس یہاں اس کوٹھی میں پہنچ گئے۔

اس سارے معاملے میں عطاالرحمان کا کردار نہایت اہم محسوس ہو رہا تھا۔ یہ کردار کیا تھا؟ میرے، عمران اور جیلانی کے ذہن میں بھی یہ سوال مچل رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کا سفری سامان دیکھ کر یہ پتا تو ہمیں چل ہی گیا تھا کہ یہ لوگ قانونی طریقے سے بذریعہ ائر لائن یہاں پہنچے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ کس طرح ممکن ہو پایا، اس کا جواب ہمیں دوپہر کے کھانے کے بعد ملا۔

ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ عطاالرحمان، الٰہ آباد کی عاصمہ کا سگا بھائی ہے۔ عطاالرحمان لکھنوی لب و لہجے میں بڑی صاف اردو بولتا تھا۔ اس کی شکل وشباہت بھی اس کی گواہی دیتی تھی کہ ڈی ایس پی سجاد کی بیوی عاصمہ سے اس کا قریبی رشتہ ہے۔

عطا نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "میں آپ حضرات کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کے ساتھیوں کو بحفاظت یہاں پہنچانے کے لیے جو بھی تھوڑی بہت کوشش کی ہے، وہ اپنی بہن عاصمہ کے کہنے پر ہی کی ہے۔ عاصمہ، عمران بھائی کی بے حد احسان مند ہے۔ اسے ہرگز ہرگز یہ گوارا نہیں تھا کہ عمران بھائی کے قریبی ساتھیوں کو وہاں الٰہ آباد میں کسی طرح کی کوئی مشکل پیش آئے۔ وہ اس بارے میں بہت فکر مند تھیں۔ انہی دنوں وہ واقعہ ہوا جس کی وجہ سے عاصمہ بہن اس قابل ہوئی کہ وہ آپ کے ساتھیوں کی مدد کر سکے۔ وہ واقعہ آپ کی ساتھی نوری کے پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونے کا تھا۔"

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "عطا بھائی! بہتر ہے کہ آپ شروع سے ساری بات بتائیں تاکہ ہم اچھی طرح سمجھ سکیں۔"

عطا بولا۔ "شروع میں جو کچھ ہوا، وہ تو آپ کو اقبال بھیّا یا میڈم صفورا ہی بتا سکتی ہیں۔"

اقبال بولا۔ "تابش اور عمران بھائی... جب ڈی ایس پی سجاد موہل نے آپ دونوں کو ہوٹل پارک ویو سے پکڑا تو ہم نے دیکھ لیا تھا۔ ہمیں حیرانی ہوئی کہ صرف دو پولیس اہلکاروں نے آپ دونوں کو بے بس کر کے گاڑی میں بٹھا لیا ہے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ کوئی معمولی پولیس والے نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ اندازہ بھی ہوا کہ اب ہمارا ہوٹل پارک ویو میں رکنا ازحد خطرناک ہے۔ ہم نے فوراً ہوٹل چھوڑ دیا اور کرائے کی اسٹیشن ویگن کے ذریعے وہاں سے نکل گئے۔ کیپٹن اجے بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس کے پاس بھرا ہوا ماؤزر بھی تھا۔

"ابھی ہم تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ہمیں ایک پولیس ناکے پر رکنے کا اشارہ کیا گیا... میرا خیال ہے کہ یہاں ہم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے غلطی ہوئی۔ وہ معمول کی چیکنگ تھی۔ ہم رک جاتے تو سرسری جائزے کے بعد ہمیں جانے کی اجازت دے دی جاتی مگر اجے کی ہدایت پر وین ڈرائیور نے گاڑی کا رخ یک دم ایک بغلی گلی میں موڑ لیا۔ یہیں سے ایک پولیس موبائل ہمارے پیچھے لگ گئی۔ وین ڈرائیور خوف زدہ ہو چکا تھا۔ اس نے اجے کے ہاتھ میں ماؤزر دیکھ لیا تھا۔ اجے نے اسے گاڑی تیز چلانے کے لیے کہا اور ہدایت کی کہ وہ پولیس موبائل سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرے لیکن پولیس موبائل تو گائیڈڈ میزائل کی طرح ہمارے پیچھے لگ چکی تھی۔ اجے نے چلتی وین میں ڈرائیونگ خود سنبھال لی اور کچھ آگے جا کر وین کو ایک تنگ سڑک میں گھسا دیا۔ یہاں ہماری تیز رفتار ڈرائیونگ کی وجہ سے کئی گاڑیوں کو نقصان پہنچا۔ دو تین افراد زخمی بھی ہوئے لیکن یہ فائدہ ہوا کہ ہم وقتی طور پر پولیس موبائل سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم نے وین ڈرائیور کو چلتی گاڑی سے نیچے اتار دیا۔ جلد ہی ہم اللہ آباد کے مضافاتی علاقے میں پہنچ گئے۔ ہمیں کچھ پتا نہیں تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں مگر اتنا پتا تھا کہ پورے شہر میں پولیس حرکت میں آچکی ہوگی اور وائرلیس پر پیغام چل رہے ہوں گے۔

''ہم نے وین کو ایک جگہ کھیتوں میں چھوڑ دیا اور دو ٹولیوں کی صورت میں اپنے درمیان کچھ فاصلہ رکھ کر آگے بڑھنے لگے۔ جلد ہی ہم ایک ویران خشت بھٹا پر پہنچ گئے۔ یہ خشت بھٹا ڈھے چکا تھا اور یہاں بھٹے کی بنیادوں میں نیچے کی طرف دو کھولیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ ہم ان کھولیوں میں جا چھپے۔ اس طرف کوئی آتا جاتا نہیں تھا۔ چمگادڑیں اور بلیاں تھیں یا آوارہ کتے تھے۔ ہم پورے چار دن وہاں چھپے رہے۔ آخر بھوک سے بے بس ہو گئے۔ تھوڑے سے بسکٹ اور نمکو تھے، وہ بھی ختم ہو چکے تھے۔ ہمیں اندازہ ہو چکا تھا کہ پولس اس علاقے میں بھی ہمیں ڈھونڈ رہی ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اجے اور نوری نے باہر جانے کا پروگرام بنایا۔ سردی بہت تھی۔ اجے نے اپنا منہ سر ایک گرم چادر میں لپیٹ لیا۔ نوری نے بھی اپنی چادر سے نقاب کر لیا۔ وہ دونوں میاں بیوی کے روپ میں کھولی سے نکلے اور قریبی بازار کی طرف روانہ ہوئے۔ قریبی بازار بھی وہاں سے قریباً تین کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی ریلوے کالونی کی تین چار دکانیں تھیں... اب آگے کی بات بتاؤ نوری۔'' اقبال نے نوری کو گفتگو میں شامل کرنا چاہا۔

نوری گم صم بیٹھی تھی۔ اس کے کانوں کے جھمکے بھی اس کی طرح اداس نظر آتے تھے... بھانڈیل میں وہ ہمیں گھاگرے اور کھلے گریبان والی چولی میں نظر آتی تھی۔ اس کی عریاں کمر نازک شاخ کی طرح لچکتی تھی اور اس کی چال میں ایک ''مشتعل کرنے والا لہراؤ'' ہوتا تھا... مگر آج وہ یکسر مختلف دکھائی دیتی تھی۔

کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد وہ بولی۔ ''اجے بابو اور میں بازار کے پاس پہنچے تو وہاں پولیس کی ایک گاڑی کھڑی نظر آئی۔ اجے بابو نے مجھ سے کہا کہ ہم دونوں کا اکٹھے آگے جانا ٹھیک ناہیں۔ انہوں نے مجھے وہاں ایک کھمبے کے پاس کھڑا کیا اور خود سودا لینے کے لیے آگے چلے گئے۔ ابھی ان کو گئے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک جیپ میرے پاس آکر رکی۔ اس میں بھی پولیس والے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا... بی بی! تم یہاں کیا کرت ہو؟ میں نے کہا، میرا گھر والا آگے گیا ہے، میں اس کا انتظار کرت ہوں۔ انہوں نے دو چار باتیں کیں اور ان کو مجھ پر شک ہو گیا۔ انہوں نے مجھے زبردستی گاڑی میں بٹھایا اور وہاں سے لے گئے۔ مجھے ایک چوکی پر زنانہ پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ پولیس والیوں نے بھی مجھ سے بہت سوال جواب کیے۔ انہوں نے میرا پتا ٹھکانا پوچھا۔ میں کچھ بھی نہ بتا سکی۔ ان کا شک پکا ہو گیا کہ میں ان چھ لوگن میں سے ہوں جو پانچ دن پہلے ہوٹل سے غائب ہوئے تھے۔

''کوئی تین گھنٹے تلک چوکی میں رکھنے کے بعد مجھے ایک کوٹھی میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں ایک کمرا تھا جو دھوئیں سے کالا ہو رہا تھا۔ یہاں مارنے پیٹنے کا سامان بھی پڑا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بھاری مونچھوں اور سوجی سوجی آنکھوں والا ایک افسر کمرے میں آیا۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی بندہ تھا جو آپ دونوں کو ہوٹل سے پکڑ کر لے گیا تھا۔ وہ بہت خراب بندہ تھا۔ اس نے مجھے گالیاں دیں اور بہت ڈرایا دھمکایا۔ اس نے کہا کہ وہ اس کمرے میں دھواں چھوڑ دیوے گا اور میں کھانس کھانس کر مر جاؤں گی۔ وہ بہت بُرا بندہ تھا۔ اس نے مجھے بہت تھپڑ مارے اور دیواروں کے ساتھ پٹخا... میرا بازو ٹوٹ گیا اور...''

نوری کی آواز بھرا گئی اور وہ سسکنے لگی۔

میڈم صفورا نے آگے بڑھ کر اسے تسلی دی۔ میڈم صفورا نے باقی کی روداد انگلش میں بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ڈی ایس پی موہل بالکل جنونی بندہ تھا۔ یہ نوری سے ہمارا پتا ٹھکانا پوچھنا چاہتا تھا۔ اس نے نوری کو 'ریپ' کرنے کی کوشش بھی کی... مگر یہاں ہمیں موہل کی بیوی کی تعریف کرنا پڑتی ہے۔ اس کا نام عاصمہ ہے اور عطاالرحمان اس کا سگا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھائی ہے۔ جب سجاد موہل نشے میں چور بے کس نوری سے زیادتی کی کوشش کر رہا تھا، وہ کمرے میں آگئی۔ اس نے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر اپنے شوہر کے سر پر پیچھے سے ماربل کے وزنی گل دان سے ضرب لگائی۔ وہ بے سدھ ہو گیا۔ عاصمہ نے نوری کو کپڑے پہنائے اور اسے فوری طور پر اپنے بھائی عطا کے حوالے کر دیا۔ وہ اسے سجاد موہل کی کوٹھی سے لے کر نکل گیا۔ سجاد موہل کو کچھ زیادہ ہی چوٹ لگ گئی تھی۔ عاصمہ نے اسے گاڑی میں ڈالا اور خود لے کر اسپتال پہنچی۔ اب پتا نہیں وہ کس حال میں ہے۔''

عطاالرحمان نے کہا۔ ''سجاد بھائی اب تک اسپتال میں ہیں۔ ان کے دماغ میں خون جم گیا تھا۔ آپریشن کے ذریعے خون کا لوتھڑا نکالا گیا ہے۔ اب وہ بہتر ہو رہے ہیں۔''

''کسی طرح کا شک تو نہیں ہوا اسے؟'' عمران نے پوچھا۔

''نہیں جی۔'' عطاالرحمان نے جواب دیا۔ ''ابھی تک تو کوئی شک نہیں ہے۔ آگے کا پتا نہیں۔ ویسے بھی چوٹ کے بعد بھائی صاحب کافی کمزور ہو گئے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ...'' وہ خاموش ہو گیا۔

''کیا لگتا ہے؟'' عمران نے استفسار کیا۔

''لگتا ہے کہ اب وہ پولیس کی سروس بھی چھوڑ دیں گے۔ بہت بدلے بدلے نظر آتے ہیں وہ۔''

میری آنکھوں کے سامنے عاصمہ کا چہرہ گھومنے لگا۔ وہ ایک وفا شعار بیوی تھی۔ ایک باہمت عورت تھی اور اس کے ساتھ ساتھ احسان شناس بھی تھی۔ اپنی احسان شناسی میں وہ اس حد تک گئی تھی جہاں تک جا سکتی تھی۔ وہ ہمارے لیے تو کچھ خاص نہیں کر پائی تھی لیکن اس نے نوری کے لیے اور ہمارے دیگر ساتھیوں کے لیے اپنی ہمت کے مطابق سب کچھ کیا تھا۔

عطاالرحمان نے کہا۔ ''نوری میرے پاس تھی۔ میں نے اسے اپنے ایک سکھ دوست کے گھر ٹھہرا دیا۔ اب نیا مسئلہ پیدا ہوا۔ نوری ٹھیک سے بتا نہیں سکتی تھی کہ باقی لوگ کہاں ہیں۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ وہ لوگ جہاں پر ہیں، وہاں سے تھوڑی دور دو اور خشت بھٹے ہیں۔ یہ دونوں بھٹے 11 کے ہندسے کی طرح بالکل ساتھ ساتھ کھڑے ہیں۔ یہ دونوں بھٹے چالو ہیں اور ان میں سے رات دن دھواں نکلتا رہتا تھا۔ اب ہم نے ان دونوں بھٹوں کی تلاش شروع کی۔ ہم بھٹے تلاش کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ ہمیں یہ اندیشہ بھی تھا کہ شاید نوری کے لاپتا ہونے کے بعد باقی لوگ اپنی پناہ گاہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہوں... ساتھ ساتھ جڑے ہوئے دونوں بھٹوں کی تلاش کسی جاسوسی کہانی کی طرح تھی جی...''

عطا نے ذرا توقف کے بعد بات جاری رکھی۔ ''میں اور میرے دوست اس جانکاری تک پہنچے کہ الہ آباد کے آس پاس کم از کم آٹھ جگہ ایسے جڑواں بھٹے موجود ہیں۔ اب ان میں سے ہماری مطلوبہ جگہ کون سی تھی... پھر نوری نے ایک اور جانکاری دی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ یہ اور باقی ساتھی جہاں چھپے ہوئے تھے، وہاں سے دن میں تین چار بار ریل گاڑی بھی گزرتی تھی۔ ریلوے لائن زیادہ دور نہیں تھی۔ نوری کی اس دوسری جانکاری نے ہمیں صرف ایک گھنٹے کے اندر اندر مطلوبہ جگہ تک پہنچا دیا۔ ہمارے اندیشے کے عین مطابق اقبال صاحب، اجے صاحب اور باقی خواتین مسمار بھٹے کی کھولیوں میں موجود نہیں تھے۔ نوری کے لاپتا ہونے کے بعد وہ یہ جگہ چھوڑ گئے تھے۔ مگر پھر قسمت نے یاوری کی۔ جب ہم دونوں دوست واپس جا رہے تھے۔ اچانک اجے صاحب گنے کے ایک کھیت میں سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئے۔ انہوں نے اپنی گرم چادر کے نیچے بھرا ہوا ماؤزر پکڑ رکھا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے ہم کوئی بھی حرکت کرتے تو وہ ہمیں اڑا دیتے۔ بہر حال، ہماری اور ان کی غلط فہمی جلد ہی دور ہو گئی۔ اجے صاحب کو پتا چل گیا کہ ہم دشمن نہیں دوست ہیں اور نوری ہمارے پاس بالکل محفوظ ہے۔ ہمیں بھی یقین ہو گیا کہ ہماری ملاقات نوری کے ساتھی اجے صاحب سے ہی ہوئی ہے۔ اقبال، میڈم صفورا، صفیہ اور بچہ مال گاڑی کے ایک خراب ڈبے میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ میں ان سب کو لے کر اپنے سکھ دوست لال سنگھ کے گھر آ گیا... اور عاصمہ کو یہ خوش خبری سنائی۔ میں ایئر لائن میں اسٹیوارڈ کے طور پر کام کرتا ہوں۔ میرے سسر بھی ایئر انڈیا میں ہیں۔ عاصمہ بہن کی یہ پُرزور خواہش تھی کہ میں نہ صرف اقبال صاحب اور تینوں خواتین کے سفری کاغذات تیار کرواؤں بلکہ انہیں خود پاکستان چھوڑ کر بھی آؤں۔ مجھے پتا تھا کہ یہ سفری کاغذات فرضی ناموں سے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ بڑے ہی اچھے ڈھنگ سے تیار کیے گئے ہیں۔ ان کو VALID کرانے میں مجھے کچھ زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اللہ نے بھی مدد کی اور اب ہم آپ کے سامنے ہیں۔''

عمران نے کہا۔ ''عطا! ہم تو ان لوگوں کو ڈھونڈنے کے لیے لمبے چوڑے پلان بنا رہے تھے۔ تم نے ایک دم نمودار ہو کر ہماری مشکلیں آسان کر دیں۔''

عطا نے جذباتی انداز میں کہا۔ ''میں نے اور عاصمہ نے کوئی احسان نہیں کیا آپ پر۔ احسان تو آپ نے کیا ہے۔ مجھے سب معلوم ہے عمران بھائی۔''

پھر عطا نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک لفافہ نکال کر عمران کی طرف بڑھایا۔ ''عاصمہ نے یہ خط بھی دیا ہے آپ کے لیے۔''

عمران نے لفافہ کھول کر خط پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر اسے جیب میں رکھ لیا۔

ہم لوگ نوری کی چوٹ پر تبصرہ کرنے لگے۔ اس کی کلائی کی بڑی ہڈی میں فریکچر ہوا تھا۔ یہ چوٹ اسے تب لگی جب ڈی ایس پی سجاد موہل اس سے مار پیٹ کر رہا تھا۔ پھر وہ اسے دوسرے کمرے میں لے گیا اور اس کی چوٹ کی پروا کیے بغیر اس سے زیادتی کی کوشش کی۔ یہ کوشش عاصمہ نے ناکام بنائی اور سجاد کو اسپتال پہنچا دیا۔

ہم رات گئے تک باتوں میں مصروف رہے اور ایک دوسرے کو اپنے حالات سے آگاہ کرتے رہے۔ اگلے روز ناشتے کے بعد یہ سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ ہم نے اقبال اور صفورا کو اس میگا کوبز شو کے بارے میں بتایا جس کی وجہ سے ہماری جان ڈی ایس پی موہل اور انڈین جیل سے بچی تھی۔ میگا شو کی تفصیلات جان کر اقبال اور میڈم صفورا بھی حیران ہوئے۔

دوپہر کے وقت ذرا تنہائی ملی تو میں نے عمران سے عاصمہ کے خط کے بارے میں پوچھا۔ اس نے جھٹ خط نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ عاصمہ نے لکھا تھا۔ ''عمران بھائی جان! مجھے ٹھیک سے کچھ پتا نہیں کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ بس اندازہ سا ہے کہ آپ کی جان سجاد سے چھوٹ گئی ہے اور آپ شاید پاکستان پہنچ گئے ہیں۔ اللہ کرے میرا یہ اندازہ درست ہو... اور میرا یہ خط بھی عطا کے ذریعے آپ تک پہنچ جائے۔ دو سال پہلے آپ نے میرے لیے جو کچھ کیا تھا، میں اسے زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتی۔ آپ انوکھے ہیں عمران... اور آپ کی ہر ادا انوکھی ہے۔ آپ نے سجاد کی زندگی بچانے اور میری زندگی سنوارنے کے لیے خود کو بلا تردد پولیس کے حوالے کر دیا تھا جیسے یہ کوئی بڑی بات ہی نہ ہو۔ حالانکہ یہ بہت بڑی بات تھی۔ آپ کی ساری زندگی انڈیا کی کسی جیل میں گزر سکتی تھی۔ آپ کے اس احسان کا بوجھ ہی کم نہیں تھا کہ پچھلے مہینے آپ نے اس احسان کو دہرا دیا۔ میرے سر کی قسم کو پورا کیا اور خود کو سجاد کی سختی اور بے حسی کے حوالے کر دیا۔ میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ میں سچ کہتی ہوں مجھے الفاظ نہیں ملتے۔

''دو سال پہلے جب سجاد کا چھوٹا بھائی اور میرا دیور انور پاکستان میں ایک پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا تو میرے دل میں بھی پاکستان اور پاکستانیوں کے خلاف ایک میل سا آ گیا تھا۔ لیکن آج میں اپنی اس کیفیت کے بارے میں سوچتی ہوں تو شرمندگی ہوتی ہے۔ آپ ایک پاکستانی ہیں... اور اس ایک پاکستانی نے میرے دل کا سارا میل دھو دیا ہے۔ مجھے ہر اس شخص سے محبت کرنا سکھا دی ہے جس کا تعلق سرحد کے اس پار سے ہے۔ آپ ہمیشہ میری دعاؤں میں رہتے ہیں اور رہیں گے۔ سخت بیمار رہنے کے بعد سجاد بھی اب کچھ بدلے بدلے سے لگتے ہیں۔ کاش ایک وقت ایسا آئے جب میں انہیں آپ کے پاس لے کر آؤں۔ وہ آپ سے معافی مانگیں... اور اس انوکھے احسان کا شکریہ ادا کریں جو آپ نے دو سال پہلے ان پر کیا تھا۔''

میں خط پڑھ چکا تو عمران بولا۔ ''اس خط میں دو باتیں غلط ہیں۔''

''وہ کیا؟''

''ایک تو وہ امید غلط ہے جو عاصمہ نے اس کھڑوس سجاد موہل سے لگائی ہے۔ بہت مشکل ہے کہ وہ سیدھا ہو سکے۔''

''اور دوسری غلط بات؟''

''اس نے پھر بھائی جان لکھا ہے۔'' عمران نے ٹھنڈی سانس لی اور کسی الّو کی طرح اداس نظر آنے لگا۔

قریباً چوبیس گھنٹے ہمارے ساتھ گزارنے کے بعد عطاالرحمان جس خاموشی سے آیا تھا، اسی خاموشی سے واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد ہی کچھ دیر بعد جان محمد صاحب آ گئے۔ انہیں ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ اقبال، میڈم صفورا اور نوری وغیرہ بخیریت واپس آ چکے ہیں۔ وہ پریشان تھے۔ انہوں نے قدرے پشیمان لہجے میں کہا۔ ''ریان سے یہ امید نہیں تھی۔ کھیل میں ہار جیت تو ہوتی ہے۔ اسے اپنی کمٹ منٹ پوری کرنی چاہیے تھی... یا ہمیں کم از کم اتنا ہی بتا دیتا کہ تلاش کا کام کس اسٹیج پر پہنچا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ کا اس سے رابطہ نہیں ہو سکا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں... لیکن مجھے امید ہے وہ رابطہ کرے گا ضرور۔ شاید ابھی تک وہ اپنی شکست اور ماریانی کی فتح کے صدمے سے باہر نہیں آیا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ساتھ والے ٹی وی لاؤنج سے میڈم صفورا کی چلاتی ہوئی آواز آئی۔ ”عمران... تابش... ادھر آؤ... دیکھو یہ کیا نیوز آرہی ہے۔“

ہم لپکتے ہوئے ٹی وی لاؤنج میں پہنچے۔ جان محمد صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ٹی وی چینل پر ایک سنسنی خیز بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔

میڈم صفورا نے لرزاں آواز میں کہا۔ ”جہاز گر گیا... پرائیویٹ جیٹ فیلکن 900 سی یہ وہی ہے جس کا تم نے بتایا تھا۔ اوہ مائی گاڈ... یہ دیکھو، نیچے پٹی میں تفصیل بھی چل رہی ہے۔“

ہم بھی سکتہ زدہ دیکھتے رہ گئے۔ یہ سی این این تھا۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا... ”ہمارے ذرائع کے مطابق یہ لگژری طیارہ چند ہی روز پہلے مسٹر بفیلو کی ملکیت میں آیا تھا۔ وہ اپنی ایک خاتون دوست مس امینڈا اور دو دیگر ساتھیوں کے ساتھ اس طیارے پر برمنگھم سے ہمبرگ جا رہے تھے۔ ان چاروں کے علاوہ عملے کے تین افراد بھی اس لگژری طیارے میں سوار تھے۔ یاد رہے کہ مسٹر بفیلو ہوٹلنگ اور کیسینوز کے کاروبار میں ایک جانی پہچانی شخصیت تھے۔ وہ کیسینوز کی ایک انٹرنیشنل چین کے مالک تھے جس کو نائٹ رائیڈر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مسٹر بفیلو کی عمر پینتالیس سال تھی۔ انہوں نے اپنے پس ماندگان میں...“

عمران نے چینل بدلا۔ یہ ”وی او اے“ تھا۔ یہاں بھی یہ خبر موجود تھی۔ ایک پہاڑی پر طیارے کا سلگتا ہوا ملبا دکھایا جا رہا تھا اور امدادی کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ نیوز کاسٹر بتا رہا تھا کہ طیارے میں سوار سات افراد میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا۔ اس نے ہلاک شدگان کے ضمن میں طیارے کی ائر ہوسٹس کا ذکر بھی کیا جو ایک معروف ماڈل گرل بھی تھی۔

ہم قریباً آدھ گھنٹے تک سخت حیرت کے ساتھ اس حادثے کی خبریں سنتے رہے۔ پھر توقع کے عین مطابق وہ خبر بھی آگئی جو ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ایک انگلش نیوز چینل نے بتایا کہ اطلاعات کے مطابق مسٹر بفیلو بوائڈ نے یہ تین انجن والا جیٹ جہاز جوئے کی کسی بڑی بازی میں جیتا تھا۔ اس بازی کا یا کہہ لیں کہ انعامی بازی میں کئی ایسے معروف افراد نے حصہ لیا تھا جن کا تعلق کیسینو کے کاروبار سے ہے۔ ان میں مسٹر بفیلو کے کاروباری حریف مسٹر ریان ولیم بھی شامل تھے۔ اطلاعات کے مطابق مسٹر ریان ولیم کا بھتیجا تھوڑے سے مارجن کے ساتھ یہ مقابلہ جیت نہیں پایا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم نے ٹی وی بند کیا اور تبصرے میں مصروف ہو گئے۔ عمران بولا۔ ”اس کو کہتے ہیں بال بال بچے۔ ہمارا آخری جواب درست ہوتا تو آج یقیناً بفیلو کے بجائے وہ موٹا ریان ولیم آنجہانی ہو چکا ہوتا۔“

جان محمد صاحب نے سگریٹ کا طویل کش لے کر کھوئی کھوئی نظروں سے عمران کو دیکھا اور بولے۔ ”میرا خیال ہے... ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک بار پھر تمہاری ”لک“ کام کر گئی ہے۔ یعنی جس کو ہم بدقسمتی سمجھے تھے، وہ خوش قسمتی نکلی۔“

اقبال اور میڈم صفورا نے اثبات میں سر ہلایا۔ جان محمد صاحب نے کہا۔ ”خبروں کے مطابق بظاہر یہ فیلکن تکنیکی خرابی کی وجہ سے تباہ ہوا ہے۔ کوئز شو کے روز یہ ”تکنیکی خرابی“ کسی کے حصے میں بھی آسکتی تھی۔“

میڈم صفورا نے کہا۔ ”مسٹر بفیلو کی اس طیارے میں یہ شاید دوسری پرواز تھی۔“

اقبال بولا۔ ”اسے پہلی ہی کہنا چاہیے۔ نیوز کے مطابق پہلی پرواز تو برمنگھم شہر کے اوپر تھی اور بالکل مختصر سی تھی۔ شاید دس پندرہ منٹ کی۔“

اس خبر نے ہمیں حیرت کے ساتھ ساتھ صدمے سے بھی دوچار کیا تھا۔ کچھ بھی تھا، یہ ایک المناک حادثہ تھا۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ ایک طمانیت کے احساس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ شان دار فیلکن 900 سی ریان ولیم کے حصے میں نہیں آیا تھا۔ ریان ولیم، اس کا بھتیجا گیری یا پھر ہم میں سے بھی کوئی اس حادثے کا لقمہ بن سکتا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد جان محمد صاحب کے سیل فون پر مسٹر ریان ولیم کی کال آگئی۔ اس نے جان محمد صاحب سے پوچھا کہ کیا انہوں نے طیارے کے حادثے کی خبر سن لی ہے؟ جان محمد صاحب نے اثبات میں جواب دیا۔

دونوں میں دس پندرہ منٹ تک اس بارے میں بات ہوئی۔ پھر جان محمد صاحب نے عمران سے کہا کہ ریان ولیم، اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ عمران نے بات کی۔ بات کرتے ہوئے اس نے فون کا اسپیکر آن کر دیا۔ دوطرفہ گفتگو ہمارے کانوں تک پہنچنے لگی۔ ریان کی آواز آئی۔

”ہیلو مسٹر ایمران! تم کیسے ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں... اور آپ؟“

”میں بھی خیریت سے ہوں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے بخیریت ہونے میں کچھ نہ کچھ تمہارا بھی ہاتھ ہے۔ بظاہر جو کچھ ہمارے نقصان میں نظر آرہا تھا، وہ دراصل فائدے میں تھا۔ ہمیں وقتی طور پر ضرور شاک پہنچا لیکن اب یوں لگ رہا ہے کہ ہم اس روز اپنی سلامتی جیت کر اٹھے تھے اور بفیلو اپنی زندگی ہار کر اٹھا تھا۔“

”بس جی، یہ اتفاقات ہیں زمانے کے...“

ذرا توقف کے بعد ریان ولیم نے کہا۔ ”تمہارے ساتھیوں کا کیا بنا؟“

”آپ کو ان کا خیال کیسے آگیا؟“ عمران نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

”مجھے افسوس ہے کہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے میں کچھ دن تک اس کام کی طرف توجہ نہیں دے سکا۔ لیکن اب میں پھر سے کوشش شروع کرتا ہوں۔“

”پھر سے کوشش کی ضرورت نہیں جناب... وہ لوگ پاکستان پہنچ گئے ہیں اور اس وقت میرے ساتھ ہیں۔ جو کام آپ اور ہم نہیں کر سکے، وہ ایک اکیلی عورت نے کیا ہے۔“

”زبردست مسٹر ایمران! یہ خبر تو تم نے بہت اچھی سنائی ہے۔ کیسے ہوا یہ سب؟“

”جیسے آپ ہمیں اچانک اٹھا کر الٰہ آباد سے لاہور لے آئے تھے، اسی طرح ان لوگوں کو بھی خدا کا ایک بندہ مل گیا۔ وہ انہیں یہاں لے آیا...“

عمران اور مسٹر ریان ولیم کے درمیان کچھ دیر تک مزید بات ہوئی۔ آخر میں ریان نے کہا۔ ”ایمران! ہمارے درمیان رابطہ رہے گا۔ مجھے اس واقعے پر بھی بہت افسوس ہے جو لاہور میں تمہارے اور میرے دوست فورڈ کے درمیان پیش آیا۔ میں شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔“

”اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں جی۔ جو ہو گیا، وہ ہو گیا۔“

☆☆☆

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ میں اور عمران ایک ہی کمرے میں سو رہے تھے۔ میں حسب معمول فرش کے سخت بستر پر تھا۔ سونے سے پہلے میں نے قریباً دو گھنٹے تک مارشل آرٹ کی کڑی مشق کی تھی۔ اس وقت تھک کر چور ہو رہا تھا۔ ایسی تھکن اب مجھے تکلیف کے بجائے راحت دیتی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ میں اپنے اس جسم کو سزا دے رہا ہوں جس نے ماضی میں مجھے سستی، بزدلی اور ذلت کے تاریک غاروں میں پھینک رکھا تھا۔ باروندا جیکی کے فلسفے کے مطابق میں اپنی ذات سے لڑتا تھا، اپنے نفس کو مارتا تھا۔ میری خوراک بہت سادہ ہو چکی تھی۔ میں سادہ ترین لباس پہن رہا تھا اور موسم کی شدت سے نبرد آزما ہونا میرا مشغلہ بن گیا تھا... عاطف، فرح اور جیلانی میری تبدیلیاں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔

موبائل کی گھنٹی نے مجھے بیدار کیا۔ عمران بستر پر سو رہا تھا۔ یہ اسی کے موبائل کی گھنٹی تھی۔ میں نے اسکرین پر نام پڑھا۔ ریان ولیم کا نام دیکھ کر میں چونکا۔ میں نے عمران کو جگایا۔

”کیا ہوا؟“ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

”تمہارے اباجی کا فون ہے۔“ میں نے اسے موبائل تھماتے ہوئے کہا۔

اس نے بھی اسکرین پر نام دیکھا اور بُرا سا منہ بنا کر کال ریسیو کی۔ ”ہیلو ایمران؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”جی میں بول رہا ہوں۔ کیا ملکہ الزبتھ قاتلانہ حملے میں ماری گئی ہے؟“ عمران نے آخری فقرہ اردو میں کہا۔

”کیا کہا تم نے؟“ ریان ولیم نے پوچھا۔

”میں پوچھ رہا ہوں، اتنی رات گئے آپ کا فون؟“

”بات ہی کچھ ایسی ہے۔“ ریان کی آواز میں ہلکا سا جوش تھا۔ موبائل فون کا اسپیکر آن تھا اس لیے اس کی آواز بھی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔

”کیا آپ مجھے بتانا پسند فرمائیں گے؟“

ریان ولیم کی آواز ابھری۔ ”میں لک پر بھروسا کرنے والا شخص ہوں۔ اور میں نے تمہیں بتایا تھا کہ مجھے تمہاری لک پر بھروسا ہے۔ یہ بھروسا کیوں تھا؟ اس لیے کہ میں لکی بندے کو پہچان لیتا ہوں۔ میری اس صلاحیت نے مجھے کم کم ہی دھوکا دیا ہے۔“

عمران مسکرایا۔ ”کیا آپ نے مجھے یہی بتانے کے لیے آدھی رات کو فون کیا ہے؟“

”تمہارے لیے آدھی رات ہو گی لیکن یہاں امریکا میں دوپہر ہے۔ ایک بڑی چمکیلی اور خوش قسمت دوپہر۔“

”خوش قسمت دوپہر؟“ عمران نے پوچھا۔

”ہاں ایمران! تمہیں پتا ہے نا کہ آخری سوال کا جواب غلط ہونے کی وجہ سے ہم مقابلے کے ابتدائی انعام پر آگئے تھے۔ یعنی بنیادی انعام پینسٹھ ہزار ڈالرز۔ پتا ہے گیری نے ان پینسٹھ ہزار ڈالرز کا کیا کیا؟“

”کیا کیا؟“

”اس نے کیلیفورنیا میں یونہی راہ چلتے چلتے ان پینسٹھ ہزار ڈالرز کے لاٹری ٹکٹ خرید لیے۔ اس ریاستی لاٹری کے لیے چار بڑے انعامات نکلتے ہیں۔ گیری کا دوسرا بڑا انعام نکل آیا ہے۔ پتا ہے یہ کتنا ہے؟“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کتنا ہے جناب؟"

"آٹھ ملین ڈالرز... پورے آٹھ ملین ڈالرز۔" ریان کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔ "تم لکی ہو بھئی۔ مجھے پہلے بھی اس میں شبہ نہیں تھا، اب بھی نہیں ہے۔"

"آپ میرے لیے اس طرح کا گمان کرتے ہیں، اس کے لیے آپ کا شکریہ۔" عمران کا لہجہ روکھا پھیکا تھا۔

"میں بہت جلد پھر پاکستان آرہا ہوں۔ پروفیسر رچی بھی میرے ساتھ ہوگا۔ کچھ اور کام بھی ہیں لیکن سب سے اہم کام تم سے ملنا ہوگا۔"

کچھ دیر بعد یہ بات چیت ختم ہوئی تو عمران نے تکیے سے ٹیک لگا کر گہری سانس لی اور بولا۔ "دنیا مطلب دی او یار۔ مطلب ہووے تے پیار وی کردے ظالم دنیادار۔"

"یہ تو واقعی چمتکار ہوا ہے عمران۔ جو بدترین ہار نظر آرہی تھی، وہ ایک مناسب جیت میں بدل گئی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو پینسٹھ ہزار ڈالرز اس انعامی مقابلے میں جیتے گئے، وہ پینسٹھ ہزار ڈالرز نہیں تھے۔ وہ آٹھ ملین ڈالرز تھے قریباً ساٹھ کروڑ پاکستانی روپیا۔"

"کہنے کو تو اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے جگر! خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میں نے کہا ہے نا کہ اتفاقات ہیں زمانے کے۔ اب پروگرام کیا ہے؟ میرا مطلب ہے کل کا پروگرام۔"

"تمہارا کیا پروگرام ہے؟ اپنی گرل فرینڈ سے ملاقات ہوئی یا نہیں؟"

"کس کی بات کررہے ہو؟"

"شاہین کی اور کس کی؟ تمہاری سرکس کی ساتھی۔ موت کے کنوئیں کی ساتھی... اور شاموں اور راتوں کی ساتھی۔"

"یہ آخری بات تم نے بالکل غلط کی ہے۔ میں نیوز چینل کا نمائندہ ہوں۔ تم پر 'توہین چینل' کا مقدمہ ہوسکتا ہے۔ شاموں تک تو بات ٹھیک ہے لیکن وہ میری راتوں کی ساتھی نہیں ہے... بلکہ کوئی بھی راتوں کی ساتھی نہیں ہے۔ یہ باب اب ہمیشہ کے لیے بند ہوچکا ہے..."

"چلو جو بھی ہے لیکن کچھ تو خوفِ خدا کرو۔ تمہیں چوبیس روز ہوگئے ہیں لاہور میں قدم رنجہ فرمائے ہوئے لیکن ابھی تک اسے شکل بھی نہیں دکھائی۔"

"میں نے ابھی شکل دکھائی ہی کسے ہے؟ ابھی تو میں لاہور سے بھی ٹھیک طرح سے نہیں ملا۔ میرے گلی کوچے... میرے لوگ... میرے بازاروں کی رونقیں سب کچھ مجھ سے دور ہے۔ یہاں آتے ہی یہ ریان ولیم والا ٹینٹا کھڑا ہوگیا تھا۔ تمہیں پتا ہی ہے سب کچھ۔"

"تو چلو ٹھیک ہے۔ کل لاہور سے ملیں گے۔"

"ضرور ملیں گے۔ اور میرے خیال میں یہ ایک تیر سے دو شکار والی بات ہوگی۔" عمران نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں؟"

"بچوں کے لیے ہر بات کا سمجھنا ضروری نہیں ہوتا۔ کئی باتیں اور فلمیں صرف اٹھارہ سال سے اوپر کے لوگوں کے لیے ہوتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے تایا جی۔" میں نے کہا۔

"یار! ایک بات کبھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ اٹھارہ سال کی حد کیوں رکھی گئی ہے؟ کیا اس عمر میں بندہ بہت مضبوط ہوجاتا ہے؟ یہ تو بہت طوفانی عمر ہوتی ہے۔ حد ہونی چاہیے پینتیس سال چالیس سال یا پھر اٹھاسی سال سے اوپر۔ یوں بے راہ روی کا کوئی خطرہ تو نہیں رہے گا۔"

"خطرہ تو پھر خطرہ ہوتا ہے۔" میں مسکرایا۔ "تم اپنے آباؤ اجداد کا کوئی تجربہ بیان کررہے ہو۔ میں عام بات کررہا ہوں۔"

میں نے گھونسا تانا تو وہ اچھل کر بیڈ سے نیچے جا کھڑا ہوا۔

اب ہم میں خاصی بے تکلفی پیدا ہوچکی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو بے دریغ لتاڑتے تھے۔ زبانی بھی اور جسمانی بھی۔ مجھے پھر اس لاٹری کا خیال آگیا جس کا دوسرا بڑا انعام برص زدہ گیری کو ملا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس خطیر انعامی رقم سے بہت سی ریان ولیم کے گنبد نما پیٹ میں چلی جاتی۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ تو گیری کے حصے میں آنا ہی تھا۔ وہ اس "کچھ نہ کچھ" سے بھی اپنی بہت سی خواہشات پوری کرسکتا تھا۔ اسے ایک ڈیڑھ ملین بھی مل جاتا تو بہت تھا۔ میں نے تصور کی نظروں سے گیری گرانٹ کے افسردہ چہرے کو خوشی کی روشنی میں چمکتے دیکھا۔ میں اور عمران دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔

اگلے روز دس بجے کے لگ بھگ میں اور عمران ایک موٹر سائیکل پر سوار لاہور کی سیر کے لیے نکلے۔ یہ وہی موٹر سائیکل تھی جو کئی برسوں سے موت کے کنوئیں میں عمران کی ساتھی تھی۔ ایک شیطانی چرخا۔ جب یہ چلتی تھی تو لگتا تھا کہ پوری دنیا میں بس اسی کی گونج ہے۔ عمران کی فرمائش پر جان محمد صاحب نے کل ہی یہ موٹر سائیکل سرکس سے منگوائی تھی۔ جان محمد صاحب نے عمران ہی کی فرمائش پر ابھی تک اس کے

"سرکس فیلوز" کو اس کی آمد سے بے خبر رکھا ہوا تھا۔ ... بھی ان میں شامل تھی۔

ہم دونوں ہیلمٹ پہن کر اس "تاریخی" موٹر سائیکل ... اور لاہور میں گم ہوگئے۔ عمران ایک گرمی میں جھلسے ... پیراک کی طرح تھا اور وہ لاہور کے ٹھنڈے تالاب ... غوطہ زن ہوگیا تھا۔ مال روڈ، لوئر مال روڈ، میکلوڈ روڈ، سر ... لطان روڈ، فیروز پور روڈ وہ کون سی سڑک تھی جس کے ... کو اس موٹر سائیکل کے شور نے تہ و بالا نہیں کیا۔ وہ بلا کی ... سے چلاتا تھا اور اس کے پیچھے بیٹھنا بھی دل گردے کا ... کام تھا۔ جیل روڈ کے قریب ایک چوراہے پر وہ دائیں ... جانب سے آنے والے ایک ٹرک کے سامنے سے اتنی تیزی ... سے گزرا کہ مجھے اپنی آنکھیں بند کرنا پڑیں۔ "یار! اب اتنے ... بھی شوخے نہ بنو۔ مانا کہ تمہاری جان ہتھیلی پر ہے لیکن ... دوسروں کی جان تو ہتھیلی پر نہ رکھو۔"

"یار! کبھی موٹر سائیکل کے نیچے آکر بھی ٹرک تباہ ہوا ..."

"یہ بالکل بیکار دلیل ہے تمہاری۔ ٹرک ڈرائیور گھبرا ... کر ٹرک کو گندے نالے میں بھی گرا سکتا تھا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ رفتار کچھ کم کردیتے ہیں۔ اب ساٹھ ... سے اوپر نہیں جاؤں گا۔"

"یعنی تمہارے خیال میں ساٹھ کم ہے؟"

اس سے پہلے کہ عمران جواب میں کچھ کہتا، ٹریفک ... پولیس کی موٹر سائیکل کا ہوٹر سنائی دیا۔ وہ ہمارے پیچھے آرہا ...

"لو اب جگنتو... اشارہ کاٹا تھا نا تم نے۔ تمہارا پھوپی ... ہمارے پیچھے لگ گیا ہے۔"

عمران نے بھی عقب نما آئینے میں ٹریفک سارجنٹ کو ... دیکھ لیا۔ پھر عمران نے وہی کیا جس کی اس سے توقع تھی۔ ... رفتار کم کرنے یا موٹر سائیکل روکنے کے بجائے اس نے رفتار ... بڑھا دی۔ اگلے پانچ منٹ تک ٹریفک سارجنٹ اور ... عمران کے درمیان اچھی خاصی ریس ہوئی۔ ایک اور ٹریفک ... سارجنٹ بھی اس "کارِ خیر" میں شریک ہوچکا تھا۔ مگر وہ عمران ... کہاں ان لوگوں سے پکڑا جاتا یا خوف کھا کر رک جاتا۔ وہ ... موت کے کنوئیں کا کھلاڑی تھا... بلکہ اس سے بھی آگے کی ... کسی بھی گیم کو "گیم آف ڈیتھ" بنا کر اسے مزہ آتا تھا۔ ... بہر حال، میرے کہنے پر اس نے بے چارے سارجنٹس کو ... "گل" نہیں کیا اور داتا دربار کے قریب اپنے شیطانی ... چرخے کو ایک تنگ گلی میں گھسا دیا۔ پھر ایک اور زیادہ تنگ گلی میں گھسنے کے بعد اندر ہی اندر سفر کرتا راوی روڈ کی طرف نکل آیا۔

یہ وہی علاقہ تھا جہاں عمران مجھے پہلے دن کی ملاقات کے بعد لایا تھا۔ ان واقعات کو چار سال سے اوپر کا وقت گزر چکا تھا مگر اب بھی یہاں زیادہ کچھ نہیں بدلا تھا۔ سڑک ویسی ہی شکستہ تھی۔ کھمبوں پر ویسے ہی بجلی کے تاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ تھڑوں پر ویسے ہی بے فکرے بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ عمران کی موٹر سائیکل کی آواز نے جیسے اس سارے علاقے میں صور...... پھونک دیا۔ لوگ مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔ اَن گنت چہروں پر حیرت آمیز مسرت کی یلغار ہوئی۔ عمران نے ہیلمٹ اتار دیا اور اپنے پسندیدہ چوراہے میں جا کھڑا ہوا۔

بہت سے لوگ اکٹھے ہوگئے۔ ہیرو بھائی، ہیرو بھائی کی آوازیں بلند ہوئیں... میں نے چار برس پہلے کے چاچے رفیق کو دیکھا۔ وہ ڈگمگاتا ہوا آیا۔ اس نے عمران کو گلے لگایا... پوپلے منہ سے بولا۔ "پتر کہاں رہے اتنی دیر؟ ڈیڑھ سال سے اوپر ہوگیا تمہیں شکل دکھائے ہوئے۔ بڑے بُرے بُرے خیال آتے تھے ہمیں۔ لگتا تھا کہ پورا محلہ ویران ہوگیا ہے۔"

"بس آگیا ہوں نا۔ اب آپ کے آس پاس ہی رہوں گا۔ اور زاہد بھائی! یہ جھنڈیاں شنڈیاں کس سلسلے میں ہیں؟ کیا آپ کو پتا تھا کہ میں تشریف لا رہا ہوں..."

عمران کا پڑوسی زاہد بولا۔ "ہمیں پتا ہوتا، تم آرہے ہو تو پھر ان جھنڈیوں کے ساتھ ساتھ ڈھول ڈھمکا اور باجا گاجا بھی ہوتا۔ یہ تو نذیرے کی شادی کی جھنڈیاں ہیں... چاچے نذیرے کی شادی ہورہی ہے ہفتے کے دن۔ آپ بڑے اچھے وقت پر آئے ہو۔"

"بھائی زاہد! تم مذاق تو نہیں کررہے؟ چاچا نذیرا اور شادی؟"

"ہاں، یہ لمبی کہانی ہے ہیرو بھائی۔" لمبے بالوں والا ایک لڑکا بولا۔ "جوانی میں چاچے نذیرے کی ایک منگیتر تھی۔ دو سال رہی تھی یہ منگنی پھر ٹوٹ گئی۔ لڑکی کی شادی کہیں اور ہوئی، ہمارے چاچے نذیرے کی شادی کہیں اور۔ اور پھر پینتالیس پچاس سال گزر گئے۔ اب دونوں اکیلے ہیں۔ دونوں کے جیون ساتھی دیر ہوئی، اللہ میاں کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ دونوں کو ساتھی کی ضرورت ہے۔ ہم سب محلے والے مل کر امام صاحب کے پاس گئے۔ ان کی اجازت اور رضامندی سے ہم لوگ چاچے نذیرے اور چاچی کلثوم کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شادی کرا رہے ہیں۔ اسی محلے سے برات جانی ہے۔ اسی محلے سے ڈولی اٹھنی ہے۔"

"زبردست... یہ تو بڑی فائیو اسٹار قسم کی خبر سنائی ہے تم لوگوں نے۔" عمران نے کہا۔

عمران کی آمد پر لوگوں کی خوشی دیدنی تھی۔ ہم سب کے ساتھ ہی سیمنٹ کے تھڑے پر بیٹھ گئے۔ کوئی ہمارے لیے حلوہ پوری لے آیا، کوئی چائے، کوئی گاجر کا حلوہ۔ ایک لڑکی نے چوبارے کی تیسری منزل سے ٹوکری لٹکائی اور زور سے بولی۔ "عمران بھیّا! گرم نہاری۔"

"شکریہ... شکریہ۔" عمران نے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔

کئی چھوٹے لڑکے عمران کے شیطانی چرخے کے اردگرد گھوم رہے تھے اور اسے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک موٹر سائیکل کے ہوٹر کی آواز سنائی دی۔ عمران کی تلاش میں بھٹکنے والے ٹریفک سارجنٹس میں سے ایک یہاں پہنچ گیا تھا۔ "لو کر لو تماشا۔" میں نے عمران سے کہا۔

سارجنٹ نے عمران کی کھٹارا موٹر سائیکل دور ہی سے دیکھ لی تھی۔ وہ غصے میں تپا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ لوگوں کے درمیان سے گزر کر وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔ "السلام علیکم سارجنٹ بھائی۔" عمران نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملانے کی کوشش کی جو ناکام ہوئی۔

"یہ تمہاری بائیک ہے؟" سارجنٹ نے کرخت لہجے میں کہا۔

"میں اس کا مالک ہونے پر شرمندہ ہوں۔ لیکن میں اس ملکیت سے انکار نہیں کر سکتا۔"

"تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا... موٹر سائیکل سمیت۔" سارجنٹ کو وردی کی موجودگی نے ایک دم پتھر کا بنا دیا تھا۔

عمران نے منت سماجت کی لیکن اس نے ایک نہیں سنی۔ وہ بار بار اپنے واکی ٹاکی کو اپنے منہ کی طرف لے جا رہا تھا۔ غالباً اپنے ساتھیوں کو اپنی لوکیشن بتانا چاہتا تھا۔ یکا یک ایک عمر رسیدہ باریش شخص آگے بڑھا اور اس نے سارجنٹ کے ہاتھ سے واکی ٹاکی چھین لیا۔ وہ گرج کر بولا۔ "ہم تمہیں کچھ نہیں کرنے دیں گے ہیرو پتر کے خلاف۔ یہ ڈیڑھ سال بعد آیا ہے یہاں۔ ہماری آنکھیں ترسی ہوئی ہیں اس کے لیے۔ تم اسے تھانے لے جانا چاہتے ہو؟"

دیکھتے ہی دیکھتے وہاں مظاہرے کی سی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ ایک ادھیڑ عمر پھل فروش بولا۔ "ہماری یونین ہے ٹھیلے والوں کی۔ تم بھتا لیتے ہو ہم غریبوں سے۔ ہمارے پا[س] ثبوت ہیں... ہم تمہارے خلاف کارروائی کرائیں [گے]۔ اخباروں کے دفتروں کے سامنے مظاہرہ کریں گے... تم[ہارے] چالان۔ ہم سے بھی جو کچھ ہو سکا، کریں گے۔ یہاں کوئی [بھی] دودھ کا نہایا ہوا نہیں ہے۔"

سارجنٹ ذرا ڈھیلا پڑتا نظر آیا... لیکن وہ پیچھے ہٹنے [کو] تیار نہیں تھا۔ اتنی دیر میں ایک اور موٹر سائیکل کا ہوٹر گونجا۔ غالباً اس دوسرے سارجنٹ کو وائرلیس پر پیغام مل چکا تھا۔ اس نے طوفانی انداز میں اپنی ہیوی موٹر سائیکل موقع [پر] پہنچائی اور اپنا ہیلمٹ اتارتے ہوئے عمران کی طرف بڑھا۔ عمران کو دیکھ کر اس کے چہرے پر شناسائی کے آثار ابھرے۔ پھر یہ آثار مسرت میں بدل گئے۔ "عمران بھا[ئی] آپ؟" اس نے تعجب سے کہا۔

"بے شک میں ہوں۔ بقلم خود۔"

"اوہ گاڈ! آپ نے اتنا دوڑایا ہمیں۔ آپ [نے] ہیلمٹ پہن رکھا تھا اس لیے پتا ہی نہیں چلا۔"

"میری بے شکل موٹر سائیکل نے تو ہیلمٹ نہیں پہن رکھا تھا۔"

"مجھے تھوڑا سا شک تو ہوا تھا لیکن..."

دوسرا سارجنٹ جو ذرا سینئر تھا، بدستور غصے میں نظر آ[رہا] تھا۔ اس کا ساتھی اسے ایک طرف لے گیا اور سمجھانے بجھانے لگا۔ وہ کبھی خاموش ہو جاتا، کبھی نفی میں سر ہلانے لگ[تا]۔ اسی دوران میں بالا دودھ فروش، دو بڑے گلاس بادا[م] والے دودھ کے لے کر آیا۔ سب نے سینئر سارجنٹ کو گھ[یر] ڈال لیا اور زبردستی بٹھا کر دودھ پلایا۔ کوئی اس کے کند[ھے] دبانے لگا۔ کوئی اس کی پینٹ سے مٹی جھاڑنے لگا۔ یہاں [تک] کہ سارجنٹ کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔

چاچے رفیق نے پوپلے منہ کے ساتھ پُرخلوص [داد] دی۔ "ہنستے ہوئے کتنا چنگا لگتا ہے۔ دیکھنا بڑی ترقی ہو[گی] تیری۔ وڈی عید سے پہلے پہلے "ہیڈ کانسٹیبل" بن جائے گا۔"

چاچے رفیق کی بات پر قہقہہ پڑا۔ ماحول خوش گوار [ہو] گیا۔ دونوں سارجنٹ ڈیوٹی پر تھے۔ وہ زیادہ دیر ہمار[ے] ساتھ نہیں ٹھہر سکے اور واپس چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ بعد [میں] آنے والا سارجنٹ نواز احمد عمران کا شناسا تھا۔ کچھ عرصہ [پہلے] اس نے کسی نئی ہنڈا گاڑی کا چالان کیا اور رجسٹریشن بک [ضبط کر] لی۔ لیکن یہ بک تھانے میں جمع کرانے سے پہلے ہی نواز [احمد] سے کہیں گم ہو گئی۔ نواز احمد کے لیے بہت بڑا مسئلہ کھڑا [ہو] گیا۔ گاڑی مالکان کا دعویٰ تھا کہ ڈپلی کیٹ بک کی وجہ [سے]

[ڈ]یڑھ دو لاکھ کا نقصان ہو گیا ہے۔ نواز احمد کو نوکری کے [لا]لے پڑ گئے۔ اس موقع پر عمران نے اپنی گرہ سے کچھ رقم [د]ی اور اس نوجوان ٹریفک آفیسر کی نوکری بچائی تھی۔ میں [جا]نتا تھا کہ اس طرح کے اَن گنت واقعات عمران سے [منسو]ب ہیں۔ یہی واقعات تھے جنہوں نے بہت سی جگہوں [پر لو]گوں کو اس کا گرویدہ بنا رکھا تھا۔

عمران اور میں عمران کے پرانے گھر میں بھی گئے اور [وہ]اں کچھ وقت گزارا۔ اس گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے اپنی [زند]گی کے وہ بدترین دن یاد آ گئے جب میں ہر گھڑی خودکشی [کے] بارے میں سوچ رہا تھا اور عمران اپنی شخصیت کے تمام تر [زو]ر کے ساتھ میرے اور میری موت کے درمیان دیوار بنا ہوا [تھا۔] تب میرا اور اس کا کوئی واسطہ، کوئی تعلق نہیں تھا مگر وہ [گھر و]الوں سے کہیں بڑھ کر میرے لیے فکرمند تھا۔

ہم نے اس شان دار ماحول میں قریباً چار گھنٹے گزارے۔ ہم نے لنچ بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی کیا۔ لکڑی [کی] پٹڑیوں پر بیٹھ کر یہ ایک عوامی لنچ تھا۔ گرما گرم نان، انڈا [...]، سلاد اور آخر میں ملائی والی دودھ پتی۔ جوں جوں [ارد]گرد کے لوگوں کو عمران کی آمد کا پتا چل رہا تھا، وہ اس سے [ملنے] کے لیے آ رہے تھے۔ اس سے اپنے دکھ سکھ بیان کر [رہے] تھے۔ گفتگو کا ایک دلچسپ موضوع چاچے نذیرے کی [شا]دی بھی تھا۔ عمران نے وعدہ کیا کہ وہ نذیرے کی شادی [میں ض]رور شرکت کرے گا اور چاچے، چاچی کو سلامی بھی دے [گا۔]

تین بجے کے قریب عمران کی موٹر سائیکل پھر اسٹارٹ [ہو]ئی اور آدھے لاہور کو پتا چل گیا کہ کچھ اسٹارٹ ہوا ہے۔ [میں] نے کہا۔ "اس دفعہ مجھے چلانے دو۔ میں بھی تو اس کا مزہ [چکھ]وں۔"

وہ بولا۔ "میں تمہاری استادی سمجھ رہا ہوں۔ گھبراؤ [نہیں]، میں آہستہ چلاؤں گا۔"

ہم نہر کے ساتھ ساتھ سفر کرتے اچھرہ پہنچے۔ یہاں ہم [نے ع]مران کے ایک پسندیدہ ریستوران میں چائے پی۔ اس [ریستو]ران سے میری بھی ایک یاد وابستہ تھی۔ میرا دل بھر [آیا۔] ایک عید کے موقع پر ہم سب گھر والے آئس کریم [کھانے] یہاں آئے تھے۔ کتنے سہانے دن تھے۔ میں، [...]، فرح اور امی... ہم اصرار کر کے ثروت اور بھائی [...] اپنے ساتھ لے آئے تھے... امی میرے سامنے [وا]لی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ میں پانی پی رہا تھا۔ انہوں [نے] کہا تھا۔ "تابش! تین گھونٹ میں پیتے ہیں۔"

وہ ہمیشہ یہی کہا کرتی تھیں۔ میں آج بھی پانی پی رہا تھا لیکن وہ آواز کہیں نہیں تھی، وہ چہرہ کہیں نہیں تھا۔ میں نے گلاس نیچے رکھ دیا۔ آنکھیں جل اٹھیں۔ سینے میں انگارے سے دہکنے لگے۔ میری ماں کو مارنے والے کہاں تھے؟ وہ اسی شہر میں تھے شاید۔ اسی فضا میں سانس لے رہے تھے۔

میں نے عمران سے کہا۔ "عمران! ہم سیٹھ سراج کو کب ڈھونڈیں گے؟"

وہ مسکرایا۔ "بھئی، ہم ڈھونڈنا شروع تو کر چکے ہیں بلکہ... میرا خیال ہے کہ ہمیں کسی حد تک کامیابی بھی مل چکی ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں چونکا۔

اس نے اپنے سر کو حرکت دیے بغیر ڈائننگ ہال کے بائیں گوشے کی طرف دیکھا اور بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ راوی روڈ سے دو بندے مسلسل ہمارے پیچھے ہیں۔ نوّے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ ان کا تعلق سراج وغیرہ سے ہے۔ نہ... نہ، مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہ کرنا۔ انہیں شک ہوگا۔"

ایک دم مجھے یاد آیا۔ جب آج صبح ہم گھومنے پھرنے کے لیے نکلے تھے تو عمران نے ایک تیر سے دو شکار والی بات کہی تھی۔ تو کیا اس کا اشارہ اس طرف تھا؟ شاید... ایسا ہی تھا... وہ جانتا تھا کہ جب ہم اس طرح نکلیں گے اور جانی پہچانی جگہوں پر جائیں گے تو سیٹھ سراج کے گرگوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور ہمیں دیکھے گا، یا اسے ہمارے بارے میں پتا چلے گا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" میں نے عمران سے پوچھا۔

"جو کچھ بھی کرنا ہے لیکن اب گھر کا رخ نہیں کرنا۔ یقیناً یہ لوگ ہمارے ٹھکانے کے بارے میں جاننا چاہتے ہوں گے۔ اور یہ ان کے نزدیک ایک بہت بڑی کامیابی ہو گی۔"

ہم تقریباً پندرہ منٹ وہاں مزید بیٹھے۔ عمران سوچ میں تھا۔ اس نے دو سو روپے کے بل کے ساتھ بیرے کو پورے آٹھ سو روپے ٹپ دے دی۔ بیرے کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ آج صبح جب ہم گھر سے نکلے تو عمران کی جیکٹ کی جیب میں ایک موٹی رقم موجود تھی۔ اب اس رقم میں سے تھوڑی ہی بچی تھی۔ اس نے یہ روپے اپنی جان پہچان والے مختلف ضرورت مندوں میں تقسیم کیے تھے۔ بیس ہزار کی رقم موج میلے کی مد میں خرچ ہوئی۔ یہ بیس ہزار روپے اس نے چاچے نذیرے کی شادی کے انتظامات مزید بہتر کرنے کے لیے دیے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہم ریستوران سے نکلے اور اپنے شیطانی چرخے پر آبیٹھے۔ عمران نے عقب نما آئینہ درست کرلیا۔ اب میری سمجھ میں آرہا تھا کہ اس نے راوی روڈ سے روانہ ہونے کے بعد طوفانی رفتار اختیار کیوں نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ہمارا پیچھا کیا جارہا ہے۔

یہ ''پیچھا'' ایک بار پھر شروع ہوگیا۔ وہ دونوں افراد بھی بائیک پر تھے۔ واقعی اب گھر جانے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ عمران یونہی اِدھر اُدھر موٹر سائیکل گھمانے لگا۔ ''کیا ارادہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کسی سنسان سڑک پر چلتے ہیں۔ وہاں جاکر ان سجن پیاروں سے ہیلو ہیلو کرتے ہیں۔''

لیکن صرف ایک دو منٹ بعد عمران قدرے متفکر نظر آیا۔ وہ بار بار عقب نما آئینہ دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! عجب اناڑی لوگوں سے واسطہ پڑا ہے۔ لگتا ہے ''پراپر'' طریقے سے کسی شریف بندے کا پیچھا کرنے کا پتا ہی نہیں ہے انہیں۔ اب پتا نہیں کہاں رہ گئے ہیں۔''

''تم بھی تو موڑ پر موڑ کاٹ رہے ہو۔''

''لیکن یار، رفتار تو معمولی سی ہے۔ اتنی رفتار پر تو کوئی نابالغ بدمعاش بھی تعاقب جاری رکھ سکتا ہے۔''

اس نے جھلا کر موٹر سائیکل روک دی۔ ہم دونوں بدستور عقب نما آئینے میں دیکھ رہے تھے۔

لگتا تھا کہ وہ دونوں بندے واقعی کوئی غلط موڑ کاٹ گئے ہیں۔ کچھ دیر انتظار کے بعد عمران نے موٹر سائیکل واپس موڑی۔ ہم انہی راستوں پر واپس ہوئے۔ یہ دلچسپ صورتِ حال تھی۔ ہم اپنا تعاقب کرنے والوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''اس کمینے سیٹھ سراج کے کارندے ایسے اناڑی نہیں ہوسکتے۔ کہیں یہ کوئی اور معاملہ نہ ہو۔''

''کبھی کبھی تم عقل کی بات کر ہی جاتے ہو۔'' عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

ابھی ہم کچھ ہی آگے گئے تھے کہ دور فاصلے پر وہ دونوں افراد اپنی موٹر سائیکل سمیت ایک پان شاپ کے قریب کھڑے نظر آئے۔ ہماری طرف ان کی پشت تھی۔ وہ متلاشی نظروں سے اردگرد دیکھ رہے تھے۔ ہماری موٹر سائیکل کی آواز... ٹریفک کے شور کے باوجود دور ہی سے ان کے کانوں میں پڑگئی۔ وہ چونک کر ہماری جانب دیکھنے لگے۔ اس وقت یقیناً ان کی سٹی گم ہوگئی ہوگی جب عمران نے اپنی عجوبہ بائیک عین ان کے پہلو میں جا کھڑی کی۔

انہوں نے گھبرا کر ہماری طرف دیکھا۔ وہ دونوں شلوار قمیص میں تھے۔ ایک نے سویٹر بھی پہن رکھا تھا۔ دونوں کی عمریں پچیس چھبیس سال رہی ہوں گی۔ دیکھنے میں وہ بالکل عام سے دکان دار ٹائپ افراد نظر آتے تھے۔ عمران نے موٹر سائیکل پر آگے بیٹھے ہوئے نوجوان سے پوچھا۔ ''ماچس ہوگی تمہارے پاس؟''

''نن... نہیں۔'' وہ ہکلایا۔

''میرا بھی یہی اندازہ تھا۔'' عمران بولا۔ ''تم اتنی دور سے ہمارے پیچھے پیچھے آرہے ہو۔ یقیناً تمہیں ا... سگریٹ جلانا ہوگا۔ یہ لو۔'' عمران نے اپنا سگریٹ لائٹر ا... کی طرف بڑھایا۔

''کیا... مطلب... جی۔''

''مطلب کے بچے۔ پیچھا کیوں کررہے ہو ہمارا... کوئی لڑکی نہیں ملی تمہیں۔'' عمران پھنکارا۔

''وہ تو... وہ جی... ہم تو...'' وہ بُری طرح ہکلایا۔

''ہم تو... تم تو... چھوڑو۔ سیدھی طرح بتاؤ۔ ورنہ ابھی یہاں مار مار کر بھرکس نکال دوں گا۔ بھرکس سمجھتے ہو تم؟''

دونوں بندوں کے رنگ پیلے پڑ گئے۔ صاف پتا... کہ وہ اس قماش کے لوگ نہیں ہیں۔ یا تو چھوٹے مو... جرائم پیشہ ہیں یا کسی اور چکر میں ہمارے پیچھے ہیں۔ عمرا... نے ان کی موٹر سائیکل کی چابی نکال لی۔ چند ہی منٹ بعد... دونوں ان دونوں کے ساتھ ایک سستے سے چائے خا... میں بیٹھے تھے۔ وہ اب بھی گھبرائے ہوئے تھے۔ ''کیا چ... ہے صاف صاف بتاؤ۔ اور میرے پاس زیادہ وقت بھی نہ... ہے۔'' عمران نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم... ہم آپ سے ملنا چاہتے تھے۔'' ان م... سے ایک بولا۔

''کیوں، میں نے دیوتا لکھی ہے یا ہیری پوٹر میں ک... کیا ہے؟''

''وہ جی... دراصل۔'' وہ ہکلا کر بولا۔

''اور تمہاری شکل مجھے کچھ پہچانی سی لگ رہی ہے... راوی روڈ پر تو نہیں رہتے ہو؟'' عمران نے قدرے ف... نوجوان سے پوچھا۔

''جج... جی ہاں۔ میں ادھر ہی رہتا ہوں۔ در... دراصل کسی نے کہا تھا کہ آپ جب بھی مجھے نظر آئیں... آپ سے ملوں اور آپ کو اس کے پاس لے کر آؤں۔''

''یہاں لاہور میں مجھے سب سے زیادہ فلمسٹار ریما ہی چاہتی ہیں۔ دوسرا نمبر نرگس کا ہے لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی تم جیسے گاؤدی کدّو کو ملازم نہیں رکھ سکتی۔ بتاؤ کون ہے وہ؟ اور کہاں رہتی ہے؟''

میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ تصدیق کیے بغیر ہی مؤنث کا صیغہ استعمال کررہا تھا۔ یہ بھی اس کی ہلکی پھلکی گفتگو کا انداز تھا۔

''وہ ہمارے پیر جی ہیں جی۔ پیر شوکت تھانوی صاحب۔ یہاں لاہور میں ہی رہتے ہیں۔ وہ کافی عرصے سے آپ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔''

عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔ مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''یار! مجھے تھانوی کے لفظ سے بہت ڈر لگتا ہے۔ کہیں یہ ''تھانے'' سے تو نہیں نکلا ہوا۔ اگر ایسا ہے تو پھر پیر تھانوی کا مطلب تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ ابھی الہ آباد والے تھانوی سے بمشکل جان چھڑائی ہے۔''

''کس مقصد سے ملنا چاہتے ہیں تمہارے پیر صاحب؟'' میں نے فربہ اندام شخص سے پوچھا۔

''انہوں نے بتایا نہیں۔ لل... لیکن آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں آیا ہوا ہوں؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''سچ پوچھیں جی تو میں پچھلے تقریباً آٹھ ماہ سے آپ کا انتظار کررہا تھا۔ میں آتے جاتے آپ کے خالی گھر پر نظر ڈالتا تھا۔ آج گھر میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا کہ آپ کی موٹر سائیکل کی آواز آئی۔ میں دوڑا ہوا باہر نکل آیا۔''

''تم چھپا رہے ہو۔'' عمران نے کہا۔ ''تمہارے پیر صاحب ہیں اور تمہیں ہی پتا نہیں کہ وہ کیوں اتنی بے قراری سے میرا انتظار فرما رہے ہیں۔''

وہ ذرا تذبذب میں رہ کر بولا۔ ''مجھے زیادہ تو پتا نہیں جی۔ پر کوئی ایسا مریض ہے جس کا وہ علاج کررہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے علاج کے لیے ان کو آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ پوری بات تو آپ کو پیر صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے، چلو ان کے پاس۔ ابھی ملاقات کر لیتے ہیں۔ لیکن جانا کہاں ہے؟''

''یہیں جی۔ شاہ جمال موڑ کے قریب۔'' اکہرے بدن والے نے جواب دیا۔

ہم چائے خانے سے باہر نکل آئے۔ عمران نے مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''تم اس موٹے کدّو کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ میں اس کے ساتھی کو بٹھا لیتا ہوں۔''

ہم اسی ترتیب کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوئے۔ اب شام ہونے والی تھی۔ ہم مختلف سڑکوں پر سفر کرتے ہوئے شاہ جمال کے علاقے کی طرف نکل آئے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ کوئی آستانہ نما جگہ ہوگی لیکن یہ تو ایک اچھی خاصی رہائشی کوٹھی تھی۔ ہم لان میں داخل ہوئے اور دونوں موٹر سائیکلیں بند کردیں۔ عمران کی جیکٹ میں بھرا ہوا پستول موجود تھا۔ یہاں ہمیں کسی طرح کے حالات بھی پیش آسکتے تھے۔ ہمیں ایک ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ یہاں الماریوں میں بہت سی کتابیں سجی ہوئی تھیں۔

زیادہ تر مذہبی علوم کے بارے میں تھیں۔ کچھ تاریخی نوعیت کی تھیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ پیر صاحب آرام فرما رہے تھے۔ انہیں جگا دیا گیا ہے۔ وہ ابھی دو چار منٹ میں تشریف لے آتے ہیں۔ اور پھر پیر صاحب جلوہ افروز ہوئے۔ پیروں، فقیروں اور عاملوں وغیرہ کے حوالے سے میرے ذہن میں جو بھی تصورات تھے، وہ ان سے مختلف نکلے۔ ان کا رنگ سرخ و سپید تھا۔ انہوں نے ایک لمبا سفید چغا پہن رکھا تھا۔ داڑھی سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ عمر پچاس کے قریب تھی۔

انہوں نے نرم الفاظ میں ہم سے بات چیت کی اور حال احوال پوچھا۔ عمران سے مخاطب ہوکر بولے۔ ''تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی بیٹا۔ مجھے کافی عرصے سے تمہارا انتظار تھا۔ تمہارا راوی روڈ والا مکان خالی پڑا تھا۔ کسی کو بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں ہو۔ جہاں تم کام کرتے ہو، وہاں سے بھی کچھ پتا نہیں چل سکا۔ یہ جمیل تمہارے ہی محلے میں رہتا ہے۔ میں نے اس کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی کہ جب بھی تمہارے بارے میں کچھ پتا چلے یہ مجھے بتائے۔''

عمران بھی شوکت احمد تھانوی کی شخصیت سے قدرے متاثر نظر آتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''مجھے بتائیے، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

تھانوی صاحب کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔ ''میں تم سے معافی چاہتا ہوں بیٹے لیکن میں وقت سے پہلے تمہیں نہیں بتا سکتا۔''

''...اور وقت کب آئے گا؟'' عمران نے پوچھا۔

''بہت جلدی۔ شاید دو چار دنوں میں۔'' تھانوی صاحب نے کھڑکی سے باہر آسمان کو تکتے ہوئے کہا جو شام کے جھٹپٹے میں اوجھل ہوتا جارہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''آپ نے تجسس میں ڈال دیا ہے۔'' عمران نے کہا۔

انہوں نے عمران کے شانے کو چھوا اور بولے۔ ''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بس تم یوں سمجھ لو کہ ایک مریض ہے جس کے علاج کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں انشاء اللہ تمہارا زیادہ وقت بھی نہیں لوں گا۔ بس ایک آدھ گھنٹے کی بات ہوگی۔''

''کیا اس مریض سے میرا کوئی تعلق ہے؟''

''ہاں، پرانا تعلق بھی ہے... لیکن بیٹے، تم خود کو پریشان نہ کرو۔ بس چند دن میں سب کچھ تمہارے سامنے آجائے گا۔ اور یہ کوئی مجبوری کی بات بھی نہیں ہے۔ اگر تم چاہو گے تو مدد کرنا ورنہ منع کر دینا۔ مجھے ذرا سی بھی شکایت نہیں ہوگی۔''

میں نے کہا۔ ''حضرت! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ مدد کس طرح کی ہوگی؟''

''میں پھر معافی چاہتا ہوں۔ وقت سے پہلے بتانا مناسب نہیں۔ اگر کوئی عذر نہ ہو تو آپ مجھے اپنا رابطہ نمبر دے دیں۔ جیسے ہی موقع آیا، میں آپ کو بتا دوں گا۔ باقی مجھے پتا چلا ہے کہ جمیل اور اس کے ساتھی نے آپ کا پیچھا کیا تھا۔ اس کی وجہ سے آپ دونوں کو جو پریشانی ہوئی، اس کے لیے میں شرمندہ ہوں۔ انہیں یہ طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں جی۔'' عمران نے کہا۔ ''اگر ہمارے دل میں کچھ تردد تھا بھی تو آپ کی بات چیت سے دور ہو گیا ہے۔''

ہم تقریباً آدھ گھنٹا پیر صاحب کے ساتھ رہے۔ وہ بہت مختلف نظر آئے۔ لیکن ایک بات تھی، وہ بہت سی چیزیں پردۂ اخفا میں رکھ رہے تھے۔ عمران نے انہیں تھوڑا بہت کریدا لیکن زیادہ اصرار نہیں کیا۔ انہوں نے ہمیں پُرتکلف چائے پلائی۔ کھانے کے لیے بھی اصرار کیا لیکن ہم چلے آئے۔ ویسے بھی ان کے مریدوں اور مریضوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

ہماری واپسی موٹر سائیکل پر ہی ہوئی... پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ یہ عمران کی پرانی روداد والا کوئی معاملہ ہے۔ اس وقت جب وہ عمران کے بجائے عمو تھا... گاؤں کے بااثر چودھری نے اپنے اکلوتے بچے پر سے ایک آفت ٹالنے کے لیے عمو کو قربانی کا بکرا بنایا تھا۔ اسے اس کی روتی بلکتی بیوہ ماں سے جدا کیا گیا اور ایک بدقماش عامل کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اس موڑ پر سے عمو کی زندگی کے راستے بدلتے چلے گئے اور وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

''کیا اندازہ لگایا ہے تم نے؟'' میں نے موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھے بیٹھے عمران کے کان میں پوچھا۔

''میرا اندازہ تو یہی ہے کہ امریکا کو عراق سے نکلنا ہی پڑے گا۔''

''میں پیر صاحب کے حوالے سے پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے سٹپٹا کر کہا۔

''پیر صاحب تو گوشہ نشین سے بندے ہیں یار! ان کا امریکا کی خارجہ پالیسی سے بھلا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟''

''بھاڑ میں جاؤ۔'' میں نے کہا۔

یہی وقت تھا جب ہم پر پہلی گولی چلی۔ یہ رائفل کی گولی تھی اور سڑک کے کنارے کھڑی ایک ایف ایکس کار کے اندر سے ہم پر چلائی گئی تھی۔ یہ گولی موٹر سائیکل کے فریم میں کہیں لگی اور زوردار آواز پیدا ہوئی۔ دوسری گولی ہمارے ہیلمٹس کو چھوتی ہوئی گزری۔ عمران نے بریک لگائے۔ موٹر سائیکل لہراتی اور سلپ کرتی ہوئی ایک بس اسٹاپ کے شیڈ کے پیچھے چلی گئی۔ اردگرد ٹریفک موجود تھا، کچھ لوگوں کو تو اس فائرنگ کا پتا ہی نہیں چلا مگر جن کو چلا، ان میں کھلبلی محسوس ہوئی... میں نے صاف دیکھا، ایف ایکس میں صرف ایک بندہ موجود تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ موٹر سائیکل زد سے نکل گئی ہے تو اس نے پوری رفتار سے گاڑی بھگا دی۔ عمران نے گری ہوئی موٹر سائیکل کو اٹھایا۔ ہم پھرتی سے اس پر بیٹھے اور تیز رفتاری سے کریم کلر ایف ایکس کے پیچھے لپکے۔

...اگلے دو منٹ میں ہم نے ایک بھری پُری سڑک پر ایف ایکس کا تیز رفتار تعاقب کیا۔ ہمیں تسلی تھی کہ گاڑی میں صرف ایک بندہ ہے۔ وہ چلتی گاڑی سے ہم پر فائر نہیں کر سکتا تھا۔ اچانک ایف ایکس نے ایک رکشا کو ٹکر ماری اور پھر ایک الیکٹرک پول سے جا ٹکرائی۔ اس کے بونٹ سے سیاہ دھواں نکلنے لگا۔ جب تک ہم گاڑی تک پہنچے، گاڑی سوار باہر نکل کر دوڑ لگا چکا تھا۔ وہ اکہرے بدن کا شخص تھا۔ اس نے شلوار قمیص پر ڈبی دار کوٹ پہن رکھا تھا۔ اندازہ یہی ہوا کہ چھوٹی نال کی رائفل اس کے ہاتھ میں ہے۔ ہم خواتین وحضرات سے ٹکراتے، خوانچوں کو الٹتے، سائیکل سواروں کو گراتے اس کے پیچھے دوڑتے چلے گئے...

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

نظرباز

سلیم انور

صنفِ نازک کو ٹکٹکی باندھ کے دیکھنا انتہائی ناشائستہ فعل ہے... ایسی ہی ایک دوشیزہ کی مشکل... جو گھر سے نکلتے ہی ان نظروں کے حصار میں آجاتی تھی... جو لمحہ بہ لمحہ اس کی زندگی کو عجیب صورتِ حال سے دوچار کر رہا تھا...

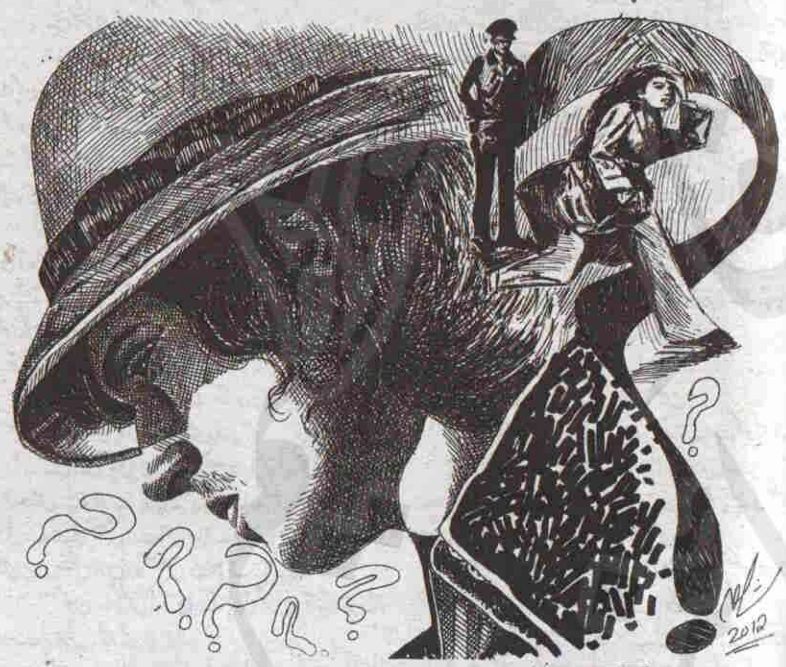

سنسنی... تجسس اور مکروفریب کے جال میں الجھے مجرم اور قانون کی آنکھ مچولی

ہر کوئی خوفزدہ تھا!

جنوری میں ریپ اور مرڈر کا ایک کیس ہوا تھا۔ فروری میں بالجبر اور قتل کی دو وارداتیں ہوئی تھیں۔ مارچ میں ان کی تعداد تین ہو گئی تھی۔

اور یہ اپریل کا پہلا ہفتہ تھا۔

کالج کی انتظامیہ نے اضافی سیکیورٹی طلب کر لی تھی۔ اس کے باوجود بھی کیمپس میں کوئی بھی لڑکی خود کو محفوظ تصور نہیں کر رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سیلی کو اپنی گردن کی پشت پر چبھن سی محسوس ہو رہی تھی جیسے اس کا رُواں رُواں اعصاب زدہ ہو۔ اسے اپنے بالوں کی جڑیں نوک دار کانٹوں کے مانند پیوست ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

سیلی نے اپنی اس بے چینی کا سبب جاننے کے لیے اطراف میں نظر دوڑائی تو اسے وہ دکھائی دے گیا۔ وہ بھی ٹکٹکی باندھے اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ سیلی کے متوجہ ہونے کے باوجود اس شخص نے اس پر سے نظریں نہیں ہٹائیں۔

سیلی جُھرجُھری لے کر رہ گئی۔

تب اس شخص نے اپنی نگاہیں سیلی پر سے قدرے دائیں جانب ہٹاتے ہوئے اس کے عقب میں گھورنا شروع کر دیا۔ پھر وہ اس شیشے کے ہوادار کمرے میں ترتیب سے سجے آرائشی پودوں کے بڑے سے گملوں کی آڑ میں چھپتا رہا جیسے کسی کی نظروں میں آنے سے بچنا چاہتا ہو۔

سیلی اپنے خیالات میں اس حد تک گم تھی کہ اسے نینا کی آمد کا احساس تک نہیں ہوا۔ جب نینا نے دھب سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنی کتابیں زوردار آواز کے ساتھ میز پر پٹخیں تو سیلی بے ساختہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی اور اس کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

”سوری، سیلی!“ نینا نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”میرا مقصد تمہیں چونکانا ہرگز نہیں تھا۔“

سیلی اپنی سہیلی نینا پر پورا بھروسا کرتی تھی۔ وہ اسے اعتماد میں لیتے ہوئے بولی۔ ”وہاں ایک شخص موجود ہے۔“ سیلی نے سر کی جنبش سے اس جانب اشارہ کیا۔ ”جب سے میں یہاں بیٹھی ہوں، وہ مستقل مجھے تاک رہا ہے۔“

”کون سا شخص؟“ نینا نے اپنی گردن آگے نکالتے ہوئے پُرجوش لہجے میں پوچھا۔

”اس کے بال براؤن، لمبے اور لہریے دار ہیں۔“ سیلی نے بتایا۔ ”اس نے بلیک ٹی شرٹ اور جینز پہنی ہوئی ہے۔“

نینا نے گردن گھما کر اس حلیے کے فرد کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔ ”وہ جس نے ہیڈفون لگایا ہوا ہے؟“

”ہاں، وہی شخص۔“

”ارے بے وقوف لڑکی، وہ تو بڑا کیوٹ ہے۔ اگر وہ مجھے تاڑ رہا ہوتا تو میں قطعی بُرا نہ مانتی۔“ نینا نے اپنی چھوٹی چھوٹی سنہری زلفوں کو ایک ادا سے جھٹکتے ہوئے کہا۔

”نینا!“ سیلی جھنجلا سی گئی۔

”کیا ہوا؟“

”مجھے لگتا ہے کہ جو بلیچ تم اپنے بالوں میں استعمال کرتی ہو وہ بالآخر تمہارے مغز میں سرایت کر گئی ہے۔“ سیلی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“

”مجھے سنسنی سی محسوس ہو رہی ہے اور تم ہو کہ اس پریشانی کو محسوس کرنے کے بجائے لطف اندوز ہو رہی ہو۔“

اچانک نینا نے اپنے پرس میں سے ایک... اشتہار نکال کر سیلی کے سامنے رکھا اور بولی۔ ”وہ شاید اس بات پر حیران ہوگا کہ تم ان لڑکیوں سے کتنی مشابہت رکھتی ہو۔ یہ سب کی سب بڑی حد تک آپس میں بہنیں لگتی ہیں... تمہاری بہنیں!“

اس اشتہاری صفحے پر سب سے اوپر ایک قطار میں پانچ طالبات کی ایر بک تصاویر چھپی ہوئی تھیں۔ ہر تصویر کے نیچے اس طالبہ کی تاریخِ پیدائش اور تاریخِ وفات درج تھی۔ یہ پانچوں طالبات اس سیریل قاتل/ریپسٹ کا شکار بنی تھیں جس نے کیمپس میں دہشت پھیلائی ہوئی تھی۔ ان تصاویر اور تاریخوں کے نیچے جلی حروف میں یہ جملہ چھپا ہوا تھا:

”اگلا شکار مت بنیں۔“

اس کے بعد حفاظتی ٹپس درج تھیں:

1-اجنبیوں کے لیے اپنے دروازے مت کھولیں۔

2-الگ تھلگ لوکیشنز سے اجتناب کریں۔

3-ایسے علاقوں سے گریز کریں جہاں چھپنے کی جگہیں ہوں جیسے کہ جھاڑیاں، نچلے احاطے وغیرہ۔

4-اپنی منزل پر پہنچ کر گاڑی جہاں تک ممکن ہو سکے، خوب روشن اور قریب ترین حصے میں پارک کریں۔

5-اندھیرا پھیلنے کے بعد اگر پیدل چلنا ضروری ہو تو گروپ کی شکل میں چلیں یا پھر سیکیورٹی معاون کی خدمات طلب کریں۔

”شکریہ نینا! اب میں خود کو خاصا بہتر محسوس کر رہی ہوں۔“ سیلی نے اپنی نگاہیں اپنے سامنے رکھے ہوئے فلائر پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دوبارہ ان تصویروں کو غور سے دیکھنے لگی۔

نینا صحیح کہہ رہی تھی، وہ سوچنے لگی۔ تصویر میں موجود ہر لڑکی کے بالوں کی رنگت ایک جیسی یعنی لائٹ براؤن تھی۔ تمام لڑکیوں کے بال شانوں تک تھے۔ ان کے چہروں کا زاویہ بھی ایک جیسا تھا۔ ان کے درمیان اور بہت سی باتیں بھی مشترک تھیں۔

سیلی کو خود بھی یہی محسوس ہوا جیسے وہ خود ان تصویروں میں سے اپنے آپ کو دیکھ رہی ہو۔ وہ تصویریں اسے آئینے میں اپنا عکس لگ رہی تھیں۔

پھر سیلی نے اپنی نگاہیں فلائر پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی کتنی احمق ہوں۔ یہ اتنا بڑا کالج ہے۔ وہ شخص روزانہ اسی وقت یہاں آتا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے اس سے پہلے کبھی اس پر توجہ نہیں دی۔ اس کے علاوہ وہ خوددار ریپسٹ مس سیلی فرام کارن فیلڈ، کینساس کو اپنا اگلا شکار کیوں بنانا چاہے گا؟“ اس نے اپنی شہادت کی انگلی اپنے گال پر رکھتے ہوئے کہا اور ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ طاری کر لی۔

نینا نے اس کے اس انداز پر بے ساختہ قہقہہ بلند کیا اور بولی۔ ”گھریلو لڑکی، جاں فزا مشاغل میں دلچسپی لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔“

”تم چاہے جتنا مذاق اڑا لو لیکن کسی پادری کی بیٹی ہونا کتنا مشکل ہوتا ہے، تم اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ مجھے صرف اپنے کان چھدوانے کے لیے مہینوں تک منت سماجت کرنی پڑی تھی، تب کہیں جا کر اس کی اجازت ملی تھی۔“ سیلی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”اوہ، آئی سی! یہ تو ان دقیانوسی ممی اور ڈیڈی کی باتیں ہیں۔ اگر تم نے اپنے بال بلیچ کرا لیے تو وہ تمہیں ہلاک کر دیں گے۔ یا تم نے ٹیٹو گدوا لیا یا اپنے جسم کے کسی حصے میں غیر ضروری چھید کروا لیا تو وہ تمہیں نہیں بخشیں گے۔“ نینا نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔

”بہرحال، جو کچھ بھی ہے لیکن اس قاتل ریپسٹ کی وجہ سے ہم سب اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگے ہیں۔“ سیلی نے کہا۔

”آؤ یہاں سے چلتے ہیں۔“ نینا نے اسے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم خود تو پٹری سے اتر رہی ہو، مجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ رہی ہو۔“

پھر ان دونوں نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور لائبریری کی جانب چل پڑیں۔

راستے میں نینا نے پوچھا۔ ”کیا کینساس میں کارن فیلڈ نامی واقعی کوئی جگہ ہے؟“

”مجھے کیا معلوم۔ میں تو کبھی کینساس گئی ہی نہیں۔ لیکن تم سمجھ سکتی ہو کہ میرا کیا مطلب تھا۔“ سیلی نے جواب دیا۔

بیس منٹ بعد سیلی اور نینا لائبریری میں مطالعے میں مگن تھیں۔

پھر نہ جانے کہاں سے سرد ہوا کا ایک جھونکا سیلی کی گردن کو یوں چھوتا ہوا گزر گیا جیسے کسی عاشق کے لب اسے بوسہ دے رہے ہوں اور پھر سیلی کو اپنی گردن کے پیچھے وہی چبھن محسوس ہونے لگی۔

سیلی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چاروں جانب دیکھنے لگی۔ لیکن اسے کوئی غیر معمولی فرد یا شے دکھائی نہیں دی۔ اس نے اسے اپنا واہمہ سمجھتے ہوئے سر کو ایک جھٹکا دیا اور پھر ایک کتاب تلاش کرنے کے لیے کارڈ کیٹلاگ والے حصے کی جانب چل دی۔

جب وہ واپس اپنی نشست پر پہنچی تو اسے اپنے سامنے کے حصے میں اوپری ریک پر کوئی حرکت محسوس ہوئی۔ اس نے بروقت سر اٹھا کر دیکھا تو وہ اسے تہ بہ تہ رکھی ہوئی کتابوں کے ڈھیر کے درمیان سے گزرتا دکھائی دیا جو اوپر والے ریک پر رکھی ہوئی تھیں۔

چند لمحوں بعد وہ دوبارہ نمودار ہوا اور اس مرتبہ اس کی نظریں سیلی کی نظروں سے ٹکرا گئیں۔ پھر اس نے اپنی توجہ اس سیکیورٹی گارڈ پر مرکوز کر دی جو اپنے سینے پر ہاتھ باندھے کتابوں کے ڈھیر اور نچلے فلور کی حفاظت پر مامور تھا اور اپنی ایڑیوں پر آگے پیچھے جھول رہا تھا۔

سیلی نے گارڈ کی طرف دیکھا تو اس نے اپنے ہیٹ کو چھوتے ہوئے اشارے سے سلام کیا۔

سیلی نے دوبارہ اس جانب دیکھا جہاں وہ شخص کھڑا تھا۔ لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔

پھر وہ سیلی کو لائبریری میں ایک بار پھر دکھائی دیا۔ اس مرتبہ وہ ہال وے میں تنہا ایک دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا سر نیچے کیے خود سے باتیں کر رہا تھا۔

لائبریری سے نکل کر سیلی اور نینا اپنے اپنے راستوں پر چل دیں۔ سیلی کو انگلش لٹریچر کی کلاس اٹینڈ کرنی تھی۔ پھر شیڈول کے مطابق کیمپس کے بک اسٹور میں چار گھنٹے کے لیے کام بھی کرنا تھا۔

سیلی کو اپنا تاکو پھر دکھائی نہیں دیا۔ وہ بک اسٹور میں اپنے کام میں مصروف رہی۔

پھر جب وہ اپنی میز پر رجسٹر لیے بیٹھی ہوئی تھی تو وہ اسٹور میں داخل ہوا۔ وہ بے مقصد ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا اور اس کی خصوصی توجہ بک اسٹور میں موجود سیکیورٹی گارڈز پر مرکوز تھی جیسے ان کی نظروں میں آنے سے بچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ بک اسٹور میں گھومتا رہا۔ کبھی کبھار ایک آدھ آئٹم اٹھا کر دیکھنے لگتا جیسے اس کا جائزہ لے رہا ہو پھر آگے بڑھ جاتا تھا۔ البتہ اس دوران میں گاہے بگاہے سیلی پر ایک اچٹتی نگاہ بھی ڈال رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے ہر مرتبہ دیکھنے پر سیلی کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اپنے کام پر سے اس کا دھیان ہٹ چکا تھا اور وہ کن انکھیوں سے بار بار اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔

بالآخر اسے تاکنے والا اسٹور سے باہر نکل گیا لیکن جاتے جاتے اس نے آخری مرتبہ بھی سیلی کی طرف دیکھا... اور مسکرادیا۔

سیلی کو اس کی مسکراہٹ بڑی پُراسرار محسوس ہوئی۔

بریک کے دوران میں سیلی اٹھ کر اسٹور کے فرنٹ پر چلی گئی اور شیشے سے باہر کی طرف دیکھنے لگی۔

اسے وہ پھر دکھائی دیا۔

وہ ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کی نگاہ بک اسٹور کے داخلی دروازے پر جمی ہوئی تھی اور وہ ایک بار پھر خود سے باتیں کررہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اپنے ہاتھوں کو یوں لہرا رہا تھا جیسے کسی نادیدہ شخص سے بحث کررہا ہو۔

جب ایک گاہک بک اسٹور سے باہر نکلا تو خود سے باتیں کرتا ہوا وہ تاکنے والا خاموش ہوگیا اور اس نے اپنے ہاتھ اپنی جیبوں میں ڈال لیے۔

جب اسٹور بند ہونے کا وقت ہوا تو سیلی نے اسٹور کی منیجر مس ڈینیل سے درخواست کی کہ وہ اسے اس کے کالج کی اقامت گاہ تک لفٹ دے دے کیونکہ اس کے پاؤں میں موچ سی آگئی ہے۔ وہ مس ڈینیل کو یہ بتانے میں شرمندگی محسوس کررہی تھی کہ اس کے خیال میں کوئی اس کا تعاقب کررہا ہے اور... وہ قاتل ریپسٹ ہوسکتا ہے جسے "کس آف ڈیتھ ریپسٹ" کا نام دیا گیا ہے۔

ایک سیکیورٹی گارڈ ان کا انتظار کررہا تھا جو انہیں مس ڈینیل کی کار تک پہنچانے ساتھ آیا۔ سیلی نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر اسے تاکنے والا اب بھی وہاں موجود ہوا تو وہ سیکیورٹی گارڈ کو اس کے بارے میں ہوشیار کردے گی۔

لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔

اپنی اقامت گاہ بحفاظت پہنچنے کے بعد سیلی کو جب چاروں طرف اپنے شناسا چہرے دکھائی دیے تو اسے خاصا اطمینان ہوگیا۔ سیلی نے خود کو قائل کرلیا کہ یہ سب اس کی خام خیالی تھی اور وہ ..... وہم کا شکار ہوگئی تھی۔ "مجھے تاکنے والا صرف کوئی طالبِ علم ہوسکتا ہے اور یہ محض ایک اتفاق ہے کہ وہ مجھے ایک ہی دن میں کئی دفعہ دکھائی دے گیا۔ اور ہر شخص اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے۔ کیا میں بھی اس وقت یہی نہیں کررہی ہوں؟ خود سے باتیں..."

پھر سیلی ٹیلی وژن دیکھنے بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد اسے نیند آنے لگی اور وہ سونے کے لیے چلی گئی۔

دوسرے دن صبح جب وہ کالج جانے کے لیے اپنے گھر سے باہر نکلی تو اس تاکنے والے کا دور دور تک کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ خود سیلی کو بھی یقین تھا کہ وہ موجود نہیں ہوگا۔ اس نے گزشتہ روز جو کچھ محسوس کیا تھا، وہ اس کی خام خیالی تھی۔

کالج میں جب وہ ایک کلاس سے دوسری کلاس میں گئی تب بھی اسے وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ صبح سے کئی بار پلٹ کر دیکھتی رہی کہ شاید کہیں اس کی جھلک دکھائی دے جائے۔ پھر دوپہر ہونے تک اس نے پلٹ کر دیکھنا بھی چھوڑ دیا اور مطمئن ہوگئی۔

وہ موسمِ بہار کا ایک خوب صورت دن تھا اور وہ مطمئن ہونے کے بعد اس دن سے بھرپور لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔

لنچ میں سیلی اور نینا کی ملاقات طلبا میں مقبول گرنڈ بیچ نامی برگر پوائنٹ پر ہوئی اور سیلی خود ہی اپنے خبط کا مذاق اڑاتے ہوئے بولی۔ "جب آج صبح میں نیند سے بیدار ہوئی اور میں نے اپنے دروازے کے باہر مشتاق مردوں کی قطار نہیں پائی جو میری منتظر ہوتی تھی، میں نے یقین کرلیا کہ اب غالباً میں کسی ریپسٹ کی توجہ سے محفوظ ہوگئی ہوں۔ ویسے وہ تاکو آج مجھے دن بھر کہیں دکھائی نہیں دیا۔"

نینا نے سیلی کے خیالات کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔ "ویل، تم یقینی طور پر ان دیگر لڑکیوں سے مشابہ لگتی ہو۔ یہ ایک بات ہی تمہارے شبہے کو تقویت دیتی ہے۔"

"وہ تصویریں اسٹینڈرڈ ایئر بک ہیڈ شاٹس ہیں۔ یہ اس کیمپس میں موجود سیکڑوں لڑکیوں سے مشابہ ہوسکتی ہیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان تمام لڑکیوں کی قامت، باڈی ٹائپ، چال، گفتگو کا انداز یا لباس ایک ہی اسٹائل کا ہوگا۔ یہ میرے بے ترتیب خیالات بھی ہوسکتے ہیں۔" سیلی نے کہا۔

جب سیلی اپنے کام پر کیمپس کے بک اسٹور پہنچی تو اس تاکنے والے کے ذہنی پیکر کو یکسر فراموش کرچکی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے اپنی ہوشیاری کو خیرباد کہتے ہوئے مس ڈینیل کو سب کچھ بتادیا اور گزشتہ روز کے بہانے کی معافی چاہی۔

پوری بات سننے کے بعد اسٹور منیجر مس ڈینیل کی پیشانی پر بل پڑگئے۔ "میں اس وقت تک روزانہ تمہیں گھر تک چھوڑنے جایا کروں گی جب تک خطرہ ٹل نہیں جاتا۔" اس نے سیلی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اس شام کاروبار مندا تھا اور سیلی کو رجسٹر پر بیٹھنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ سو اس نے کتابوں کو ری اسٹاک کرنے اور فرنٹ ونڈوز پر ڈسپلے کی جھاڑ پونچھ کا ارادہ کرلیا۔

اس نے عقبی کمرے میں سے پروں کا بنا ہوا ڈسٹر اٹھایا اور گنگناتے ہوئے اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

جب اس کا کام تقریباً ختم ہوگیا تو اس کی نگاہ اچانک کھڑکی کے پار باہر کی جانب اٹھ گئی۔

اس کو تاکنے والا سامنے بس اسٹاپ کی ایک بینچ کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔

اس پر نگاہ پڑتے ہی سیلی کے ہاتھ کانپ گئے اور ڈسپلے پر رکھی ہوئی نئی کتابوں کا ڈھیر جو ترتیب سے سجایا گیا تھا، وہ نیچے آرہا۔

سیلی ایک لمحے کے لیے ساکت کھڑی رہ گئی۔ وہ شخص جینز اور ڈینم کی جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ بس اسٹاپ کی بینچ پر وہ اس پوزیشن میں بیٹھا ہوا تھا کہ بک اسٹور میں داخل ہونے اور وہاں سے نکلنے والے ہر فرد پر نظر رکھ سکے۔ اس مرتبہ بھی اس نے اپنا ہیڈ فون لگا رکھا تھا اور اس بار بھی وہ خود سے باتیں کررہا تھا۔

سیلی نے اپنے ذہن کو ایک جھٹکا دیا۔ "تمہارا واہمہ پھر تم پر غالب آرہا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔ "وہ تو شاید بس کا انتظار کررہا ہے اور غالباً میوزک کے ساتھ خود بھی گنگنا رہا ہے۔"

پھر وہ ڈسپلے پر گری ہوئی نئی کتابوں کو دوبارہ سے ترتیب سے سجانے میں مصروف ہوگئی۔

کچھ دیر بعد اسٹور منیجر مس ڈینیل اپنے کمرے سے پرس سنبھالے باہر نکلی اور اپنا کوٹ اٹھاتے ہوئے سیلی سے مخاطب ہوئی۔ "سیلی! گھر پر موجود میرے بچے کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ مجھے فوری طور پر جانا پڑ رہا ہے۔ میں نے سیکیورٹی گارڈ کو طلب کرلیا ہے جو تمہیں بہ حفاظت گھر تک پہنچادے گا۔ آئی ایم سوری۔"

"اوہ، میری فکر مت کریں مس ڈینیل! آپ گھر جاکر اپنے بے بی کو دیکھیں۔" سیلی نے جواب دیا۔

مس ڈینیل کے جانے کے بعد ایک سیکیورٹی گارڈ نے بک اسٹور کے داخلی دروازے کے پاس جگہ سنبھال لی۔ وہ دونوں بازو سینے پر باندھے اور پیر چوڑے کیے کھڑا تھا۔ دیکھنے میں وہ نہ تو زیادہ لمبا اور نہ ہی توانا لگ رہا تھا... لیکن اس کا یونیفارم سیلی کو اپنے تحفظ کا ضامن محسوس ہوا۔

رات کے آٹھ بجتے ہی داخلی دروازہ بند ہوگیا اور سیکیورٹی گارڈ اندر آگیا۔ ابھی سال کے ابتدائی دن تھے اس لیے دن چھوٹے اور راتیں بڑی تھیں۔ باہر گہرا اندھیرا پھیل چکا تھا۔

سیلی ملازمین کے لاؤنج میں چلی گئی اور اپنے لاکر سے اپنا پرس، کتابیں اور جیکٹ نکال کر واپس آگئی۔ جب وہ داخلی دروازے کے پاس پہنچی تو اسے ایک اور سیکیورٹی گارڈ دکھائی دیا جو دروازے کے شیشے کو کھٹکھٹا رہا تھا۔ اندر موجود گارڈ نے دروازہ کھول دیا تو اس نے آنے والے گارڈ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اسے کسی ینگ لیڈی کی ہمراہی کے لیے بھیجا گیا ہے جو یہاں کام کرتی ہے۔

سیلی یہ سن کر آگے بڑھی اور بولی۔ "وہ میں ہوں۔"

یہ سن کر پہلا گارڈ بولا۔ "اسے لازمی ان لڑکیوں میں سے کسی ایک کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے۔" اس نے سر سے ان دو لڑکیوں کی جانب اشارہ کیا جو رجسٹر سے رقم کا حساب کتاب کرنے میں مصروف تھیں۔ "میں آپ ہی کا انتظار کررہا ہوں۔ مجھے آپ کو بہ حفاظت پہنچانے کا کہا گیا ہے۔"

تب سیلی نے اس گارڈ کے سینے پر لگے ہوئے نام کے ٹیگ پر نگاہ ڈالی اور بولی۔ "تھینک یو آفیسر ڈالٹن! میں آپ کو بہت دیر سے یہاں دیکھ رہی ہوں۔ آئی ایم سوری کہ میں نے آپ کو اتنی تکلیف دی۔ لیکن آپ کی رفاقت میرے لیے باعثِ طمانیت ہوگی۔ میں آپ کی مشکور ہوں۔"

پھر وہ گارڈ کے ہمراہ باہر نکل گئی۔

پہلے بلاک کے خاتمے پر سیلی نے اپنے بازو میں تھامی ہوئی کتابوں کو دوسرے بازو پر منتقل کرنا چاہا تو وہ نیچے گر پڑیں۔ کچھ کاغذات بھی فٹ پاتھ پر بکھر گئے۔

وہ اکڑوں بیٹھ کر اپنی کتابیں اور کاغذات سمیٹنے لگی۔ جب وہ کھڑی ہوئی تو اس کو اپنے تاکنے والے کی ایک جھلک دکھائی دی۔ وہ روشنی کے ایک حلقے سے تیزی سے گزرتا ہوا جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں غائب ہوگیا۔ گو سیلی اس کا چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی لیکن اس کے باوجود اسے یقین تھا کہ یہ چھلاوا کوئی اور نہیں بلکہ تاکو ہی تھا۔ سیلی نے اس کا لباس پہچان لیا تھا اور اس کے سر پر ہمیشہ موجود رہنے والا ہیڈ فون تو اس کی شناخت بن چکا تھا۔

تب سیکیورٹی گارڈ ڈالٹن کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ "کیا آپ روزانہ پیدل گھر اسی راستے سے جاتی ہیں؟"

"ہاں، یہ پوائنٹ اے اور پوائنٹ بی کے درمیان مختصر ترین راستہ ہے۔ میں گزشتہ تین سال سے تمام وقت اسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

راستے سے آرہی ہوں اور اس سے پہلے مجھے کبھی خوف محسوس نہیں ہوا۔" سیلی نے گارڈ کو بتایا۔

کچھ دور آگے جانے کے بعد سیلی کو دائیں جانب گھومنا تھا۔ جب وہ اس موڑ پر پہنچی تو سیکیورٹی گارڈ ڈالٹن جو اس سے آگے چل رہا تھا، سیدھا جانے لگا۔

سیلی کو اچانک خوف کی ایک سرد لہر سی محسوس ہوئی جیسے کسی یخ بستہ جھیل کی سرد ہوا نے کمبل کے مانند اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو۔ وہ گارڈ کو پکارتے ہوئے بولی۔ "مجھے لگتا ہے کہ میرا تعاقب کیا جارہا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" سیکیورٹی گارڈ نے جواب دیا۔

سیلی کو اس کا لہجہ کسی پھنکار کی طرح محسوس ہوا۔ وہ ایک لمحے کے لیے سٹپٹا سی گئی۔ "کیا؟"

"ہاں، اپنے اگلے شکار کے لیے میں نے تمہیں منتخب کیا ہے۔" سیکیورٹی گارڈ کا لہجہ زہریلا تھا۔

سیلی نے نگاہ اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ اتنی درشت اور سیاہ تھیں جیسے پالش کیا ہوا پتھر۔

سیلی نے اپنی کتابیں سیکیورٹی گارڈ پر پھینک کر ماریں اور پلٹ کر دوڑنا چاہا لیکن سیکیورٹی گارڈ نے لپک کر اس کے بالوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ساتھ ہی سیلی کو ایک کھٹکے کی آواز سنائی دی۔ پھر ایک چاقو کا پھل روشنی میں چمکنے لگا۔ وہ سیکیورٹی گارڈ سیلی کو دو عمارتوں کے درمیان پتلی سی گلی میں گھسیٹ رہا تھا۔

اچانک سیلی کی آنکھیں تیز روشنی سے خیرہ سی ہوگئیں۔ پھر کسی نے چیختے ہوئے کہا۔ "پولیس! چاقو پھینک دو اور لڑکی کو چھوڑ دو۔"

ڈالٹن کے حلق سے ایک ناگوار چیخ سی بلند ہوئی اور وہ جواب میں بولا۔ "تمہیں میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔ میں اس لڑکی کو نہیں چھوڑوں گا۔"

تب سیلی کو چاقو کی نوک اپنی گردن کی نرم جلد پر چبھتی محسوس ہوئی اور یوں لگا جیسے زخم سے گرم گرم خون رسنے لگا ہو پھر فائر کی آواز گونجی اور ڈالٹن کا جسم لڑکھڑا گیا۔ پھر وہ سیلی کو ساتھ لیتا ہوا زمین پر آرہا۔

جب فائر کرنے والے نے اپنی فلیش لائٹ کا رخ نیچے کی طرف کیا تو سیلی کو سب کچھ صاف دکھائی دینے لگا۔ اسے تاکنے والا اس پر جھکا ہوا تھا اور سرگوشی کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ "وہ قابلِ نفرت شخص مر چکا ہے... اور لڑکی صدمے میں ہے۔ فوراً ایک ایمبولینس بھیج دو۔" پھر اس نے تیزی سے اطراف کا جائزہ لیا اور بولا۔ "ہم میموسا کے شمال میں دو سرخ اینٹوں کی عمارتوں کے درمیان ہیں۔"

پھر سیلی کو تاکنے والے نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ تم ٹھیک ہوجاؤ گی۔"

سیلی کی گردن میں ہلکا سا گھاؤ آیا تھا جسے صاف کر کے اس پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔

سیلی کو ایک ہیرو کا درجہ مل گیا تھا کیونکہ اس نے ایک سیریل قاتل/ریپسٹ کو ٹھکانے لگانے میں پولیس کی مدد کی تھی۔ اسپتال میں پولیس نے اس کا انٹرویو لیا اور اس کا بیان قلم بند کیا۔

لیکن سیلی کو تاکنے والا ان میں کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا اور اس کی بے چین نگاہیں اپنے اطراف موجود چہروں کو ٹٹول رہی تھیں۔

بالآخر ایک بھاری بھرکم عمر رسیدہ باوردی پولیس افسر نے اس کی بے چینی کو بھانپ لیا۔ وہ سیلی سے بولا۔ "وہ ہمارا ایک خفیہ ایجنٹ ہے... ہمارے بہترین ایجنٹوں میں سے ایک اور ہم نہیں چاہتے کہ وہ منظر عام پر آئے اور اس کی شخصیت عیاں ہوجائے۔ اسے علم تھا کہ اس کی وجہ سے تم نروس ہورہی ہو۔ گزشتہ شب جب وہ بک اسٹور کے باہر انتظار کررہا تھا تو اس بارے میں ہماری آپس میں بحث بھی ہوئی تھی۔"

اس بات پر سیلی نے الجھی ہوئی نظروں سے پولیس افسر کی طرف دیکھا تو اس نے وضاحت کی۔

"جو ہیڈ فون وہ پہنے رہتا تھا اس میں ایک ریسیور لگا ہوا تھا تاکہ وہ ہماری بات سن سکے۔ اس کی قمیص کے اندر ایک ٹرانسمیٹر چھپا رہتا تھا جس کی مدد سے ہم اس کی بات سن سکتے تھے۔ اسے علم تھا کہ تم اس پر شبہ کررہی ہو اور اسے یہ ڈر تھا کہ کہیں تم ڈالٹن کو اس کے بارے میں ہوشیار نہ کردو۔"

"میری نگرانی کرنے اور میری زندگی بچانے پر میں اس کا ذاتی طور پر شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔" سیلی نے ممنون لہجے میں کہا۔

"اوہ، اس کی میرے خیال میں کوئی ضرورت نہیں۔" پولیس افسر نے کہا۔

"وہ کیوں؟" سیلی نے پوچھا۔

"اس نے کبھی بھی تمہارا تعاقب نہیں کیا۔ وہ تو ڈالٹن کی نگرانی پر مامور تھا اور ہمیشہ اسی کا پیچھا کیا کرتا تھا۔" پولیس افسر نے بتایا۔ "تمہارا خدشہ بے جا تھا کہ وہ تمہیں تاکتا رہتا ہے۔"

سیلی ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔

مغربی ہواؤں کا ایک خیال آفریں جھونکا

شکستِ منطق

سیریناراض

خیالات اور سوچوں کی بے پراڑان بھرنے کے لیے کوئی خاص تگ ودو نہیں کرنی پڑتی... اس منفرداور نرالی دنیا کی نہ ہی کوئی سرحد ہوتی ہے... جہاں اور جب تک چاہیں پرواز کرتے رہیں... ایسی ہی ایک دلچسپ اور باتونی لڑکی کی شوخیاں... جس کا ہردن ایک نئی بات سے شروع ہوتا تھا... اور اپنی منطق ثابت کرنے کے لیے اس کے پاس ہر رفعہ کوئی انوکھی اور منفرد دلیل حاضر رہتی تھی...

اس کیس کی روداد جس کے انجام کی ڈور خیال کی کاوش سے بندھی تھی

"ایسی لگ رہی ہے جیسے فریزر میں جمی سبزیوں کے درمیان قاشوں میں کٹی گاجر۔ مسٹر وگ نے اُس پر یہ تبصرہ کیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ دوسرے درجے کی رقاصہ ہے۔" ایشلے یہ کہہ کر سانس لینے کو رکی۔ اس وقت وہ بھری کلاس میں اپنے ساتھیوں میں گھری ڈیسک پر بیٹھی، انہیں پچھلے ویک اینڈ پر نائٹ کلب میں ہونے والے ڈانس کی تفصیل بتا رہی تھی۔ جہاں وہ اس کے بقول مسٹر وگ کے ساتھ پہلی بار گئی تھی۔ مسٹر وگ اس کے نئے مگر بوڑھے دوست کا نام تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کا نام وِگ نہیں تھا، وہ ویبر بھی ہوسکتا تھا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جمعے کے دن ایشلے نے بھری کلاس میں پورے ہوش وحواس سے یہ بات کہی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کا نام وِگ ہی ہو۔ یہ بات غیر اہم ہے کہ اس کا اصل نام کیا تھا۔ ایشلے کا کہنا تھا کہ وہ شخص بڑی عمر کا تھا۔ اس کی رنگت کسی لاش کی طرف زردی مائل تھی اور اس کے ماتھے پر ملگجے بالوں کی ایک لٹ پڑی ہوئی تھی۔ ''مگر تھا زندہ دل۔'' یہ اس کی شخصیت کے بارے میں ایشلے کا بے لاگ تجزیہ تھا۔ ایشلے کے بقول اسے دیکھ کر ایسی گھن آئی جیسے کسی نے اچھی خاصی کھانے کی چیز پر بری طرح کیچپ لتھیڑ دیا ہو اور اب مکھیاں اس پر بھنبھنانے کے لیے آرہی ہوں۔ ''مگر پھر بھی اس کی اسپورٹس کار بہت دلکش تھی کسی نازک اندام حسینہ کی طرح جس پر لڑکے بری طرح مر مٹتے ہیں۔''

ایشلے پوری کلاس میں واحد لڑکی تھی جو ہر بات کے متعلق پہلے سے اندازہ لگانے کی عادی تھی۔ اس کے بعد اس کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ کسی بھی چیز یا شخص کے بارے اس نے پیش بینی کرتے ہوئے جو رائے قائم کی ہے، وہ درست ثابت ہو۔ اس لیے جب وہ ایک ایسی پارٹی کا قصہ سنانے لگی جس میں مسٹر وِگ شامل تھے اور وہاں ایک رقاصہ نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا، تو سنا سب نے مگر کسی نے اس کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ ایشلے کو منطقی انداز میں جھوٹے سچ گھڑ کر سنانے کی عادت تھی۔ سارے دوست اب اس کی عادت سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ ہر بات میں ایشلے کی اپنی ہی نرالی منطق موجود ہوتی، البتہ منفرد ضرور ہوتی تھی۔

اسے ہر بات میں اختراعیں کرنے کی عادت تھی۔ ایک روز کلاس میں ریاضی کا مضمون پڑھایا جارہا تھا۔ جب اس کی باری آئی تو اسے فارمولا یاد نہیں تھا۔ بس پھر کیا تھا، اس نے اپنی غلطی ماننے کے بجائے نئی منطق بیان کرنا شروع کردی۔ وہ کہنے لگی ''لڑکی کا دماغ ریاضی کے بڑے بڑے فامولے ذہن نشین کرنے کے قابل نہیں ہے۔ یہ دماغ کی ساخت کا مسئلہ ہے، اُس کا نہیں۔ جب لڑکی کا دماغ ہی یہ صلاحیت نہیں رکھتا تو وہ کس طرح اتنا مشکل فارمولا یاد رکھ سکتی ہے۔'' اس نے بڑی سنجیدگی سے دلیل دی۔ پوری کلاس بشمول ٹیچر نے نہایت خاموشی سے اس کی بکواس سنی، اس کے بعد بھری کلاس میں زوردار قہقہہ ابل پڑا۔

''احمق ہے؟'' خود اس کی ساتھی ایملی نے نعرہ لگایا۔

''تم لڑکی ہو؟'' کلاس ٹیچر نے اس سے سوال کیا۔

''سو فیصد۔''

''تو پھر بیگ اٹھاؤ اور کلاس سے باہر چلتی پھرتی نظر آؤ۔'' انہوں نے انگلی سے اشارہ کیا۔ ''جب لڑکی کا دماغ ریاضی کے فارمولوں کو سمجھ نہیں سکتا تو پھر وہ ریاضی کی کلاس کیوں اٹینڈ کرتی ہے۔''

ایشلے نے کتابیں بیگ میں ٹھونسیں، اسے پیٹھ پر لٹکایا اور چوئنگم چباتی ہوئی یہ جا اور وہ جا۔

''کلاس میں کوئی اور لڑکی ہے تو وہ بھی جاسکتی ہے؟'' اس کے باہر نکلتے ہی ٹیچر نے کہا۔

''نہیں ٹیچر!'' وہاں موجود ساری لڑکیوں نے بیک وقت جواب دیا۔

''شاباش...'' انہوں نے ستائشی نظروں سے سب کو دیکھا۔ ''چلو ہم آگے پڑھتے ہیں۔''

وہاں اس وقت آٹھ دس لڑکیاں تھیں مگر ریاضی کی کلاس میں ایشلے کی منفرد منطق نے مجبور کردیا کہ وہ اپنے لڑکی ہونے سے انکار کردیں۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ وہ کئی بار اپنی نرالی منطقیں پیش کرکے کلاس سے باہر ہوچکی تھی۔ اِک روز بائیولوجی کا پیریڈ تھا۔

''انسانی جسم کا نظام کیسے کام کرتا ہے، یہ جاننے کے لیے اس ڈمی کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔'' ٹیچر کہا اور پھر سب کی طرف دیکھا۔ ان کی نظریں اس پر جم گئیں۔ ''ہاں تو ایشلے تم بتاؤ۔''

''بتا تو دوں مگر مجھے افسوس ہے۔'' ایشلے نے کھڑے ہو کر جواب دینا شروع ہی کیا تھا کہ ٹیچر نے بات کاٹ دی۔

''کس بات کا؟''

''بک شاپس پر، لائبریری میں ایسی کئی کتابیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ انسانی جسم کی ڈمی کو سمجھو۔''

''یہ تو ہے۔'' ٹیچر نے قطع کلامی کی۔ ''اس سے مضمون کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔''

''افسوس اسی بات کا تو ہے۔'' ایشلے نے بات آگے بڑھائی۔ سب سنجیدگی سے اس کی بات سن رہے تھے۔ ''ڈمی کو سمجھنے کے لیے بے شمار کتابیں لکھ دی گئی ہیں، سیکڑوں تحقیق ہوچکی مگر اب تک ایک بھی ایسی کتاب میری نظر سے نہیں گزری جو اس بارے میں ہو کہ آؤ لڑکی کو سمجھو۔''

اس جواب کے بعد کیا کچھ ہوا، یہ بتانے کی ضرورت نہیں خود سمجھ جانا چاہیے۔ ایشلے کی ہر منطق بلاشبہ نئی اور انوکھی ہوتی تھی مگر اس کا انجام ہر بار ایک ہی جیسا ہوتا تھا۔ اس مرتبہ بھی اس کی منطق کا انجام ریاضی کی کلاس جیسا ہی ہوا مگر وہ اپنی یہ عادت بدلنے والی نہیں تھی۔

☆☆☆

جب گھنٹی بجی تو فون ایشلے کی ماں مسز میری کولن نے اٹھایا۔ اس کا باپ شہر کے دوسرے باوقار نظر آنے کی کوشش کرنے والے کھوکھلے مردوں کی طرح ویک اینڈ پر فون اٹینڈ کرنا اپنی توہین سمجھتا تھا، حالانکہ اس وقت فون اس کے زیادہ قریب تھا مگر عمر کی چوتھی دہائی میں موجود اس وکیل کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ عام لوگوں کی طرح لپک کر خود فون اٹھائے، وہ بھی ویک اینڈ پر۔ اس وقت وہ لوگ ناشتے کی میز پر تھے۔ مسز میری فون پر بات کررہی تھی کہ اسی دوران میں ایشلے بھی وہاں پہنچ گئی۔ دونوں باپ بیٹی حسبِ عادت اندازہ لگا رہے تھے کہ دوسری طرف کون ہوسکتا ہے۔

فون لیفٹیننٹ ڈوئل نے کیا تھا۔ وہ بتارہا تھا کہ ہائی وے پر ایک لاش ملی ہے جس کے سینے میں دو گولیاں مار کر قتل کیا گیا تھا۔ ''آپ کو فوراً پہنچنا ہوگا۔'' وہ اس سے درخواست کررہا تھا۔ ڈوئل پولیس ڈپارٹمنٹ میں پبلک سیفٹی کے امور کا انچارج تھا اور اس وقت جائے حادثے پر تھا۔

''ٹھیک ہے، پتا لکھواؤ۔'' اس نے رائٹنگ پیڈ کھینچ کر سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''کوشش کرتی ہوں کہ اگلے تیس منٹ میں پہنچ جاؤں۔'' اس نے پتا لکھنے کے بعد کہا اور فون رکھ کر نوٹ بک آگے کھسکا دی، جسے مسٹر کولن نے اُچک لیا اور اُس پر لکھے ہوئے نوٹس پڑھنے لگا۔ گفتگو کے دوران وہ سارا واقعہ نوٹ کرتی جارہی تھی۔

''آرچر اسمتھ؟'' مسٹر کولن نے سوالیہ نگاہوں سے وہ نوٹس دیکھنے کے بعد خود کلامی کی۔ ''پرلے درجے کا بدمعاش، لچا، لفنگا ہے یہ شخص اگر وہی ہے تو۔ میں ایک بار پہلے بھی یہ نام سن چکا ہوں۔''

''یہ بدمعاش نہیں، اس وقت ایک مقتول ہے۔'' مسز میری نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ''وہ کینیڈا کا ایک ڈرائیور ہے۔ گولیاں اس کے سینے پر آر پار ہوئی ہیں۔'' سب ناشتا کرچکے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی برتن سمیٹتے ہوئے شوہر کی تصحیح کی۔

''مما میں آپ کی مدد کے لیے آؤں؟'' ایشلے نے اسے برتن سنک میں رکھتے دیکھ کر کہا۔

''بالکل نہیں سویٹی، بھول گئیں تم کہ یونانی ہو اور اعلیٰ نسل کے یونانی لوگ چھوٹے کام نہیں کرتے۔'' انہوں نے بڑے پیار سے مگر کاٹ دار لہجے میں کاہل بیٹی پر طنز کیا۔

اگرچہ میری امریکن تھی مگر اس کے شوہر کولن الیگزینڈر کا تعلق یونان سے تھا اور باپ کی نسبت سے ایشلے کو اپنے یونانی النسل ہونے پر بہت فخر تھا۔ اس کے بار بار اصرار پر والدین نے اسے روایت پسند سخت گیر چرچ کے تحت چلنے والے ایک اسکول میں داخل کروادیا تھا جہاں جدید یونانی زبان وادب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ روایت پسند چرچ کا اسکول بھی ڈسپلن کے معاملے میں سخت گیر اصولوں پر کاربند تھا۔ ایشلے کی عمر اتنی تھی کہ اسے اسکول کے قواعد وضوابط کی سختی سے پابندی کرنا تھی۔

ہفتے کا دن تھا۔ ایشلے کی ہفتہ وار کلاس تھی۔ ویسے تو مسز میری اسے چھوڑ کر شاپنگ کے لیے جانے کا تہیہ کرکے بیٹھی تھی لیکن لیفٹیننٹ ڈوئل کے فون نے معاملہ بگاڑ دیا۔ اب اسے پہلے جائے وقوع پر پہنچنا تھا۔ وہ گاڑی چلاتے ہوئے ایشلے کو سبق بھی یاد کروانی جارہی تھی۔

کولن الیگزینڈر فیملی کینیڈا، امریکا کی سرحد کے قریب ایک چھوٹے سے شہر میں رہتے تھے۔ ان کے گھر سے کچھ فاصلے پر ہائی وے گزرتا تھا جہاں سے کینیڈا کو جانے اور وہاں سے امریکا آنے والے مال بردار ٹریلر دن رات گزرا کرتے تھے۔

میری ڈسٹرکٹ کے پولیس ڈپارٹمنٹ میں بطور سینئر سراغرساں کام کرتی تھی۔ ویسے تو آج چھٹی تھی مگر مجرم چھٹی پر نہیں تھا۔ ایشلے کو اسکول چھوڑ کر وہ اس کے مخالف سمت جانے والے راستے پر آگے بڑھی۔ اس وقت شدید سردی تھی۔ سرد ہوا چل رہی تھی اور سڑک پر جگہ جگہ برف کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ وہ نہایت محتاط انداز میں ڈرائیونگ کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔۔۔ اس کا رخ ہائی وے پر واقع ہارڈ ویئر مارکیٹ کی طرف تھا۔ جہاں کئی موٹیل بھی بنے ہوئے تھے۔ یہ سب موٹیل زیادہ تر ڈرائیوروں کے زیرِ استعمال تھے۔

ابھی وہ ڈوئل کے لکھوائے ہوئے پتے سے کچھ دور تھی کہ اسے لوگوں کا ایک چھوٹا سا ہجوم نظر آیا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہی جائے وقوع ہے۔ وہ تھوڑا ہی آگے بڑھی تھی کہ اسے پولیس کا وہ زرد ٹیپ نظر آگیا جو جائے وقوع کے گرد باندھ کر کرائم سین کو تفتیش کے لیے محفوظ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ میری نے اس ہجوم کے قریب پہنچ کر گاڑی روکی اور احتیاط سے کار پارک کرکے باہر نکل آئی۔

''گڈ مارننگ میری۔'' گاڑی سے اترتے ہی سامنے ڈوئل نظر آگیا۔

وہ جواب دیے بغیر آگے بڑھی اور جھک کے ٹیپ کے نیچے سے گزری۔ اب وہ جائے وقوع پر موجود تھی۔ اس کی چوکنی نظریں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ وہ اس جگہ کو ذہن نشین کرنا چاہ رہی تھی۔

یہ علاقہ ایک بڑی مارکیٹ کے قریب واقع تھا جہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچرا ڈالنے کے لیے بڑے بڑے ڈرم رکھے ہوئے تھے۔ آج صبح انہی میں سے ایک ڈرم کے قریب سے لاش ملی تھی۔ پولیس کو یہ اطلاع کچرا اٹھانے والے ایک ٹریلر کے عملے نے دی تھی، جس کے فوراً بعد ڈیوٹی پر موجود لیفٹیننٹ ڈوئل کچھ پولیس والوں کو لے کر جائے وقوع پر پہنچ گیا۔ مرنے والا ایش گرے رنگ کی جینز، چمڑے کی سیاہ جیکٹ اور نیوی بلیو ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ دیکھنے میں وہ چالیس کے قریب کا لگتا تھا۔ اس کے سینے پر گولیوں کے دو نشانات تھے۔ یہی گولیاں بظاہر موت کا سبب بنی تھیں۔ ایمبولینس پہنچ چکی تھی مگر لاش اب تک جائے وقوع پر موجود تھی۔ ڈوئل سمجھتا تھا کہ جب تک میری اس کا معائنہ نہ کرلے، تب تک اسے اٹھانا مناسب نہیں تھا۔ وہ ہاتھوں میں سفید دستانے پہنے باریک بینی سے لاش کا معائنہ کررہی تھی۔

”کچھ ملا اِدھر سے؟“ اس نے نگاہیں لاش پر مرکوز کیے ہوئے پوچھا۔

”یہ بٹوا ملا ہے۔“ ڈوئل نے پلاسٹک کی ایک تھیلی آگے بڑھائی، جس میں ایک بٹوا موجود تھا۔ یہ سن کر میری نے سر اٹھایا اور اسے دیکھنے لگی۔

”اس میں سے سارا کیش غائب تھا اور یہ یہاں پڑا ہوا تھا۔“ ڈوئل نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”البتہ رقم کے علاوہ اس میں رکھی ہوئی باقی چیزیں موجود ہیں۔“ اس نے تفصیل بتائی۔ زمین پر جہاں بٹوا پڑا ہوا ملا تھا، وہاں سفید چاک سے بنا دائرہ نظر آرہا تھا۔

”باقی چیزیں؟“ میری نے استفساریہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”ڈرائیونگ لائسنس۔“ لیفٹیننٹ ڈوئل نے فوراً جواب دیا۔ بٹوے میں موجود باقی چیزیں صرف ایک ڈرائیونگ لائسنس پر محیط تھیں۔ جو ونی پیگ ریاست سے آرچر اسمتھ کے نام پر جاری ہوا تھا۔

”لاش اٹھواؤ۔“ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ڈوئل نے اشارہ کیا اور ایمبولینس کا عملہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

”ہیلو میری۔“ اسی دوران میں راجر وائن تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ ”مجھے کچھ ثبوت ملے ہیں لاش کے کپڑوں سے۔“ اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں اور سرد ترین ہوا میں اس کی گرم گرم سانسیں بھاپ کی لکیر کی طرح فضا میں تحلیل ہورہی تھیں۔

”کیا ملا ہے؟“ میری نے پوچھا۔

”اس کی پتلون کی جیب سے پلاسٹک کی ایک تھیلی ملی ہے، جس میں ایک پین، چابیاں، مٹھی بھر سکے، تین ڈالر اور دو پرانی رسیدیں تھیں۔“ یہ کہہ کر وہ سانس لینے کو رکا۔ ”میں نے ان سب چیزوں کی تفصیلی تصویریں بنالی ہیں۔“ راجر پولیس ڈپارٹمنٹ میں ثبوت جمع کرنے والے شعبے میں ٹیکنیشن تھا۔ وہ ڈوئل کے ساتھ ہی جائے وقوع پر پہنچا تھا۔

میری نے راجر کی بات سن کر کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے دستانے اتار کر ایک ڈرم میں پھینکے اور پنجوں پہ کھڑی ہوکر قدِ آدم کچرے کے ڈرم میں جھانکنے لگی۔ لاش اسی ڈرم کے قریب سے ملی تھی۔ زمین پر پڑا ہوا خون جم کر سیاہی مائل ہوچکا تھا۔ ”میرا خیال ہے کہ اسے کل رات قتل کیا گیا ہے۔“ اس نے ڈوئل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”سامنے اتنی بڑی مارکیٹ ہے۔ لوگ رات گئے تک یہاں ہوتے ہوں گے۔ اسی لیے یہ واردات مارکیٹ بند ہونے کے بعد کی گئی ہوگی۔“ میری نے جس مارکیٹ کی بات کی تھی وہ علاقے میں ہارڈ ویئر کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ”ویسے یہ مارکیٹ کب بند ہوتی ہے، پتا کیا تھا؟“

”رات نو بجے۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔ ”ہوسکتا ہے کہ تمہارا خیال درست ہو۔ اسے مارکیٹ بند ہونے کے بعد قتل کیا گیا ہو۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”تم نے اِردگرد کے لوگوں سے بات چیت کی ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”مختصر سی۔“ ڈوئل نے جواب دیا۔ ”جن لوگوں سے بات چیت کی ہے، اُن کا کہنا ہے کہ اس شخص کو انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔ ”آپ چاہیں تو مارکیٹ منیجر سے بات کرلیں، شاید وہ کچھ بہتر بتا سکے۔“

”تم نے کیوں نہیں کی اس سے بات؟“ میری کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”وہ اس وقت موجود نہیں تھا۔“ ڈوئل نے فوراً جواب دیا۔

”اوکے۔“ یہ کہہ کر اس نے پلاسٹک کی تھیلی اس کے ہاتھ سے لی اور بٹوا نکال کر اس کا اندر سے جائزہ لینے لگی۔ ”اس میں بھی ایسا کچھ نہیں ہے جس سے اس کے گھر یا فیملی کا پتا چل سکے؟“ اس نے تھیلی ڈوئل کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”کیا اس کا ٹریلر وہاں کھڑا ہے؟“ اس نے پارکنگ لاٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ وہاں کافی لوگ کھڑے تھے۔

”اگر اس نے ٹریلر وہاں کھڑا کیا تھا تو ضرور ہوگا۔“ ڈوئل نے جواب دیا۔ ”مگر ہم اب تک اسے تلاش نہیں کر پائے ہیں۔“

یہ سن کر میری نے پھر پارکنگ کی طرف دیکھا۔ وہاں درجنوں چھوٹے بڑے ٹریلر پارک تھے۔

”ویسے وہاں کینیڈا کی نمبر پلیٹ کا کوئی ٹریلر موجود نہیں ہے۔“ ٹیکنیشن راجر نے مداخلت کی۔ ”میں وہاں جاکر کم از کم یہ بات تو چیک کرچکا ہوں۔“

”گولیوں کے خول ملے؟“ اس نے ایک بار پھر کچرے کے ڈرم کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔“ ڈوئل نے سادگی سے جواب دیا۔ ”وہاں خالی نٹ بولٹ اور دوسرا کاٹھ کباڑ اتنا پڑا ہوا ہے کہ تلاش کے باوجود خول نہیں مل سکے۔“

”تلاش اسی کا نام ہے۔“ میری نے طنز کیا۔ ”خیر... میرا خیال ہے کہ یہ مسلح ڈکیتی کی واردات کا نتیجہ ہے۔ مرنے والے کو خود پر بھروسا ہوگا، مزاحمت کی ہوگی مگر اگلے کا پستول پر بھروسا زیادہ تھا، کامیاب ہوگیا۔“ میری خود کلامی کررہی تھی۔ ڈوئل اور راجر غور سے اس کی بات سننے اور سمجھنے کی کوشش کررہے تھے۔

”ممکن ہے کہ وہ اس کا ٹریلر ہی لوٹ کر لے گئے ہوں۔“ وہ چپ ہوئی تو ڈوئل نے نکتہ اٹھایا۔ ”ان چابیوں میں مجھے کوئی ایسی چابی نظر نہیں آئی جو ٹریلر کی ہوسکتی ہے، البتہ لائسنس ہیوی وہیکل کا ہے۔“

”اسی بنا پر کہہ رہی ہوں کہ وہ ٹریلر ڈرائیور تھا اور اس کا ٹریلر بھی یہیں کہیں ہوگا۔“ اس نے چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے کہا۔ یہ کہہ کر اس نے آگے بڑھتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“ ڈوئل اور راجر اس کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ وہ مارکیٹ منیجر سے ملنے جارہی تھی۔

”جی میں ہی ہوں اس مارکیٹ کا منیجر۔“ ڈوئل اس کے دفتر کا پتا کرچکا تھا۔ وہ اسے لے کر سیدھا وہیں پہنچا۔ ”جان وینگرو۔“ موٹے بھدے جان نے بتیسی نکالتے ہوئے میری کی طرف ہاتھ بڑھائے مگر وہ پشت پر دونوں ہاتھ باندھے سیدھی کھڑی رہی۔ توتے کی چونچ والے جان نے خفت سے مسکراتے ہوئے ہاتھ پیچھے کرلیا۔

میری نے راجر کو اشارہ کیا، اس نے ڈیجیٹل کیمرے سے لی گئی لاش کی تصویر اسکرین پر کرکے کیمرا جان کی طرف بڑھایا۔ ”تم اس شخص کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“ میری نے پوچھا۔

جان مرنے والے کا کلوز اپ میں لیا گیا چہرہ پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ ”نہیں...“ چند لمحوں کے بعد اس نے چہرہ اوپر اٹھایا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”صبح جب میں یہاں آیا تو دکانیں کھل رہی تھیں۔ باہر پارکنگ کے سامنے پولیس کھڑی تھی، لوگوں کا مجمع تھا۔ انہی سے پتا چلا کہ کسی کو قتل کرکے لاش وہاں پھینک دی گئی ہے۔ میں لاش دیکھنے نہیں گیا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے رکا۔ ”پہلی بار اسے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں۔ اس نے دوٹوک انداز میں کہا جیسے کہ اب یہ ملاقات ختم۔ ”ویسے آج کل لوگوں کو بھی نہ جانے کیا ہوگیا ہے، جہاں چاہیں کچرا ڈال دیتے ہیں۔ اٹھانے کے لیے پیسے ہمیں دینے پڑتے ہیں۔“

”کم از کم اس کچرے کو صاف کرنے کے لیے تمہیں اپنے پلّے سے کچھ نہیں دینا پڑے گا... شکریہ۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دفتر سے باہر نکل آئی۔

”تم یہ سارے ثبوت لے کر پولیس اسٹیشن چلو، وہیں چل کر اسے دیکھتے ہیں تفصیل سے۔“ اس نے ڈوئل کو ہدایت کی اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ ایشلے کو واپس لینے کے لیے ابھی اس کے پاس اتنا وقت باقی بچا تھا کہ وہ ان دونوں کے ساتھ کہیں بیٹھ کر ایک کپ کافی پی سکے۔

☆☆☆

میری نے سینٹ گریگوری چرچ اسکول کے سامنے گاڑی روکی تو ایشلے باہر کھڑی تھی۔ ”راجر وہاں تھا؟“ اس نے کار کی پچھلی نشست پر بیٹھتے ہی پہلا سوال کیا۔ راجر کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے جس نے اسے بدنما بنادیا تھا۔ اس کی پیشہ ورانہ لحاظ سے کوئی خاص اہمیت بھی نہیں تھی مگر ایشلے کو اس میں بڑی دلچسپی تھی۔ سچ پوچھو تو میری خود اس میں مقناطیسی کشش محسوس کرتی تھی لیکن کسی کو کانوں کان بھی اس بات کی خبر نہیں تھی۔ وہ سخت احتیاط پسند تھی مگر ایشلے اس معاملے میں ماں پر نہیں گئی تھی۔ ویسے بھی ایشلے کو بڑی عمر کے مرد پُرکشش لگتے تھے۔

واپسی پر سارے راستے میری کولن اُس قتل کی واردات کے بارے میں غور کرتی رہی۔ وہ کینیڈا سے ملنے والے سرحدی علاقے میں مقامی امریکی پولیس ڈپارٹمنٹ کی سینئر سراغرساں تھی۔ اسے ہی کیس کی ساری رپورٹ لکھنی تھی۔ گھر لوٹتے ہوئے وہ اپنے ذہن میں رپورٹ کا مکمل خاکہ بنا چکی تھی۔ جب وہ بیٹی کو لے کر گھر پہنچی تو لنچ کا وقت ہوچکا تھا۔

گھر پہنچی تو مسٹر کولن الیگزینڈر اسٹڈی میں تھے۔ اس نے لنچ کیا اور ایشلے کو گھر پر ہی چھوڑ کر فراتزک کلب کی میٹنگ میں چلی گئی۔ یہ رسمی کارروائی تھی۔ کچھ لوگ مشروبات سے لطف اندوز ہورہے تھے، کچھ ٹی وی پر بیس بال کا میچ دیکھ رہے تھے۔ یہ سول سوسائٹی اور پولیس کے اشتراک سے قائم کلب تھا مگر اس ماہانہ میٹنگ میں شریک ہوتے ہی وہ سمجھ گئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی کہ صرف وقت ہی ضائع ہوگا۔ وہ اب بھی واردات کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔

وہ میٹنگ میں ہی تھی کہ اسے لیفٹیننٹ ڈوئل کا فون ملا۔ ”کچھ پیشرفت ہوئی ہے آرچر اسمتھ قتل کیس میں۔“ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

”کیا ہوا ہے؟“ میری نے اشتیاق سے پوچھا۔

”تم دفتر پہنچو تو تفصیل سے بتاتا ہوں۔“

”نہیں، ابھی بتاؤ۔“ میری نے حکم دیا۔

”جہاں سے لاش ملی ہے، اُس سے لگ بھگ ایک میل دور ہائی وے پر پولیس کی موبائل کار کو ایک ٹریلر لاوارث ۔اِ۔ مل کھڑا ملا تھا۔“ ڈوئل نے بتانا شروع کیا۔ ”انہوں نے ہمیں مطّلع کیا۔ یہ ٹریلر دراصل کاریں لانے، لے جانے والا کیریئر ہے، جس پر کینیڈا کی نمبر پلیٹ ہے۔ اس میں آٹھ گاڑیاں لوڈ کرنے کی گنجائش ہے مگر اس پر صرف ایک کار لدی ہوئی تھی۔ میں نے ٹریلر کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ٹریلر اسمتھ کا ہی ہے اور اندر سے ملنے والی چیزوں سے بھی اس خیال کو تقویت ملتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا

”مثلاً...؟“ میری نے سوال کیا۔

”پیپرز وغیرہ۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”سب اس کے ناپ کے ہی لگتے ہیں۔“

”گاڑی کے اندر یا باہر خون کا کوئی نشان ملا ہے؟“ میری نے فوراً پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے کہ ایسے کوئی آثار ملے ہیں کہ جس سے محسوس ہو کہ وہاں ڈکیتی کی واردات ہوئی تھی۔“

”نہیں۔“ اس نے فوراً کہا۔ ”ٹریلر ہمارے قبضے میں ہے اور کارپورل گراؤنڈ میں کھڑا ہے۔ راجر اس کا تفصیلی معائنہ کر رہا ہے۔ بہتر ہے کہ آپ خود آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔“

”یقیناً۔“ میری نے جواب دیا۔ ”تم کوشش کرو کہ اس کمپنی سے رابطہ ہو جائے، جس کا وہ ٹریلر ہے۔“

”کوشش کی تھی مگر بات نہیں ہو سکی۔“ ڈوئل نے فوراً جواب دیا۔ ”کوئی فون ہی نہیں اٹھا رہا۔ آج ہفتہ ہے۔ وہاں چھٹی ہوگی البتہ میں نے آنسرنگ مشین پر پیغام ریکارڈ کروا دیا ہے۔ ٹریلر کا نمبر اور ڈرائیور کا نام بھی نوٹ کروا دیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور اچانک جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ ”سنو میری...“ اس نے جلدی سے کہا جیسے اسے ڈر ہو کہ وہ فون بند کرنے والی ہے۔

”کہو، کیا بات ہے؟“

”یہاں شہر میں دو کار ڈیلروں سے بات ہوئی ہے۔ کل اسمتھ نے ان دونوں کو دو، دو نئی کاروں کی ڈلیوری دی تھی۔ یہ کاریں کینیڈا سے لوڈ کر کے لائی گئی تھیں۔“

”مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ اس ٹریلر کی گنجائش آٹھ کاروں کے لیے ہے۔“ یہ سنتے ہی میری نے سوال کر دیا۔

”جی ہاں، مگر اس پر صرف ایک کار کے سوا کوئی اور گاڑی نہیں ہے۔“ ڈوئل نے جواب دیا۔ ”میں نے جن دو کار ڈیلروں سے بات کی ہے وہ بھی کہتے ہیں کہ انہیں یاد نہیں کل ڈلیوری لیتے وقت انہوں نے یہ سرخ کار اس ٹریلر پر دیکھی تھی۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا مگر جب میری کچھ نہ بولی تو کہنے لگا۔ ”کوئی اور بات...“

”نہیں۔“ یہ کہہ کر میری نے فون کر دیا۔ ”تھوڑی دیر میں نکلتی ہوں یہاں سے۔“ فون ہینڈ بیگ میں رکھتے ہوئے اس نے خود کلامی کی۔

☆☆☆

وہ سرخ رنگ کی اسپورٹس کار تھی۔ کتاب میں چھپی اس تصویر پر چار سالہ ایشلے کی جیسے ہی نظر پڑی، وہ مبہوت ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ ”میں شرط لگاتی ہو کہ یہ منی سوٹا کے اسپورٹس مین پولیس والے کی گاڑی ہے، جس کی نمبر پلیٹ ایکس پی 94 ہے۔“ میری نے گرمجوشی سے کہا مگر وہ بچی کار دیکھنے میں منہمک تھی۔

یہ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت ایشلے بہت چھوٹی تھی اور میری کھیل ہی کھیل میں اس کی ذہانت بڑھانے کے لیے کوشش کیا کرتی تھی۔ میری کے ساتھی بھی یہ بات جانتے تھے۔ وہ اکثر اسے پولیس اسٹیشن لے آتی تھی اور جیسے ہی کچھ فارغ وقت ملتا بچی کو ذہنی مشق کروانے لگتی۔ میری کا کہنا تھا کہ اس طرح بچوں کا شعور پختہ ہوتا ہے اور وہ اچھے برے کی تمیز سیکھتے ہیں۔ یوں اُن کی ذہانت کا معیار بھی بڑھتا ہے۔ اس کے کئی ساتھی اس دلیل سے متفق نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بچے کو اسکول جانے سے پہلے از خود چیزوں کو سمجھنے کے لیے کھلا چھوڑ دینا چاہیے مگر میری یہ ماننے کو تیار نہیں تھی۔

اُس وقت بھی جب وہ اپنے بیڈروم میں بیٹھی کتاب میں سرخ رنگ کی بڑی سی اسپورٹس کار کی تصویر اس کے سامنے کھول کر بیٹھی تھی تو ایشلے اس کی بات پر دھیان دینے کے بجائے سرخ رنگ کی کشش میں کھوئی ہوئی تھی۔ میری نے اس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی مگر وہ بدستور تصویر میں منہمک رہی۔

”یہ میری کار ہے۔“ اس نے لپک کر کتاب اٹھائی اور

سینے سے چمٹالی۔ ”یہ پولیس مین کی نہیں، ایشلے کی کار ہے۔“ وہ لہک لہک کر ماں سے کہہ رہی تھی۔ میری نے ڈوئل کو بھی یہ قصہ سنایا۔

یہ قصہ میری کو اُس وقت ایک بار پھر یاد آ گیا، جب وہ پولیس اسٹیشن میں آرچر اسمتھ کیس کی تفتیش کے لیے پہنچی۔ تحویل میں لیا گیا ٹریلر کارپورل پریڈ گراؤنڈ میں کھڑا تھا۔ اس پر لدی ہوئی جس کار کی بات ڈوئل نے اسے فون پر بتائی تھی، وہ دراصل سرخ رنگ کی جدید ماڈل کی اسپورٹس کار تھی۔ اس پر منی سوٹا ریاست کی نمبر پلیٹ تھی اور اتفاق سے اس کا نمبر ایکس پی 94 تھا۔

”حیرت انگیز۔“ راجر نے اس کار کی مختلف زاویوں سے تصویریں بنالی تھیں۔ ان تصویروں کو دیکھنے کے بعد میری نے حیرت سے کہا۔ اسے برسوں پرانی بات یاد آ گئی تھی۔ اس نے بے خیالی میں جو کچھ کہا تھا، یہاں سب کچھ ویسا ہی تھا۔ گاڑی کی نمبر پلیٹ بالکل وہی تھی۔

”یہ گاڑی دیکھ کر مجھے بھی کچھ حیرت ہو رہی ہے۔“ میری کو خاموش دیکھ کر ڈوئل نے کہنا شروع کیا۔ ”میرا گھر ہائی وے کے ساتھ اس موڑ پر ہے جہاں سے گاڑیاں شہر میں داخل ہوتی ہیں۔ میرے گھر کے سامنے ٹریفک سگنل لگا ہوا۔ جمعے کو میری چھٹی ہوتی ہے اور میں گھنٹوں کھڑکی کے سامنے بیٹھا رہتا ہوں۔ مجھے حیرت ہے کہ میں نے کئی بار جمعے کو ایک کار کیریئر ٹریلر کو اس سگنل پر رکتے دیکھا، جس پر بالکل اس جیسی یا پھر یہی کار سب سے اوپر لدی ہوتی تھی۔“ اس نے ہاتھ سے، میز پر رکھی کار کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں نے کار کا نمبر بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ یہی تھا ایکس پی 94 منی سوٹا اسٹیٹ۔“

”اگر یہ اتفاق ہے تو بہت ہی عجیب اتفاق ہے۔ مجھے تو حیرت ہے اس پر۔“ وہ سنجیدگی سے اس کی بات سن رہی تھی۔ ڈوئل سمجھا کہ یہ اس کی بات پر تبصرہ ہے مگر وہی جانتی تھی کہ یہ خود اس نے اپنے اوپر تبصرہ کیا ہے۔ برسوں پہلے اس نے یہ قصہ ڈوئل کو سنایا تھا مگر لگتا ہے کہ اسے اس بارے میں کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔

کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لیفٹیننٹ ڈوئل، ٹیکنیشن راجر اور سینئر سراغرساں میری کولن سر جوڑے بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان بڑی سی میز پر وہ تمام ثبوت موجود تھے، جو جائے وقوع اور ٹریلر سے برآمد ہوئے تھے۔ سب گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

”سنو...“ میری نے خاموشی کو توڑا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی گاڑی ہر ہفتے کیریئر پر لدی ہوئی شہر میں داخل ہو اور وہ بھی بالکل نئی مگر پرانی نمبر پلیٹ کے ساتھ۔“ میری نے کہا۔ وہ پریشان نظر آ رہی تھی۔ ”جب ایک نئی کار ڈیلر کے پاس شوروم میں پہنچ جاتی ہے تو جہاں اسے کھڑی کرتے ہیں، وہاں فرش پر خاص قسم کا مقناطیسی لاک لگا ہوتا ہے۔ وہ لاک لگانے کے بعد گاڑی تب تک اپنی جگہ سے ہلائی نہیں جاسکتی جب تک وہ فروخت نہ ہو جائے یا شوروم مالک الیکٹرانک مقناطیسی لاک کھول نہ دے۔“ اس نے بڑی تفصیل سے بتایا۔

”آپ گاڑی کے نمبر کو کس طرح یقینی بنا سکتے ہیں؟“ ڈوئل نے میری کی بات کا جواب دینے کے بجائے نوٹ بک کھولی اور یہ لکھ کر اس پر بڑا سا سوالیہ نشان بنا دیا۔

”یہ ڈکیتی کا سیدھا سادہ کیس ہرگز نہیں ہے۔“ وہ دونوں بھی سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگے۔ ”معاملہ کچھ اور بھی ہے یا ہو سکتا ہے۔“ اس نے کیریئر ٹریلر سے ملنے والی اسپورٹس کار کے بڑے سے پرنٹ آؤٹ پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ گاڑی بالکل نئی ہے مگر نمبر پلیٹ پرانی لگتی ہے۔“

”میں نے بھی یہ بات نوٹ کی ہے۔“ ڈوئل نے قطع کلامی کی۔

”جی ہاں...“ راجر نے مداخلت کی۔ ”میں نے اچھی طرح دیکھا تھا۔ مجھے بھی وہ نمبر پلیٹ کچھ پرانی پرانی لگ رہی تھی۔“

”صرف یہی نہیں اور بھی کچھ سوال ہیں۔“ میری نے کہنا شروع کیا۔ ”جو گاڑیاں اس نے کل ڈلیور کی ہیں، تمہاری رپورٹ کے مطابق وہ فورڈ تھیں اور یہ اسپورٹس کار بی ایم ڈبلیو ہے۔“ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا، جس پر وہ معلومات لکھی ہوئی تھیں جو اب تک لیفٹیننٹ ڈوئل نے اکٹھی کی تھیں۔

”ایسا ہی ہے۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے تائید کی۔

”یہ سب گاڑیاں فورڈ اور بی ایم ڈبلیو کمپنی کے کینیڈا یونٹ میں تیار کی گئی ہیں۔“ اس نے ایک بار پھر اپنی بات شروع کی۔ ”سوال یہ ہے کہ آخر یہ گاڑیاں وہاں سے ہی امریکا کیوں آ رہی تھیں جبکہ یہ دونوں تو یہاں بھی بنتی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ سانس لینے کو رکی۔

”یہ سوچنے کی بات ہے۔“ ڈوئل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ایک اور بات...“ میری نے کچھ وقفے کے بعد دوبارہ بات شروع کی۔ ”کار ڈیلر اس سوال کے جواب میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہہ سکتے ہیں طلب میں زیادتی اور فراہمی میں کمی کے باعث یہ گاڑیاں کینیڈا سے درآمد کی جارہی تھیں مگر پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی گاڑی جو کیریئر پر لدی ہوئی ہے، ڈیلر کو اس کی ڈلیوری نہیں ہوئی، کسی نے اسے خریدا نہیں مگر پھر بھی اس کی رجسٹریشن ہوچکی۔ کینیڈا سے آنے والی کار پر بغیر رجسٹریشن کے ایک امریکی ریاست کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ رکی۔ ''اسمتھ سیدھا سادہ آدمی نہیں تھا۔ وہ کسی بڑے گینگ کا کارندہ تھا۔ اس کی موت کا سبب بھی کچھ اور ہی ہے۔''

''بات تو تشویش ناک ہے؟'' راجر نے لقمہ دیا۔

''ہمیں سب سے پہلے اس نمبر پلیٹ کا پتا چلانا ہے۔'' میری نے ایک بار پھر کہنا شروع کیا۔ ''ڈونل تم سب سے پہلے ہنگامی بنیادوں پر ریاست منی سوٹا کے موٹر رجسٹریشن یونٹ سے رابطہ کر کے پتا چلاؤ کہ یہ نمبر پلیٹ اصلی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو کس کے نام پر رجسٹرڈ ہے۔ اس آدمی کا پتا چلاؤ۔ تمہارے پاس دو گھنٹے ہیں۔''

''او کے میری، مگر ایک مشکل ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''کیا۔'' اس نے اسے استفساریہ نگاہوں سے دیکھا۔

''ممکن ہے کہ ویک اینڈ کے باعث بات پیر تک نہ چلی جائے مگر پھر بھی کوشش کرتا ہوں۔'' اس نے بے یقینی سے کہا۔

''میں ڈنر کے لیے گھر جارہی ہوں۔'' وہ بھی کھڑی ہوگئی۔ ''راجر تم یہ پتا چلانے کی کوشش کرو کہ اس گاڑی میں ایسی کوئی خاص بات ہے جو اسے غیر معمولی بناتی ہو۔''

''او کے، میں ابھی کام شروع کردیتا ہوں۔'' راجر نے مستعدی سے جواب دیا۔

''بائے۔'' یہ کہتے ہوئے میری نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور دفتر سے باہر نکل گئی۔

میری گھر پہنچی تو مسٹر کولن اپنی اسٹڈی میں کسی کیس کی تیاری کررہے تھے۔ ایشلے گھر پر نہیں تھی۔ وہ کچن میں پہنچی۔ وہ فریج کھول رہی تھی کہ اس کی نظر ایک چٹ پر پڑی جو فریج کے اوپری حصے کے ہینڈل سے چپکی ہوئی تھی۔

''مما میں دیر سے گھر آؤں گی۔ دوست سے ملنے باہر جارہی ہوں۔''

یہ ایشلے کا ماں کے لیے پیغام تھا۔ اسے علم تھا کہ وہ گھر لوٹیں گی تو اسے نہ پاکر پریشان ہوجائیں گی۔ میری نے موبائل فون اٹھایا اور اس کا نمبر ملانے لگی۔ اس نے کئی بار نمبر ملایا مگر وہ اٹھا نہیں رہی تھی۔ ''ہوگی کسی ڈانس پارٹی میں دوستوں کے ساتھ۔'' اس نے فون ڈائننگ ٹیبل پر پٹخا اور دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔ ''مجال ہے جو یہ کسی ویک اینڈ پر گھر میں ٹھہر جائے۔''

☆☆☆

ایشلے مرنجاں مرنجاں قسم کی لڑکی تھی۔ نئی نئی منطق بیان کرنا اس کی پہچان تھی۔ اگرچہ وہ ابھی صرف سترہ برس کی تھی مگر پھر بھی اپنے بڑی عمر کے دوستوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح ویک اینڈ پر بار اور نائٹ کلب میں داخل ہوجاتی تھی۔ اکثر اس کے دوست اس کے نائٹ کلب میں داخلے کے لیے گیٹ کیپر کی مٹھی گرم کردیتے تھے۔

ایشلے کو نئے نئے دوست بنانے کا بہت شوق تھا۔ اسے ادھیڑ عمر مردوں میں بڑی کشش محسوس ہوتی تھی۔ پچھلے چار ماہ سے اس نے ادھیڑ عمر کے ایک مرد سے دوستی گانٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سارے دوست اسے جانتے تھے مگر نام سے۔ اسے دیکھا کسی نے بھی نہیں تھا۔ اگر کسی نے اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا تھا تو وہ صرف اُس کے ماں باپ میری اور کولن تھے۔ ایشلے کے سب دوست اُس کے قصے آئے دن ایشلے کی زبانی سنتے رہتے تھے۔ اس نے اس دوست کو مسٹر وِگ کا نام دیا ہوا تھا۔ ویسے سب دوست مسٹر وِگ کے ساتھ اس کی پارٹی اور نائٹ کلب میں گزرے ویک اینڈ کا احوال سن سن کر مزے لیتے تھے مگر کسی کو یقین نہیں تھا کہ مسٹر وِگ نام کا کوئی حقیقی شخص ہے بھی یا نہیں۔ سب متفق تھے کہ یہ ایشلے کا خیالی دوست ہے اور سارے قصے من گھڑت... مگر ایسا نہیں تھا۔

ہوا یہ تھا کہ چند ماہ پہلے میری کسی کام سے شہر سے باہر گئی ہوئی تھی۔ مسٹر کولن بھی اس روز دیر سے آنے کا کہہ گئے تھے۔ ایشلے اسکول سے نکلی اور پیدل ہی گھر کی طرف چل دی۔ راستے میں اسے بھوک لگنے لگی اور وہ ایک فاسٹ فوڈ ریستوران میں گھس گئی۔ وہ ہاتھ میں برگر لیے کھاتی ہوئی باہر نکل رہی تھی کہ سامنے سرخ رنگ کی ایک اسپورٹس کار نظر آئی۔ اسپورٹس کار اور وہ بھی سرخ رنگ کی، یہ ایشلے کی کمزوری تھی۔ وہ سیدھی کار کے پاس پہنچی اور گھوم پھر کر اس کا جائزہ لینے لگی۔ کار جدید ماڈل کی بی ایم ڈبلیو کمپنی کی تیار کردہ تھی۔ برگر اس کے ہاتھ میں تھا مگر کار دیکھتے ہی اس کی بھوک مرچکی تھی۔

ابھی وہ کار کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ ایک موٹا سا گنجے بالوں والا شخص قریب آیا اور دروازہ کھولنے لگا مگر ایک نوجوان لڑکی کو بڑے انہماک سے کار کا جائزہ لیتے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ چند لمحے تک تو اس کے چہرے پر سوالیہ تاثر قائم رہا مگر پھر وہ سمجھ گیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔

''اچھی ہے یہ کار۔'' وہ ایشلے کے قریب آکر بولا تو وہ چونک گئی۔

''نہیں۔'' ایشلے نے جھٹ سے جواب دیا۔

''کیا؟'' اس آدمی نے حیرت سے کہا۔

''یہ بہت ہی اچھی ہے۔'' اگلے ہی لمحے اس نے ایک ہاتھ کی مٹھی بھینچ کر اتنے جوش سے کہا کہ جیسے اس کی ماں نے یہ کار خرید کر اسے دے دی ہو۔ یہ سنتے ہی اس شخص کے چہرے پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''اندر بیٹھ کر سیر کرنے چلوگی؟''

''نہیں...'' ایشلے نے فوراً اس کی پیشکش مسترد کردی۔ ''میں اجنبی لوگوں کے ساتھ کار میں نہیں بیٹھتی۔''

''او کے۔'' اس نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ ''یہ لو ہم دوست بن جاتے ہیں، میرا نام وِگ ہے۔'' اس نے داہنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اور میں ایشلے کولن۔'' اس نے بھی جھٹ سے تعارف کروادیا۔

''لو اب ہم دوست بن گئے، چلو میں تمہیں گھماتا ہوں۔''

''ہاں اب ٹھیک ہے۔'' یہ سنتے ہی وہ اتراتی ہوئی کار کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد دونوں شہر سے باہر کی طرف جارہے تھے مگر ایشلے کو کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ کہاں جارہے ہیں۔ اس کی نظر تو کار کے اندر سے ہی نہیں ہٹ رہی تھی، وہ شیشے کے باہر کیا جھانکتی۔

''بالکل نئی ہے۔'' اس نے سیٹ پر چڑھے پلاسٹک پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''ابھی شوروم سے نکلوائی ہے۔''

''اوہ...'' اس نے کہا۔ ''رجسٹریشن بھی نہیں کروائی ہوگی۔''

''ہوجائے گی۔''

''تم کہاں سے ہو؟'' ایشلے نے پوچھا۔

''منی سوٹا اسٹیٹ سے۔'' وہ شخص ہنستے ہوئے بولا۔ ''ویسے اس کی نمبر پلیٹ کیسی ہونی چاہیے۔''

''اس کا نمبر ہونا چاہیے...'' یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگی۔ ''ہاں یاد آگیا۔'' یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی۔ ''سنو مسٹر وِگ، اس کار کا نمبر ہونا چاہیے ایکس پی 94 منی سوٹا اسٹیٹ... کیسا ہے؟''

''بہت عمدہ۔'' وہ مسکرایا۔ ''مگر ایک مشکل ہے۔''

''وہ کیا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہوسکتا ہے کہ یہ نمبر کسی اور کو الاٹ ہوگیا ہو۔''

''ہو ہی نہیں سکتا، تم جو نمبر کہوگی، وہی نمبر پلیٹ اس پر لگے گی۔'' اس نے یقین سے جواب دیا۔

''تو بس... پھر ٹھیک ہے۔ یہ نمبر لے لو۔''

ایشلے کا حافظہ بچپن سے ہی بہت تیز تھا۔ وہ صرف چار سال کی تھی، جب اس کی ماں نے اسی طرح ایک سرخ اسپورٹس کار کی تصویر دکھاتے ہوئے اس سے یہ بات کہی تھی مگر اب سترہ سال کی عمر میں اسے وہ بات یاد آگئی تھی۔

''چلو، تم اُترو۔'' تقریباً بیس منٹ کی ڈرائیو... کے بعد اس شخص نے ایک جگہ گاڑی روکی۔ وہ جگہ شہر سے باہر ہائی وے کے قریب تھی۔ سامنے دو تین موٹیل اور فاسٹ فوڈ ریستوران نظر آرہے تھے۔ ''یہ لو۔'' اس نے بٹوا نکال کر سو ڈالر کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ ''جاؤ، میرے اور اپنے لیے کچھ پیک کرواؤ، تب تک میں ذرا ایک کام نمٹا کر آتا ہوں۔''

''او کے۔'' ایشلے نے بے فکری سے دوازہ کھولا اور اتر گئی۔

''سنو...'' مسٹر وِگ نے کھڑکی سے سر باہر نکالتے ہوئے کہا۔ ''لے کر یہیں آکر کھڑی ہوجانا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

گاڑی آگے بڑھی اور کچھ آگے جاکر مڑ گئی جس طرف گاڑی مڑی تھی، وہاں ایک بڑا سا شیڈ اور کچھ عمارتیں بنی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں کوئی ورکشاپ ہو۔ گاڑی نظر سے اوجھل ہوئی تو وہ ریستوران کی طرف بڑھ گئی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ باہر نکلی، سامنے وِگ موجود تھا۔ وہ سیدھی گاڑی کی طرف بڑھی۔

''تم بہت اچھی بیٹی ہو۔'' اس نے کھانا دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

''پاپا بھی یہی کہتے ہیں۔''

''میں بھی عمر میں تمہارے پاپا جتنا ہوں؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''نہیں، ان سے کچھ بڑے۔''

''او کے چھوٹی دوست۔'' اس نے گاڑی گیئر میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈالی۔اب وہ واپس جا رہے تھے۔

"تمہیں کہاں اترنا ہے؟" جب وہ ٹاؤن کی حدود میں داخل ہونے لگے تو اس نے پوچھا۔

"اُسی جگہ اتار دو۔" ایشلے نے کیچپ زدہ انگلیاں ٹشو پیپر سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "میں گھومتی پھرتی گھر جاؤں گی۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد جب ایشلے کار سے اتری تو دونوں ایک دوسرے کے موبائل فون نمبروں کا تبادلہ کر چکے تھے۔

"پھر ملیں گے۔" وِگ نے کھڑکی سے سر نکال کر ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

"بائے۔" ایشلے نے بھی گرمجوشی سے جواب دیا۔

ایشلے کے خیال میں مسٹر وِگ بہت اچھا انسان تھا۔ وہ اس سے اچھے دوستوں کی طرح مہینے میں ایک دو بار ویک اینڈ پر ملتا تھا، وہ بھی سنیچر کی رات کو۔ وہ جب بھی اس سے ملتا تو اس کے پاس وہی چمچماتی ہوئی سرخ بی ایم ڈبلیو اسپورٹس کار ہوتی تھی۔

"یہ دیکھو۔" جب وہ دوسری بار ملے تو اس نے ایشلے کو گاڑی کی نمبر پلیٹ دکھائی۔ "ایکس پی 94 منی سوٹا اسٹیٹ۔"

"واہ... یہ تو کمال ہو گیا۔" اس نے خوشی سے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

"تم نے کہا اور مجھے مل گیا، لکی فرینڈ۔" وہ مسکرایا۔

یہ واقعہ ایشلے کے ذہن میں ایک نئی منطق پیدا کر گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ جو خیال آپ کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے، وہ صرف آپ کا ہوتا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ نمبر اس کے دماغ میں ہی نہیں رجسٹریشن ڈپارٹمنٹ میں بھی موجود تھا۔ چونکہ یہ اس کا خیال تھا، اسی لیے یہ نمبر ابھی تک کسی کو الاٹ نہ ہو سکا۔ اس نے یہ خیال اُس روز مسٹر وِگ سے بھی شیئر کیا۔ وہ یہ سن کر کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔"

کئی بار ایشلے کو خیال آیا کہ وہ اس سے پوچھے مگر اس نے کبھی نہیں پوچھا۔ وہ حیران تھی کہ چار پانچ ماہ سے اس نے کار کی سیٹوں پر لگے پلاسٹک کور ہٹانے کی زحمت کیوں نہیں کی تھی؟ دوسرا یہ کہ اتنے مہینے گزر جانے کے باوجود جب بھی وہ اندر بیٹھتی، اسے ایسی مہک محسوس ہوتی جو نئی گاڑیوں سے آتی تھی۔ اس نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا کہ ممکن ہے وہ ہفتے میں صرف ایک ہی دن یہ گاڑی استعمال کرتا ہو اور عام استعمال کے لیے اس کے پاس کوئی اور کار ہو۔ وہ خاصا امیر تھا۔ اس لیے ایشلے کو یقین تھا کہ اس کے پاس بڑی سی مرسڈیز ہو گی۔ ایشلے کے خیال میں کم استعمال کی وجہ سے یہ کار اب تک بالکل نئی لگتی ہے۔

اُس دن سنیچر کی رات تھی۔ کل رات اس نے جب مسٹر وِگ کو موبائل پر پیغام بھیجا کہ وہ دو ہفتوں سے کہاں ہے تو اس نے فوراً جواب دیا اور ٹیسٹی فاسٹ فوڈ کے سامنے شام ساڑھے سات بجے ملنے کا کہا۔ وہ پہنچ گئی مگر جب ساڑھے آٹھ بجے تک وہ نہ آیا تو اس نے فون کیا مگر اس کا فون بند تھا۔ وہ اس سے ناراض تھی۔ اس نے موبائل کی رنگ بیل آف کی اور فون جینز کی جیب میں ٹھونس کر پیر پٹختی ہوئی پیدل ہی گھر کی طرف چل دی۔ جب اس کی ماں فون کر رہی تھی، اس وقت بھی فون کا وائبریٹر اور رِنگ بیل بند تھی۔

جب وہ گھر پہنچی تو میری ڈنر کر کے واپس دفتر جا رہی تھی۔ اس وقت وہ لاؤنج میں تھی۔

"کہاں گئی تھیں؟" میری نے رک کر پوچھا۔

"دوست سے ملنے۔" اس نے بُرا سا منہ بنا کر جواب دیا اور کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی بیڈ روم کی طرف چل دی۔

"سنو... میں رات دیر سے آؤں گی۔" میری نے کہا مگر وہ جواب دینے کے بجائے سیڑھیاں چڑھتی رہی۔ مسٹر وِگ کے نہ آنے کی وجہ سے اس کے ویک اینڈ کی شام غارت ہو گئی تھی۔ اُس کا موڈ سخت خراب تھا۔ کمرے میں جا کر وہ بستر پر گری اور پھر جو سوئی تو کچھ دیر میں اس کے خراٹے پورے کمرے میں گونج رہے تھے۔

میری پولیس اسٹیشن پہنچی۔ راجر اور ڈوئل پیزا کھا رہے تھے۔ "کوئی کام کی بات پتا چلی؟" اس نے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" راجر نے نوالہ نگلتے ہوئے کہا۔

"اوہ مائی گاڈ۔ پورا دن گزر گیا اور ہم ابھی تک وہیں کھڑے ہیں۔" وہ ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

"پوسٹ مارٹم ہو گیا ہے۔ رپورٹ پیر کو ملے گی۔" ڈوئل نے لقمہ دیا۔ "لاش کو مردہ خانے میں رکھ دیا گیا ہے، ورثا کے ملنے تک۔"

"راجر... جلدی سے کھانا ختم کرو۔" اس نے لیپ ٹاپ کھولتے ہوئے کہا۔ "مجھے کیس کی ابتدائی رپورٹ لکھنی ہے۔" "تم لوگ کھانا ختم کر کے جلدی سے اب تک کارروائی کے نوٹس دو۔"

"بہتر ہے۔" راجر نے جواب دیا اور دونوں جلدی

جلدی ہاتھ منہ چلانے لگے۔ سچ بات یہ تھی کہ وہ دونوں میری سے ڈرتے بہت تھے۔ یہ دونوں اس کے کافی پرانے ساتھی تھے۔ اچھی طرح جانتے تھے کہ میری کام کے معاملے میں بہت سخت ہے۔

"ارے سنو ڈوئل۔" میری نے اونچی آواز میں پکارا۔ "نمبر پلیٹ کے بارے میں منی سوٹا اسٹیٹ کے..."

"رابطہ کیا تھا مگر دفتر بند ہے۔" ڈوئل نے اسے بات پوری کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ "ویسے میں نے فیکس پر درخواست بھیج دی ہے پولیس اور موٹر رجسٹریشن ڈپارٹمنٹ دونوں کو۔ میں نے اسٹیٹ پولیس کو بھی ایک علیحدہ درخواست بھیجی ہے کہ اگر اس نمبر کے بارے میں ان کے پاس کسی قسم کی معلومات ہوں تو فوراً ہمیں بھیج دیں۔"

"ویری گڈ۔" میری نے مسکرا کر کہا تو اس کا ڈھیروں خون بڑھ گیا۔ "اور وہ ٹریلر کمپنی سے کوئی بات ہو سکی۔" اُس نے استفساریہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" ڈوئل نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے کئی بار ٹرائی کیا مگر فون پر آنسرنگ مشین لگی ہوئی ہے۔ لگتا ہے کہ ویک اینڈ کی وجہ سے ان کا دفتر بھی مکمل طور پر بند ہو گا۔"

"ہاں... یہ بھی ایک مسئلہ ہے۔" میری نے آہستہ سے جواب دیا۔ وہ کیس کی ابتدائی رپورٹ، اب تک کی تفتیش اور شواہدات کی تفصیلات لکھنے کی تیاری کر رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ پیر تک طول پکڑے گا۔" ڈوئل نے کھانا ختم کر کے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ "جب تک ٹریلر کمپنی سے رابطہ نہ ہو جائے تب تک تو مقتول کے وارثوں کی تلاش بھی ممکن نہیں۔"

"نظر تو یہی آتا ہے۔" میری نے لیپ ٹاپ پر نظریں جمائے ہوئے جواب دیا۔

"پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی پیر کو ملنی ہے، نمبر پلیٹ کی رپورٹ کا معاملہ بھی تب تک ٹل گیا ہے۔" ڈوئل اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میری نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔

"تب تک ہمیں اس گاڑی کا اچھی طرح جائزہ لینا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس سے بھی کچھ سراغ مل سکتا ہے۔"

"مگر اب تک کچھ نہیں مل سکا ہے۔" راجر نے جواب دیا۔ "میں نے گاڑی کا تفصیلی معائنہ کیا ہے مگر کوئی غیر معمولی بات پتا نہیں چل سکی۔ گاڑی بالکل نئی ہے۔ اس کے سیٹ کور پر چڑھا پلاسٹک اب تک چمک رہا ہے۔ ان سب سے تو یہی لگتا ہے کہ جیسے گاڑی سیدھی کمپنی سے نکل کر آئی ہے۔"

"یہی تو حیرت کی بات ہے۔" میری نے سر اٹھا کر کہا۔ "گاڑی نئی مگر نمبر پلیٹ پرانی اور..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"اور کیا..." ڈوئل اسے خاموش ہوتا دیکھ کر چونک گیا۔

"تمہارا بیان ہے کہ یہ گاڑی کئی بار دیکھی گئی ہے ٹریلر پر۔" میری نے فوراً بات بنائی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کچھ اور ہی بات تھی، جسے وہ کہتے کہتے رک گئی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ اور زیادہ پریشان تھی مگر کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس سوال کا جواب وہ خود تلاش کرنا چاہتی تھی۔ "ایکس پی 94 منی سوٹا اسٹیٹ۔" وہ زیرِ لب بڑبڑائی اور لکھنے میں مصروف ہو گئی۔ کچھ ہی دیر بعد ڈوئل اور راجر نے بھی میز پر اس کے سامنے کچھ کاغذات رکھ دیے۔ یہ ان دونوں کی اب تک کی چھان بین پر مشتمل نوٹس تھے۔ میری نے سر جھکائے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا اور ایک بار پھر لکھنے میں مصروف ہو گئی۔ اس کی انگلیاں تیزی سی کی بورڈ پر چل رہی تھیں۔

"میں تو تھک گئی۔" تقریباً گھنٹا بھر بعد اس نے کی بورڈ پر تیزی سے چلتی ہوئی انگلیوں کو بریک لگایا اور کرسی کی پشت سے سر ٹیکتے ہوئے بولی۔ ڈوئل اور راجر بھی اپنی اپنی سیٹ پر موجود تھے۔ "سارا دن بھاگ دوڑ میں گزر گیا۔" کچھ دیر بعد وہ سیدھی ہو کر بیٹھی اور خود کلامی کرتے ہوئے لیپ ٹاپ بند کرنے لگی۔

"کل صبح تم دونوں نو بجے تک پہنچ جانا۔ میں نے فیلڈ تفتیش کا پروگرام بنایا ہے ساتھ چلیں گے۔" اس نے لیپ ٹاپ بند کر کے اُسے بیگ میں رکھتے ہوئے کہا اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ "پونے بارہ بج گئے۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔" اس نے بیگ اٹھایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے سرخ اسپورٹس کار کی تصاویر کے کلر پرنٹ آؤٹ اور تفتیش کے نوٹس بھی لیپ ٹاپ بیگ میں رکھ لیے تھے۔

راجر اور ڈوئل بھی جانے کے لیے تیار تھے۔ کچھ دیر بعد وہ تینوں اپنی اپنی گاڑیوں میں گھروں کو جا رہے تھے۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ نے تینوں کو تھکا دیا تھا مگر میری اب بھی گھر جا کر کچھ کام کرنے کے موڈ میں تھی۔ وہ اب بھی وہیں بیٹھی رہتی لیکن اسے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ ایشلے نے کھانا کھایا ہو گا یا نہیں۔ اسی وجہ سے وہ جلدی اٹھ گئی، ورنہ وہ تو پوری پوری رات بیٹھ کر کام نمٹانے کی عادی تھی اور ابھی تو رات کے صرف بارہ ہی بجے تھے۔

میری گھر پہنچی تو پورے گھر کی لائٹیں بند تھیں۔ مسٹر کولن کو تو ویسے بھی جلدی سونے کی عادت تھی البتہ ایشلے کی آنکھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رات میں کئی بار کھلتی تھی۔ عموماً جب بھی اس کی آنکھ کھلتی، وہ کچھ کھانے کے لیے کچن کا ضرور چکر لگاتی تھی مگر اس وقت کچن کی بھی لائٹ بند تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ سب سو چکے ہیں۔

میری نے ہینڈ بیگ سے چابی نکالی اور نہایت آہستہ سے دروازہ کھولا اور سیدھی کچن میں آگئی۔ ڈائننگ ٹیبل پر لیپ ٹاپ بیگ رکھ کر اس نے اپنے ہیل والے جوتے اتار کر ہاتھ میں پکڑے اور دبے قدموں سیڑھیاں چڑھتی ہوئی بیڈ روم کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے جوتوں کی ہیل کی کھٹ کھٹ شوہر یا بیٹی کے آرام میں خلل ڈالے۔

بیڈ روم میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ایشلے کے کمرے میں جھانکا، وہ اوندھے منہ بستر پر لیٹی خراٹے لے رہی تھی۔

''اُف۔'' میری نے اس کے خراٹوں کی آواز سنتے ہی آہستہ سے کہا۔ اسے خراٹوں سے چڑ تھی مگر دونوں باپ بیٹی سوتے میں زور زور سے خراٹے لیتے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ لباس تبدیل کر کے کچن میں لوٹی۔ کافی بنا کر اپنا مخصوص بڑا مگ بھرا۔ پلیٹ میں چند بسکٹ نکالے اور دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے ساڑھے بارہ ہونے والے تھے۔ ''ابھی تو پوری رات پڑی ہے سونے کے لیے۔'' اس نے خود کلامی کی اور لیپ ٹاپ کھولنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد ڈائننگ ٹیبل پر اس کا دفتر کھل چکا تھا۔ وہ تفتیشی رپورٹ لکھنے کے ساتھ ساتھ پورے معاملے پر نہایت سکون سے غور بھی کر رہی تھی۔ رہ رہ کر اسے وہ واقعہ یاد رہا تھا، جب اس نے چار سالہ ننھی ایشلے کو سرخ رنگ کی گاڑی دکھاتے ہوئے جھٹ سے کہا تھا ''ایکس پی 94 منی سوٹا اسٹیٹ۔'' وہ سوچ رہی تھی کہ کیا اُس بات اور اس گاڑی کی نمبر پلیٹ میں کوئی خاص تعلق ہے یا صرف اتفاق۔ ''جب تک رجسٹریشن ڈپارٹمنٹ کی رپورٹ نہیں مل جاتی کچھ کہنا درست نہ ہوگا۔'' اس نے حسبِ عادت خود کلامی کی اور کی بورڈ پر اس کا ہاتھ تھم گیا۔ اس نے سرخ کار کی تصویروں کے پرنٹ آؤٹ اٹھائے اور ایک ایک کر کے انہیں غور سے دیکھنے لگی۔ اُس وقت وہ جس کرسی پر بیٹھی تھی، اُس کا رخ کچن کے داخلی دروازے کی طرف تھا۔ اس کی نظریں اس تصویر پر جمی تھیں، جس میں نمبر پلیٹ صاف نظر آ رہی تھی۔

''اے مما...'' ایشلے کی آواز سنتے ہی وہ چونک پڑی اور سامنے دیکھا۔ وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔

''اتنی رات گئے کیا کر رہی ہو؟'' اس نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

''اور یہ تم...'' میری نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''لباس تبدیل کیے بغیر ہی سو گئی تھیں۔''

''کھانا کھائے بغیر بھی۔'' اس نے اٹھلا کر کہا۔ ''بڑی بھوک لگی ہے۔''

''تم نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا؟'' اس نے بیٹی کو گھورا۔

''نیند آ رہی تھی بڑ۔ے زور کی۔'' اس نے کھڑے کھڑے کھانا کھائے بغیر سو جانے کا جواز بیان کرنا شروع کیا۔ ''اب کھانا کھاتی یا سوتی۔'' اس نے الٹا سوال کیا۔

''ٹھیک ہے، آؤ۔'' میری اپنی جگہ سے اٹھی اور فریج کی طرف بڑھی۔ ''کھانا کھا کر سو جاتیں تو زیادہ بہتر تھا۔'' وہ فریج سے کھانا نکال کر مائیکرو ویو اوون کے قریب رکھتے ہوئے بولی۔

''مما...'' اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے منطقی انداز میں بات شروع کی۔ ''رات کا کھانا سونے سے کم از کم دو گھنٹے پہلے کھانا چاہیے۔ اگر کھا کر فوراً سو جاؤ تو بدہضمی ہو سکتی ہے۔ اب خود سوچیں، اُس وقت مجھے سخت نیند آ رہی تھی۔ آپ بتائیں... کھا کر بدہضمی سے بیمار پڑنا اچھا ہے یا دیر سے اٹھ کر کھا لینا۔''

''باتیں مت بناؤ۔'' اس نے گھور کر بیٹی کو دیکھا۔

''میں تو حقیقت بیان کر رہی ہوں۔'' اس نے بھولپن سے جواب دیا۔ ''خود سوچو کہ اس وقت کھانا گرم کرنا تمہارے لیے آسان ہے یا میں بیمار پڑ جاؤں تو دو تین روز تک میری دیکھ بھال کرنا آسان ہوتا۔''

''میں تمہاری اوٹ پٹانگ منطقی دلیلوں سے تنگ آ چکی ہوں... سمجھی۔'' اس نے غرا کر ایشلے دیکھا اور پلیٹ میں کھانا نکالنے لگی۔

وہ کھانا کھانے لگی تو میری ایک بار پھر اپنے کام میں مگن ہو گئی۔

''کیا ہو رہا ہے مما؟'' اس نے بیسن میں ہاتھ دھوئے اور تولیے سے پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''قتل کیس پر کام کر رہی ہوں۔''

''اوہ...'' اس نے یہ سنتے ہی ہونٹ سکیڑ لیے۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ آگے بڑھی اور کار کی تصاویر والے پرنٹ آؤٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''خبردار جو اسے چھوا گیلے ہاتھوں سے۔'' میری نے الٹے رکھے پرنٹ آؤٹ کی طرف ایشلے کے بڑھتے ہوئے ہاتھ پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے اسے روکا۔

''او کے۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے فوراً ہاتھ پیچھے کر لیے اور فریج کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ماں کے سامنے

بیٹھی اورنج جوس پی رہی تھی۔ میری بدستور رپورٹ لکھنے میں مصروف تھی۔ ایشلے نے اپنی نیند پوری کر لی تھی اور اب پوری طرح چاق و چوبند نظر آ رہی۔

''جاؤ، جا کر سو جاؤ۔'' میری کافی بنانے کے لیے اٹھی تھی۔

''ابھی تو سو کر اٹھی ہوں اور اب دو گھنٹے سے پہلے نہیں سوؤں گی ورنہ...''

''بدہضمی ہو سکتی ہے، تم بیمار پڑ سکتی ہو، مجھے تمہاری دیکھ بھال کے لیے گھر پر رکنا پڑے گا۔'' میری نے منطقی بیٹی کی قطع کلامی کی۔

''بالکل ٹھیک کہا۔'' یہ سنتے ہی وہ ہنس کر بولی۔ ''بات اب آپ کی سمجھ میں آگئی ہے۔''

''کافی پیو گی؟'' میری نے کیتلی میں پانی ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں نہیں، ویسے بھی کل کس نے صبح سویرے اٹھنا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے زوردار انگڑائی لی۔ ''اتوار تو ویسے بھی آرام کا دن ہے۔''

''ہے آرام کا دن مگر نکموں کے لیے۔'' میری نے ایک بار پھر اس کی بات بیچ میں کاٹتے ہوئے کہا۔ ''مگر ہمیں کام کرنا پڑتا ہے۔''

''تو کرتی جاؤ کام، کس نے روکا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''میں تمہاری نہیں، اپنی بات کر رہی تھی۔''

اس نے گردن موڑی اور نہایت سنجیدگی سے اسے لمحہ بھر دیکھا اور پھر زور سے ہنس پڑی۔ ایشلے نے بھی زوردار قہقہہ لگایا۔

''آہستہ۔'' میری نے مگ میں کافی انڈیلتے ہوتے تنبیہ کی۔ ''پاپا جاگ گئے تو قیامت آجائے گی۔''

''اوہ۔'' ایشلے نے یہ کہہ کر فوراً منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسی دوران ایک بار پھر اس کی نظر الٹے رکھے کاغذوں پر پر گئی۔ اس کی طبیعت میں تجسس بھرا ہوا تھا۔ ماں کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔ اس نے چپکے سے وہ سارے کاغذ اٹھا لیے۔ پہلی تصویر سرخ اسپورٹس کار کی ایک مکمل تصویر تھی جو سامنے سے لی گئی تھی۔ وہ مبہوت ہو کر تصویر کو دیکھتی رہی۔

''منع کیا تھا نا۔'' اس کے ہاتھ میں تصویریں دیکھ کر میری نے اسے ڈانٹنے کے انداز میں کہا اور مگ میز رکھے۔ مگر اس نے سنی ان سنی کر دی۔ ''کیا دیکھ رہی ہو؟''

''مما... یہ تمہارے پاس کیسے؟'' اس نے تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔ اس کے لہجے سے انجانا خوف جھلک رہا تھا۔

''بتایا تھا نا کہ کیس پر کام کر رہی ہوں۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ ایشلے نے جلدی جلدی ساری تصویریں ایک، ایک کر کے دیکھ لیں۔ ''میں جانتی ہوں اُس شخص کو جس کی یہ کار ہے، میں اس میں بیٹھی ہوں کئی بار۔'' ایشلے نے سنجیدگی سے انکشاف کیا۔

''کیا...'' یہ سنتے ہی میری کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس پر ایشلے کا انکشاف کسی بم کی طرح پھٹا تھا۔ ''تم...''

''ہاں مما... میں بیٹھی ہوں اس میں، یہ میرے دوست کی کار ہے۔'' وہ یہ کہتے ہوئے بہت سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

''جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟'' میری بدستور حیرت زدہ تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''جانتی ہوں۔''

''مگر یہ تو بالکل نئی کار ہے۔''

''میرے دوست کی کار کا نمبر ہے ایکس پی 94 منی سوٹا اسٹیٹ۔''

''کیا...'' وہ سخت حیران تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ ایشلے کیا کہہ رہی ہے۔ ''اِدھر لاؤ یہ۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر تصویریں اس کے ہاتھ سے لے لیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے بہت سرسری انداز میں تصویریں دیکھی تھیں مگر اس کے باوجود کار کا نمبر بالکل درست بتایا تھا۔ چند لمحے وہ خاموش رہی اور اپنے حواس درست کرتی رہی۔

''پوری بات بتاؤ، اس کار سے تمہارا تعلق کیا ہے، تمہارا دوست کون ہے؟'' اس نے نہایت سکون سے سوال کیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اگر اس نے اپنے اوسان بحال نہ کیے تو ایشلے کو ذہنی دھچکا لگ سکتا ہے۔

''یہ میرے دوست مسٹر وِگ کی کار ہے۔''

''یہ وِگ کون ہے اور تم اسے کیسے جانتی ہو؟'' میری نے قطع کلامی کی۔ ''پوری بات بتاؤ تفصیل سے۔''

''وہ کئی مہینے پہلے جب آپ شہر سے باہر گئی تھیں نا تو اُس دن میری اس سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔'' یہ کہتے ہوئے ایشلے نے ماں کو مسٹر وِگ سے ملاقات اور پھر دوستی کا سارا احوال تفصیل سے سنانا شروع کر دیا۔

''اوہ میرے خدا۔'' جب وہ خاموش ہوئی تو میری نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے پاس اُس کا موبائل فون نمبر ہے؟''

''ہاں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی جینز کی جیب سے موبائل فون نکالا اور وہ نمبر ماں کی نگاہوں کے سامنے کر دیا۔

میری نے جلدی جلدی وہ نمبر نوٹ بک پر لکھا۔ ''تم نے اس کا گھر دیکھا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نہیں۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
''جانتی ہو، وہ کہاں رہتا ہے؟'' میری نے ایک اور سوال کیا۔
''نہیں۔''
یہ سنتے ہی میری نے اپنا موبائل فون اٹھایا اور ڈوئل کا نمبر ملانے لگی۔
''ہیلو۔'' ڈوئل نے کئی بیل بجنے کے فون اٹینڈ کرلیا تھا مگر اس کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔
''بہت بڑا سراغ ملا ہے قاتل اور کار کے بارے میں۔'' اس نے چھوٹتے ہی کہا۔
''کیا...'' یہ سنتے ہی ڈوئل نے ایسے کہا جیسے نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور بھاگ گئی ہو۔
''تم فوراً راجر کو فون کرو۔ اسٹاف آرٹسٹ کو بھی اٹھاؤ اور فوراً پہنچو۔ رات کے پونے دو بج رہے ہیں۔ ٹھیک دو بجے تم سب کو پولیس اسٹیشن میں ہونا ہے، میں بھی پہنچ رہی ہوں۔'' میری نے سپاٹ لہجے میں حکم دیا۔
''بالکل ٹھیک... بائے۔'' ڈوئل سمجھ گیا تھا۔ اس نے فوراً فون بند کردیا۔
''تم چلو میرے ساتھ۔'' میری نے سارا سامان سمیٹتے ہوئے کہا۔ میں کپڑے بدل کر آرہی ہوں، تب تک تم لیپ ٹاپ بند کر کے سب چیزیں بیگ میں رکھ دو۔''
''اوکے مما۔'' ایشلے نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی ایک بات کے بعد ساری صورتِ حال کیسے بدل گئی۔ مما بیڈ روم کے بجائے پولیس اسٹیشن کیوں جارہی ہیں اور اس کو ساتھ لے جانے کا مطلب کیا ہے۔ وہ اسی ادھیڑ بُن میں تھی کہ میری آگئی۔ چند منٹ کے بعد وہ دونوں پولیس اسٹیشن جارہی تھیں۔ کچن کی لائٹ بند تھی اور ڈائننگ ٹیبل پر کافی کے مگ سے اڑتی ہوئی بھاپ کم ہوتی جارہی تھی۔ ایشلے کے انکشاف کے بعد وہ نمبر پلیٹ کا راز جان چکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ بہت جلد قاتل پولیس کی گرفت میں ہوگا۔
میری ایشلے کو لے کر پہنچی تو راجر، ڈوئل اور پولیس کا اسٹاف آرٹسٹ مائیکل اس کے منتظر تھے۔ اس نے ڈوئل کا ہاتھ تھاما اور اسے باہر لے جاکر وہ سارا قصہ بیان کردیا جو ایشلے نے سنایا تھا۔
''اوہ...'' پوری بات سن کر اس کا منہ بھی حیرت کے مارے کھل گیا۔
ڈوئل نے پولیس ریکارڈ میں موجود جرائم پیشہ افراد کی ساری تصویریں ایشلے کو دکھائیں مگر اس میں ایک بھی تصویر وِگ کی نہیں تھی۔ جس کے بعد اس نے ایشلے کو مائیکل کے ساتھ بٹھایا اور وہ ایشلے کے کہنے کے مطابق اس شخص کا خاکہ بنانے لگا جسے وہ وِگ کے نام سے جانتی تھی۔
اِدھر خاکہ تیار ہورہا تھا، اُدھر راجر اور میری دو پولیس والوں کے ساتھ ٹریلر کی ایک بار پھر تفصیلی تلاشی لے رہے تھے۔ راجر ٹریلر کے قریب بیٹھا اس کا ٹول بکس کھول رہا تھا۔
ٹول بکس کے سارے اوزار باہر نکال کر وہ اندر کا جائزہ لے رہا تھا کہ اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ جب راجر نے اس چھوٹے کنڈے کو کھینچا تو وہ صندوق کے ڈھکن کی طرح اوپر کی جانب کھل گیا۔ یہ ٹول بکس کے اندر، تہ میں بنایا ہوا خفیہ خانہ تھا۔ اس نے طاقتور ٹارچ سے اندر روشنی ڈال کر دیکھا تو اسے خفیہ خانے میں ایک پیکٹ اور نوٹوں کا بنڈل نظر آیا۔ ''میری یہاں آؤ۔'' یہ دیکھتے ہی وہ چلّایا۔
تقریباً ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ ایشلے خاکے کو فائنل ٹچ دلوا رہی تھی۔ اُدھر کمرے میں میری، راجر اور ڈوئل بیٹھے ہوئے گرفتاری کا منصوبہ تیار کررہے تھے۔ ان کے سامنے میز کے بیچوں بیچ نوٹوں کا بنڈل اور پلاسٹک کی تھیلی رکھی ہوئی تھی۔ تھیلی میں سفید پاؤڈر کوکین تھا اور نوٹوں کا بنڈل ایک لاکھ ڈالر پر مشتمل تھا۔ اب بات صاف ہوچکی تھی۔ معاملہ منشیات کی اسمگلنگ کا تھا۔ ڈالر، کوکین، قتل اور مسٹر وِگ... معاملہ سب کی سمجھ میں آگیا تھا۔ وہ جان گئے تھے کہ آرچر اسمتھ ایک کارندہ تھا اور اسے بد دیانتی کی پاداش میں قتل کیا گیا تھا۔ اب انہیں بے چینی سے خاکہ مکمل ہونے کا انتظار تھا۔
خاکہ مکمل ہونے کی دیر تھی کہ ڈیوٹی پر موجود ایک پولیس افسر نے اسے پہچان لیا۔ اس شخص کا نام نیلسن تھامس تھا۔ وہ ہائی وے کے قریب چیپل فارم میں رہتا تھا۔ اگرچہ نیلسن پولیس کو کسی جرم میں بظاہر مطلوب نہیں تھا لیکن اینٹی نارکوٹکس والے اس پر نظریں رکھے ہوئے تھے۔ وہ جس علاقے میں رہتا تھا، وہ منشیات کے بڑے پیمانے پر دھندے کی وجہ سے بدنام تھا مگر لاکھ کوشش کے باوجود پولیس کو وہاں اس کاروبار کے حوالے سے ٹھوس ثبوت نہیں مل سکے تھے۔ نیلسن کوئی چھ ماہ پہلے ہی وہاں منتقل ہوا تھا۔ بظاہر اس کی نہ تو کوئی ملازمت تھی اور نہ ہی کوئی کاروبار۔ اسی لیے اس پر بھی کڑی نظر رکھی جارہی تھی۔ جس پولیس افسر نے اسے شناخت کر کے جو پتا بتایا تھا، وہ اسی علاقے کا تھا، جہاں پہلی ملاقات کے وقت وہ ایشلے کو لے کر گیا تھا۔
صبح کے پونے چار بج رہے تھے جب میری نے

سٹریٹ کو فون کیا اور انہیں سنگین جرائم میں مشتبہ ملزم نیلسن تھامس نامی شخص کے وارنٹ گرفتاری فوری طور پر جاری کرنے کی استدعا کی۔
چھاپا مارنے کی تیاری مکمل ہوچکی تھی۔ میری ایک پولیس افسر کے ساتھ ایشلے کو گھر بھیج رہی تھی۔ ''سنو... یہ بات کسی کو بتانا نہیں، اپنے پاپا کو بھی نہیں کہ ہم نے رات بھر کیا کیا تھا۔'' میری نے اسے علیحدہ لے جاکر سمجھایا۔
''کون سی بات مما، میں تو شام سے ہی گھر پر سو رہی ہوں۔'' اس نے حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اتوار کو تو ویسے بھی ہم لوگ تو دیر تک سوتے ہیں نا۔''
''اوہ میری پیاری بچی۔'' میری نے اسے سینے سے چمٹا لیا۔ میری کے روانہ ہوتے ہی پولیس پارٹی بھی نیلسن کی گرفتاری کے لیے چل دی۔
صبح کے سوا پانچ بج رہے تھے۔ نیلسن گہری نیند سویا ہوا تھا جب پولیس نے اس کے گھر پر چھاپا مارا۔ کچھ ہی دیر بعد اسے تفتیشی سینٹر منتقل کیا جاچکا تھا۔
اس کی گرفتاری پر میری نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ تفتیشی ٹیم بنادی گئی تھی۔ میری کو یقین تھا کہ اب جب وہ لوٹے گی تو سارا معاملہ کھل چکا ہوگا۔
''تم بھی جاؤ اور جاکر سوجاؤ، کل دوپہر دو بجے یہیں ملتے ہیں۔'' اس نے راجر اور ڈوئل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اتوار کو تو لوگ ویسے بھی دیر تک سوتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ مسکرائی۔ اسے ایشلے کی بات یاد آگئی تھی۔
''ہاں مگر وہ لوگ جو ہفتے کی رات سوئے ہوں۔ اتوار کا سورج نکلنے ہی والا ہے۔'' ڈوئل نے مذاق کے لہجے میں کہا تو وہ تینوں ہنس پڑے اور ہنستے ہنستے پارکنگ کی طرف چل دیے۔

☆☆☆

پیر کی دوپہر تک آرچر اسمتھ کا کیس حل ہوچکا تھا۔ نیلسن نے زبان کھول دی تھی۔ آرچر اس کا کارندہ تھا، جسے اس کے آدمیوں نے کوکین چرا کر بیچنے کے جرم میں قتل کردیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کا کہنا تھا کہ اسے نہایت قریب سے گولیاں ماری گئی تھیں۔ دونوں گولیاں دل پر لگی تھیں۔ نیلسن کی نشاندہی پر وہ دونوں شخص پکڑے گئے، جن میں سے ایک نے اسے گولیاں ماریں اور دوسرے نے اس کا پرس خالی کر کے واردات کو ڈکیتی کا رنگ دینے کی کوشش کی تھی۔
منی سوٹا کے موٹر رجسٹریشن ڈپارٹمنٹ نے نمبر پلیٹ کو جعلی قرار دیا تھا۔ کینیڈا کی ٹریلر کیریئر کمپنی نے پولیس کو تحریری طور پر مطلع کیا تھا کہ جس ٹریلر کا پوچھا گیا ہے، وہ

MoB: 0300-2219514,0344-2609828
Tel: 021-34519074
بذریعہ ڈاک
معقول فیس میں ہنرمند بنیں
موبائل سے SMS کرتے وقت اپنا مکمل نام پتہ کورس کا نام ضرور لکھیے
صبح 9 بجے تا شام 5 بجے
ہنر سیکھیے روزگار لیجیے
Registered with CBR
Govt. of Pakistan
اگر آپ مندرجہ ذیل کورسز کے علاوہ کسی بھی فیلڈ میں تجربہ رکھتے ہوں اور اسکا سرٹیفکیٹ آپکے پاس موجود نہیں ہے سرٹیفکیٹ نہ ہونے کی وجہ سے آپکی ترقی کی راہ میں یا ملازمت میں رکاوٹ ہورہی ہے ہم آپکا ٹیسٹ لے کر سرٹیفکیٹ جاری کردینگے۔ نیچے دیے ہوئے ایڈریس پر خط لکھکر تفصیلات منگائیں
حکمت
ڈسپنسر
اکیوپنکچر
لیڈیز ٹیلرنگ
کشیدہ کاری
ہومیوپیتھک کورس
یوگا
کمپیوٹر
سروئیر
ایریبک
بیوٹی پارلر
مہرسازی
عینک سازی
کیمیکل
مڈوائفری
شمسی توانائی
فارمیسی
ویلڈنگ
میجک
فن مصوری
باغبانی
فائر فائٹنگ
دی انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر 3349 ملیر سعود آباد کراچی 75080

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پرائیویٹ کمپنی کا تھا جو معقول معاوضہ ادا کر کے صرف ان کا مونوگرام استعمال کر رہی تھی۔ پرائیویٹ ٹریلر کمپنی دراصل نیلسن کی تھی اور پوری کمپنی کا کل اثاثہ وہی ٹریلر تھا جو پولیس تحویل میں کارپورل پریڈ گراؤنڈ میں کھڑا تھا۔۔ نیلسن جس موبائل فون سے کبھی کبھار ایشلے کو میسج بھیجتا تھا، اس کی سم کینیڈا کی ایک فون کمپنی کی تھی۔ میری نے تو نمبر دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ اس کا کوڈ امریکی نہیں تھا۔ نیلسن بھی کینیڈا کا شہری تھا اور امریکا میں مافیا سے تعلق رکھتا تھا۔

اس کی نشاندہی پر پولیس نے ایک جیسی دو اور بی ایم ڈبلیو سرخ اسپوٹس کاریں بھی ایک شیڈ سے برآمد کر لی تھیں۔ یہ شیڈ اس کے گھر کے برابر بنایا گیا تھا۔ ان دونوں پر بھی ایک جیسی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھیں: ایکس پی 94 منی سوٹا اسٹیٹ۔

نیلسن نے اعتراف کیا کہ کوکین کی کھیپ کینیڈا پہنچتی تھی جہاں سے وہ امریکا پہنچانے کے لیے کاریں اپنے ٹریلر پر لادتے اور اس کے ساتھ ہی سرخ رنگ کی اسپورٹس کار بھی لاد لیتے تھے۔ اس کار کی پچھلی نشست میں خاص طور پر تبدیلی کی گئی تھی۔ اسی میں منشیات چھپائی جاتی تھی۔

ایک کار آتی، وہ اسے شیڈ میں لے جاتے اور پھر بنا نمبر پلیٹ کی ویسی ہی ایک کار دوبارہ لوڈ کر کے بھیج دیتے۔ جواز کے طور پر ایک فرضی کار ڈیلر کا خط بھی آرچر کو تھما دیا جاتا تھا۔ جس میں یہ بارڈر پولیس کو مطمئن کرنے کے لیے یہ جواز بیان کیا جاتا تھا کہ آرڈر پر بنوائی گئی کار میں فنشنگ کے کچھ نقائص ہیں، جنھیں ٹھیک کرنے کے لیے کار کو دوبارہ موٹر ساز کمپنی بھیجا جا رہا ہے۔ کار اتارنے اور چڑھانے کا کام وہیں ہوتا تھا، جہاں سے آرچر اسمتھ کا ٹریلر لاوارث حالت میں کھڑا ملا تھا۔

نیلسن کا کہنا تھا کہ آرچر بہت عرصے سے اس کے لیے کام کر رہا تھا۔ وہ بھروسے کا آدمی تھا مگر کچھ عرصے سے اس نے ہفتہ وار ڈلیوری میں ڈنڈی مارنا شروع کر دی تھی۔ اس نے راستے میں ٹریلر روک کر مال کی تھوڑی تھوڑی مقدار نکال کر خفیہ طور پر بیچنا شروع کر دی تھی۔

جس رات اسے قتل کیا گیا، اس روز سہ پہر اس نے نیلسن کے بھیجے ہوئے ایک فرضی گاہک کو ایک لاکھ ڈالر میں کوکین بیچی تھی جبکہ دوسرے فرضی گاہک سے معاملہ طے کرنے گیا تھا۔ انہی گاہکوں میں سے ایک نے اسے گولی ماری تھی۔ گولی چلانے والا شخص ہارڈ ویئر مارکیٹ کا طوطے جیسی ناک والا منیجر جان وینگرو تھا جو دراصل نیلسن کے لیے بھی کام کرتا تھا۔

”مجھے حیرت ہے کہ اس نے اتنی جلدی وہ رقم کس جگہ چھپائی تھی، جہاں سے مجھے بھی نہیں مل پائی۔“ جب اسے عدالت لے جایا جا رہا تھا تو اس نے میری سے پوچھا۔

”تمھیں صرف اس ایک بات پر حیرت ہے؟“ میری نے الٹا سوال کیا۔

”ایک اور بات ہے۔“ اس نے میری کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”پولیس اتنی جلدی مجھ تک کیسے پہنچی؟“

”اس کا جواب میں دے نہیں سکتی۔“ یہ کہہ کر اس نے نیلسن کو لمحہ بھر کے لیے غور سے دیکھا۔ ”اور جو دے سکے، اُس سے اب تم کبھی بھی نہیں مل پاؤ گے، نہ ہی اس کا نام جان سکو گے۔“

نیلسن سے یہ میری کی آخری ملاقات تھی۔ اُسی روز عدالت نے اسے جیل بھجوا دیا۔

☆☆☆

جمعے کا دن تھا۔ پیریڈ خالی تھا۔ ایشلے حسبِ عادت ڈیسک پر چڑھ کر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے چاروں طرف اس کے دوست جمع تھے۔ ”تو تمھیں پتا ہے میرے دوست ہیرالڈ کہہ رہے تھے کہ...“

”پتا ہے...“ ایملی نے لقمہ دیا۔ ”ڈانسر فضول ہے، بیرا اچھی نہیں۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“ ایشلے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ ستارہ شناس ہیں۔ کہہ رہے تھے سنیچر میری زندگی کا سب سے اچھا دن ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ ایملی نے ہانک لگائی۔ ”مگر تمہارے کسی دوست کے لیے تمہاری وجہ سے زندگی کا بدترین بُرا دن بھی بن سکتا ہے۔“

ایملی نے تو برسبیلِ تذکرہ یہ بات کہہ دی تھی مگر ایشلے یہ سن کر سوچ میں پڑ گئی۔ اس کے ذہن میں فوراً مسٹر وِگ کا خیال آ گیا تھا اگلے ہی لمحے اس نے سر جھٹکا۔ ابھی وہ اپنی نئی منطق بیان کرنے والی تھی کہ مما کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا... ساتھ ہی ان کی بات بھی۔ ”خدا کے لیے ایشلے، یہ منطق بازی ختم کر دو، بدل ڈالو اپنی اس عادت کو ورنہ کبھی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”منطق کی شکست۔“ اُس کے منہ سے یہ بات نکلتے ہی ایملی چلائی۔ اس کے جواب میں زوردار قہقہہ پڑا۔ ایشلے بھی ہنس رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے کسی دوسرے کی دلیل کو تسلیم کیا تھا، کھلے دل سے۔

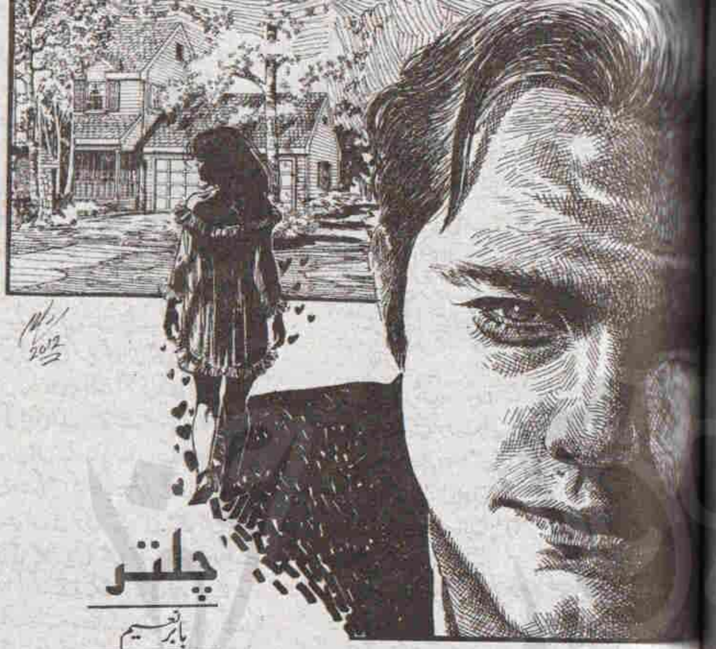

چلتر

بابر نعیم

فتح اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے نئے جتن اور تجربے سے گزرنا پڑتا ہے... وہ عشق پیشہ تھا... اس نے ٹھان لیا تھا کہ وہ لاحاصل کو اپنے لیے ہر صورت حاصل بنائے گا... مغربی معاشرے کی ایک اور سفاک اور دردناک تصویر...

اس ماہر کھلاڑی کا ماجرا جس کی شہ آخری پل مات میں بدل گئی...... چونکا دینے والا اختصاریہ

”میں دنوں سے ہوں۔“ اس نے کہا۔ ہماری دھما چوکڑی کے باعث اس کی زلفیں الجھ گئی تھیں۔ وہ اپنے بالوں کو درست کرنے لگی۔

”کیا اس کا ذمے دار میں ہوں...؟“

”میں کئی ماہ سے اپنے شوہر سے دور ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”تمہارے سوا اور کسی سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے؟“

کمرے میں ہم دونوں کی تمباکو نوشی کی وجہ سے دھند سی چھا گئی تھی۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔

”تو تم اسے قتل کر دو گے نا؟“

آخرکار بات اس کی زبان پر آ ہی گئی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”اور پھر ہنی، ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔“

وہ جملے میں یہ اضافہ کرنا بھول گئی کہ ”اور دولت مند بھی۔“

☆☆☆

پیٹی گریو کی عمر چالیس پینتالیس کے درمیان تھی اور جسمانی لحاظ سے وہ تنومند تھا۔ وہ اس فیکٹری کا مالک تھا جہاں پھلوں کے گودے نکال کر ٹن میں محفوظ کیے جاتے ہیں۔

میں اسی کی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ اس سے روز ہی آمنا سامنا ہوتا تھا۔ میں نے جتنے بھی رئیس دیکھے تھے، سب ہی کے انداز سے رعونت ٹپکتی تھی۔ پیٹی گریو بھی ان میں سے ایک تھا۔ غرور کے نشے میں اس کی گردن ہر وقت اکڑی رہتی تھی۔

میں اور اس کی بیوی ایک ہفتے تک موقع کی تاک میں لگے رہے۔ پھر ایک دن اس نے بتایا کہ اس کے شوہر نے گھر کے سوئمنگ پول میں رات کو تیراکی دوبارہ شروع کر دی ہے۔

میں اس رات ان کی کوٹھی کے عقبی حصے میں واقع سوئمنگ پول کی قریبی جھاڑیوں میں چھپ گیا اور اسے سوئمنگ پول میں تیراکی کرتے دیکھتا رہا۔ کئی چکر کاٹنے کے بعد بالآخر وہ تھک گیا اور جب وہ سوئمنگ پول سے باہر نکلنے لگا تو میں نے دبے پاؤں جا کر اس کے سر پر ایک ضرب لگائی جس سے وہ نیم بے ہوش سا ہو گیا۔ پھر میں نے اسے دوبارہ سوئمنگ پول کے اس حصے میں گھسیٹ لیا جہاں پانی اتھلا تھا۔

میں نے اسے دیر تک پانی میں ڈبوئے رکھا۔ جب اس کی موت کا یقین ہو گیا تو میں چپکے سے وہاں سے اسی طرح نکل گیا جیسے وہاں داخل ہوا تھا۔

☆☆☆

پیٹی گریو کے مرنے کے بعد اس کی فیکٹری بند ہو گئی۔

پیٹی گریو کی بیوہ سے ایک ہفتے تک میں نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ نہ اس نے فون کیا اور نہ ہی ہماری ملاقات ہو پائی۔

میں اس سے ملاقات کے لیے تڑپ رہا تھا۔ میری ایک ایک رگ، میرے جسم کی ایک ایک نس اور بدن کا ہر عضو اس کی طلب میں مچل رہا تھا۔

بے چین ہو کر میں نے اسے فون کر دیا۔ ”مجھے تمہاری ضرورت ہے، بے بی!“

”ابھی نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بعد میں۔“

لیکن وہ بعد میں بھی نہیں آئی۔

البتہ پولیس آ گئی۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ وہ مجھے پولیس اسٹیشن لے گئے۔

”تم مسز پیٹی گریو کو جانتے ہو؟“ انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔

”میں اس کے شوہر کی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔“ میں نے بتایا۔

”تمہارا اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”وہ ایک گھامڑ شخص تھا۔“

”تم یہ کیوں کہہ رہے ہو؟“

”کیا تمہارا باس تمہاری نگاہ میں گھامڑ نہیں ہے؟“ میں نے الٹا سوال کر ڈالا۔

”مسز پیٹی گریو کے بارے میں کیا کہو گے؟“

”میں نے اسے پہلے بھی دیکھا ہے۔“

”کہاں؟“

”فیکٹری میں۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ اکثر مسٹر پیٹی گریو کے لنچ کے لیے فروٹ پلپ لے کر آتی تھی۔“

”جنسی طور پر وہ خاصی پُرکشش شے ہے۔“

”میں اندھا نہیں ہوں۔“

”کبھی اس سے سابقہ پڑا؟“ معنی خیز لہجے میں سوال کیا گیا۔

”وہ میرے طبقے سے تعلق نہیں رکھتی۔“

”پوسٹ مارٹم سے ظاہر ہوا ہے کہ مسٹر پیٹی گریو کی گردن کے گرد خراشوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔“

”میرا اس سے کیا تعلق؟“ میں نے کہا۔

”ایسی خراشیں کسی ڈوب کر مرنے والے شخص سے مطابقت نہیں رکھتیں۔“

”تو پھر؟“

”پیٹی گریو کی کوٹھی کے عقب میں ایک گھومنے والا سیکیورٹی کیمرا نصب تھا۔“

”امیر لوگ اور ان کے کھلونے ہوتے ہیں یہ!“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”کیمرے کے ٹیپ میں جو منظر ریکارڈ ہوا ہے وہ اندھیرے کی وجہ سے زیادہ صاف نہیں ہے۔ البتہ اس میں اس شب سوئمنگ پول سے ایک شخص کو نکلتے اور اندھیرے میں غائب ہوتے دیکھا گیا ہے جس شب مسٹر پیٹی گریو کی موت واقع ہوئی تھی۔“

”میرا اس سے کیا تعلق؟“ میں نے ڈھٹائی سے پوچھا۔

”کسی نے مسٹر پیٹی گریو کو زیرِ آب ڈبوئے رکھا تھا جس سے ان کی موت واقع ہوئی۔“

”کیا تم لوگ بتا سکتے ہو کہ وہ فیکٹری دوبارہ کھولیں گے یا نہیں؟“ میں نے الٹا سوال داغ دیا۔

سوال و جواب کا یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا لیکن وہ میرے خلاف کچھ ثابت نہ کر سکے۔

☆☆☆

میں نے دوبارہ اسے فون کیا۔

”بے بی پولیس مجھے حراست میں لینے کے چکر میں ہے۔“

”وہ فیکٹری میں کام کرنے والے ہر فرد سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”یہ کوٹھی کے عقب میں سیکیورٹی کیمرے کا کیا معاملہ ہے؟“ میں نے جاننا چاہا۔

”پیٹی گریو نے حال ہی میں یہ کیمرا لگوایا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”خود مجھے بھی اس کا علم نہیں تھا۔“

”مجھے تمہاری شدت سے طلب ہو رہی ہے۔“

”مجھ سے خود بھی برداشت نہیں ہو رہا۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن فی الحال صبر سے کام لو۔“

میرے لیے اس کے مشورے پر عمل کرنا ناممکن تھا!

میں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ مال میں، تدفین تک...

یہ پیٹی گریو کی تدفین سے اگلے دن کی بات ہے جب وہ اس شخص کے ہمراہ دکھائی دی۔ وہ مجھ سے مختلف نہیں تھا اور جنسی طور پر خاصا پُرکشش تھا۔ انہوں نے ایک اسٹور سے ٹیک اوے کھانے پینے کی اشیا خریدیں اور پھر وہ دونوں اس شخص کے فلیٹ میں چلے گئے اور وہاں کئی گھنٹے تک موجود رہے۔

☆☆☆

مسز پیٹی گریو کو ٹھکانے لگانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ لیکن اس کے وجود میں جو بچہ پرورش پا رہا تھا، وہ میرا بھی ہو سکتا تھا اور میں اپنے بچے کو پیٹی گریو کی وراثت سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں اس کے نئے عاشق کے فلیٹ کے باہر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جب وہ اپنے فلیٹ میں تنہا رہ گیا... میں نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ میرا اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔

اس نے جونہی دروازہ کھولا میں نے اس پر ریوالور تانتے ہوئے اسے اندر دھکیل دیا۔

”ہمیں معلوم تھا کہ تم مسز پیٹی گریو کی تاک میں لگے ہوئے ہو۔“ اس نئے عاشق نے بتایا۔ ”وہ اپنی حفاظت کے لیے خوف زدہ تھی۔ اس نے اپنے تحفظ کے لیے اپنی کوٹھی میں سیکیورٹی کیمرا لگوایا تھا۔“

”تم کون ہو؟“

”پولیس۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تمہاری اس وقت سے نگرانی ہو رہی ہے جب تمہیں پولیس اسٹیشن پوچھ گچھ کے لیے لایا گیا تھا۔“

”میں اس چال میں نہیں آؤں گا۔“ میں نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

”میں تمہیں مزید بتاتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”جب تم نے مال تک اس کا تعاقب کیا تھا تو ہم اس وقت بھی تمہاری نگرانی کر رہے تھے۔ تم تدفین گھر کے باہر اور قبرستان میں بھی موجود تھے۔ مسز پیٹی گریو کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ جو شخص اس کا تعاقب کر رہا ہے اسی نے اس کے شوہر کو پانی میں ڈبو کر ہلاک کیا تھا تاکہ وہ اس سے راہ و رسم بڑھا سکے۔ ہم نے ایک منصوبے کے تحت ظاہر کیا جیسے وہ مجھ سے ملاقاتیں کر رہی ہے تاکہ تم کھل کر سامنے آ جاؤ۔“

میں نے مایوسی کے عالم میں اپنے ریوالور کی نال کا رخ نیچے کر دیا۔

”ہمارا افیئر چل رہا تھا۔“ میں نے کہا۔

”یہ تمہارا وہم تھا۔“

”اس کے رحم میں میرا بچہ پرورش پا رہا ہے۔“ میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”گزشتہ ہفتے ایک انٹرویو کے دوران میں وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں اس کے ہمراہ اسپتال گیا تھا۔ وہاں ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ اس کے ماں بننے کے کوئی آثار نہیں تھے۔“

جونہی اس نے اپنی بات مکمل کی، سیڑھیوں پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ باہر سڑک پر سائرن بج رہے تھے۔

”اپارٹمنٹ کو گھیرے میں لیا جا چکا ہے۔“ باہر سے آوازیں ابھرنے لگیں۔

میں نے لپک کر دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔

پولیس افسر کے انکشاف نے مجھے مایوسی کی دلدل میں دھکیل دیا تھا۔ مجھے دولت کی ضرورت تھی۔ پیٹی گریو کی بیوہ اگر مجھے دھوکا دے رہی تھی تو میری آخری امید اس سے ہونے والے بچے سے وابستہ تھی... لیکن افسوس کہ وہ اس عورت کا ایک ڈھکوسلا تھا۔ وہ میرے ہاتھ آئی اور نہ ہی میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ میرے لیے غربت اور محرومی کے ساتھ لمبی قید بھی مقدر بننے والی تھی۔

وہ پولیس افسر مجھ پر جھپٹا تو میں نے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔

☆☆☆

میں نے یہ سب کچھ تحریر کر دیا ہے۔

مسز پیٹی گریو کی رسوائی یا بدنامی کی خاطر نہیں بلکہ سچ بیانی کے طور پر۔

اور یہ تحریر میری خودکشی کا اعتراف نامہ ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قسط : 33

اسماقادری

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل..... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور با اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالاتر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے ... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے - پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے - دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے - زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے - بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے - جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرنگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ پیر آباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہریار کا سہارا پاکر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ ماہ بانو کو اغوا کر لیتے ہیں۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو عمران نامی لڑکے کے ساتھ دشمنوں کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ ماہ بانو آری کسنڈی میں پہنچ جاتی ہے۔ شہریار، ماہ بانو کو چھڑا کر کراچی منتقل کر دیتا ہے۔ ادھر چودھری کے کارندے بابر کو مار کر آفتاب اور کشور کا پتا لگا لیتے ہیں لیکن وہ وہاں سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ آفتاب اور کشور میرپور خاص آ جاتے ہیں۔ شہریار جگو کو فون کر کے چودھری کی مرمت کرانا چاہتا ہے۔ عبدالمنان شہریار کو بتاتا ہے کہ ماہ بانو ڈاکوؤں کے پاس ہے۔ شہریار، مختار مراد کو ٹیلی فون کر کے جنگل میں آپریشن پر زور دیتا ہے۔ آفتاب کے ہاں ایک لڑکی کی پیدائش ہوتی ہے۔ ماہ بانو کو اسلم کے ذریعے شہریار کی شادی کی اطلاع ملتی ہے تو وہ صدمے سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو اسلم کو شادی کی آفر کرتی ہے مگر ساتھ میں شرط رکھتی ہے کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھ چھوڑے اور عزت کی زندگی گزارے، تب وہ اس سے شادی کرے گی۔ چودھری چراغ پا ہو جاتا ہے اور آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر اسلم اور ماہ بانو ڈاکوؤں کی پناہ گاہ سے بھاگنے کا پروگرام بنا رہے ہوتے ہیں، للی زبردستی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔ چودھری کے گرگے آفتاب کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اسپتال پر دھاوا بول دیتے ہیں تاہم آفتاب اور کشور وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر اس افراتفری میں ان کی نوزائیدہ بچی وہیں رہ جاتی ہے۔ چودھری کے آدمی بچی کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ تاہم جگو کے آدمی بچی کو چھڑا لیتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو، اسلم اور للی ڈیرے سے بھاگ نکلتے ہیں۔ پولیس ڈیرے پر آپریشن کر کے تمام ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیتی ہے تاہم ماہ بانو کی بازیابی ممکن نہیں ہوتی۔ ڈیوڈ پیسوں کا لالچ دے کر چودھری کو اس کے جوتے کے کارخانے میں ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب قائم کرنے پر آمادہ کر لیتا ہے۔ اسلم، ماہ بانو اور للی سفر کے دوران ایک جگہ رکتے ہیں۔ وہاں جمرو پہنچ جاتا ہے اور اسلم اور جمرو کے درمیان خونی تصادم ہوتا ہے۔ للی اس تصادم میں جمرو کی گولی کا شکار بنتی ہے۔ جمرو اسلم کے چاقو کا شکار ہو کر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ ادھر شبانہ آفتاب کی مدد کرنے کے چکر میں پولیس کے ہاتھوں دھر لی جاتی ہے اور اپنی آبرو کھو بیٹھتی ہے۔ ... لوگ آفتاب کا فون نمبر پتا کر کے اس کی قیام گاہ کا پتا لگا لیتے ہیں اور چودھری سے پیسوں کے عوض اس کا پتا بتا دیتے ہیں۔ آفتاب کو شہریار کے ذریعے پتا چلتا ہے کہ اس کی بچی خیریت سے ہے۔ سفر کے دوران ماہ بانو اور اسلم کی ملاقات شفقت راؤ نامی شخص سے ہوتی ہے۔ وہ انہیں اپنے بہنوئی کا پتا سمجھا دیتا ہے اور ان کے لیے پناہ کا بندوبست کر دیتا ہے۔ ادھر چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ ماہ بانو اور اسلم، شفقت راؤ کے بتائے ہوئے گاؤں تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ لوگ حامد راؤ کے گھر آ جاتے ہیں۔ ادھر شہریار شہزادی نامی عورت سے مردہ بچے کی ہڈیاں وصول کرنے والے شخص سے تفتیش کرتا ہے اور کافی کچھ اگلوانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مراد شاہ کو ماں کے انتقال کی خبر ملتی ہے تو وہ پاکستان آ جاتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ اسلم اور ماہ بانو ایک ہی کمرے میں رات گزارتے ہیں۔ صبح ان کی روانگی کا پروگرام ہوتا ہے۔ تاہم رات میں کچھ لوگ ان کے مکان کو گھیر تے ہیں۔ گھیرا ڈالنے والے لوگ حامد راؤ سے کہتے ہیں کہ شفقت راؤ کی بیوی اور بیٹی کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ بات سن کر حامد راؤ گولی چلا دیتا ہے اور پھر وہاں دو بدو مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تاہم وہ سب دشمنوں کا گھیرا توڑ کر فرار ہو جاتے ہیں اور حامد راؤ کے شہر میں واقع فلیٹ میں آجاتے ہیں۔ ادھر مشابرم خان شہریار کو خانقاہ کی رپورٹ دیتا ہے اور اس گاؤں میں ہونے والے مقابلے کی خبر دینے کے ساتھ وہاں اسلم اور ماہ بانو کی موجودگی اور پھر فرار کا بتاتا ہے۔ شہریار کی خبر سن کر چونک جاتا ہے۔ بہرحال وہ مشابرم خان کو دوبارہ ٹاہلی والا جا کر تحقیقات کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مشابرم خان وہاں پہنچ کر ایک بوڑھے شخص سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ بات چیت کے دوران اچانک اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگتا ہے۔ بے ہوشی طاری ہونے سے قبل اس کے کان جو آواز سنتے ہیں، وہ گولی چلنے کے دھماکے کی ہوتی ہے۔ اس کے سر پر وار کر کے اسے بے ہوش کر دیا جاتا ہے۔ وہ پیر سائیں کے ہرکاروں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے جو اس پر تشدد کرتے ہیں۔ لیکن وہ نور بخش کے بیٹے کی مدد سے وہاں سے فرار ہو کر شہریار کے پاس پہنچتا ہے۔ ادھر ماہ بانو اسلم کے گاؤں اس کی ماں کو لینے پہنچتی ہے مگر زینت بی بی انتقال کر جاتی ہے۔ وہ اس کی تدفین کرا کے واپس اسلم کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ تاہم نواز چانڈیو اور اس کا بھائی وہاں پہنچ جاتے ہیں اور ماہ بانو اور اسلم کو وہاں سے لے کر ویرانے میں آجاتے ہیں مگر اسلم اچانک حملہ کر کے انہیں ناکوں چنے چبوا دیتا ہے۔ وہ چانڈیو کو مارنے کا ارادہ کرتا ہے تو ماہ بانو آڑے آجاتی ہے اور اسے اس عمل سے روکتی ہے۔ وہ اسے چھوڑ کر وہاں سے چل دیتے ہیں اور شہر چھوڑ دیتے ہیں۔ ادھر شہریار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کر لی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہو گیا ہے۔ شہریار یہ خبر سن کر خوش ہوتا ہے۔ یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہریار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے تو وہ چونک جاتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔ شہریار اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور اس کی مدد کرنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ ادھر الفا چودھری کو ہیروئن کی ترسیل بیرون ملک کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ ناچار چودھری کو ہامی بھرنی پڑتی ہے۔ شہریار کو مشابرم خان کے ذریعے ٹاہلی والا میں مشکوک ڈبوں کے پہنچائے جانے کی اطلاع ملتی ہے۔ شہریار میجر ذیشان کے ذریعے وہاں کارروائی کرواتا ہے اور خود بھی اس کے ہمراہ ٹاہلی والا پہنچتا ہے۔ میجر ذیشان اور شہریار زیر حراست افراد سے تفتیش کے لیے جانے لگتے ہیں تو اچانک میجر ذیشان اس کے شانے پر ہاتھ رکھتا ہے۔ وہ اس کے شانے کو بغور دیکھتے ہوئے اس کی ٹی شرٹ پر چپکی کسی ہم رنگ شے کو انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے الگ کرتا ہے۔ یہ منظر شہریار کو ششدر کر دیتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

شہریار نے حیرت سے ذیشان کے ہاتھ میں موجود شے کو دیکھا۔ وہ کیکڑے کی شکل کی ایک چپٹی سی شے تھی جسے ذیشان نے اس کی شرٹ پر سے اکھاڑا تھا۔ اس شے کی رنگت اس کی ٹی شرٹ جیسی ہی تھی اس لیے پہلی نظر میں اسے وہاں دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ ذیشان بھی اگر اس کے شانے پر ہاتھ رکھنے کے نتیجے میں محسوس ہونے والے ابھار پر غور نہ کرتا تو اسے اس شے کی وہاں موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ شہریار خود اس شے کی موجودگی پر حیران اور پریشان تھا کہ آخر اس نے اس کی ٹی شرٹ تک کیسے اور کب رسائی حاصل کی۔ اپنی اس الجھن میں اس نے ذیشان سے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود اس کیکڑے نما شے کا غور سے جائزہ لیتا رہا۔ آخرکار ڈیڑھ دو منٹ کے جائزے کے بعد وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس سے بولا۔

''تم قیدیوں والے کمرے کی طرف چلو شہریار.... میں ابھی دو منٹ میں وہاں آتا ہوں۔'' شہریار کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اس کی ہدایت پر عمل پیرا ہو گیا اور اس کمرے کا رخ کیا جہاں دوسرے کئی افراد کے ساتھ ساتھ واجد کو بھی قید کیا گیا تھا۔ اس کمرے کے دروازے پر اب رینجرز کے کسی اہلکار کے بجائے ان کے ساتھ آیا ہوا CFP کا اہلکار موجود تھا۔ اس کے اشارے پر اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ کمرے میں آٹھ افراد بند تھے جن کے ہاتھ پیروں کو رسی کی مدد سے باندھ کر انہیں بے بس کر دیا گیا تھا۔

''ہم بے قصور ہیں صاحب! ہمیں آپ نے یہاں کیوں بند کر دیا ہے؟'' اسے اندر آتا دیکھ کر ان میں سے ایک فرد نے تیز لہجے میں کہا تو شہریار نے زبان سے کچھ کہنے کے بجائے اسے سخت نظروں سے گھورا۔ اس شخص کی ڈھٹائی واقعی بڑے کمال کی تھی کہ وہ اسلحے اور منشیات سے بھرے ایک آسیب زدہ مشہور مکان میں پایا گیا تھا پھر بھی خود کو بے قصور قرار دے رہا تھا۔ اسے گھورتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اس آدمی کے نقش و نگار کچھ آشنا سے محسوس ہو رہے ہیں۔ فوری طور پر اسے وجہ بھی سمجھ آگئی۔ وہ شخص کافی حد تک واجد سے مشابہ تھا لیکن اس کے مقابلے میں ذرا کم موٹا اور عمر میں چند سال چھوٹا محسوس ہو رہا تھا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' اس نے سخت لہجے میں احتجاج کرنے والے سے دریافت کیا۔

''خالد جناب۔'' اس نے نام بتایا۔

''واجد کے بھائی ہو؟'' اس نے کمرے میں ہی موجود نیلے لباس میں ملبوس موٹے واجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی... بالکل صحیح پہچانا آپ نے۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''ٹھیک ہے، تم ان دونوں بھائیوں کو یہاں سے نکال کر دوسرے کمرے میں لے چلو۔'' اس بار اس نے سی ایف پی کے اہلکار کی طرف رخ کرتے ہوئے حکم دیا اور خود باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ واجد اور خالد یہ دونوں اس کی یادداشت میں اچھی طرح محفوظ تھے اور اسے یاد تھا کہ پیر آباد سے پکڑے جانے والے کالے میاں نے سخت تفتیش کے نتیجے میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ پیر سائیں کا سب سے خاص گرگا واجد ہے جبکہ اس کا بھائی خالد بھی اپنے بڑے بھائی کا معاون و مددگار ہے۔ اس لیے اسے یہی مناسب معلوم ہوا تھا کہ تفتیش کا آغاز ان دونوں بھائیوں سے ہی کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہو سکیں۔

''میں ان دونوں کو اس سامنے والے کمرے میں لے جاتا ہوں۔ وہاں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو آپ کو ان سے بات چیت کرنے میں مدد دیں گی۔'' سی ایف پی کا اہلکار بھی ذرا سے وقفے سے کمرے سے باہر آگیا اور اس سے بولا۔ اہلکار کے ساتھ ساتھ واجد اور خالد بھی کمرے سے نکلے تھے لیکن اس طرح کہ ان کے ہاتھ پیر بدستور بندھے ہوئے تھے اور اسی وجہ سے انہیں حرکت کرنے کے لیے عجیب و غریب طریقۂ کار استعمال کرنا پڑا تھا۔ خالد اپنی آپس میں جوڑ کر بندھی ہوئی پنڈلیوں کے باعث اچھل اچھل کر آگے بڑھ رہا تھا جبکہ واجد موٹا ہونے کی وجہ سے اس طریقۂ کار پر عمل نہیں کر سکتا تھا اور کسی جانور کی طرح گھٹنوں کے بل آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ عمل بھی کچھ ایسا آسان نہیں تھا۔ اسے اپنے آپس میں بندھے ہوئے ہاتھوں پر کافی زور ڈال کر جسم کو آگے کھسکانا پڑ رہا تھا۔ سی ایف پی کا اہلکار مسلح تھا اور چاہتا تو ان دونوں کے پیر کھول کر انہیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آسانی سے منتقل کر سکتا تھا۔ اسلحے کی موجودگی میں دونوں بھائیوں کی یہ جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ بھاگنے کی کوشش کرتے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا تو شاید اس لیے کہ پہلے مرحلے پر ہی ان کے کس بل نکالنے کا انتظام ہو سکے۔ شہریار کھڑا دونوں بھائیوں کی یہ درگت دیکھ رہا تھا کہ ذیشان واپس لوٹ آیا۔ ''گڈ۔'' اپنے سامنے جاری تماشے کو دیکھ کر اس نے بے ساختہ ہی اپنے ماتحت کو داد دی۔

''میں نے رینجرز کے آفیسر سے بات کر کے چند سپاہیوں کو یہیں روک لیا ہے۔ ہمارے پاس نفری بہت کم ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ باہر نگرانی کے لیے چند مسلح افراد موجود رہیں۔'' اس نے شہریار کے برابر میں کھڑے ہوتے ہوئے اسے اطلاع دی لیکن اس وقت شہریار کا الجھا ہوا ذہن اس شے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا... جس کی موجودگی پر ذیشان خاصا چونکا ہوا نظر آیا تھا۔ ذیشان نے اس کی کیفیت کو بھانپ لیا اور شانے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''باقی معاملات پر بعد میں بھی تفصیل سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔ اس وقت ہمیں فوری درپیش مسائل سے نمٹنا ہوگا۔''

شہریار کے پاس اس کی تائید کرنے کے سوا کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ کیکڑے نما شے کیا تھی؟ یہ ذیشان ہی جانتا تھا اور اگر فی الوقت وہ اسے اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا تو اس کے لیے بھی بہتر تھا کہ اس کا خیال ذہن سے جھٹک کر موجودہ کاموں کی طرف توجہ دے۔ واجد اور خالد دوسرے کمرے میں منتقل کیے جا چکے تھے چنانچہ ان دونوں نے بھی اس کمرے کا رخ کیا۔ کمرے میں کئی ایسی اشیا موجود تھیں جنہیں تشدد کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

''ہاں بھئی! اب فوراً شروع ہو جاؤ اور بتاؤ کہ تمہارا پیر سائیں یہاں اپنی پیری کی آڑ میں کون کون سے دھندے کر رہا تھا؟'' اپنے ماتحت کو اشارے سے واپس اپنی پہلے والی ڈیوٹی پر جانے کی ہدایت کرتے ہوئے ذیشان نے سخت لہجے میں تفتیش کا آغاز کیا۔

''میں کچھ نہیں جانتا، نہ میرا اس مکان سے کوئی تعلق ہے۔ آپ لوگوں نے مجھے زبردستی ٹاہلی کے جھنڈ سے پکڑ کر یہاں پہنچایا ہے، اور اب زبردستی ہی الزام لگا رہے ہو۔'' موٹے واجد نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ جواب دیا۔

''الزام تو ہم نے ابھی تک کوئی لگایا ہی نہیں مسٹر! ابھی تو ہم صرف تم سے تمہارے پیر سائیں کے دھندوں کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔'' ذیشان نے اسے جواب دیا۔

''اور تم ہرگز بھی یہ نہ کہنا کہ پیر سائیں سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمہارے پیر سائیں نے کالے میاں نامی جس شخص کو شہزادی سے مردہ بچے کی ہڈیاں لینے پیر آباد بھیجا تھا، وہ ہماری حراست میں ہے اور نہ صرف ہمیں اس کے موبائل پر تمہارا نمبر ملا ہے بلکہ اس نے خود بھی ہمیں بتایا ہے کہ واجد، پیر سائیں کا سب سے خاص بندہ ہے۔ تمہارے ساتھ ساتھ اس نے تمہارے اس بھائی کا بھی نام لیا ہے۔''

اسے جھوٹ پر کمربستہ دیکھ کر شہریار نے دخل اندازی ضروری سمجھی اور چند ایسے حقائق اس کے سامنے رکھ دیے کہ اس کے پاس جھوٹ بولنے کی گنجائش کم سے کم ہی رہے۔ اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھ لیا تھا کہ اس کی زبان سے کالے میاں کا نام سن کر واجد کا سیاہ چہرہ مزید سیاہ پڑ گیا تھا اور وہ یوں ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا جیسے اپنے دفاع میں کچھ کہنے کے لیے جھوٹ تراشنا چاہتا ہو لیکن فوری طور پر ایسا کرنے سے قاصر ہو۔ سی ایف پی کے اہلکار کی عجلت آمیز آمد نے اس کی یہ مشکل آسان کر دی۔

''سر! باہر گاؤں کے بہت سے لوگ جمع ہیں اور آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' اس نے ذیشان کو اطلاع دی۔

''اوہ..... مجھے پہلے ہی اس بات کا اندازہ تھا۔'' اطلاع سن کر وہ دھیرے سے بڑبڑایا اور پھر اپنے ماتحت سے بولا۔ ''ہم لوگ ابھی آتے ہیں۔ باہر پہرے پر جو سپاہی ہیں، انہیں پیغام دے دو کہ ہجوم کو مکان سے دور ہی رکھیں لیکن ایسی کوئی حرکت نہیں کریں کہ لوگ مشتعل ہو جائیں۔''

''اوکے سر!'' ماتحت فوراً واپس پلٹ گیا۔

''میں ابھی باہر والوں سے نمٹ کر آتا ہوں۔ تم دونوں بھائی اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر سوچ لو کہ تمہیں سیدھے طریقے سے ہمارے سامنے حقائق اگلنے ہیں یا ہم اپنے طریقۂ کار سے تمہاری زبانیں کھلوائیں۔ یہ بات بہرحال یاد رکھنا کہ سچ تمہیں اگلنا ہی ہوگا۔ اپنی کھال بچا کر آسانی سے اگل دو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے ورنہ ہمارے لیے تمہاری زبانیں کھلوانا کچھ مشکل نہیں ہے۔'' ماتحت کے باہر نکلنے کے بعد اس نے واجد اور خالد کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت سفاک لہجے میں یہ سب کہا اور پھر شہریار کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ مکان کے اردگرد رینجرز کے چوکس جوان پھیلے ہوئے تھے اور کچھ فاصلے پر وہ ہجوم تھا جو ان لوگوں سے ملنے آیا تھا۔ وہ لوگ تعداد میں کافی زیادہ تھے لیکن وردی پوش مسلح رینجرز اہلکاروں کی وجہ سے قابو میں تھے ورنہ بصورتِ دیگر مکان پر ہلا بھی بول سکتے تھے۔ ذیشان نے شاید ایسے ہی کسی خطرے کے پیشِ نظر ان جوانوں کو روک لیا تھا۔

''آپ میں سے صرف تین افراد آگے آئیں اور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہہ دیں۔'' دروازے سے ذرا آگے جا کر کھڑے ہوتے ہوئے ذیشان نے دبنگ لہجے میں حکم صادر کیا جس پر ہجوم میں ذرا دیر کے لیے کھلبلی سی مچی اور پھر تین مرد آگے بڑھے۔ یہ تینوں ہی عمر رسیدہ تھے اور چہرے مہرے اور لباس سے خوش حال محسوس ہو رہے تھے۔

''ہم آپ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہمارے پنڈ میں کیا ہو رہا ہے؟ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ پیر سائیں کی گرفتاری کے لیے آئے ہیں اور ان کے نہ ملنے پر شریف صاحب کو ان کے گھر سے گرفتار کر لیا ہے۔ شریف صاحب کے علاوہ پنڈ کے ہور بھی کچھ لوگ آپ کی قید میں ہیں۔ آپ کے سپاہیوں نے گھر گھر تلاشی لے کر ہم سب کی بے عزتی کی ہے۔ ہم سب عزت دار لوگ ہیں، کوئی چور اچکے نہیں کہ ایسا برتاؤ برداشت کر سکیں۔ ہمارے نوجوان بہت غصے میں ہیں لیکن ہم نے صرف سرکاری وردی کے احترام میں انہیں قابو میں رکھا ہوا ہے۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، آپ اس کے بارے میں وضاحت دیں ورنہ جوشیلے نوجوان ہمارے قابو سے باہر بھی ہو سکتے ہیں۔'' تین میں سے ایک باریش شخص نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا تو آخر میں اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔ ذیشان نے اس کا یہ انداز محسوس کرنے کے باوجود نظرانداز کر دیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''بزرگوار! جو کچھ ہوا اس کے لیے مجھے افسوس ہے۔ یقیناً آپ لوگوں نے اپنے گھروں میں ہمارے سپاہیوں کے داخل ہونے کا برا مانا ہوگا لیکن ہم اپنی ڈیوٹی سے مجبور تھے۔ ہمارے پاس اطلاع تھی کہ یہاں ایک مشکوک ملک دشمن آدمی پیر سائیں کا بہروپ بھر کر اپنی مجرمانہ سرگرمیوں میں مصروف ہے اس لیے ہمیں اس شخص کی گرفتاری کے لیے یہ آپریشن کرنا پڑا۔ ہمیں شریف صاحب کے گھر میں اس کی موجودگی کی اطلاع ملی تھی لیکن ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ شریف صاحب کو ہم نے صرف شبے میں گرفتار کیا ہے۔ اگر تفتیش کے بعد وہ بے قصور ثابت ہوئے تو انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ میرے خیال میں اب آپ یہ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ ہمیں آپ کے گھروں کی تلاشی کیوں لینی پڑی۔ ہمیں شک تھا کہ مفرور مجرم کو آپ میں سے اس کے کسی عقیدت مند نے اپنے گھر میں پناہ نہ دے رکھی ہو اس لیے بہ حالتِ مجبوری ہمیں آپ لوگوں کی خانہ تلاشی لینی پڑی۔''

''یہ بکواس ہے۔ تم پیر سائیں پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔ وہ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ اسی لیے تو اللہ نے تمہارے ناپاک قدموں کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی انہیں خبردار کر دیا۔'' اس کی بات ختم ہوتے ہی ان تینوں میں سے ایک جو شاید عمر میں ان سب سے چھوٹا تھا، جوش سے چلایا۔

''مجھے ایسا کوئی جھوٹ بولنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی میں اور میرے سپاہی اتنے فارغ ہیں کہ فضول معاملات میں اپنی ٹانگ اڑائیں۔ ہم نے پکی مخبری پر یہاں ریڈ کیا تھا اور اب ہمارے پاس ایسے ٹھوس ثبوت ہیں جنہیں دیکھنے کے بعد آپ ہمیں جھٹلا نہیں سکتے۔ میں آپ کے

مہمان اور گاؤں کے معصوم لوگوں کے ذہنوں پر سوار عقیدت کی اندھی عینک... اتارنے کے لیے آپ کو بھی وہ ثبوت دکھانے کے لیے تیار ہوں۔ آپ میرے ساتھ اندر چل کر دیکھ سکتے ہیں کہ یہاں کیا کچھ موجود ہے۔'' ذیشان ایک جھٹکے سے مڑ گیا۔ وہ تینوں بھی لمحہ بھر تو تذبذب کا شکار نظر آئے پھر اس کے پیچھے چل پڑے۔ ان کے ساتھ اندر کی طرف جاتا ہوا شہریار دل ہی دل میں ذیشان کی فہم و فراست کو سراہ رہا تھا۔ اتنے بڑے ہجوم سے چند سپاہیوں اور اسلحے کے زور پر نمٹنا واقعی مشکل تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ سب لوگ معصوم اور بے گناہ ہیں اور صرف اندھی عقیدت اور وقتی اشتعال کے تحت سامنے آ کھڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اگر ایک فرد کو بھی گولی ماری جاتی تو یہ ظلم ہوتا۔ چنانچہ ان سے نمٹنے کے لیے سب سے بہترین راستہ وہی تھا جو ذیشان نے اختیار کیا تھا۔

''یہ اسلحے اور بارود کا ڈھیر آپ لوگ یہاں دیکھ سکتے ہیں۔ ان آتشیں ہتھیاروں کے علاوہ یہاں اس سفید سفوف کا بھی ذخیرہ ہے جو لوگوں کو ہتھیاروں سے بھی زیادہ مہلک اور دردناک موت سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ گولی کھا کر مرنے والا تو صرف ایک بار میں مر جاتا ہے لیکن نشے کی لعنت میں مبتلا لوگوں کا حال تو آپ لوگ بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ ایسا آدمی نہ صرف اپنی صحت، دولت اور عزت گنواتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کا پورا خاندان بھی برباد ہو جاتا ہے۔ آپ کے درمیان پیر سائیں کا بہروپ دھار کر رہنے والا سفاک درندہ لوگوں میں یہی موت بانٹ رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اپنی آنکھوں سے اتنا سب کچھ دیکھ لینے کے بعد اب آپ کے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔'' ان تینوں کو منشیات اور بارود کے ذخیرے سے بھرے کمرے میں لے جا کر ذیشان نے بلند آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ وہ ایک محبِ وطن پاکستانی تھا جو حقیقتاً اس وقت اپنے ہم وطنوں کی بے وقوفی اور جاہلانہ عقیدت مندی پر سخت غصے میں تھا لیکن باہر اس نے محض اس لیے خود کو قابو میں رکھا تھا کہ بات بڑھنے کے بجائے سنبھل جائے۔

''یہ سب تو ٹھیک ہے جناب لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہو سکتا ہے کہ پیر سائیں کا ان سب چیزوں سے کوئی تعلق ہے؟ یہ مکان تو آسیب زدہ مشہور تھا اور پیر سائیں کبھی اس مکان میں نہیں آئے۔ وہ تو اپنی خانقاہ سے بھی بہت کم باہر نکلتے تھے۔'' کچھ دیر پہلے ذیشان کی باتوں کو الزام تراشی قرار دینے والا ایک بار پھر بہروپیے پیر کی حمایت میں دلیل دینے لگا لیکن اب اس کا لہجہ پہلے جتنا بلند نہیں تھا۔

''پیر سائیں یہاں نہیں تو کیا ہوا؟ اس کے آدھے درجن سے زیادہ خاص مرید تو یہیں ہیں نا۔ ان کو دیکھ کر تمہاری آنکھیں نہیں کھل رہیں یا پھر عقل پر پتھر پڑے ہوئے ہیں۔'' ذیشان جھنجلایا۔

''ایک منٹ..... میرے خیال میں ہم ان کے رہے سہے شکوک و شبہات دور کرنے کا انتظام کر سکتے ہیں۔ یہ اگر ہمارا کہا نہیں مان رہے تو واجد اور خالد کی زبان سے حقائق سن کر ضرور یقین کر لیں گے۔'' اس موقع پر شہریار نے دخل اندازی کی اور پھر براہ راست ان تینوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''آپ تینوں ہمارے ساتھ آئیں۔'' وہ انہیں اس جگہ سے باہر لے کر اس کمرے تک پہنچ گیا جہاں واجد اور خالد کو رکھا گیا تھا۔

''اندر پیر سائیں کے سب سے خاص بندے واجد اور خالد موجود ہیں۔ ہم ان سے تفتیش کریں گے۔ آپ لوگوں کو صرف اتنا کرنا ہوگا کہ بغیر کوئی آواز نکالے بالکل خاموشی سے اندر کی باتیں سنتے رہیں اور اس کے بعد فیصلہ کریں کہ کون غلطی پر ہے۔'' کمرے کے دروازے پر پہنچ کر شہریار نے سرگوشی میں ان تینوں سے کہا اور پھر انہیں رضامند پا کر ذیشان کے ساتھ کمرے کے اندر چلا گیا۔ کمرے کا دروازہ اس نے جان بوجھ کر پوری طرح بند کرنے کے بجائے اس میں ہلکی سی جھری چھوڑ دی تھی تاکہ باہر موجود تینوں افراد آسانی سے اندر کی آوازیں سن سکیں۔ ان تینوں کی نگرانی کے لیے البتہ سی ایف پی کا مسلح اہلکار ان کے سروں پر ضرور مسلط تھا تاکہ اگر ان کے عمر رسیدہ جسموں میں اگر جوانی کی کوئی ایسی رمق جاگے جو انہیں کنٹرول سے باہر کرنے لگے تو اسے قابو کیا جا سکے۔

''ہاں بھئی..... کیا فیصلہ کیا تم دونوں بھائیوں نے؟ سچ بولنا ہے یا پھر ہم بولنا سکھائیں؟'' اندر پہنچ کر شہریار نے ہی واجد اور خالد سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ذیشان نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا لیکن وہ کچھ خاموش سا ہو گیا تھا۔

''ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ جو کچھ ہمیں معلوم ہے، ہم آپ کو سچ سچ بتا دیں گے لیکن اس کے لیے ہماری بھی ایک شرط ہے۔'' دونوں بھائیوں نے پہلے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر واجد نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

''کیسی شرط.....؟'' شہریار غرایا۔

''آپ کو ہمیں سلطانی گواہ بنانا ہوگا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ٹھیک ہے، ہمیں منظور ہے۔" شہریار کو تذبذب میں دیکھ کر ذیشان نے اسے جواب دیا۔ وہ کسی صورت اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دونوں بھائی پیر سائیں کے قریبی ساتھی تھے اس لیے ان سے بڑے بڑے انکشافات کی امید تھی۔ وہ خود بھی اگر بہت بڑے مجرم تھے تو ان سے وعدہ کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ سی ایف پی کوئی عام حکومتی اداروں کی طرح تو کام کرتی نہیں تھی کہ وہ لوگ خود کو کسی کا پابند محسوس کرتے۔ یہ تو ان کی اپنی صوابدید پر ہوتا تھا کہ کس مجرم کو تھانے میں بند کروانا ہے، کسے عدالت کے سامنے پیش کرنا ہے اور کسے خود ہی سزا دینی ہے۔ ان کی دی ہوئی سزا عموماً سزائے موت ہی ہوتی تھی کیونکہ ان کے پاس کوئی ایسی جیل وغیرہ تو تھی نہیں جہاں اپنے مجرموں کو قید میں طویل عرصے تک رکھ سکیں۔ سزائے موت کے علاوہ وہ اگر خود سے کوئی سزا دیتے تھے تو وہ قطعی غیر روایتی ہوتی تھی ورنہ قانون میں لکھی ہوئی روایتی سزاؤں کے لیے دیگر محکمے تھے ہی۔

"پیر سائیں کے نام سے مشہور یہ بندہ کئی سال پہلے ہمارے پنڈ میں آیا تھا۔ اس وقت بھی یہاں ایک خانقاہ موجود تھی لیکن وہ موجودہ خانقاہ سے بہت چھوٹی اور معمولی تھی۔ اس وقت اس میں رہنے والے پیر سائیں بھی اتنے مشہور نہیں تھے لیکن تھے سچ مچ اللہ والے۔ بے چارے خاموشی سے اپنی عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے تھے۔ اگر کوئی عقیدت مند اپنی حاجت لے کر آتا تو اسے دعا سے نواز دیتے۔ باقی انہیں کوئی لالچ وغیرہ نہیں تھا۔ موجودہ پیر سائیں ان کے پاس ایک غریب، نادار اور دنیا سے بیزار شخص بن کر آیا اور ان کا مرید بن کر رہنے لگا۔ بڑے پیر سائیں کے مقابلے میں وہ بڑا چرب زبان اور ہوشیار تھا۔ آہستہ آہستہ خانقاہ میں آنے والے لوگوں پر اس کا جادو چلنے لگا۔ وہ بڑے پیر سائیں کی طرح صرف دعا نہیں دیتا تھا بلکہ اس کے پاس کچھ سفوف وغیرہ موجود ہوتے تھے جن سے وہ ٹونے ٹوٹکے کر کے لوگوں کا علاج معالجہ بھی کر دیتا تھا۔ ہمارا باپ پنڈ کے قبرستان کا گورکن تھا اس لیے میرا اور خالد کا قبرستان میں کافی آنا جانا تھا۔ ایک رات میں نے دیکھا کہ پیر سائیں قبرستان میں ہے اور وہاں ایک کھلی ہوئی قبر سے ہڈیاں جمع کر رہا ہے۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور بجائے گھبرانے یا شرمندہ ہونے کے خود چل کر میرے پاس آ گیا اور بولا کہ اگر تم اپنی زبان بند رکھو تو بہت فائدے میں رہو گے ورنہ ابھی اور اسی وقت مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔۔۔ مجھے یہ دھمکی دیتے ہوئے اس نے اپنے میلے کچیلے کپڑوں میں سے پستول نکال لیا۔ پستول دیکھ کر میں ڈر گیا کہ اگر میں نے اس کی گل نہ مانی تو وہ مجھے قتل کر دے گا۔ فیر میں تھا بھی غریب گھر کا بندہ۔ ہمیں ڈھنگ سے پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں ملتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر اس کی گل مان کر مجھے چار پیسے مل گئے تو میرا بھلا بھی ہو جائے گا اور جان بھی بچ جائے گی۔ ویسے بھی وہ قبرستان سے پرانی گلی سڑی ہڈیاں ہی تو لے رہا تھا جس سے کسی کا کیا بگڑنا تھا۔ میں نے اس کی گل ماننے کی ہامی بھر لی۔ وہ میرا جواب سن کر بہت خوش ہوا ہور بولا۔

"یہ تو نے اپنے حق میں وڈا چنگا فیصلہ کیا ہے۔ تو دیکھنا کہ آنے والے دنوں میں، میں کیا سے کیا ہو جاؤں گا ہور اگر تو نے اس وقت بھی میرا ساتھ دیا تو عیش کرے گا۔۔۔۔ عیش۔" مجھ سے یہ کہنے کے بعد اس نے مجھے تھوڑی سی رقم بھی دی اور قبرستان سے چلا گیا۔ مجھے پیسے ملنے کی خوشی تھی ہور اس خوشی میں، میں نے اس کے کہے پر غور بھی نہیں کیا تھا لیکن جب دو دن بعد وڈے پیر سائیں کے مرنے کی خبر ملی اور ان کی جگہ نئے پیر سائیں نے سنبھال لی تو مجھے شک گزرا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔ وچارے وڈے پیر سائیں تو تھے بھی بالکل اکیلے آدمی۔ ان کے بال بچے ہوتے تو ان کی اچانک موت پر غور کرتے۔ پنڈ والوں نے تو اپنا اتنا فرض ادا کیا کہ عزت کے ساتھ انہیں دفنا دیا مگر مجھے چونکہ کھد بد لگ گئی تھی اس لیے میں پیر سائیں کے پاس جا پہنچا اور صاف صاف اپنے شک کا اظہار کر دیا۔ اس نے میرے شک کی تصدیق تو نہیں کی لیکن بولا کہ اگر تم الٹی سیدھی بکواس کرنے کے بجائے میرے مرید بن جاؤ تو میں تمہیں بہت فائدہ پہنچاؤں گا۔ میں پہلے بھی ایک بار اس سے رقم حاصل کر چکا تھا اس لیے لالچ میں آ گیا اور خانقاہ میں اس کے ساتھ رہنے لگا۔ وہ وڈا عجیب آدمی تھا۔ نماز قرآن پڑھتا کبھی نظر نہیں آیا۔ بس جب دیکھو، تب ایک کوٹھری میں گھسا رہتا تھا ہور جانے کون سے جنتر منتر کرتا رہتا تھا۔ اس کے پاس جانے کون کون سے ٹونے ٹوٹکے تھے کہ آنے والے لوگ نامراد نہیں رہتے تھے۔ فیر میں بھی تھا جو اس کی کرامات کو ایک سے چار کر کے لوگوں کے سامنے بیان کرتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے خانقاہ پر آنے والوں کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی۔ اسی حساب سے نذرانے بھی خوب آتے تھے ہور میرا اس میں ٹھیک ٹھاک حصہ ہوتا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ یہ بندہ جو کر رہا ہے، کرنے دو۔ اس سے کسی کو کوئی نقصان تو نہیں ہو رہا بلکہ الٹا لوگ فائدے میں ہی ہیں۔"

واجد ذرا دیر کے لیے سانس لینے کو رکا پھر ان دونوں کی مستقل خود پر جمی نظروں کو دیکھتے ہوئے ایک بار پھر بولنا شروع

ہو گیا۔

"میں پیر سائیں کا خاص مرید تھا لیکن رات کے وقت مجھے بھی خانقاہ میں رکنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ گزرتے برسوں میں خانقاہ کی عمارت وڈی شان دار ہو گئی تھی ہور ادھر بہت سی جگہ تھی۔ پیر سائیں نے باہر سے بندے بلوا کر کے عمارت بنوائی تھی۔ اس عمارت میں ایک تہ خانہ بھی ہے، مجھے معلوم تھا لیکن اس کا مقصد میں نہیں جانتا تھا۔ مجھے بس یہی شک تھا کہ وہ جنتر منتر کرتا ہوگا اس لیے کسی کو خانقاہ میں آنے نہیں دیتا۔ سچ پوچھیں تو اتنے سالوں میں، میں اسے کسی ایک بزرگ کے بجائے سفلی علم کا ماہر سمجھنے لگا تھا اور میرا یہ شک اتنا غلط بھی نہیں تھا لیکن وہ اس کے علاوہ ہور کون کون سے دھندے کرتا ہے۔۔۔۔ یہ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا۔ اس نے دیکھا کہ میں اس کا وفادار ہوں تو وہ آہستہ آہستہ مجھے اپنے رازوں میں شامل کرتا چلا گیا۔ یہ زیادہ پرانی گل نہیں ہے۔ بس ڈیڑھ دو سال پہلے ہی کی گل ہے کہ مجھے معلوم ہوا کہ پیر سائیں ہیروئن ہور اسلحے کا دھندا بھی کرتا ہے بلکہ اس کا اصل دھندا تھا ہی یہ۔ پیری کا ناٹک تو اس نے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے رچایا ہوا تھا۔ رات کے وقت خانقاہ میں اس سے ملاقات کے لیے اس کے گاہک اور سپلائر آتے تھے اس لیے وہ اس وقت کسی کو آنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ مجھے بھی اس نے ہم راز یوں بنایا کہ اکیلے سارے معاملات دیکھنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ دوسرے وہ چاہتا تھا کہ خانقاہ کے علاوہ بھی پنڈ میں اسے ایسا کوئی ٹھکانا مل جائے جہاں وقتِ ضرورت وہ اپنا مال رکھ سکے۔ یہ مکان برسوں سے خالی پڑا تھا، ہور پنڈ والے اسے آسیب زدہ سمجھتے تھے اس لیے میں نے اسے استعمال کرنے کا مشورہ دیا، ہور پھر کچھ اپنے شعبدے بھی دکھائے کہ پنڈ والوں کو مکان کے آسیب زدہ ہونے کا یقین ہو گیا۔۔۔۔ ہور انہوں نے مکان کے قریب بھٹکنا بالکل ہی بند کر دیا۔ مجھے اس ساری خدمت اور راز داری کی وڈی قیمت ملتی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ اپنے بھرا خالد کو بھی شامل کر لیا۔ ہمارا پیو چار پانچ سال ہوئے دنیا سے گزر چکا ہے اس لیے کوئی ہم سے پوچھ تاچھ کرنے والا نہیں تھا ہور کوئی کچھ پوچھنا بھی چاہتا تو نہیں پوچھ سکتا تھا کیونکہ ہم پیر سائیں کے سب سے خاص مرید تھے۔ پیر سائیں کی عقیدت کے علاوہ ہمارے پالے ہوئے غنڈوں کا بھی ڈر تھا جو لوگوں کو ہم سے دور رکھتا تھا۔ یہ غنڈے ہی خانقاہ کے خادم بن کر دن رات وہاں رہتے تھے ہور دھندا سنبھالنے کے علاوہ آنے جانے والوں پر نظر بھی رکھتے تھے۔"

واجد کا اعترافی بیان یہاں تک پہنچا تھا کہ دروازے کے باہر شور شرابا سنائی دینے لگا۔ شہریار فوری طور پر اس شور کا مطلب سمجھتا ہوا باہر نکل گیا اور دروازہ باہر جا کر بند کر دیا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق دروازے سے کان لگائے کھڑے تینوں افراد غیظ و غضب میں مبتلا تھے اور کمرے کے اندر داخل ہونا چاہتے تھے لیکن سی ایف پی کے اہلکار نے انہیں ان کی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دیا اور دروازے سے کافی دور ہٹا لے گیا تھا۔

"کیا تماشا ہے؟ کیوں آپ لوگوں نے یہاں ہنگامہ مچا رکھا ہے؟" اس نے ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ پوچھا۔

"ہمیں اندر جانے کی اجازت دیں صاحب۔ ہم اس مردود کے ٹوٹے ٹوٹے کر دیں گے۔" کچھ دیر قبل پیر سائیں کا سب سے بڑا حمایتی بننے والا غضب ناک لہجے میں بولا۔

"فی الحال ایسا ممکن نہیں ہے۔ وہ ہمارے کام کا بندہ ہے جس سے ہمیں کافی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ آپ لوگوں کو اس سے ہونے والی گفتگو سنانے کا صرف اتنا مقصد تھا کہ آپ سچ خود اپنے کانوں سے سن لیں اور باقی گاؤں والوں کو بھی کنٹرول میں رکھیں کہ ہم نے کسی کی دل آزاری یا بے حرمتی کے لیے یہ آپریشن نہیں کیا ہے بلکہ ان کے سامنے نیکوکار بن کر رہنے والے ایک بڑے مجرم کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ بے شک مجرم یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن اس کا ایک اہم ٹھکانا بھی ختم ہو گیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ اب آئندہ کبھی آپ ایسے کسی فرد کو اپنے درمیان ٹھکانا بنانے بھی نہیں دیں گے۔" اس نے ان لوگوں کو دھیمی آواز میں سمجھایا۔ یہ احتیاط اس لیے تھی کہ کہیں واجد اور خالد تک اس کی آواز نہ پہنچ جائے اور وہ اپنی زبانیں بند کر لیں۔

"ہمیں صاحب کی گل ماننی چاہیے۔ یہ سرکاری افسر ہیں۔ ان کا حکم ماننا ہمارا فرض ہے۔" مذاکرات کے لیے آئے ہوئے تینوں معززین میں سے جو شخص اب تک بالکل خاموش رہا تھا، وہ اس موقع پر بول پڑا اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اپنی خاموشی سے اس کی تائید کر ڈالی۔

"میری آپ لوگوں سے گزارش ہے کہ باہر جا کر لوگوں کو بے شک پیر سائیں کے بارے میں سب کچھ بتا دیں لیکن فی الحال واجد اور خالد کے بارے میں زبان نہیں کھولیے گا۔ وہ پیر سائیں کے خلاف بہت اہم گواہ ہیں اس لیے ان کا زندہ سلامت رہنا ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ ان کے بارے میں بتائیں تو لوگ اشتعال میں انہیں قتل کرنے چڑھ دوڑیں۔ انہیں قتل کر کے کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوگا لیکن ہم بہت سی اہم معلومات حاصل کرلیں گے۔''

انہیں قائل ہوتا دیکھ کر اس نے دھیمی آواز میں ایک اور استدعا کی جو قبول کرلی گئی اور وہ تینوں سر جھکا کر باہر نکل گئے۔ انہیں رخصت کرنے کے بعد وہ واپس کمرے میں لوٹا۔ دونوں بھائی سراسیمہ نظروں سے دروازے کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

''کیا گل ہے سر! کون لوگ اندر گھسنے کی کوشش کر رہے تھے؟'' اسے دیکھتے ہی واجد نے سوال کیا۔ وہ عمر میں بڑا تھا اور پیر سائیں سے اس کے تعلقات بھی زیادہ قریبی اور دیرینہ تھے اس لیے اب تک ساری گفتگو وہی کر رہا تھا۔ خالد کسی سعادت مند چھوٹے بھائی کی طرح ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔

''گاؤں کے کچھ مشتعل افراد اندر آگھسے تھے۔ کسی طرح باہر یہ خبر پھیل گئی ہے کہ اس مکان میں منشیات اور اسلحے کا ذخیرہ موجود ہے چنانچہ گاؤں والے ان لوگوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے خواہش مند ہیں جنہیں یہاں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔'' اس نے انہیں ہراساں کرنے کے لیے حقائق کو توڑ مروڑ کر بیان کیا۔ ان کے چہروں پر موجود دہشت نے بتادیا کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا ہے۔

''تم اتنے پریشان نہ ہو۔ فی الحال میں نے ان لوگوں کو ٹال دیا ہے کہ مجرموں سے نمٹنا قانون کا کام ہے اس لیے ہم کسی شخص کو آپ لوگوں کے حوالے نہیں کرسکتے۔ اب تمہارا بھی فرض ہے کہ ہمارے ساتھ تعاون کرو ورنہ دوسری صورت میں ہم تمہیں ان لوگوں کے حوالے کردیں گے۔ ہم مصروف لوگ ہیں اور خوانخواہ کا بوجھ ڈھوتے پھرنے کے قائل نہیں۔ اگر تم ہمارے لیے بیکار ثابت ہوئے تو ہم تمہیں یہیں پھینک جائیں گے اور یہ تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو کہ تمہارے پنڈ کے لوگ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرسکتے ہیں۔'' وہ لوہا گرم دیکھ کر اس پر مزید چوٹیں لگانے سے باز نہ آیا۔ ذیشان ایک طرف خاموش کھڑا تھا اور اس کی کارکردگی سے مطمئن نظر آرہا تھا۔

''ہم وعدہ کرتے ہیں سر! اب تک بھی میں نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے بالکل سچ بتایا ہے۔ آگے بھی جہاں تک ہوسکا، ہم آپ سے تعاون کریں گے۔'' واجد نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ وہ بے شمار لوگوں کے ہاتھوں اپنی تکا بوٹی ہونے کے خیال سے ہی لرزاں تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت خالد کی تھی۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ تم اپنا بیان جاری رکھو۔ ہم خود فیصلہ کرلیں گے کہ تم ہمارے لیے کتنے مفید ہو۔'' اس بار ذیشان نے گفتگو میں مداخلت کی اور اپنے سیٹ پر آنے والا پیغام پڑھنے لگا۔

''ہور کیا سر! ساری گل تو میں نے آپ کو بتادی ہے۔ پیر سائیں کیا دھندا کر رہا تھا، وہ آپ خود بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔ ادھر ہم مال وصول کرتے تھے، ہور بعد میں وہ اسے آگے سپلائی کر دیتا تھا۔ اگر سپلائی کرنے میں ٹیم ہوتا تو مال خانقاہ کے تہ خانے میں رکھ دیا جاتا ورنہ ادھر سے ہی آگے بڑھا دیتے۔ اس واری بھی ارجنٹ سپلائی تھی اس لیے ہم نے مال یہاں سے اٹھایا نہیں تھا۔ اب ملوم نہیں کہ آپ لوگوں کو اس کی خبر کیسے ہوگئی۔ میرے پاس بالکل اخیر میں پیر سائیں کا فون آیا تھا کہ واجد پنڈ سے نکل جاؤ ادھر چھاپا پڑنے والا ہے لیکن مجھے نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا ہور رینجرز والے پہلے ہی پہنچ گئے۔ میں بچنے کے لیے ٹاہلی کے جھنڈ میں چھپ گیا جدھر سے آپ لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔'' اس نے گویا قصہ ختم کردیا۔

''تمہارا پیر سائیں یہاں سے کب فرار ہوا تھا اور کیسے؟ رینجرز والوں نے تو پنڈ میں داخل ہوتے ہی اس مکان پر ریڈ کیا تھا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا لیکن انہیں اس کا کوئی نام و نشان نہیں ملا۔'' اس کی رکی ہوئی گاڑی کو آگے بڑھانے کے لیے شہریار نے سوالوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ذیشان خاموشی سے یہ کارروائی دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے سیٹ پر بھی مصروف تھا۔

''میرے خیال میں وہ پہلے ہی ادھر سے نکل گیا تھا۔ اس کے پاس ایک شان دار گھوڑا تھا جسے وہ کبھی کبھار اردگرد آنے جانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ وہ اسی گھوڑے پر گیا ہوگا۔ خود کو بچانے کی فکر میں اسے میرا خیال بھی بعد میں آیا ہوگا اس لیے اس نے مجھے دیر سے فون کیا۔ میں خود ایسا بدحواس تھا کہ خالد تک کو فون کرنا بھول گیا۔'' واجد نے جواب دیا۔

''پیر سائیں کا فون نمبر بتاؤ۔'' اس نے حکم دیا۔

''نمبر اس موبائل میں ہے جو آپ کے ساتھیوں نے تلاشی میں میری جیب سے نکالا تھا۔ اس نمبر پر میں نے دوبارہ فون کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن نمبر بند جا رہا تھا۔'' واجد نے بتایا تو وہ معنی خیز انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے امید تھی کہ اب وہ بھگوڑا پیر سائیں کبھی اس نمبر کو استعمال نہیں کرے گا۔

''تمہارے اس پیر سائیں کا نام کیا تھا؟''

''ملوم نہیں جی۔ نام اس نے کبھی بتایا نہیں۔ وڈے

پیر سائیں کی زندگی میں خود کو فقیر کہلواتا تھا پھر پیر سائیں بن کر بیٹھ گیا۔ سب اسے یہی کہتے تھے ہور اس نے کبھی پوچھنے پر بھی اپنا نام نہیں بتایا تھا۔''

''مال پہنچانے والوں اور لے جانے والوں میں سے تم جن جن افراد کو جانتے ہو، ان کے نام پتے بتاتے جاؤ۔'' اس نے تفتیش کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

''ان میں سے کوئی میری جان پہچان کا نہیں ہے۔ لانے اور لے جانے والے دونوں ہی کی طرف کے بندے خاموشی سے آکر اپنا کام نمٹا لیتے ہیں۔ ہمیں آپس میں گل بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ مال کدھر سے آ رہا ہے، کون لا رہا ہے یا کدھر جائے گا ہور کون لے جائے گا، یہ سارے مالے پیر سائیں آپ نمٹاتا تھا۔ ہم لوگ تو صرف نگراں ہور مزدور تھے۔'' واجد نے صاف ہری جھنڈی دکھائی۔

''پھر بھی تم ان میں سے کچھ لوگوں کو تو پہچانتے ہوگے؟ ہر بار سارے نئے لوگ تو تمہارے سامنے نہیں آتے ہوں گے..... کچھ لوگوں سے بار بار بھی تمہارا واسطہ پڑتا ہوگا؟'' اس نے ہمت نہیں ہاری اور تحمل سے پوچھ تاچھ کا سلسلہ جاری رکھا۔

''ہاں تھے تو ایسے کچھ لوگ پر ان کے بارے میں بھی میں آپ کو زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا۔ بس ان کے حلیے وغیرہ ہی بتا سکتا ہوں۔'' وہ پرسوچ انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے۔ ابھی رہنے دو۔ یہ باتیں ہم تم سے بعد میں تفصیل سے پوچھیں گے۔ تم اپنا ذہن بنالو۔'' اس کے مزید تفصیلات میں جانے سے پہلے ذیشان نے گفتگو میں دخل دیا پھر شہریار کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے آدمی یہاں پہنچ چکے ہیں۔ ان کے ساتھ ہر طرح کے ماہرین بھی موجود ہیں۔ ہمیں پہلے ان کے ساتھ مل کر یہاں کے معاملات نمٹانے ہوں گے۔ ان لوگوں سے باقی تفتیش ہم بعد میں اپنے مرکز پہنچ کر کریں گے۔''

''او کے، ایز یو وش۔'' وہ فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں سی ایف پی کے اہلکاروں کی کارروائیاں شروع ہوگئیں۔ ان کے کرنے کے لیے وہاں بے شمار کام تھے جنہیں وہ نہایت مستعدی اور برق رفتاری سے نمٹا رہے تھے۔ ذیشان بھی ان کے ساتھ مصروف تھا اور مختلف ہدایات جاری کر رہا تھا۔ اس دوران میں اس کا اپنے افسرانِ بالا سے بھی وقتاً فوقتاً رابطہ ہوتا رہا تھا اور وہ انہیں بھی یہاں کی رپورٹس پہنچا رہا تھا۔

اس موقع پر شہریار کو ایک طرف ہو جانا پڑا..... وہ کتنا

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مارچ 2012ء

کے جھلملاتے

رنگوں کی دلکش کہکشاں

سودے بازی

بہت انتظار کے بعد آخری صفحات پر **احمد اقبال**

کے قلم کا جادو... کچھ پانے اور کچھ کھو دینے کا اذیت ناک احساس....

وہ جو بہت بڑا بیوپاری تھا، کبھی زندگی کی کوئی سچی خوشی نہ خرید سکا

شہید ہند

ابتدائی صفحات پر **ڈاکٹر ساجد امجد**

کے قلم سے، تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہوئے

ایک اور عہد ساز شخصیت کے حالات زندگی......

گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی کو بہتر

جاننے والے ٹیپو سلطان کا دبنگ اندازِ حکومت

ضرورت مند

مرزا امجد بیگ کی جرح اور ایک ضرورت مند کا اقدام

قتل...... مگر افسوس اس بھکاری کی جھولی پھر بھی خالی رہی

مسافر

سلسلے وار صفحات پر **ناصر ملک** کا چونکا دینے والا طویل

سلسلہ۔ گل وگلزار سے راہِ پرخار تک ایک مسافر بے نوا کی رودادِ حیات

حضرت داؤد علیہ السلام

پرندوں کی زبان سمجھنے والے اور پتھروں کی پکار سننے والے

نبی کی سوانح...... انہیں نبوت اور بادشاہت بیک وقت ملی

اور کئی مستقل سلسلے کشکول، محفل شعر و سخن، آپ کے خط

مزید ابرار احمد راحت، کاشف زبیر، مختار آزاد، ڈاکٹر شیر شاہ سید، سلیم انور اور تنویر ریاض کے دلکش شاہکار آپ کے منتظر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی محبِ وطن اور وفادار سہی لیکن سی ایف پی کا ملازم نہیں تھا اس لیے اس کا براہِ راست ان کے معاملات میں دخل دینا مناسب بھی نہیں تھا۔ وہ بس خاموش تماشائی بنا وہاں ہونے والی کارروائیاں دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں ان کے نظم وضبط اور مہارت کو سراہتا رہا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے اندر انہوں نے وہاں اپنی کارروائی مکمل کرلی اور واپسی کی تیاری کرنے لگے۔ ہیروئن اور اسلحے وغیرہ کا اسٹاک رینجرز کی نگرانی میں روانہ کیا گیا۔ ان چیزوں کو ٹھکانے لگانا انہی لوگوں کے ذمے تھا۔ اس ذخیرے کو پکڑنے کا کریڈٹ بھی انہیں ہی ملتا۔ سی ایف پی کو ایسے کسی کریڈٹ سے کوئی غرض نہیں تھی، نہ انہیں میڈیا پر آکر اپنے کارنامے کی تشہیر کرنی تھی۔ درحقیقت ان کے نزدیک یہ کوئی کارنامہ تھا بھی نہیں۔ ان کا اصل کام تو شروع ہی یہیں سے ہوا تھا۔ انہیں ان ذخائر سے زیادہ ان افراد میں دلچسپی تھی جو اس کے پیچھے اصل کردار ادا کررہے تھے۔ سازش کی بنیاد تک پہنچے بغیر ایسی چھوٹی موٹی کامیابیاں حاصل کرنا ان کے نزدیک غیر اہم اور بے معنی تھا۔ اس موقع پر انہوں نے واجد اور خالد کے علاوہ دیگر گرفتار شدگان کو بھی رینجرز کے ہی حوالے کردیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ جو بھی سلوک کرتے، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ روانگی کے وقت ہی یہ بات بھی شہریار کے علم میں آئی کہ مقامی تھانے کے چھ افراد پر مشتمل عملے کو بھی معطل کرکے زیرِ حراست لیا جاچکا ہے۔ یہ کام بھی ان کے ٹاہلی والا میں داخلے سے قبل ذیشان کی ہدایت پر رینجرز اہلکاروں نے ہی انجام دیا تھا۔

خاص بات یہ ہوئی تھی کہ تھانے دار کو بھی سی ایف پی نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا لیکن ظاہر یہ کیا گیا تھا کہ وہ عملے کی گرفتاری سے پہلے ہی فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ شہریار بہت غور سے ان لوگوں کے طریقۂ کار کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اہم نکات کو فوکس کرکے بڑی سرعت سے کام کرنے والے لوگ تھے جن کی کارکردگی قابلِ تعریف تھی۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ کئی گھنٹے گزارنے کے بعد واپسی کے راستے پر عازمِ سفر ہوا تو ذہن کئی سمتوں میں تقسیم ہوچکا تھا۔ اگر ایک طرف یہ اطمینان تھا کہ ایک قابلِ قدر ادارہ ملکی سلامتی کے لیے فعال ہے، دوسری طرف دشمنوں کے بارے میں بھی اس بات کا بخوبی اندازہ لگا چکا تھا کہ ان کی جڑیں بہت گہرائی تک اتر چکی ہیں اور وہ کسی عفریت کی طرح اس وطن کو کھانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ان کے ان ناپاک عزائم کو کامیاب بنانے کے لیے ٹاہلی والا کے تھانے دار، واجد اور خالد جیسے کئی بے ضمیر و لالچی لوگ مددگار و معاون تھے۔ اسے اس کیکڑے نما شے کی طرف سے بھی تشویش تھی جسے ذیشان نے اس کی ٹی شرٹ سے علیحدہ کیا تھا اور پھر نہایت خاموشی سے اٹھا کر باہر کی طرف لے گیا تھا۔ وہ ٹاہلی والا سے باہر نکلے تو اس کی الجھن زبان پر آگئی۔

”میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں ذیشان؟“

”وہ ایک جدید ڈیوائس تھی جس کی مدد سے ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کہیں اور سنی جارہی تھی۔ میں نے باہر لے جاکر اسے ضائع کردیا تھا لیکن میرا اندازہ ہے کہ پیر سائیں کی گرفتاری میں ہونے والی ناکامی کے پیچھے اسی ڈیوائس کا ہاتھ ہوگا۔“ اس کے لبوں سے سوال ادا ہونے سے پہلے ہی ذیشان نے گمبھیر سنجیدگی کے ساتھ اسے مختصر جواب سے نواز دیا جسے سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ایسی کوئی ڈیوائس مجھ تک کیسے پہنچی؟“ اس نے بیک وقت حیرانی اور پریشانی سے سوال کیا۔

”یہ تم سوچ کر بتاؤ اور غور کرو کہ اس مشن پر نکلتے وقت کن افراد سے تمہارا اس طرح سے واسطہ پڑا تھا کہ وہ موقع کا فائدہ اٹھا کر ڈیوائس تمہاری ٹی شرٹ پر چسپاں کرسکتے۔ یہ خیال رکھنا کہ اس ڈیوائس کو تمہارے ساتھ نتھی کرنے کے لیے بس چند سیکنڈوں ہی کی ضرورت تھی۔ اسے بہت آسانی سے کسی اسٹیکر کی طرح تمہارے کپڑوں کے ساتھ چپکایا جاسکتا تھا۔“ ذیشان سنجیدہ تھا لیکن اس کے انداز میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ جس سے وہ یہ اندازہ لگاتا کہ وہ اس پر شک کر رہا ہے۔ وہ بہت بردباری کے ساتھ اسے حقیقت سے آگاہ کرنے کے ساتھ مشوروں سے نواز رہا تھا۔ اس کے رویے کا کمال تھا کہ شہریار اچانک لگنے والے شاک سے فوراً ہی سنبھل گیا اور غور کرنے لگا کہ یہ کس کی حرکت ہوسکتی ہے۔ غور کرتے ہوئے اسے سی ایف پی کا وہ اہلکار یاد آیا جس سے اس کا سی ایف پی کے دفتر میں زیرِ زمین عمارت میں جاتے ہوئے سیڑھیوں پر ٹکراؤ ہوا تھا۔ وہ ٹکراؤ لمحاتی تھا لیکن مقابل کو اتنی مہلت بہرحال ملی تھی کہ اگر وہ چاہتا تو اس کی ٹی شرٹ پر وہ ڈیوائس چسپاں کردیتا۔ اس شخص کے علاوہ اس کا صرف ماریا سے قریبی واسطہ پڑا تھا۔ وہ اسے رخصت کرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے جذباتی ہوگئی تھی اور اس طرح سے اس کے وجود سے لپٹ گئی تھی کہ اس کے لیے ڈیوائس کو اس کے ساتھ اٹیچ کرنا بے حد آسان تھا۔ ماریا کا خیال ذہن میں آنے کے باوجود وہ اس پر شک کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اس کی شریکِ حیات تھی اور شادی شدہ زندگی کے مختصر سے دورانیے میں ہی خود کو ایک اچھی بیوی کے ساتھ ساتھ انسان دوست

بھی ثابت کرچکی تھی۔ ذرا سی دیر میں ایسے کئی واقعات اس کے ذہن سے گزر گئے جب اس نے ماریا کی اچھائی کا مشاہدہ کیا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود ستم رسیدہ تھی۔ چودھری نے اپنی بدمعاشی سے اسے پیر آباد والے مرکزِ صحت میں کام کرنے کے لیے راضی کیا تھا اور وہ اس کی دھمکیوں سے خوف زدہ ہوکر نہ چاہتے ہوئے بھی لاہور سے اپنی پریکٹس چھوڑ کر وہاں آنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ وہ چودھری کے ہاتھوں جسمانی استحصال اور بلیک میلنگ کا بھی شکار ہوتی رہی تھی۔ وہ تو شہریار سے شادی کے بعد اس کی جان چھوٹی اور ایک مضبوط سہارا ملنے کے بعد چودھری نے اس کا پیچھا چھوڑا۔

اگر وہ جرائم پیشہ افراد کے کسی اتنے مضبوط نیٹ ورک سے جڑی ہوتی تو چودھری کے ہاتھوں کھلونا ہرگز بھی نہ بنتی۔ دل ہی دل میں ماریا کے حق میں دلائل دیتے ہوئے اسے اچانک ہی ایک بات یاد آئی۔ اس سے قبل بھی جب وہ ذیشان سے ملاقات کے لیے جارہا تھا تو ماریا نے گٹار کی شکل کی ایک ٹائی پن اس کی ٹائی میں لگائی تھی۔ بچکانا محسوس ہونے کی وجہ سے اس نے وہ ٹائی پن نکال کر کوٹ کی جیب میں رکھ لی تھی لیکن سوئے اتفاق کہ وہ ٹائی پن جیب میں جانے کے بجائے باہر ہی کہیں گر گئی۔ ذیشان سے ملاقات کے بعد وہ گھر واپس پہنچا تو ماریا نے اس سے ٹائی پن کے بارے میں استفسار کیا تھا اور اس کے کھو جانے کا سن کر ناراض بھی ہوئی تھی۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ ٹائی پن بھی کوئی ڈیوائس تھی جس کی مدد سے ماریا اس کی اور ذیشان کی ملاقات کا حال جاننا چاہتی تھی یا پھر واقعی وہ ایک بیوی کا اپنے شوہر کے لیے محبت بھرا تحفہ تھا؟ اس کا ذہن الجھ سا گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ فی الوقت وہ اس سلسلے میں ذیشان سے کچھ نہیں کہے گا اور اپنے طور پر ماریا کو چیک کرے گا۔ البتہ سی ایف پی کے اہلکار سے اپنے ٹکراؤ کے بارے میں اس نے ضرور بتا دیا۔

”کیا تم اس کو پہچان لو گے؟“ اس کی بات سن کر ذیشان نے فوراً ہی سوال کیا۔

”نہیں، اس وقت چونکہ میں جلدی میں تھا اور وہ واقعہ پیش بھی بس چند سیکنڈوں میں آیا تھا، اس لیے میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔“ اس کا جواب ذیشان کے لیے مایوس کن تھا۔

”تم نے مجھے بہت بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ میرے نزدیک سی ایف پی ایک ایسا ادارہ ہے جس کا ہر رکن مخلص، ایمان دار اور محبِ وطن ہے۔ یہاں کسی ایسے شخص کا

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کرکے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وجود جسے کالی بھیڑ کہا جاسکے، میرے لیے بے حد تشویش ناک ہے۔ پھر تم اس شخص کی نشان دہی بھی نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں تو میرے لیے میرا ہر ماتحت مشکوک ہو جائے گا۔ تم خود سوچو کہ ان حالات میں، میں اپنی ٹیم کے ساتھ کس طرح کام کر سکوں گا؟'' ان کی واپسی اسی لینڈ کروزر میں ہو رہی تھی لیکن ڈرائیور کے علاوہ اب عملے کا کوئی فرد ان کے ساتھ نہیں تھا اس لیے وہ سرگوشیوں میں سہی لیکن کھل کر اس موضوع پر بات کر رہے تھے۔

''میں نے صرف ایک شبہ ظاہر کیا ہے۔ ہو سکتا ہے میرا اندازہ غلط ہو اور وہ ڈیوائس کسی اور شخص نے میرے کپڑوں سے اٹیچ کی ہو۔''

''سوال پھر وہی پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص کون ہے؟'' ذیشان اس کی بات سن کر بولا تو اس کے تصور میں ایک بار پھر ماریا کا چہرہ ابھرا لیکن اس نے اس بار بھی ذیشان سے اپنے اندیشے کا ذکر کرنے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی اور کھڑکی کے شیشوں کے پار تیزی سے گزرتے مناظر کو خالی الذہنی کی کیفیت کے ساتھ دیکھتا رہا۔

☆☆☆

حامد راؤ کے چھوٹے سے فلیٹ میں اس وقت جشن کا سا سماں تھا۔ وہ سب پورے جوش و خروش کے ساتھ مختلف چینلز سے نشر کی جانے والی خبریں دیکھ رہے تھے۔ ان خبروں کا تعلق ٹاہلی والا سے تھا۔ نیوز کاسٹر نے جو تفصیلات بتائی تھیں، ان کے مطابق ٹاہلی والا میں قائم خانقاہ کا سارا کچا چٹھا کھل گیا تھا۔ برسوں سے لوگوں کو اپنی اندھی عقیدت میں مبتلا رکھنے والا پیر سائیں ایک اسمگلر اور ملک دشمن کے طور پر سامنے آیا تھا جس نے صرف اپنے مکروہ کاروبار پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے پیر سائیں کا بہروپ اختیار کر رکھا تھا۔ خبروں میں بار بار منشیات، اسلحے اور بارود کے ذخائر کی فوٹیج دکھائی جا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ پاک رینجرز کی کارکردگی کو بھی خوب سراہا جا رہا تھا جس نے اتنی بڑی سازش کا پتا چلا کر کارروائی کی۔ سی ایف پی حسب روایت اپنا اصل کام انجام دینے کے بعد پسِ پردہ چلی گئی تھی اور سارا کریڈٹ رینجرز والوں کو ملا تھا۔

رینجرز کے افسران کی اکڑی ہوئی گردنیں فوٹیج میں واضح طور پر دیکھی جا سکتی تھیں اور راؤ فیملی ان مناظر کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ خبروں میں واضح طور پر بتایا گیا تھا کہ اس سارے دھندے کو چلانے میں خانقاہ پر رہنے والے مریدوں کے ساتھ ساتھ مقامی تھانے کا عملہ بھی پوری طرح شامل تھا۔ مریدوں اور پولیس اہلکاروں کی گرفتاری کی خوش خبری کے ساتھ یہ ایک بری خبر بھی سنائی گئی تھی کہ اس سارے واقعے کا اصل کردار پیر سائیں اور اس کے ٹکڑے کھا کر سرکار سے نمک حرامی کرنے والا تھانے دار ریڈ سے قبل ہی ٹاہلی والا سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ان دونوں مجرموں کے فرار ہونے پر ان سب کو بہت دکھ تھا لیکن پھر بھی وہ خوش تھے کہ بہت سے مسائل سے خود بخود ہی نکل آئے ہیں۔ ٹاہلی والا میں ان کے مکان اور کھیتوں کو بے شک نذرِ آتش کر دیا گیا تھا لیکن وہ اتنے بحیثیت اور باہمت تھے کہ واپس اپنی جگہ پر لوٹ کر نئے سرے سے زندگی کا آغاز کر سکتے تھے۔ واپس لوٹنے کا ارادہ تو خیر وہ پہلے بھی رکھتے تھے لیکن خود اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہیں کافی ہاتھ پیر مارنے پڑتے، خصوصاً اس لیے بھی کہ پیر سائیں کے وحشی مرید اور اندھے عقیدت مند ان کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ اب مرید تو گرفتار ہو چکے تھے اور یقیناً عقیدت مندوں کی آنکھوں پر بندھی پٹی بھی کھل چکی تھی، اس لیے واپسی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ لوگ خبریں دیکھتے ہوئے جلد از جلد گاؤں واپس لوٹنے کے پروگرام بنا رہے تھے۔ ساتھ ہی یہ امید بھی کی جا رہی تھی کہ شفقت راؤ تک بھی جب یہ خبریں پہنچیں گی تو وہ جلد ان سے آ ملے گا۔

''کیوں بھئی اسلم پتر! تمہارا کیا ارادہ ہے...... ہمارے ساتھ پنڈ واپس چلو گے یا یہیں رہ کر کام کاج کرنے کا ارادہ ہے؟ ہم نے انتخاب تم پر چھوڑ دیا ہے۔ تم جہاں چاہو رہ کر ہمارے ساتھ کام کر سکتے ہو یا اگر چاہو تو ہم سے الگ بھی کہیں اور کام دھندا دیکھ سکتے ہو۔ ہماری طرف سے تمہیں فیصلے کا پورا اختیار ہے۔ تم پر کوئی زور زبردستی نہیں ہے، جو چاہو کرو۔ ہمارے گھر اور دل کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔'' ٹی وی پر کمرشل بریک چلنے لگا تو حامد راؤ نے اپنی توجہ وہاں سے ہٹا کر اسلم کی طرف مبذول کی اور اس سے دریافت کرنے لگے۔

''ابھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے چاچا جی! ہمیں سوچنے کے لیے تھوڑی سی مہلت چاہیے۔'' اسلم فوری طور پر ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے تذبذب میں پڑ گیا تو ماہ بانو نے خود جواب دینے کی ذمے داری سنبھال لی۔ اس نے یہ مہلت اس لیے مانگی تھی کہ اسے شہریار کے جواب کا انتظار تھا۔ اگر وہ لوگ اس کے تعاون سے ملک سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تو یہ ان کے لیے سب سے بہتر ہوتا ورنہ یہاں رہنے میں مسلسل ان کے سروں پر خطرے کی تلوار ہی لٹکی رہتی کہ

جانے کب چودھری کا کوئی پٹھو اس تک رسائی حاصل کر لے یا اسلم کو ایک مفرور ڈاکو کی حیثیت سے شناخت کر کے گرفتار کر لیا جائے۔

''جیسا تم دونوں مناسب سمجھو۔ ہم تو تمہاری خوشی میں خوش ہیں۔'' حامد راؤ نے مہلت طلب کرنے پر کسی قسم کے تجسس کا اظہار نہیں کیا اور کھلے دل سے انہیں فیصلے کی آزادی دے کر خود مسعود کی طرف متوجہ ہو گئے جو ٹی وی پر خبریں دیکھنے کے ساتھ ساتھ فون پر اپنے ذرائع سے بھی ان کی تصدیق کر رہا تھا۔ وہ فون بند کر کے فارغ ہوا تو وہ اسے ہدایات دینے لگے کہ پنڈ واپسی سے قبل انہیں کن کن امور پر غور کرنا ہوگا اور وہاں گھر کے تباہ ہو جانے کے باعث خواتین کی واپسی کو کتنے عرصے تک مؤخر کرنا پڑے گا۔ تھوڑی سی تشویش انہیں وہاں سے فرار ہوتے وقت کی جانے والی فائرنگ سے زخمی اور ہلاک ہونے والوں کی طرف سے تھی۔ یقیناً انہیں وہاں لوٹ کر ان مسائل سے بھی نمٹنا پڑتا لیکن بہر حال یہ امید ضرور تھی کہ سیلف ڈیفنس میں کی جانے والی اس کارروائی پر وہ زیادہ مشکل میں گرفتار نہیں ہوں گے۔

دونوں باپ بیٹے کو گفتگو میں منہمک دیکھ کر اسلم نے ماہ بانو کو وہاں سے اٹھنے کا اشارہ کیا اور جب وہ دونوں وہاں سے نکل کر علیحدہ کمرے میں پہنچے تو معمولی سی جھنجلاہٹ کے ساتھ بولا۔

''آخر تمہیں راؤ صاحب کی پیشکش قبول کرنے میں کیا قباحت محسوس ہو رہی ہے؟ میرے خیال میں تو ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں، ان میں یہ ایک اچھی پیشکش ہے۔ رہائش اور روزگار کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور راؤ صاحب اپنے اثر رسوخ سے کام لے کر ہمارے شناختی کاغذات بھی بنوا دیں گے۔''

''یہ سب تو ہو جائے گا لیکن تم ان لوگوں کو کیوں بھول رہے ہو جو بو گیر کتوں کی طرح ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ ٹاہلی والا پیر آباد سے اتنی دور نہیں ہے کہ چودھری کے کتے میری تلاش میں وہاں تک نہ پہنچیں۔ میں نے اس ملک کے طول و عرض میں بہت بھاگ کر دیکھ لیا ہے اسلم..... میرے دشمن ہر جگہ میرے پیچھے پہنچ جاتے ہیں۔ اب میں یہاں سے کہیں دور نکل جانا چاہتی ہوں تاکہ کچھ تو سکھ سے رہنے کی صورت بنے۔'' اس نے دل گیر لہجے میں اسلم کی بات کا جواب دیا تو وہ چونک گیا۔

''ملک سے باہر تم کہاں جانا چاہتی ہو؟''

''کچھ معلوم نہیں، بس جہاں قسمت لے جائے۔'' اس کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔

''لیکن کیسے؟ یہ سب کیسے ہوگا؟ ہمارے پاس ایسے وسائل ہی کہاں ہیں جو یہ کام ہو سکے۔ پھر میں پولیس کو مطلوب بھی ہوں۔ اگر ائرپورٹ پر ہی دھر لیا گیا تو۔۔۔؟'' اسلم نے سوالات اٹھائے۔

''مجھے معلوم ہے کہ یہ مشکل کام ہے لیکن پھر بھی امید سی ہے کہ جس سے مدد کے لیے درخواست کی ہے، وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ رہی تمہارے ائرپورٹ پر دھر لیے جانے کی بات تو میرے خیال میں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ یہاں تم سے بہت بڑے بڑے مجرم آسانی سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ویسے بھی میں نے جس شخص کے ذمے یہ کام لگایا ہے، اسے معلوم ہے کہ تم کون ہو اور تمہاری حقیقت کیا ہے۔ وہ خود ہی دیکھ بھال کر سارا انتظام کرے گا۔''

''آخر وہ کون ہے جس پر تمہیں اتنا اعتماد ہے؟'' اسلم نے حیرانی سے پوچھا۔

''وہی جسے میں اپنے نکاح کے موقع پر بلانا چاہتی ہوں۔ میں نام نہیں بتاؤں گی، تم اسی روز ان سے مل لینا۔''

''لگتا ہے وہ تمہارا کوئی بہت ہی قریبی عزیز ہے۔'' اسلم کے لہجے میں خود بخود حسد کی ہلکی سی جھلک ظاہر ہو گئی۔

''تم جو بھی سمجھ لو لیکن بس مجھے اس شخص پر بھروسا ہے۔ اگر اس نے میرے یقین کو توڑا تو پھر ہمارے اس سیکنڈ آپشن راؤ صاحب کی پیشکش کو ہی قبول کرنا ہوگا۔ اسی لیے میں نے احتیاطاً انہیں کوئی واضح جواب نہیں دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔ بس یہ خیال رکھنا کہ ہم بہت نازک حالات سے گزر رہے ہیں اور ہمارے پاس زیادہ دیر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ماہ بانو کچھ دیر تو اپنی جگہ ساکت بیٹھی رہی لیکن پھر اندرونی بے چینی نے زیادہ دیر تک ایک جگہ بیٹھنے نہیں دیا اور وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اسے اس بات سے انکار نہیں تھا کہ اسلم کے اندیشے درست بھی نکل سکتے ہیں۔ وہ تو بس ایک انجانے سے احساس کے تحت شہریار پر بھروسا کیے بیٹھی تھی، ورنہ بہر حال شہریار اس کا پابند نہیں تھا کہ اس کی ہر خواہش اور مطالبہ پورا کر دیتا۔

کمرے کے مختصر طول و عرض میں چکر پر چکر لگاتی وہ مسلسل اپنے یقین اور اسلم کے اندیشوں کا موازنہ کرتی رہی اور بالآخر بے چینی اس حد تک بڑھی کہ وہ شہریار کا خصوصی موبائل نمبر ڈائل کرنے پر مجبور ہو گئی۔ دوسری طرف سے فوراً

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی کال ریسیو کی گئی۔

''السلام علیکم۔'' شہریار کی آواز سن کر اس نے کانپتی ہوئی آواز میں سلام کیا۔ یہ طے تھا کہ وہ دونوں الگ الگ راہوں کے مسافر ہیں پھر بھی دل اس کی آواز سن کر اپنی دھڑکن کی ''لے'' بدلنے سے باز نہیں آتا تھا۔

''وعلیکم السلام! کیسی ہو؟'' اس نے متانت سے سلام کا جواب دیتے ہوئے دریافت کیا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپ...اسے ایک کام کہا تھا اس کے بارے میں پوچھنا تھا۔'' وہ ہمت کر کے فوراً ہی اصل مطلب پر آگئی۔

''کام تم نے ایک نہیں، کئی ایک کہے تھے .... لیکن فکر نہیں کرو، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی تو تم یہ بتاؤ کہ نکاح کا پروگرام کب ہے تا کہ تمہاری فرمائش پر میں اس میں شرکت کے لیے تیار رہ سکوں اور اس دن اپنا کوئی اور پروگرام نہ رکھوں۔''

''شناختی کاغذات کے بغیر قانونی کارروائی میں پریشانی ہوگی اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ پہلے یہ کام ہو جائے۔'' اسے لگا کہ شہریار کا لہجہ کچھ عجیب سا ہے پھر بھی حقیقت بیان کر دی۔

''تمہاری راہ کی یہ رکاوٹ تو سمجھو دور ہو گئی۔ تمہیں شاید یاد نہیں رہا لیکن جب میں نے تمہیں کراچی میں ایڈمیشن دلوایا تھا تو مہرین کے نام سے تمہارے نئے شناختی کاغذات بھی تیار کروائے تھے۔ اسلم کے لیے بھی میرا خیال ہے کہ نئے کاغذات بنوانے کے بجائے اس کے پرانے کاغذات وغیرہ کی ہی ڈپلیکیٹ نکلوا دوں۔ یہ کام ایک دو دن میں ہو جائے گا۔ میں ذرا دوسرے معاملات میں الجھ گیا تھا اس لیے تھوڑی سی تاخیر ہو گئی۔'' اس بار وہ سنجیدگی سے بتانے لگا۔

''آپ کا بہت شکریہ سر! مجھے آپ پر یقین تھا اسی لیے آپ سے مدد کی درخواست کی تھی۔'' اس کا جواب سن کر ماہ بانو نے فوراً ہی ممنونیت کا اظہار کیا۔

''تمہارے اس یقین پر پورا اترنے کے لیے مجھے اپنے اصولوں کو توڑنا پڑا ہے۔'' شہریار کی آواز میں شکوہ اتر آیا۔

''سوری سر! میں خود بھی اس بات کو سمجھتی ہوں لیکن سکون سے جینے کی ایک راہ نظر آئی تو تھوڑی سی خود غرضی پر اتر آئی۔'' اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں اپنی مجبوری بیان کی۔

''او کے! تم خوش رہو، میرے لیے یہی سب سے اہم ہے۔'' اس نے گویا بات ہی ختم کر دی لیکن ماہ بانو کا دل ایک بار پھر بے طرح دھڑکنے لگا۔ روانی میں شہریار یہ کیا کہہ گیا تھا۔ کیا واقعی وہ اس کے لیے اتنی اہم تھی کہ اس کے لیے اس کی خوشی ہر شے سے بڑھ کر تھی۔

''ٹاہلی والا سے متعلق خبروں کا تمہیں علم تو ہو گیا ہوگا۔ رینجرز نے وہاں کافی بڑی کارروائی کی ہے اور میرے خیال میں تمہارے محسنوں کی بھی بہت سی مشکلات اب دور ہو جائیں گی۔'' ابھی وہ اپنی بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں کو پوری طرح سنبھال بھی نہیں پائی تھی کہ شہریار نے گفتگو کا موضوع یکدم ہی بدل دیا۔

''جی مجھے معلوم ہے۔ تقریباً تمام نیوز چینلز نے اس خبر کو گہری دلچسپی کے ساتھ دکھایا ہے۔'' اس نے جواب دیا پھر یکدم چونک کر بولی۔ ''کہیں اس آپریشن کے پیچھے آپ کا ہاتھ تو نہیں ہے؟ میرے خیال میں آپ نے جن معاملات میں الجھے ہونے کا ذکر کیا تھا، وہ یہی ہیں۔''

''وہ رینجرز کا کارنامہ ہے بی بی! تم نے خبریں ٹھیک طرح سے دیکھی اور سنی نہیں شاید۔ میں ایک چھوٹے سے ضلع کا اے سی ہوں۔ میرے کہنے پر بھلا رینجرز والے اتنا بڑا آپریشن کیونکر کر سکتے ہیں؟'' اس نے جان بوجھ کر خود کو اس معاملے سے الگ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''آپ انکساری سے کام لیں تو الگ بات ہے ورنہ پیر آباد کے جنگل میں ہونے والا آپریشن اس سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔'' وہ ذہین تھی اس لیے اسے جتانے سے باز نہ آئی کہ وہ اس بظاہر چھوٹے سے افسر کی پہنچ سے خاصی واقف ہے۔

''میں تمہاری سوچ پر کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتا۔ تم جو چاہو سمجھنے کے لیے آزاد ہو۔ تمہارا کام بہر حال ہو جائے گا۔ تم نے جس نمبر سے مجھے کال کی ہے، اسے آن رکھنا۔ میں اسی پر تمہیں اطلاع دوں گا۔'' شہریار نے اس سے بحث کیے بغیر گفتگو کا موضوع ایک بار پھر بدل دیا بلکہ گفتگو کو ایسی نہج پر لے آیا کہ اب مزید بات چیت جاری رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے جس مقصد کے لیے اسے فون کیا تھا، اس کا جواب مل چکا تھا اس لیے اب اجازت طلب کر لینا ہی بہتر تھا۔ اس نے یہی کیا لیکن خود کو بہت دیر تک اس کی آواز کے سحر سے آزاد نہیں کر سکی۔

☆☆☆

''گرفتار شدگان پر کام کرنے کا کیا نتیجہ نکلا؟ ان سے کوئی کام کی بات معلوم ہوئی یا نہیں؟'' وہ پھر ذیشان سے رابطے میں تھا اور اس سے استفسار کر رہا تھا۔

''مجھے ان لوگوں سے بہت زیادہ کام کی باتیں معلوم ہونے کی امید تھی بھی نہیں۔ بس اس لیے ساتھ اٹھا کر لے گیا تھا کہ انہیں ان کے لالچ کا ٹھیک ٹھاک مزہ چکھا سکوں۔ اب اگر ان میں سے کوئی زندہ رہا بھی تو باقی زندگی اپنے زخموں کو چاٹتے ہوئے گزارے گا۔ ان میں سے کوئی اس قابل بھی نہیں رہا ہوگا کہ خود سے بھیک مانگ سکے۔ ہاں، ان کی حالت دیکھ کر کوئی خود سے چند سکے ان کے آگے ڈال کر چلا جائے تو الگ بات ہے۔'' ذیشان نے نہایت سفاکانہ لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

''کیا مطلب؟ کیا تم لوگ اس طرح کے کام بھی کرتے ہو؟'' وہ حیران ہوا۔

''ہم جو کچھ کرتے ہیں، اس ملک کے لیے کرتے ہیں چنانچہ جو اس ملک کے ساتھ برا کرتا ہے، ہم اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔'' اس نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔

''او کے، ایز یو لائک..... لیکن کچھ معلومات تو حاصل ہوئی ہوں گی ان لوگوں سے؟ کوئی بہت معمولی سا کلیو بھی ہمارے کام کو آگے بڑھانے میں مدد دے سکتا ہے۔ ہم ٹاہلی والا میں ان کے صرف ایک ٹھکانے کو ختم کر دینے پر تو اکتفا نہیں کر سکتے۔ اس سازش کے پیچھے چھپے اصل چہروں کو دیکھنے کے لیے ہمیں ہر طرف ہاتھ پیر مارنے پڑیں گے۔'' اس نے تحمل سے کام لیتے ہوئے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

''اس بات کو میں اور میرے بڑے بھی سمجھتے ہیں۔ ہمارے لوگ ٹاہلی والا کی کارروائی کے بعد آرام سے نہیں بیٹھے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا ہے اور وہ کر رہے ہیں۔'' ذیشان کا جواب بڑا مبہم سا تھا۔ اس بار وہ ذرا چونک پڑا۔ گفتگو کی ابتدا ہی سے ذیشان اس سے ایسے لہجے میں بات کر رہا تھا جیسے وہ اسے خود سے الگ سمجھ رہا ہو اور کھل کر اسے کچھ بھی بتانے سے گریزاں ہو۔

''کیا بات ہے تم کچھ اکھڑے اکھڑے لگ رہے ہو؟ کوئی پرابلم ہے کیا؟'' اس نے فوراً ہی اس سے اس کے رویے کی وجہ دریافت کی۔

''میرے پرابلمز کو چھوڑو، تم یہ بتاؤ کہ تم نے ڈیوائس کے معمے کو حل کیا یا نہیں؟'' ذیشان کے سوال نے اس کے ذہن کو ایک زوردار جھٹکا لگایا۔

''کیا تم مجھے ناقابلِ اعتبار سمجھ رہے ہو؟ تمہیں ڈر ہے کہ مجھے کچھ بتانے کی صورت میں تمہارے سیکرٹس اوپن ہو جائیں گے؟'' اس نے صدمے کی سی کیفیت میں دریافت کیا۔

''اعتبار اور بے اعتباری کا معاملہ بھی عجیب ہے دوست! تمہارے معاملے نے تو برسوں سے خدمات انجام دیتے کئی افراد کو مشکوک افراد کی لسٹ میں کھڑا کر دیا ہے۔ تم ہمارے درمیان موجود سیاہ بھیڑ کو شناخت نہیں کر سکتے لیکن تم نے اس کی موجودگی کا شک ظاہر کر کے مجھے سخت مشکل میں ڈال دیا ہے۔ تم خود سوچو کہ چارج سنبھالتے ہی میں کس مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ اگر تمہارے حوالے کے ساتھ ایسا کوئی شک ظاہر کر کے تحقیقات شروع کرتا ہوں تو خود کئی سوالوں کی زد میں آجاؤں گا۔ سب سے پہلے تو مجھ سے یہی پوچھا جائے گا کہ میں نے باہر کے آدمی کو اپنے ساتھ شامل کیوں کیا؟''

''یہ سوال کون پوچھے گا؟ جو تم سے اوپر ہے وہ میری شمولیت سے واقف ہے اور اس پر معترض بھی نہیں۔'' وہ ذیشان کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا لیکن پھر بھی اسے اس کی باتوں سے گہرا صدمہ پہنچا تھا چنانچہ اپنے لہجے میں اترنے والی سرد مہری کو کسی طور قابو نہیں کر سکا۔

''ٹھیک ہے.... لیکن اوپر والوں میں سے بھی کوئی یہ پسند نہیں کرے گا کہ تمہارے ذریعے ہمارے راز باہر نکلیں۔ اب بھی میں کہہ نہیں سکتا کہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کہیں اور نہیں سنی جا رہی ہوگی۔'' وہ کچھ زیادہ ہی صاف گوئی اور بے مروتی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''او کے! اگر تمہیں میری طرف سے اتنے ہی زیادہ خدشات ہیں تو مناسب ہے کہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔ مجھے تو کام کرنا ہے۔ تم میرا ساتھ دو یا نہیں دو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اپنی بساط کے مطابق اپنے مشن پر ڈٹا رہوں گا۔ البتہ مجھے یہ افسوس رہے گا کہ ہم ایک اچھی ٹیم بنتے بنتے رہ گئے۔'' ذیشان بے مروتی پر اتر آیا تھا تو اس کے لیے یہی مناسب تھا کہ وہ خود کو اس سے الگ کر لیتا۔ چنانچہ یہ الفاظ ادا کر کے سلسلہ منقطع کر دیا اور موبائل پٹخنے کے انداز میں میز پر رکھنے کے بعد اور کچھ بس نہیں چلا تو اپنی ہی ہتھیلی کو اپنے داہنے ہاتھ کے زوردار مکے کا نشانہ بنا لیا۔ اس ٹکراؤ سے اچھی خاصی زوردار آواز پیدا ہوئی لیکن بہر حال، اس نے اپنے موبائل کی میسج ٹون سن لی۔ اگر یہ موبائل نمبر چند مخصوص لوگوں کے لیے ہی مختص نہ ہوتا تو وہ میسج ٹون کو نظر انداز کر دیتا لیکن اب دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ میسج ذیشان کی طرف سے تھا اور محض ایک لفظ پر مشتمل تھا۔ وہ لفظ تھا ''احتیاط۔'' اس پیغام کو پڑھ کر اس پر سوچ کے نئے در وا ہو گئے اور وہ ذیشان کی ساری گفتگو کو مختلف تناظر میں دیکھنے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ذیشان نے اس سے ایسے لب و لہجے میں شاید اس لیے گفتگو کی تھی کہ اگر کسی ذریعے سے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی بھی جا رہی ہو تو اول تو کسی قسم کی معلومات دشمن تک منتقل نہ ہو سکیں اور دوم یہ کہ اپنے مخالفین کو یہ تاثر دیا جا سکے کہ اب ان دونوں کا گٹھ جوڑ ختم ہو چکا ہے اور اب وہ ایک نہیں رہے ہیں۔

یہ سارے خیالات ذہن میں آنے پر وہ پُرسکون ہو گیا اور دل ہی دل میں ذیشان کو اس کی ذہانت پر داد دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو... اس نے صرف احتیاطاً ہی نہیں، سچ مچ بھی انہی خدشات اور مشکلات کی وجہ سے جن کا وہ ابھی ذکر کر رہا تھا، اس سے ذرا بدتہذیبی سے بات کی ہے تو وہ اس کا حق تھا۔ ذہن سوچنے سمجھنے کے لائق ہوا تو وہ دیگر امور کی طرف توجہ دینے کے بھی قابل ہوا۔

اسے یاد آیا کہ ٹاہلی والا میں ڈیوائس پکڑے جانے پر اس کا شک ماریا پر بھی گیا تھا لیکن اس شک کو رفع کرنے کے لیے وہ کوئی عملی قدم نہیں اٹھا سکا تھا۔ نور کوٹ واپس آتے ہی اسے دفتری امور میں الجھنا پڑا تھا پھر ماہ بانو سے متعلق مسائل بھی تھے جنہوں نے اس کے دل و دماغ کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔ ایسے میں وہ ماریا کو پرکھنے کا کام کیسے کرتا؟ وہ خود خاصی مصروف عورت تھی اور لاہور سے واپس آتے ہی اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ پیر آباد والے مرکزِ صحت گئی ہوئی تھی۔ اس کے مرکزِ صحت جانے کا خیال آیا تو اسے محسوس ہوا کہ یہ بہت اچھا موقع ہے جب وہ ماریا کی غیر موجودگی میں اس کے سامان کی تلاشی لے سکتا ہے۔ وہ فوراً ہی اپنی رہائش گاہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ملازمین اسے معمول سے ہٹ کر گھر آتا دیکھ کر حیران ضرور ہوئے لیکن کسی نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ سیدھا اپنے اور ماریا کے مشترکہ بیڈروم میں پہنچ گیا۔ سب سے پہلے اس نے بیڈروم کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ وہاں ایسی کوئی شے موجود نہیں تھی جسے وہ مشکوک قرار دے سکتا۔ بیڈروم کی طرف سے مطمئن ہو کر اس نے ڈریسنگ روم کا رخ کیا۔ وہاں اس کے اور ماریا کے کپڑوں کے علاوہ آرائش سے متعلق دیگر چیزیں بھی موجود تھیں۔ اس بے تحاشا سامان کا جائزہ لینا اتنا آسان نہیں تھا لیکن اس کی مجبوری یہ تھی کہ اسے تن تنہا ہی یہ کام کرنا تھا۔ وہ کسی کو اپنی مدد کے لیے اپنے ساتھ شامل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ماریا سے اس کی شادی چاہے جن حالات میں بھی ہوئی تھی، بہرحال وہ اس کی شریکِ حیات اور عزت تھی اور وہ محض شک کی بنیاد پر اسے کسی ایک بھی شخص کے سامنے ذلیل نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی بیوی کو اپنی زبان سے کسی کے سامنے مشکوک قرار دینا اس کے نزدیک اسے ذلیل کرنے ہی کے مترادف تھا چنانچہ وہ خود تنہا سارا کشٹ اٹھا رہا تھا۔

کپڑوں کے ڈھیر سے لے کر جوتے، جیولری، ہیئر کلپس، ٹائی پنز اور کف لنکس تک اس نے ہر ہر شے کھنگال ڈالی۔ کہیں ایسا کچھ نہیں تھا جو مشکوک لگتا۔ البتہ یہ ضرور ہوا تھا کہ کئی گھنٹوں کی اس مشقت سے وہ سخت اوب گیا تھا اور اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا احمق ہے جو خواہ مخواہ اپنی بیوی پر شک کر کے خود کو اس جنجال میں پھنسا بیٹھا ہے۔ بہرحال، ہمیشہ کے لیے دل میں شک کا کانٹا لیے بیٹھے رہنے سے یہ کہیں بہتر تھا کہ وہ ایک بار اپنی تسلی کر ہی لیتا۔ اس خیال کے آنے پر اس نے ایک بار پھر کمر کسی اور میدان میں اترنے کے لیے تیار ہونے لگا۔ بیڈروم اور ڈریسنگ روم کے بعد اس کی اسٹڈی ہی رہ جاتی تھی جہاں کسی خفیہ اور حفاظتی نقطۂ نظر سے خاص شے کو رکھا یا چھپایا جا سکتا۔ ان تین مقامات کے علاوہ باقی پوری رہائش گاہ میں ملازمین کا بلا روک ٹوک آنا جانا لگا رہتا تھا اس لیے کسی بھی آلے کے نظر میں آنے یا ضائع ہو جانے کا بہت زیادہ خطرہ تھا۔

وہ ملازم کو چائے پہنچانے کا حکم دے کر اسٹڈی میں چلا گیا۔ ڈھیروں کتابوں سے بھرے شیلفس میں سے کہیں بھی ایک چھوٹی سی ڈیوائس چھپا دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ خاص طور پر اس طرح کی کوئی ڈیوائس جو ٹاہلی والا میں اسے اپنی ٹی شرٹ پر چسپاں حالت میں ملی تھی۔ حقیقتاً ایسی کسی شے کو اسٹڈی میں تلاش کرنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاشنے کے مترادف تھا لیکن اسے یہ کام کرنا ہی تھا۔ ایک بار میں نہ سہی، مختلف اوقات میں وہ قسطوں میں یہ کام کر سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ دائیں طرف کی دیوار میں موجود شیلفس سے یہ کام شروع کرے گا۔ وہ اس شیلف کی طرف بڑھتا، اس سے قبل ہی دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔

”یس کم اِن۔“ اسے یاد آ گیا کہ اس نے ملازم کو چائے لانے کا حکم دیا تھا چنانچہ اسے اندر آنے کی اجازت دینے کے ساتھ خود رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ رکھی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔ مؤدب ملازم نے اس کے سامنے چائے لا کر رکھی اور اس کی طرف سے واپس جانے کا اشارہ ملنے پر فوراً ہی باہر کی طرف رخ کر لیا۔ وہ گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پیتا ہوا ایک بار پھر اپنی اسٹڈی کا جائزہ لینے لگا۔ اسے کتابوں کا

شروع ہی سے بہت شوق تھا۔ گھر سے ملنے والی تربیت نے اس شوق کو اور بھی زیادہ پنپنے کا موقع دیا۔ نتیجتاً اس کے پاس کتابوں کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا۔ یہاں پوسٹنگ کے وقت جہاں وہ اپنی پسند کا فرنیچر وغیرہ ساتھ لے کر آیا، وہیں اپنی بیشتر کتابیں بھی یہیں منتقل کر لیں۔ یہ کتابیں اس کی بہترین رفیق تھیں جن کے ساتھ وہ بے تحاشا مصروفیت کے باوجود کچھ نہ کچھ وقت گزارنے کی کوشش کرتا تھا۔ اب انہی ہمدم و ہم ساز کتابوں کے بیچ اس کے کسی دشمن کی کسی سازش کے چھپے ہونے کا امکان تھا اور اسے بہت تحمل کے ساتھ اس سازش کو بے نقاب کرنا تھا ورنہ ان قیمتی کتابوں کو نقصان پہنچنے کا بھی احتمال تھا۔ چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ انہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ بے خیالی میں ٹیبل پر رکھے کرسٹل کے اس پیالے میں گردش کر رہا تھا جس میں بہت سے رنگ برنگے موتی بھرے ہوئے تھے۔ وہ بغیر دیکھے پیالے میں سے ایک موتی اٹھاتا اور پھر اسے چھوڑ کر دوسرا اٹھا لیتا۔ یکے بعد دیگرے کئی موتی اس طرح اس کے ہاتھ سے گزر چکے تھے اور ان کے ایک ردھم سے پیالے میں گرنے سے خوش گوار سا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ غیر شعوری طور پر موتی گرنے سے پیدا ہونے والی آوازوں کے ردھم میں ڈوبا وہ یکدم ہی چونک گیا اور اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے بیچ دبے موتی کو غور سے دیکھنے لگا۔

وہ ایک سرخ رنگ کا چمک دار موتی تھا۔ اس رنگ اور سائز کے اور بھی بہت سے موتی پیالے میں موجود تھے لیکن اسے محسوس ہوا کہ اب تک اس کے ہاتھ سے گزرنے والے موتیوں کے مقابلے میں اس موتی کا وزن قدرے مختلف ہے۔ اس نے موتی ہٹا کر ایک جانب احتیاط سے رکھ دیا اور پیالے میں موجود سرخ رنگ کے موتی چن چن کر نکالنے لگا۔ پہلے نکالے گئے موتی کو ملا کر ان کی کل تعداد بارہ بنتی تھی۔ پہلے نکالے گئے موتی کے مقابلے میں اسے ان گیارہ موتیوں کے وزن میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ پہلا موتی باقیوں کی نسبت وزنی تھا۔ وہ اپنے شک کی مضبوطی کو جانچنے کے لیے ایک ایک کر کے باقی رنگ کے موتیوں کا بھی جائزہ لینے لگا۔ نتیجہ وہی تھا۔ اس کے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ چائے پینی تو وہ کبھی کا بھلا چکا تھا۔ اب پوری طرح اس مشکوک موتی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ باقی موتیوں کی طرح اس موتی میں بھی کوئی سوراخ نہیں تھا اور پوری سطح پر چمک دار و ہموار سرخ رنگ چڑھا ہوا تھا۔ وہ نہایت احتیاط سے انگوٹھے کے ناخن کی مدد سے موتی پر سے وہ رنگ کھرچنے لگا۔ آہستہ آہستہ سرخ رنگ بالکل غائب ہو گیا اور سفید رنگ کا پلاسٹک کا خول نظر آنے لگا۔ اس خول کو بہت غور سے دیکھنے پر اسے ایک باریک سی لکیر نظر آئی۔ یہ لکیر واضح طور پر موتی کو دو حصوں میں تقسیم کر رہی تھی۔ یعنی وہ موتی دو کروں میں مل کر بنا تھا۔ دیکھا جائے تو یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں تھی۔ عام طور پر موتی جیسی ساخت کی اشیا کو بنانے کے لیے یہ طریقہ استعمال کیا جاتا تھا لیکن وہ جس طرح کھوج میں مبتلا تھا اور جس شک کی بنیاد پر اس موتی کو ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا، وہ اسے آخری حد تک جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ آخری حد یہی تھی کہ وہ جوڑ سے موتی کو کھول کر دیکھتا چنانچہ اس نے یہی کیا اور پیپر کٹر کی معمولی سی مدد سے اس موتی کو کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔

دو حصوں میں تقسیم ہو جانے والے موتی نے اس کے چھکے چھڑا دیے۔ موتی اندر سے خالی نہیں تھا بلکہ اس کے کھوکھلے کرے میں کوئی شے موجود تھی۔ سائنسی ایجادات و آلات کے بارے میں بہت زیادہ وسیع معلومات نہ رکھنے کے باوجود وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کیا شے تھی۔ یقیناً وہ ویسی ہی کوئی ڈیوائس تھی جو اس سے قبل ٹاہلی والا میں اس کی ٹی شرٹ پر چسپاں پائی گئی تھی۔ کوئی تھا جو اس کی مصروفیات سے واقف رہنے کی کوشش کر رہا تھا اور یقینی طور پر وہ اس کے اتنے قریب تھا کہ اس کی دسترس اس کی نجی استعمال کی اشیا تک بہت آسانی سے تھی۔ تو کیا واقعی وہ ماریا تھی جو اس کی بیوی کے روپ میں دشمن کی آلۂ کار بنی ہوئی تھی؟ سانپ کی دم سے پڑنے والے کوڑے کی طرح یہ خیال اس کے ذہن سے ٹکرایا اور اشتعال کی ایک زوردار لہر اس کے پورے وجود میں اٹھی۔ اگر یہ ماریا کا کارنامہ تھا تو وہ اس کے ہاتھوں اپنے برے انجام سے کسی صورت نہیں بچ سکتی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ خیال چکرا ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ اس نے جلدی سے دو ٹکڑوں میں منقسم موتی کو ڈیوائس سمیت اپنی جیب میں منتقل کر لیا اور دستک دینے والے کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ فوراً ہی دروازہ کھلا اور ماریا خوشبو کے جھونکے کی طرح اندر داخل ہوئی۔ اس نے خوب صورت لباس زیبِ تن کر رکھا تھا اور مناسب میک اپ اور جیولری کے ساتھ خاصی دلکش لگ رہی تھی۔

”ہیلو۔“ وہ مسکراتی ہوئی اس کے قریب چلی آئی۔

”مجھے معلوم ہوا کہ آپ گھر آئے ہوئے ہیں اور خاصا وقت اوپر بیڈروم میں گزارنے کے بعد اب اسٹڈی میں ہیں تو میں نے سوچا کہ آپ سے خیریت معلوم کر لوں۔ آپ کی بے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وقت دفتر سے واپسی آدمی کو ذرا تشویش میں مبتلا کر دیتی ہے کہ نصیبِ دشمناں کہیں طبیعت وغیرہ خراب نہ ہو۔'' وہ شہریار کی خود پر جمی نظروں سے بے خبر اپنی ہی بولتی جا رہی تھی۔ بولتے بولتے اس کی نظر میز پر رنگوں کے اعتبار سے الگ الگ کر کے رکھے گئے موتیوں پر پڑی تو حیران نظر آنے لگی۔

''آپ کیا یہاں بیٹھ کر کوئی گیم کھیل رہے ہیں؟''

''نہیں لیکن گیم کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' شہریار نے چبھتے ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا۔

''میں ہیلپ کروں۔ ویسے کیا کوئی نیا گیم ہے؟'' وہ خود بھی ایک کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گئی اور تجسس سے پوچھنے لگی۔

''گیم تو یقیناً پرانا ہے لیکن میرے علم میں ابھی آیا ہے۔'' وہ جواب دیتے ہوئے بہت غور سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں حیرت اور تجسس تو بے شک تھا لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے اسے محسوس ہوتا کہ وہ اپنی چوری پکڑے جانے پر خائف ہو۔ اس کا ردِعمل ایک مکمل طور پر انجان شخص جیسا تھا۔ کہیں سے لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ اس کرسٹل باؤل میں موجود کسی مشکوک موتی سے واقف ہو۔ اس کے رویے پر وہ ایک بار پھر تذبذب میں مبتلا ہو گیا اور اس معاملے کو دوسرے پہلو سے سوچنے لگا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ماریا کا اس سارے چکر سے کوئی تعلق ہی نہ ہو اور جو لوگ اس کی کھوج میں لگے ہیں، انہوں نے یہ سارا بندوبست کیا ہو۔ سی ایف پی کے دفتر میں سیڑھیوں پر اس سے ٹکرانے والا اہلکار بھی ان کا ساتھی ہو سکتا تھا اور اس کے گھر پر کام کرنے والے ملازمین میں سے بھی کسی کو چھوٹی موٹی خدمت کے بدلے میں بڑا لالچ دے کر راضی کیا جا سکتا تھا۔ صفائی کے لیے اسٹڈی میں آنے والے ملازم کے لیے نظر بچا کر باؤل میں سے ایک موتی نکال کر لے جانا اور اس کی جگہ دوسرا لا رکھنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا۔ اگر کوئی اسے وہ موتی اٹھاتا ہوا دیکھ بھی لیتا تو اتنی معمولی سی شے کی چوری کے الزام میں کچھ کہہ تو نہیں سکتا تھا۔ ماریا اگر اس معاملے میں ملوث ہوتی تو اس کے لیے بہت آسان ہوتا کہ کسی زیادہ محفوظ اور خفیہ مقام کا انتخاب کرتی۔ اس کی بیوی کی حیثیت سے وہ اس گھر کی مالکن تھی اور ہر جگہ بلا روک ٹوک اور بلا جواز جتنا چاہے وقت گزار سکتی تھی۔

''کن خیالوں میں ڈوب گئے؟ مجھے کچھ بتائیں نا اپنے گیم کے بارے میں۔'' ماریا کی آواز اسے گہری سوچ سے باہر لائی۔

''چھوڑو بھی، تم کس چکر میں پڑ گئیں۔ میں تو بس وقت گزاری کے لیے اس کام میں لگ گیا تھا۔ آج طبیعت تھوڑی سست ہو رہی تھی اس لیے دفتر میں دل نہیں لگا اور گھر واپس آ گیا کہ کچھ دیر آرام کر لوں گا لیکن بے وقت آرام کی عادت نہیں ہے اس لیے زیادہ دیر بستر پر لیٹ نہیں سکا۔ تم تھکی ہوئی آئی ہو، جا کر فریش ہو جاؤ اور کچھ کھاؤ پیو۔ میں بھی واپس دفتر جاتا ہوں۔ میرے چلے آنے سے وہاں کئی کام رک گئے ہوں گے۔'' اس نے تیزی سے خود کو سنبھال کر خلافِ عادت تھوڑی لمبی وضاحت دی اور پھر عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بار پھر دفتر جانے کے لیے کمر بستہ ہو گیا۔ ماریا نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ کوشش کامیاب نہیں رہے گی۔ شہریار کے روانہ ہوتے ہی اس نے بے پروائی سے سر کو جھٹکا دیا اور اس کے مشورے پر عمل کرنے چل پڑی۔

☆☆☆

''اپنی کارکردگی کی رپورٹ دو سنتھیا! ہمارے بڑے آج کل تم سے خوش نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تمام مراعات حاصل کرنے کے باوجود کافی طویل عرصے سے کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کر رہیں، بہتر ہے کہ اس سے قبل کہ تمہیں ریٹائر کر دیا جائے، تم خود کو مزید کام کرنے کا اہل ثابت کرو۔''

پر رعونت لہجے میں کہے گئے یہ الفاظ سن کر ادھیڑ عمر سنتھیا کو پتنگے لگ گئے اور وہ چیخ کر بولی۔

''میں اپنی مرضی سے ایک طرف ہو کر نہیں بیٹھی ہوں۔ بڑوں ہی نے میرے میرج بیورو والے سیٹ اپ کا بھانڈا کھل جانے پر مجھے انڈر گراؤنڈ ہو جانے کا مشورہ دیا تھا۔ میں نے صرف اس مشورے پر عمل کیا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ کچھ نہیں کر رہی ہوں۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ میں نہایت خاموشی سے خام مال پر کام کر رہی ہوں۔ میرا طریقۂ کار ذرا سست رفتار ہے لیکن تم دیکھنا کہ اس کے کتنے زبردست نتائج حاصل ہوں گے۔''

''اوہ پلیز! اب تم مجھ پر اپنے استانی بننے کا رعب مت جھاڑو۔ جو کچھ تم کر رہی ہو، وہ ہمارے آدمی پہلے ہی سے کر رہے ہیں اور ان کے نتائج بھی بہت واضح اور تیز رفتار ہیں۔'' دوسری طرف سے بیزاری کا اظہار کیا گیا۔

''تیز رفتار نتائج دینے والے تمہارے وہ جعلی ملا تیز رفتاری سے پکڑے بھی جا رہے ہیں۔ میرے ساتھ کم از کم ایسا نہیں ہوگا۔'' سنتھیا نے تیزی سے جواب دیا۔

''کرنے کو میں تم سے اس معاملے پر لمبی بحث بھی کر

سکتا ہوں کیونکہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے۔ ایک طرف تو ہم نے انہیں دہشت گردی کا شکار کر دیا ہے۔ اور ساتھ ہی ان مسلمانوں کو ساری دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا..... پاکستان کے اندرونی حالات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں۔ ان کی معاشی حالت ہر گزرتے دن کے ساتھ کمزور سے کمزور تر ہوتی جا رہی ہے۔ بہرحال، اس وقت میں تمہیں یہ سب نہیں گنوانا چاہتا۔ میرے کال کرنے کا مقصد کچھ اور تھا۔''

''تو پھر بہتر ہے کہ تم وہ مقصد بیان کر دو۔'' سنتھیا نے روکھے پن سے کہا۔

''پرابلم یہ ہے کہ ہمارا ایک بندہ غائب ہے۔ اس بندے کا نام ہے اشیش کمار۔ وہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ڈیوٹی دے رہا تھا اور چونکہ لمبے منصوبے پر کام کر رہا تھا اس لیے ہمیں ڈیلی رپورٹ دینے کا پابند نہیں تھا۔ اسے اس کی جگہ سے ایک رات اچانک چھاپا مار کر اٹھا لیا گیا لیکن بدقسمتی سے ہمیں وقت پر خبر نہیں ہو سکی اور جب خبر ہوئی تو کافی دن ہو گئے تھے۔ ہم نے دوڑ دھوپ کر کے یہ تو معلوم کر لیا ہے کہ اس چھاپے کے پیچھے آرمی انٹیلی جنس تھی اور ہمارا آدمی ابھی تک انہی کی کسٹڈی میں ہے۔ تم اندازہ کر سکتی ہو کہ اس عرصے میں انہوں نے اس پر ہر طرح کا ٹارچر کر کے معلومات اگلوانے کی کوشش کی ہوگی۔ اشیش کس حد تک ٹارچر کو سہہ سکا ہوگا اور اس نے اب تک کیا کچھ اگلا ہوگا، ہمیں ٹھیک طرح سے اندازہ نہیں بس ہم نے احتیاطاً اپنے وہ سارے پتے اور ٹھکانے بدل لیے ہیں جو اشیش کے علم میں تھے لیکن پھر بھی ہم یہ چاہتے ہیں کہ اشیش کو انٹیلی جنس والوں کی گرفت سے نکالا جائے اور اسی سلسلے میں مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔'' وہ یہاں تک بتا کر رک گیا۔

''کیسی مدد؟ تم بولتے جاؤ میں تمہاری بات توجہ سے سن رہی ہوں۔'' سنتھیا کے لہجے سے اس کی گہری دلچسپی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''ہم معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ اشیش کا کیس کرنل توحید کے ہاتھ میں ہے۔ ہم نے کرنل کی مصروفیات کو مسلسل اپنی نظر میں رکھا ہے۔ ہم موقع کی تلاش میں رہے ہیں کہ کسی طرح کرنل کو گرفت میں لے سکیں اور اب وہ موقع مل گیا ہے۔ کرنل اپنے کسی قریبی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے چار دن کی چھٹی پر لاہور آ رہا ہے۔ ہمیں ایسا کوئی موقع تلاشنا ہے کہ اس تک تمہاری کوئی ٹرینڈ لڑکی پہنچ جائے۔ اگر وہ لڑکی کرنل کو شیشے میں اتارنے میں کامیاب رہی تو اس سے اشیش کے متعلق بہت کچھ اگلوا سکتی ہے۔ ہمیں ایک بار اشیش کا ٹھکانا معلوم ہو جائے تو سمجھو مسئلہ حل ہو گیا۔ ہم اپنی پوری کوشش کر کے اسے وہاں سے نکال لائیں گے..... اور اگر نکالنے میں ناکام رہے تو اسے دیش پر قربان ہونا پڑے گا۔ ہم اپنا اتنا اہم ایجنٹ پاکستانی انٹیلی جنس کی کسٹڈی میں نہیں چھوڑ سکتے۔'' اس کا لہجہ فیصلہ کن اور سفاکیت سے بھرپور تھا۔ عرصے سے ان کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے سنتھیا ان کے اس طریقۂ کار سے واقف تھی۔ وہ غیروں کی طرح اپنوں کو بھی خوب جی بھر کر استعمال کرنے کے بعد کوئی برا وقت پڑنے پر ٹھوکر لگانے میں دیر نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک کوئی بھی آدمی بس اس وقت تک اہم رہتا تھا جب تک وہ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ دوسری صورت میں وہ اسے کسی ٹشو پیپر کی طرح ہاتھ پونچھ کر ڈسٹ بن میں پھینک دیتے تھے۔

''میں نے تمہاری ساری بات سمجھ لی ہے لیکن تم خود اچھی طرح یہ بات جانتے ہو کہ میرا وہ پرانا سیٹ اپ بکھر چکا ہے۔ ارمیلا، گیتا اور جولی کے انجام سے تم واقف ہو۔ میری وہ تینوں قابل لڑکیاں اب میرے پاس کیا، اس دنیا میں ہی نہیں رہی ہیں۔ جولی کو تو مجھے خود مروانا پڑا تھا کہ وہ سجاد رانا کی نظروں میں آ گئی تھی۔ اب میرے لیے جو لڑکیاں کام کر رہی ہیں، وہ کند ذہن اور عیاش سیاست دانوں کو تو بے وقوف بنانے کے لیے ٹھیک ہیں لیکن آرمی انٹیلی جنس کے کرنل کو قابو کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ ان میں سے کسی کو میں نے ڈیوٹی سونپ دی تو وہ کرنل کو ہاتھ میں لینے کے بجائے خود بھی اس کے ہاتھ آ سکتی ہے۔ اس لیے میرے خیال میں تم اس کے بجائے کوئی اور طریقہ سوچو۔'' اس نے اپنی مجبوری بتاتے ہوئے انکار کر دیا۔

''مجھے چلانے کی کوشش مت کرو سنتھیا! میں ورما ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہارا سب سے اہم مہرہ ابھی سلامت ہے۔ تم اسے یہ ڈیوٹی سونپ دو تو وہ ہر حال میں کامیاب لوٹے گی۔'' وہ مکاری سے بولا۔

''تم اتنے ہی حالات سے واقف ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ وہ پہلے ہی ایک اہم کام میں مصروف ہے اور اسے اس کی جگہ سے نہیں ہلایا جا سکتا۔ پہلے ہی اس کے لیے حالات بہت مشکل ہیں۔'' سنتھیا نے سختی سے جواب دیا۔

''مجھے اس کے حالات کا اچھی طرح علم ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ چاہے تو کسی بھی بہانے دو چار دن کے لیے خلاصی پا سکتی ہے۔ اشیش ہمارے لیے اتنا اہم نہیں ہوتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو میں تم پر زور نہیں دیتا۔ مجھے اشیش والا مسئلہ ہر صورت حل کرنا ہے۔" سنتھیا پر اپنی باخبری کا رعب جھاڑنے کے بعد وہ آخر میں کچھ نرم پڑ گیا۔

"او کے! میں دیکھتی ہوں کہ تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں۔ پھر جو بھی سچویشن ہوئی، تمہیں اس سے آگاہ کر دوں گی۔" اس بار سنتھیا نے بھی نرم رویہ اختیار کیا۔ وہ ایک مانی ہوئی سیکرٹ ایجنٹ تھی جو برسوں سے را اور موساد دونوں کے لیے کام کر رہی تھی۔ آج تک اس کی ڈبل ایجنٹ والی حیثیت نہیں کھل سکی تھی۔ درحقیقت وہ موساد کے لیے کام کرتی تھی اور را میں اس کی شمولیت کا مقصد محض موساد کے مفادات کا تحفظ تھا۔ را کے اعلیٰ سطحی افسران اس کی خدمات کو سراہتے تھے کیونکہ وہ پاکستان میں رہ کر بڑی کامیابی سے پاکستان کے خلاف کارکردگی دکھاتی رہتی تھی۔ موساد کی طرف سے بھی اسے کچھ اسی قسم کی ذمّے داریاں سونپی گئی تھیں لیکن ان ذمّے داریوں میں کچھ اضافہ اس حوالے سے ہو جاتا تھا کہ اسے را والوں کے تمام اقدامات سے موساد کے بڑوں کو آگاہ رکھنا ہوتا تھا۔ یقیناً موساد میں بھی کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو درحقیقت را کے مفادات کے لیے کام کرتے ہوں گے۔ سنتھیا بہر حال ایسے کسی مشکوک فرد سے واقف نہیں تھی اور پوری تن دہی سے اپنی ذمّے داریاں پوری کر رہی تھی۔ ان ذمّے داریوں میں سے ایک بظاہر الگ تھلگ رہ کر افیون کی کاشت اور ہیروئن کی تیاری کے سلسلے میں چودھری کی کارکردگی پر نظر رکھنا بھی شامل تھا۔ وہ ان دنوں جس قسم کی زندگی گزار رہی تھی، کوئی شک نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کس قدر خطرناک عورت ہے۔ اس کی بظاہر سادہ اور بے ضرر شخصیت کے پیچھے جو سیکرٹ ایجنٹ موجود تھی، اس تک کسی کا پہنچنا آسان نہیں تھا اور وہ مزے سے اعلیٰ افسران سے اہم ملکی راز اگلوانے سے لے کر بم دھماکے کروانے تک سب کچھ کر گزرتی تھی۔

"صرف کوشش نہیں کرنی، ہر حال میں یہ کام کرنا ہے۔" اس کے نرم پڑتے ہی ورما نے مزید زور دیا۔

"او کے! تم بے فکر رہو۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔" بالآخر اس نے ہامی بھر ہی لی۔

"تھینکس! تم نے ہاں کر دی ہے تو اب میں سچ مچ بے فکر ہو گیا ہوں۔" اس بار ورما خوش ہو گیا اور چند ایک مزید رسمی جملے بول کر فون کال کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ ورما سے جان چھوٹتے ہی وہ دوسری اہم کالز میں مصروف ہو گئی۔ اسے اشیش کمار سے ایسی کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اس کی خاطر اپنی کسی اہم ایجنٹ کو مشکل میں ڈالتی لیکن مجبوری یہ تھی کہ ایک طرف اسے را سے اپنی وفاداری کو ثابت کرنا تھا تو دوسری طرف وہ کرنل توحید کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ اسے امید تھی کہ اس پر کام کر کے وہ پاکستان کے کئی اہم راز معلوم کر سکتی ہے، چنانچہ رسک لینا مجبوری تھا۔

☆☆☆

"تم نے مجھے جو ڈیوائس بھجوائی تھی، میں نے اس کا معائنہ کروالیا ہے۔ تمہارا اندازہ درست تھا۔ وہ واقعی ایک نہایت حساس نوعیت کا مائیکروفون ہے جس کی مدد سے کافی طویل فاصلے سے بھی تمہاری گفتگو سنی جا سکتی تھی۔" ذیشان اسے جو کچھ بتا رہا تھا، وہ پہلے ہی سمجھ چکا تھا اس کے باوجود دھچکا سا لگا تھا۔ وہ تو اپنی دانست میں پوری رازداری سے دشمنوں کے خلاف برسرِ پیکار تھا لیکن اب یہ جان کر کہ دشمن تو کب کا اس کے گھر میں نقب لگا چکا ہے، اپنی ہی جگہ چور سا بن گیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے ساتھ یہ کھیل کب سے کھیلا جا رہا ہے اور اس کے کون کون سے راز ہیں جو دشمنوں کے ہاتھ لگ چکے ہیں۔

"میں تمہیں ایک ڈیٹیکٹر بھجوانے والا ہوں۔ اس ڈیٹیکٹر کی خصوصیت ہے کہ وہ مائیکروفون اور جاسوسی کے لیے استعمال ہونے والے دیگر آلات کو بڑی مہارت سے پکڑ لیتا ہے۔ تم پر نظر رکھنے کے لیے جو طریقۂ کار استعمال کیا جا رہا ہے، اس کے توڑ کے لیے میرا بھیجا ہوا ڈیٹیکٹر بہت کارآمد ثابت ہو گا۔" دوسری طرف ذیشان نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا۔

"تھینک یو ذیشان! مجھے واقعی ایسی کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

"تمہیں شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم ہماری صفوں میں شامل ہو اس لیے تمہارے مسائل کو حل کرنا ہمارا فرض ہے۔" ذیشان نے اسے جواب دیا اور مزید سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا اور اب موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے بھی یہ مشورہ دوں گا کہ اپنے قرب و جوار میں ایسے شخص کو تلاش کرو جو یہ سب کر رہا ہے۔ یہ مت سوچو کہ تمہارے اردگرد موجود سارے لوگ تمہارے وفادار ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہمیشہ قریب ترین لوگ ہی غداری کے مرتکب ہوتے ہیں۔ تمہارے شک ظاہر کرنے پر میں نے سی ایف پی کے اپنے یونٹ میں موجود ایک ایک فرد کو کھنگالنا شروع کر دیا ہے۔ اس یونٹ میں موجود ہر شخص ایسا ہے جس کے کریڈٹ پر کوئی نہ کوئی کارنامہ

موجود ہے اور وہ ادارے اور ملک سے اپنی وفاداری کو ثابت کر چکا ہے۔ لیکن تمہارے شک ظاہر کرنے کے بعد میرے لیے ہر شخص مشکوک ہو گیا ہے۔ اب میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک اپنے درمیان موجود اس غدار کو ڈھونڈ نہ نکالوں گا یا پھر یہ کہ میرے لوگ بے قصور ثابت ہو جائیں گے۔" ذیشان بہت گمبھیر لہجے میں بول رہا تھا۔ اس نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ جب سے ذیشان نے سی ایف پی کو جوائن کیا تھا، بے حد سنجیدہ ہو گیا تھا اور پہلے سے کہیں زیادہ ذمّے دار محسوس ہونے لگا تھا۔

"میں تمہارے مشورے پر ضرور عمل کروں گا۔ درحقیقت حالات ایسے ہیں کہ میں خود اسی نہج پر سوچنے کے لیے مجبور ہو گیا ہوں۔" اس نے ذیشان کو یقین دہانی کروائی۔

"وِش یو گڈ لک۔ امید رکھو کہ حالات تمہارے قابو میں آجائیں گے اور کسی صورت اپنا مورال گرنے نہ دو۔" ذیشان یقینی طور پر اس کی کیفیات کو سمجھ رہا تھا چنانچہ گفتگو کا سلسلہ منقطع کرنے سے پہلے اسے حوصلہ دینا ضروری سمجھا۔ اس کے خلوص کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہوئے اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بنگلے کے اندرونی حصے میں جانے کے لیے پلٹ گیا۔ احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس فون کال کے لیے اس نے اندر کسی کمرے تک محدود رہنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور لان کی کھلی فضا میں ذیشان سے گفت و شنید کی تھی۔

"آپ کہاں تھے؟ میں آپ ہی کو دیکھ رہی تھی۔ ابھی اسٹڈی میں جھانک کر آئی ہوں کہ آپ زیادہ تر وہیں پائے جاتے ہیں لیکن آپ شاید کہیں باہر نکل گئے تھے۔" وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا، ماریا نے اسے دیکھتے ہی بولنا شروع کر دیا۔ اس نے اس دوران غور سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا لیکن وہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے اسے اندازہ ہوتا کہ وہ اس کے ساتھ کسی قسم کی دھوکا دہی کر رہی ہے۔ وہی معمول کا لب و لہجہ تھا اور وہی چہرے پر موجود سادگی اور سنجیدگی۔۔۔۔ وہ اس کو مشکوک افراد کی فہرست میں سب سے اوپر رکھنے کے باوجود اس پر شک کرنے میں تذبذب کا شکار تھا۔

"کہیں گم نہیں ہوا، یہیں تھا بس ذرا دیر کے لیے لان میں چہل قدمی کے لیے گیا تھا۔" اس نے جواب دیا اور آگے بڑھ کر ایک نشست سنبھال لی۔ موبائل پر گفتگو کا ذکر اس لیے بھی جان بوجھ کر گول کر دیا تھا کہ یہ نمبر بس مخصوص لوگوں کے لیے ہی تھا۔ دفتری امور اور میل جول کے لیے وہ الگ موبائل استعمال کرتا تھا۔ ماریا کے بیوی ہونے کے باوجود اس نے کبھی اسے یہ نمبر دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی بلکہ ایک طرح سے احتیاط ہی برتتا رہا تھا کہ کبھی یہ سیٹ کسی کے ہاتھ میں نہ جانے پائے۔ اپنی اس احتیاط کی وجہ سے اسے خاصا اطمینان تھا کہ یہ نمبر کسی غیر محفوظ ہاتھ تک نہیں پہنچا ہو گا۔

"اصل میں، میں آپ کو انفارم کرنا چاہ رہی تھی کہ کل میرا لاہور جانے کا پروگرام ہے۔ ایک فرینڈ کا فون آیا تھا۔ جس ہاسٹل میں، میں جاب کرتی تھی، وہاں کی انتظامیہ کی کوششوں سے ڈاکٹرز کا ایک سیمینار منعقد کیا جا رہا ہے۔ موضوع اچھا ہے اور میری اس میں دلچسپی بھی ہے تو میں نے سوچا کہ شرکت کر لی جائے۔ نالج کے ساتھ ساتھ پرانے فرینڈز اور کولیگز سے ملاقات کا موقع بھی مل جائے گا۔"

"ایز یو وِش۔ مشابرم خان تمہیں لاہور پہنچا دے گا۔" اس نے بغیر کسی حیل و حجت کے اسے اجازت دے دی۔ ویسے بھی وہ اس سے اجازت نہیں مانگ رہی تھی، صرف اطلاع دے رہی تھی اور وہ اس کے اس رویے پر یوں بھی معترض نہیں تھا کہ ابتدا سے ہی اس نے ماریا پر اس قسم کی پابندیاں عائد نہیں کی تھیں کہ وہ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اس سے اجازت طلب کرے۔ اس کے نزدیک ماریا ایک باشعور، سمجھ دار اور تعلیم یافتہ عورت تھی جسے پوری پوری شخصی آزادی حاصل ہونی چاہیے تھی۔

"تین روزہ سیمینار ہے۔ ہو سکتا ہے ایک دو دن میں مزید وہاں دوستوں کے ساتھ گزاروں۔ اتنے دن مشابرم خان وہاں رکا تو آپ کو پریشانی ہو گی۔" اس نے کسی خیال رکھنے والی بیوی کی طرح فکر مندی کا اظہار کیا۔

"مشابرم خان تمہیں چھوڑ کر واپس آجائے گا۔ وہاں ماموں جان کا ڈرائیور ہو گا تم کہیں بھی آنے جانے کے لیے اس کے ساتھ چلی جانا۔ واپسی کے لیے دیکھ لیتے ہیں کہ کیا صورت بنے گی۔ ہو سکتا ہے کہ دو تین دن میں خود میرا لاہور کا چکر لگ جائے ورنہ تم فون کر دینا تو میں مشابرم خان کو بھجوا دوں گا۔" وہ بہت سہولت سے اس کے سامنے تجاویز پیش کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں ایسا کوئی شائبہ نہیں تھا کہ وہ اسے شک کی نظر سے دیکھنے لگا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ ابھی تک دل سے اس پر شک کر بھی نہیں رہا تھا۔

"سوری، میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ ممی کا بھی میرے ساتھ لاہور جانے کا پروگرام ہے۔ آپ کو یاد ہی ہو گا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ کتنی سوشل خاتون تھیں اور انہیں صرف اور صرف میری وجہ سے یہاں ایک گاؤں میں آ کر رہنا پڑ رہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ بے شک وہ اپنی زبان سے شکوہ نہیں کرتیں لیکن مجھے تو احساس ہے کہ میری وجہ سے ان کی زندگی بالکل چینج ہو گئی ہے۔ اسی لیے جب میرا لاہور جانے کا پروگرام بنا تو میں نے انہیں بھی اپنے ساتھ چلنے کی آفر کر دی۔ میرا خیال تھا کہ جتنا وقت میں اپنی مصروفیت میں گزاروں گی، ممی اپنے احباب سے ملاقات کر لیں گی۔ باقی بچا کھچا وقت ہم دونوں ماں بیٹی ایک ساتھ گزار لیں گے۔ انہوں نے میری آفر قبول کر لی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ہم کسی ہوٹل میں اسٹے کریں گے۔ ایکچوئلی انہیں ماموں جان کے گھر میں رکنا اچھا نہیں لگ رہا۔ ظاہری طور پر کافی ماڈرن نظر آنے کے باوجود وہ مشرقی ویلیوز کو اہمیت دیتی ہیں۔ اس لیے بیٹی کے سسرال میں رہنا پسند نہیں کرتیں۔ پھر ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان کے وقت بے وقت آنے جانے سے ماموں جان وغیرہ ڈسٹرب ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے، جب تم سب کچھ طے ہی کر چکی ہو تو میں تمہارے پروگرام کو خراب کرنے والا کون ہوتا ہوں۔ البتہ یہاں سے لاہور تک تم مشابرم خان کے ساتھ ہی جانا کیونکہ مجھے تمہارا پبلک ٹرانسپورٹ سے جانا بالکل اچھا نہیں لگے گا اور میرے خیال میں تمہاری ممی بھی اس میں کوئی حرج محسوس نہیں کریں گی۔'' اس نے نہایت سکون سے ماریا کی ساری بات سنی اور آخر میں اپنا فیصلہ سنایا۔

''تھینک یو شہر یار! مجھے خوشی ہے کہ آپ کو میرا اتنا خیال ہے۔ میرے ساتھ ممی کی مجبوری نہیں ہوتی تو میں خود بھی ماموں جان کی کوٹھی پر رکنا پسند کرتی۔ آفرین آنٹی اتنی خیال کرنے والی خاتون ہیں کہ ان سے مل کر ہمیشہ ہی اچھا لگتا ہے۔ اب بھی مجھے جیسے ہی موقع ملا، ان سے ملاقات کے لیے ضرور جاؤں گی۔'' اس نے مشابرم خان کے ساتھ جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ارادے سے بھی آگاہ کیا۔

''اس سلسلے میں میری طرف سے تمہارے اوپر کوئی زبردستی نہیں ہے۔ تمہارا دل چاہے اور تم سہولت محسوس کرو تو ممانی جان سے ملنے چلی جانا ورنہ کوئی پابندی نہیں ہے۔ البتہ مجھے یہ فکر ضرور رہے گی کہ تم وہاں کنوینس کے لیے پریشان رہو گی۔''

''پریشانی کیسی؟ میں کرائے پر کوئی کار لے لوں گی یا پھر ہوٹل سے بھی ایسی کوئی سہولت مل جائے گی۔ آج کے دور میں اس قسم کی باتوں کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔'' اس نے بے نیازی سے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا تو شہر یار اس کی اس ادا کو دیکھتا رہ گیا۔ مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی وہ ڈاکٹر جو اس سے شادی کے نتیجے میں اپر کلاس میں داخل ہوئی تھی، کیسے اسے بتا رہی تھی کہ پیسے کے بل بوتے پر کون سے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور کیسی سہولتیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

''ٹھیک ہے، جو مناسب سمجھو کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' اس نے کل اختیارات ماریا کو سونپ دیے تو وہ خوش ہو گئی اور فرطِ جذبات سے اس کے قریب چلی آئی۔

''تھینک یو سو مچ شہر یار! آپ سچ مچ بہت اچھے ہیں۔'' صوفے پر اس کے پہلو میں بیٹھ کر اس نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''اور تم اس بہت اچھے شوہر کو اکیلا چھوڑ کر جا رہی ہو؟'' اس نے بھی شکوہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

''دو چار دن کی تو بات ہے۔ اگر آپ نہیں چاہتے تو میں نہیں جاتی۔'' وہ اس کے کچھ اور بھی قریب ہو بیٹھی اور اپنی ٹھوڑی اس کے بازو پر ٹکاتے ہوئے ایک ادا سے بولی۔ قربت کے ان لمحات میں شہر یار نے اپنے جسم میں سنسناہٹ سی محسوس کی۔ یہ عورت اس کی بیوی تھی اور انہوں نے خلوت میں ایک دوسرے کے بھیدوں کو خوب جانا تھا لیکن شاید کچھ بھید ایسے تھے جو دل کے نہاں خانوں میں ہی چھپے رہ گئے تھے اور ان بھیدوں تک رسائی کے لیے اسے ماریا کو ڈھیل دینی ہی تھی۔ چنانچہ خود کو سنبھالتا ہوا نرمی سے بولا۔ ''میں نے تو صرف مذاق کیا تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں زبردستی کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ اگر تم لاہور جانا چاہتی ہو تو ضرور جاؤ۔ میں اپنی خاطر تمہیں قطعی نہیں روکوں گا۔''

''سو کیوٹ۔'' ماریا نے جھک کر اس کا رخسار چوما۔

''مجھے معلوم تھا کہ آپ کا یہی جواب ہوگا۔'' وہ بہت خوش تھی۔

''سارے شریف شوہر بیوی کی بات مانتے ہیں۔ میں نے کون سا کمال کیا ہے؟'' اس نے بھی ہنس کر جواب دیتے ہوئے خوش مزاجی کا ثبوت دیا۔ موجودہ حالات میں دل کی ہر بات دل میں ہی رکھنی ضروری تھی کیونکہ اگر ماریا مجرم تھی تو اسے اس کی کسی بات پر شک میں مبتلا ہو کر چوکنا ہونے کا موقع نہیں ملنا چاہیے تھا۔ بصورتِ دیگر بھی یہ راز، راز ہی رہتا تو اچھا تھا، ورنہ ایک شک کا اظہار اس کی ازدواجی زندگی کو تباہ کر ڈالتا۔

''آپ کی شرافت کی گواہ ہوں جب ہی تو یہاں بیٹھ کر چھیڑ چھاڑ کر رہی ہوں۔'' ہنسی میں اس کا ساتھ دیتے ہوئے ماریا نے اس کے بازو پر ہلکی سی چٹکی لی۔ اس کی آنکھوں سے

چھلکتی شرارت نے اسے کچھ اور بھی دل ربا بنا دیا تھا۔ شہر یار پُرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ ایسا کچھ تو تھا اس عورت میں کہ وہ اس سے محبت نہ کرنے کے باوجود اس کی قربت میں زندگی گزار رہا تھا۔

''ایسے نہ دیکھیں۔ یہ ہمارا بیڈ روم نہیں ہے۔'' وہ کچھ اور شریر ہوئی۔

''تو چلو پھر وہیں چلتے ہیں۔'' اس نے بھی جوابی وار کیا۔

''آپ چلیں، مجھے تو اپنے لاہور کے سفر کے لیے پیکنگ کرنی ہے۔'' اس نے یکدم ہی ہری جھنڈی دکھا دی اور ہنستی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ وہ خود کون سا خواہش مند تھا، سو وہیں آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔ ماریا کے لاہور کے سفر کے لیے اسے خود بھی تو تیاری کرنی تھی اور سوچنا تھا کہ کیا لائحہ عمل اختیار کرے۔

☆☆☆

ماریا اور اس کی ممی سویرے ہی مشابرم خان کے ساتھ لاہور کے لیے روانہ ہو گئی تھیں۔ اس نے مشابرم خان کو اچھی طرح اس کی ڈیوٹی سمجھا دی تھی۔ بظاہر وہ ان دونوں کو ان کے پسندیدہ ہوٹل تک ڈراپ کرنے کے بعد واپس آ جاتا لیکن حقیقت میں اسے وہیں رہ کر ان دونوں کے معمولات کی نگرانی کرنی تھی۔ اس مقصد کے لیے وہ شہر یار کی گاڑی کو رانا ہاؤس میں چھوڑ دیتا اور خود اپنے لیے موٹر سائیکل کرائے پر لے لیتا۔ شہر یار کی گاڑی ماریا کے لیے جانی پہچانی ہونے کی وجہ سے نگرانی کے لیے غیر موزوں تھی۔ اس گاڑی کو استعمال کرنے کی صورت میں مشابرم خان فوراً ہی نظر میں آ جاتا۔ موٹر سائیکل کے استعمال کا یہ فائدہ تھا کہ ایک تو موٹر سائیکل سوار کے لیے خود کو کسی کونے کھدرے میں چھپا لینا آسان تھا اور تعاقب کرتے ہوئے بھی وہ ہیلمٹ کے استعمال سے اپنا چہرہ چھپا سکتا تھا۔

مشابرم خان اس کی ساری ہدایات بغیر کسی حیل و حجت کے سنتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے چہرے پر بھی ایسا کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ اسے شہر یار کے اپنی بیوی کی نگرانی کروانے پر حیرت یا کسی قسم کا تجسس ہے۔ وہ واقعی اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک نہایت وفادار آدمی تھا جس کے لیے حکم کی بجا آوری ہی سب سے اہم تھی اس کے باوجود شہر یار اس کے سامنے خفت محسوس کر رہا تھا اور جانتا تھا کہ زبان و تاثرات سے کسی قسم کا اظہار نہ کرنے کے باوجود مشابرم خان کے ذہن میں سوالات نے جنم تو ضرور لیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سوچ رہا ہو کہ صاحب کو اپنی بیوی کے کردار پر شک ہے اور یہ ایک قابلِ شرم بات تھی۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ ماریا والے معاملے کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر بات اس کے ذاتی مفاد کی حد تک ہوتی تو شاید وہ طرح دے بھی جاتا لیکن یہ ملکی سالمیت کا معاملہ تھا۔ پچھلے کچھ عرصے میں جس طرح کے واقعات سامنے آتے رہے تھے، اس سے صاف ظاہر تھا کہ ملک دشمن ایجنسیاں خصوصاً را کے پٹھو پوری طرح سے سرگرم ہیں اور پاکستان کی سالمیت کے درپے ہو چکے ہیں۔ دیکھا جائے تو اس قسم کے لوگوں سے نمٹنا اس کے فرائض منصبی میں شامل نہیں تھا لیکن ایک محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے وہ خود کو اس جنگ سے الگ تھلگ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسے اسی ملک میں جینا مرنا تھا تو وہ اس ملک کے لیے جینے مرنے کا بھی حوصلہ رکھتا تھا۔ ملکی مفادات کے آگے اسے کوئی شخص اور رشتہ عزیز نہیں تھا۔ نہ ہی وہ اپنی ناک بچانے کے لیے اس معاملے کو مزید ٹال سکتا تھا۔ البتہ اس نے اتنی احتیاط ضرور کی تھی کہ ذیشان کو اس معاملے میں ملوث کرنے کے بجائے مشابرم خان سے کام لے رہا تھا کیونکہ مشابرم خان اس کے لیے ہر فرد سے زیادہ قابلِ اعتماد تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہر دو صورتوں میں بات اس کی ذات سے آگے نہیں بڑھے گی اور اگر ماریا بے قصور ثابت ہوئی تو وہ اپنی ازدواجی زندگی کو پہلے ہی کی طرح چلاتا رہے گا۔ دوسری صورت میں ماریا کو اس کے بدترین انجام سے بھی کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

اس معاملے کو ہر زاویے سے سوچ لینے کے باوجود وہ شدید اضطراب کا شکار تھا۔ دفتری امور بھی اسی بے چینی کے ساتھ انجام دیے جا رہے تھے۔ عبدالمنان نے تجویز پیش کی تھی کہ آج نور پور کا دورہ کر لیتے ہیں تاکہ وہاں جاری ترقیاتی کاموں کا جائزہ لیا جا سکے لیکن اس نے یہ ذمے داری اس کے شانوں پر ڈال کر خود جانے سے انکار کر دیا تھا۔ معمول کے کاموں کی انجام دہی کے دوران ماہ بانو اور اسلم کے شناختی کاغذات بھی اس تک پہنچ گئے اور مشابرم خان کا فون بھی آ گیا کہ وہ ماریا اور اس کی ممی کو لاہور پہنچا چکا ہے۔ اس موقع پر شہر یار نے اسے ہدایت دی کہ وہ خود ہوٹل کے سامنے سے ہٹ کر گاڑی رانا ہاؤس پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔ اس کام کے لیے وہ رانا ہاؤس فون کر کے کسی ملازم کو بھیج دے گا اور وہی ملازم اس کے لیے موٹر سائیکل بھی فراہم کر دے گا۔ اس نے یہ نئی ہدایت اس خیال سے دی تھی کہ یہ نہ ہو کہ مشابرم خان گاڑی پہنچانے رانا ہاؤس جائے اور اس دوران ماریا اپنی ممی کے ساتھ کہیں روانہ ہو جائے۔ یہ احکامات جاری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے کے بعد اسے قدرے اطمینان ہوا تھا کہ جلد یا بدیر بلی تھیلے سے باہر آجائے گی۔ لیکن بہرحال، وہ مکمل طور پر پُرسکون نہیں ہوسکتا تھا۔ اضطراب کی اس کیفیت سے گزرتے ہوئے اسے ماہ بانو کی کال موصول ہوگئی۔

''تم نے بہت اچھے موقع پر فون کیا ہے۔ تمہارے کاغذات مجھ تک پہنچ چکے ہیں اور اب تم دونوں جب چاہو سول میرج کرسکتے ہو۔'' اس نے خوش دلی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے اطلاع دی۔

''ہم تو فوری طور پر یہ کام کرنا چاہتے ہیں لیکن اصل مسئلہ آپ کا ہے۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ میری شادی میں ضرور شرکت کریں گے۔'' ماہ بانو نے اسے یاد دلایا۔

''مجھے اپنا وعدہ بہت اچھی طرح یاد ہے۔ تم جب کہو گی، میں پہنچ جاؤں گا۔'' اس نے بڑے وقار سے جواب دیا۔ یہ الگ بات تھی کہ دل میں ایک ملال سا تھا۔ وہ ایسے نہیں پاسکا تھا یہ دکھ اپنی جگہ لیکن اسے ماہ بانو کا جیون ساتھی کے طور پر ایک مفرور ڈاکو کو منتخب کرنا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

''اگر میں کہوں کہ آج ہی تو کیا آپ آجائیں گے؟'' وہ جانے کیوں اسے آزمانے پر تلی ہوئی تھی۔

''ہاں، مجھے تھوڑی مشکل تو ضرور ہوگی لیکن میں ضرور آجاؤں گا۔'' اس نے صاف لہجے میں جواب دیا تو کچھ دیر کے لیے لائن پر خاموشی سی چھا گئی پھر ماہ بانو کی نم ناک سی آواز سنائی دی۔

''تو پھر آجائیں۔ دیر ہوگئی تو کہیں میرے لیے اپنے وعدے کی پاسداری کرنا مشکل نہ ہوجائے۔'' اس ایک جملے میں کیا نہیں تھا۔ وہ اپنی جگہ تڑپ سا گیا۔ اس چھوٹی سی لڑکی کے جذبے کوئی اس سے پوشیدہ تو نہیں تھے جو وہ اس کی کیفیت کو محسوس نہ کرسکتا یا اسے اتنی بات سمجھ نہیں آتی کہ اس کا اسلم سے شادی کا فیصلہ محض ایک سمجھوتا ہے۔

''جب دل نہیں مانتا تو خود پر جبر کیوں کرتی ہو؟ مت کرو یہ شادی۔ میں تمہیں تنہا ہی ملک سے باہر بھجوا دوں گا۔ باہر رہ کر تم اطمینان سے اپنی تعلیم مکمل کرنا اور جب تمہیں اپنے معیار کا کوئی شخص ملے تو اس سے شادی کرلینا۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے لیے تمہارے پاس ابھی بہت وقت ہے۔'' اس نے اسے سمجھانے کی ایک اور کوشش کی۔

''وقت کی بات رہنے دیں اے سی صاحب! کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان ساری زندگی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پاتا اور کبھی زندگی بھر کے فیصلے ایک لمحے میں ہوجاتے ہیں۔ رہی میری کم عمری کی بات تو یہ آپ بھی جانتے ہیں کہ میں اتنی ہی عمر میں جتنے تجربات سے گزر چکی ہوں، عام طور پر لڑکیاں ساری زندگی میں بھی اتنے برے تجربات سے نہیں گزرتیں۔ اس لیے مجھ میں انسانوں کی پرکھ بھی عام لڑکیوں کے مقابلے میں تھوڑی زیادہ ہے۔ آپ کا قانون چاہے اسلم کو کسی بھی نام سے پکارے، میرے نزدیک وہ حالات کا مارا ہوا ہے جو بہت آسانی سے سنبھل جائے گا اور اپنی مثبت خصوصیات کے ساتھ زندگی گزار سکے گا۔'' وہ کسی جہاندیدہ عورت کی طرح اس کی بات کا جواب دے رہی تھی۔

''اگر تم اسلم کو صرف ہمدردی میں اپنا رہی ہو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے اس سے شادی کیے بغیر بھی اسے ملک سے باہر نکلوا دوں گا تاکہ وہ پوری آزادی کے ساتھ اپنی نئی زندگی کی شروعات کرسکے۔'' وہ ہر حال میں اسے اس کے غلط فیصلے سے روک لینا چاہتا تھا۔

''میں اسلم کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس کی نئی زندگی کے آغاز کے لیے میرا وجود آکسیجن کی طرح لازم و ملزوم ہے۔ اس نے بڑی شدت سے میرے ساتھ جینے کا خواب دیکھا ہے۔ میں اسے نہ ملی تو وہ جی نہیں سکے گا۔'' اس نے نہایت دردمندی سے بتایا۔

''لگتا ہے اسے بہت قریب سے جاننے لگی ہو؟'' جانے کیوں وہ طنز کر گیا۔ جواباً ماہ بانو کچھ نہیں بولی تو اسے خود ہی اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔

''سوری، میں کچھ زیادہ ہی بول گیا ہوں۔ تم مجھے ایڈریس بتاؤ کہ میں کہاں پہنچوں؟ میں ابھی آدھے گھنٹے میں یہاں سے روانہ ہوجاؤں گا۔ اگر تمہاری تقدیر میں لکھا ہے تو تمہاری شادی آج ہی کی تاریخ میں اسلم سے ہوگی۔'' شرمندگی کا اظہار کرتے کرتے آخر میں اس کا لہجہ پُرعزم ہو گیا۔

''آپ ایسا کیجیے کہ مینار پاکستان پر پہنچ جائیں۔ پھر جہاں بھی جانا ہوگا، ہم ساتھ چلیں گے۔'' ذرا دیر سوچنے کے بعد ماہ بانو نے اس سے کہا تو اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے سلسلہ منقطع کر دیا اور خود عبدالمنان کو بلا کر اسے ہدایات دینے لگا۔ ان ہدایات میں عبدالمنان کو آج کے دن نور پور جانے سے منع کرنا بھی شامل تھا۔ یہ کام اس کے بجائے دفتر کا کوئی دوسرا بندہ بھی کرسکتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں البتہ عبدالمنان کا یہاں رہنا بہت ضروری تھا۔ اسے ہدایات دینے کے بعد اس نے چند ایک مزید ضروری امور نمٹائے اور حسبِ وعدہ آدھے گھنٹے میں دفتر سے روانہ ہو

گیا۔ اس کی ذاتی گاڑی میں تو اس وقت مشابرم خان ماریا کو لاہور چھوڑنے گیا ہوا تھا اس لیے ناچار اسے دفتر کی گاڑی استعمال کرنی پڑی۔ گاڑی وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا اور عبدالمنان کی پیشکش کے باوجود اس نے کسی اور ڈرائیور کو ساتھ لے جانا پسند نہیں کیا تھا۔ مشابرم خان کی بات پھر بھی الگ تھی لیکن اس وقت وہ جس نجی نوعیت کے کام سے جارہا تھا، کسی دوسرے شخص کو اپنے ساتھ لے جانا گوارا ہی نہیں کرسکتا تھا۔ ماہ بانو کا معاملہ اتنا نازک تھا کہ وہ اس کے سلسلے میں اپنے سائے پر بھی بھروسا کرنے میں ڈرتا تھا۔ وہ خانماں برباد لڑکی اگر اس کی کسی کوتاہی کے سبب مزید مشکل میں پڑ جاتی تو وہ سخت پچھتاوا اور ندامت محسوس کرتا۔ اس پچھتاوے سے بچنے کے لیے ہی تو وہ اس کے لیے بہت کچھ قانون کی حدود سے نکل کر بھی کرنے کے لیے راضی ہوگیا تھا۔ اگر وہ آباد ہوجاتی تو اسے اپنے دل کی بربادی کا ذرا ملال نہ رہتا۔

خیالوں میں غلطاں وہ مسلسل آگے بڑھتا چلا گیا لیکن پھر تھکن کا سا احساس ہونے لگا۔ یہ تھکن اس سفر کی نہیں تھی۔ کئی دن سے اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ کل رات بھر بھی وہ ماریا کے کردار کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اعصابی کشیدگی نے اسے ڈھنگ سے ناشتا بھی نہیں کرنے دیا تھا اور وہ پہلے دفتری مصروفیات کے بعد اب اس سفر میں مبتلا ہوگیا تھا۔ گاڑی بھی ذاتی نہیں تھی اس لیے چلانے میں تھوڑی سی الجھن ہورہی تھی۔ اس نے مناسب سمجھا کہ راستے میں رک کر کہیں سے گرما گرم چائے پی لے تاکہ طبیعت تھوڑی فریش ہو جائے۔ عام حالات میں وہ جب بھی لمبے سفر پر نکلتا تھا راستے کی ضروریات کے مطابق سامان گاڑی میں رکھوا لیتا تھا، لیکن آج کچھ عجلت کے باعث اور کچھ اپنی ذہنی کیفیت کے سبب ایسی کوئی تیاری نہیں کی تھی اور گاڑی میں سوائے سادہ پانی کی بوتل کے خورونوش کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔

ذہن میں رکنے کا خیال آیا تو اس نے آنے والے پہلے ہوٹل پر ہی گاڑی روک لی۔ اس ہوٹل پر اترنے کے بعد اسے یاد آیا کہ یہ وہی مقام ہے جہاں سے اس کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ ماریا سے شادی کا فیصلہ اس ہوٹل کے ہی ایک چھوٹے سے کمرے میں قیام کا مرہونِ منت تھا۔ یہاں اس نے اپنی ذات کا فخر و غرور لٹا دیا تھا اور پھر تاوان میں عمر بھر کے لیے ماریا کا ساتھ قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ آج بھی اپنی زندگی کے ان تاریک لمحوں پر حیران ہوتا تھا جب ماریا کے وجود نے اس سے اس کی ساری سدھ بدھ چھین لی تھی۔ مانا کے وہ حسین اور پُرکشش تھی لیکن اس کی زندگی میں خوب صورت لڑکیوں کی کون سی کمی رہی تھی جو وہ ماریا کے ساتھ تنہائی ملتے ہی آپے سے باہر ہوگیا۔ قدموں کی وہ لغزش آج اس کے جی کا جنجال بنی ہوئی تھی اور وہ ماریا کو گلے میں پھنسی ہوئی ہڈی کی طرح نہ تو نگل سکتا تھا اور نہ اگل سکتا تھا۔

''یہ لو صاحب! اسپیشل دودھ پتّی ہے۔'' اس کی فرمائش پر نہایت پھرتی سے اس کی ٹیبل تک چینک اور پیالی پہنچانے والے ہوٹل کے چھوٹے نے مخصوص لب و لہجے میں اس کے قریب آکر کہا تو وہ سامنے دھری چائے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ چھوٹا آرڈر پورا کرکے فوراً ہی وہاں سے ہوا ہو گیا تھا۔ یہ ایک خاصا مصروف ہوٹل تھا جہاں پرائیویٹ کاروں سے لے کر عام بسوں میں سفر کرنے والے مسافروں تک سب ہی رکتے تھے۔ اسی وجہ سے ہوٹل کے مختصر سے عملے کو خاصا فعال رہنا پڑتا تھا۔ وہ چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا ہوا یونہی اپنے اردگرد پھیلی افراتفری کا جائزہ لینے لگا۔ وہ وقت ایسا تھا کہ زیادہ تر لوگ چائے پینے پر ہی اکتفا کر رہے تھے۔ بس اِکّا دُکّا ہی افراد ایسے تھے جن کے آگے کھانے کی پلیٹیں نظر آرہی تھیں۔ کھانے کا اصل وقت ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہوتا۔ پھر یقیناً ترتیب الٹ جاتی اور وہاں چائے نوشوں کے بجائے کھانا تناول کرنے والوں کا رش بڑھ جاتا۔

اپنی فراغت اور تنہائی کے باعث آزادی سے اردگرد کی ٹیبلوں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے سے کچھ فاصلے پر موجود ایک چہرے کو دیکھ کر وہ ذرا چونک گیا۔ وہ چہرہ اسے کچھ شناسا سا لگا تھا لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ اس سے نظر ملتے ہی وہ شخص کچھ بوکھلا سا گیا اور فوراً ہی چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگا کر منہ پھیر لیا۔ اس شخص کے اس ردِعمل نے اسے حیرت میں مبتلا کر دیا۔ وہ جب اس شخص کی طرف متوجہ ہوا تھا تو وہ پہلے ہی سے اسے دیکھ رہا تھا لیکن نظر ملنے پر نہ صرف فوراً ہی انجان بن گیا بلکہ کچھ اس طرح سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے اس کی سرے سے شہریار کی طرف توجہ ہی نہ ہو۔ اس کے اس ردِعمل پر بےچینی محسوس کرنے کے باوجود وہ انجان بن گیا اور چائے ختم کرکے اس کا بل ادا کرنے تک دانستہ خود کو انجاں ہی ظاہر کرتا رہا۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جب وہ بل کی ادائیگی کے بعد وہاں سے اٹھا تو اس شخص نے بھی بہ عجلت اپنی جگہ چھوڑ دی اور اس سے بھی زیادہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ شہریار باہر نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھا تو وہ شخص بھی پیچھے کچھ فاصلے پر کھڑی اپنی گاڑی... اسٹارٹ کرنے لگا۔ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شخص کا انداز ایسا تھا کہ شہر یار چونک گیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھنے کے باوجود تذبذب کے باعث انجن اسٹارٹ نہیں کر سکا۔ پچھلی گاڑی میں موجود شخص نے البتہ اس کا انتظار نہیں کیا اور اپنی گاڑی آگے نکال لے گیا۔ اس کی اس حرکت سے شہر یار کے دل میں جو موہوم سا اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ شاید وہ شخص اس کا تعاقب کر رہا ہے، وہ دور ہو گیا لیکن اس کے ذہن میں پیدا ہونے والی الجھن ہنوز اپنی جگہ موجود تھی۔

اس نے گاڑی ہوٹل سے آگے بڑھالی تھی، اس کے باوجود اس شخص کا خیال اپنے ذہن سے نہیں جھٹک سکا تھا۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال آرہا تھا کہ اس شخص کی صورت اسے شناسا کیوں محسوس ہورہی تھی؟ آخرکار آدھے گھنٹے کی مغزماری کے بعد اس کے ذہن میں روشنی سی چمکی۔ اس شخص کو وہ اس سے قبل بھی مذکورہ ہوٹل میں ہی دیکھ چکا تھا۔ شاید وہ وہاں ویٹر تھا اور جس روز وہ ماریا کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہاں رکا تھا، یہی شخص ماریا کی مطلوبہ دوائیں لینے کسی قریبی قصبے وغیرہ تک گیا تھا لیکن آج تو اس کی جون ہی بدلی ہوئی تھی۔ وہ کہیں سے بھی اس معمولی ہوٹل کا ملازم نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے جسم پر بیش قیمت لباس تھا اور وہ جس گاڑی میں گیا تھا، وہ بھی لاکھوں کی مالیت کی تھی۔ جانے قلیل عرصے میں اس کی ایسی کیا کایا پلٹ ہوئی تھی کہ وہ بالکل بدل کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر وہ مزید سوچتا رہا لیکن پھر یہ خیال آنے پر کہ خوانخواہ اپنی توانائیاں ایک غیر متعلق شخص کے متعلق سوچنے میں برباد کر رہا ہے، آنے والے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا لیکن دماغ کو چین ہی کہاں تھا۔ کبھی ماریا کی تصویر پردۂ خیال پر ابھرتی تو کبھی ماہ بانو کی متوقع شادی کا خیال آجاتا اور دل ہی دل میں وہ اسلم پر رشک کرنے لگتا جسے اتنا انمول اور معصوم حسن ملنے والا تھا۔ جانے وہ دلہن بن کر کیسی لگتی۔ بری لگنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس یہ سوچتا تھا کہ اس کے حسن کے سامنے چاند شرما کر بادلوں میں چھپ جاتا ہے یا سورج کو اپنی ضیا کم لگتی ہے۔ اس کے معصوم حسن کے سامنے تو مس ورلڈ کا ناپا تلا اور کئی ججوں کی آرا سے مستند ٹھہرایا ہوا حسن بھی بے معنی تھا پھر دلہن کے روپ کی تو بات ہی الگ ہوتی ہے۔ عام سی لڑکی بھی جب ارمانوں کے ساتھ سہاگ کا جوڑا پہنتی ہے تو بھلی ہی معلوم ہوتی ہے لیکن جانے ماہ بانو کے لیے کسی نے وہ خصوصی جوڑا خریدا بھی تھا یا نہیں۔

اس نے اسے مینار پاکستان پر بلوایا تھا اور ظاہر ہے اس عوامی جگہ پر تو وہ سولہ سنگھار کیے دلہن کے روپ میں جلوہ افروز نہیں ہو سکتی تھی۔ یعنی وہ بغیر سج دھج کے ہی دلہن بننے جارہی تھی۔ یہ خیال ذہن میں آیا تو اس کے دل پر ایک گھونسا سا پڑا۔ آخر ہر لڑکی کی طرح اسے بھی تو حق تھا کہ سہاگ کا سرخ رو پہلا جوڑا پہنے۔ لیکن اس کا ایسا کوئی عزیز تھا ہی کب جو اس کے لیے یہ اہتمام کرتا۔ وقت کے گرداب میں پھنسی اس لڑکی کا ہر رشتہ تو اس سے چھین لیا گیا تھا۔ اس کے پیاروں میں سے کچھ کو موت نے نگل لیا تھا اور کچھ ویسے ہی اس سے جدا ہو گئے تھے۔ شاید اپنی اسی شدید تنہائی کی وجہ سے اس نے اپنی شادی کے اہم موقع پر اسے مدعو کیا تھا یقیناً اپنا واحد عزیز مان کر..... تو پھر اس کا بھی فرض بنتا تھا کہ اس کا مان رکھتے ہوئے اپنے بے نام رشتے کا حق ادا کرتا۔

وہ لاہور کی حدود میں داخل ہوا تو اس کی گاڑی کا رخ خودبخود ہی ایک بڑے شاپنگ سینٹر کی طرف ہو گیا۔ اس شاپنگ سینٹر میں ایسے کئی بوتیکس تھے جہاں وہ بھاری رقم کے عوض فوری طور پر تیار شدہ برائیڈل ڈریس خرید سکتا تھا۔ گاڑی شاپنگ سینٹر کی پارکنگ میں کھڑی کر کے اس نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا، وہ کافی تیز رفتاری سے آیا تھا اس لیے وقت کی خاصی بچت ہو گئی تھی اور ماہ بانو سے مینار پاکستان پر ملنے وہ دن کی روشنی میں آرام سے پہنچ سکتا تھا۔ اس بات کا اطمینان ہو گیا تو اس نے قدم ایک مشہور بوتیک کی طرف بڑھا دیے۔ ماضی میں اسے اس قسم کی شاپنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس کی اپنی شادی کے موقع پر بھی ساری خریداری آفرین رانا نے ہی کی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ وہ ماہ بانو کے لیے ایک عمدہ عروسی جوڑے کا انتخاب کرنے میں کامیاب رہے گا۔

وہ بوتیک میں داخل ہوا تو سیلز گرل نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی خریداری کی نوعیت جان کر مہذبانہ لہجے میں بولی۔ ”اگر آپ کے پاس وقت ہے تو میں آپ کو کیٹلاگ دکھا دیتی ہوں۔ کیٹلاگ کی مدد سے آپ اپنی پسند کے ڈریس کا آرڈر دے سکتے ہیں اور اس میں اپنی پسند کے مطابق ردوبدل بھی کروا سکتے ہیں۔ ہمارا بوتیک طے شدہ وقت پر آپ کا آرڈر تیار کر دے گا۔“

”نہیں، میرے پاس بالکل بھی وقت نہیں ہے۔ میں ابھی ابھی بالکل تیار شدہ ڈریس خریدنا چاہتا ہوں۔“ ظاہر ہے اس کا جواب یہی ہونا چاہیے تھا جسے سن کر سیلز گرل نے ذرا سا تامل کیا اور پھر اپنی ایک ہیلپر کی مدد سے اسے تیار شدہ عروسی جوڑے دکھانے لگی۔ وہ سارے ہی جوڑے یقینی طور پر قیمتی اور بیش قیمت تھے لیکن اسے کوئی ایک بھی ماہ بانو کے لیے نہیں جچ رہا تھا۔ سیلز گرل خنداں پیشانی سے اس کی رنجیدگی

برداشت کر رہی تھی۔ اس کی ہیلپر بھی تن دہی سے ڈبے نکال نکال کر لارہی تھی۔ اتفاق سے اسی وقت سیلز گرل کے موبائل پر کوئی کال آنے لگی اور وہ اسے ایکسکیوز کرتی ہوئی ایک سائڈ پر ہو کر کال سننے لگی۔ اس دوران ہیلپر لڑکی نے اسے انتظار کی زحمت سے دوچار نہیں کیا اور خود ملبوسات نکال کر دکھانے لگی۔ اس کے دکھائے ہوئے ایک سرخ عروسی جوڑے نے شہر یار کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ قندھاری انار جیسے سرخ رنگت والے اس جوڑے کا کپڑا بے حد نفیس تھا جسے رنگ برنگے پتھروں کے امتزاج سے بوجھل کیا گیا تھا۔ جوڑا اسلی ہوئی حالت میں بالکل تیار تھا اور اسے دیکھ کر شہر یار کو یوں لگا تھا جیسے یہ ماہ بانو کے لیے ہی تیار کیا گیا ہو۔

”مجھے یہ ڈریس خریدنا ہے۔“ اس نے فوراً ہی لڑکی کو اپنی پسند سے آگاہ کیا۔

”اوہ ایمن! تم نے یہ سوٹ کیوں دکھایا۔ اسے تو مسز تنویر نے اپنی بیٹی کے لیے آرڈر پر تیار کروایا ہے۔“ اسی اثنا میں کال سننے کے لیے ایک سائڈ پر ہو جانے والی سیلز گرل نے واپس آکر اپنی ہیلپر کو ٹوکا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوتی ہوئی کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”سوری سر! میری اسسٹنٹ نے غلطی سے آپ کو کسی اور کا آرڈر کیا ہوا ڈریس دکھا دیا ہے۔ آپ اس کے علاوہ کوئی اور ڈریس دیکھ لیں۔ ہمارے بوتیک پر اس سے بھی زیادہ خوب صورت اور قیمتی برائیڈل ڈریسز موجود ہیں۔ یقیناً آپ کو ان میں سے کوئی ضرور پسند آئے گا۔“

”سوری مس! مجھے یہی چاہیے۔ آپ اپنی اونر سے معلوم کر لیں، ہو سکتا ہے وہ اس سلسلے میں کچھ کر سکیں۔ مجھے بہرحال، یہ سوٹ ابھی اور ہر قیمت پر چاہیے۔“ اس نے اپنا مافی الضمیر پوری وضاحت سے بیان کر دیا جسے سن کر سیلز گرل کے چہرے کے تاثرات کچھ بدل سے گئے اور وہ نہایت طفلانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”آپ ضد کر رہے ہیں تو میں میڈم سے بات کر کے دیکھتی ہوں۔ آپ پلیز کچھ دیر یہاں بیٹھ کر ویٹ کر لیں۔“ وہ کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر باہر آئی اور اپنی اسسٹنٹ سے بولی۔ ”ایمن! ان صاحب کو ان کی پسند کے مطابق چائے، کافی یا جو بھی یہ لینا چاہیں سرو کرو۔ میں ابھی میڈم سے ڈسکس کر کے آتی ہوں۔“ اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ایمن نامی لڑکی شہر یار کی خدمت پر کمربستہ نظر آنے لگی لیکن اس وقت وہ کچھ بھی کھانے پینے کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے صاف لفظوں میں انکار کر کے یونہی وہاں بیٹھا رہا اور بے مقصد ادھر ادھر نظریں گھمانے لگا۔ بوتیک کی بناوٹ خوب صورت تھی اور وہاں تعمیر میں شیشوں اور آئینوں کا بے تحاشا استعمال کیا گیا تھا۔ شیشوں والی دیواروں کی وجہ سے باہر سے ہی اندر موجود ملبوسات نظر آنے لگتے تھے اور گاہک خودبخود ہی اندر کھنچے چلے آنے پر مجبور ہو جاتے تھے..... جبکہ آئینوں کا استعمال یقیناً اس لیے کیا گیا تھا کہ خواتین ملبوسات کو اپنے ساتھ لگا کر اندازہ کر سکیں کہ کون سا رنگ اور جوڑا ان پر جچ رہا ہے۔ مقصد بہرحال جو بھی رہا ہو، وہ تو اس وقت ایک آئینے میں اس چہرے کی جھلک دیکھ کر بھونچکا رہ گیا جسے دورانِ سفر بھی ہوٹل پر دیکھ کر چونکا تھا لیکن پھر نظرانداز کر دیا تھا۔ اس چہرے کا آج ہی کے دن میں اتنی جلدی دوبارہ نظر آنا محض اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔

”کیا یہ شخص میرا تعاقب کر رہا ہے؟ لیکن کیوں؟“

اس کے ذہن میں سوالات ابھرے۔ وہ تو ہوٹل سے اس کے گاڑی آگے نکال لے جانے پر اس کی طرف سے قطعی بے پروا ہو گیا تھا لیکن اب حالات بتارہے تھے کہ یہ بے پروائی مناسب نہیں تھی۔ اب بھی وہ بے شک آئینے میں اس کے چہرے کی ایک جھلک ہی دیکھ سکا تھا لیکن یہ ضروری تھا کہ پوری طرح ہوشیار رہے۔ ”مبارک ہو سر! میں نے میڈم کو آپ کے حق میں راضی کر لیا ہے۔ ہم مسز تنویر کو ان کا آرڈر دوبارہ تیار کر کے دے دیں گے لیکن ظاہر ہے کہ وقت کی کمی کی وجہ سے ہمیں کافی مشکلات اور اخراجات کا سامنا کرنا پڑے گا جس کے لیے آپ کو زحمت اٹھانی پڑے گی۔“ بوتیک کی مالکن سے مذاکرات کے لیے جانے والی سیلز گرل نے اسے خوش خبری سنانے کے ساتھ ساتھ کاروباری سی تمہید بھی باندھنا شروع کر دی۔

وہ اس تمہید کا مقصد سمجھ سکتا تھا چنانچہ نہایت سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ مجھے پرائس بتا دیں۔“ جواباً سیلز گرل نے اسے ایک ہوشربا رقم بتائی جو یقیناً عام حالات میں اس جوڑے کی قیمت سے دگنی تگنی ہی تھی لیکن وہ کسی قسم کی بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ خاموشی سے کریڈٹ کارڈ کی مدد سے پے منٹ کر دی اور پیک شدہ عروسی جوڑے کا ڈبا لیے بوتیک سے باہر نکل گیا۔ اب اسے پروگرام کے مطابق مینار پاکستان کی طرف جانا تھا لیکن اس طرف کا رخ کرنے سے پہلے اسے اپنے تعاقب کار کو بھی دیکھنا تھا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے اس نے ماہ بانو کو موبائل پر اپنی لاہور آمد کے بارے میں باخبر کر دیا تاکہ وہ کسی اندیشے کا شکار نہ ہو لیکن فوری طور پر مینار پاکستان تک پہنچنے سے منع کر دیا اور اسے ہدایت دے دی کہ وہاں آنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے وہ اس کے فون کا انتظار کرے۔ اس طرف سے فارغ ہو کر وہ پوری طرح اپنے تعاقب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بہت جلد اس کی نظروں نے اس کلٹس کو تلاش کر لیا جو کافی فاصلے سے اس کے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ تعاقب کرنے والا بہت ہوشیاری سے اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ اگر اس نے بوتیک کے آئینے میں اس کے چہرے کی جھلک نہ دیکھ لی ہوتی تو کبھی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے۔

اس نے فیصلہ کیا کہ اس شخص سے پیچھا چھڑانے کے بجائے اچھی طرح نمٹتا ہے تا کہ کھل کر اپنے دشمنوں کو دیکھ سکے۔ اپنے پاس پسٹل کی موجودگی کی یقین دہانی کرنے کے بعد اس نے جان بوجھ کر آہستہ آہستہ گاڑی مصروف شاہراہوں کے بجائے ایسے راستے پر ڈال لی جہاں کم سے کم ٹریفک تھا اور پھر بالکل ہی سنسان راستے کی طرف نکل پڑا۔ کلٹس اس کے پیچھے تھی اور فاصلہ کافی زیادہ ہونے کے باوجود وہ درمیان میں دوسری گاڑیاں نہ ہونے کے سبب اسے صاف دیکھ سکتا تھا۔ اس موقع پر اس نے ایک خطرناک قدم اٹھایا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جس سڑک سے گزر رہا ہے، آگے جا کر اس پر دائیں جانب ایک راستہ نکلے گا۔ اس نے یکدم ہی اپنی گاڑی کی رفتار بہت تیز کر دی اور جیسے ہی دائیں جانب جانے والا وہ راستہ نظر آیا، سیدھی چلتی گاڑی کو اس پر موڑ لیا اور پھر گاڑی بیک کر کے پہلے والے راستے پر واپس آیا لیکن اب اس کی گاڑی آگے کے بجائے واپس پیچھے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ یعنی اب اس کی گاڑی اور کلٹس کا رخ ایک دوسرے کی جانب تھا۔ کلٹس کو ڈرائیو کرنے والا یقیناً صورتِ حال میں آنے والی اس اچانک تبدیلی پر کچھ گڑبڑا گیا تھا اور خود کو انجان ظاہر کر کے وہاں سے نکلنا چاہتا تھا اس لیے ہارن پر ہارن دے کر شہریار کو راستہ دینے کا اشارہ کرنے لگا لیکن اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ سڑک کی چوڑائی کم ہونے کی وجہ سے وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی تھا اور گاڑی کے بالکل درمیان میں ہونے کی وجہ سے کلٹس والے کے پاس یہ گنجائش نہیں تھی کہ وہ دائیں یا بائیں سے نکل سکے۔ دونوں گاڑیوں کا تصادم ہونے سے قبل اس نے بریک لگا کر جھٹکے سے اپنی گاڑی روک لی۔ کلٹس ڈرائیور نے بھی عین اسی وقت یہی قدم اٹھایا۔ یقینی طور پر وہ ڈر گیا تھا کہ کہیں یہ پاگل آدمی اپنی گاڑی کو میری گاڑی سے نہ ٹکرا دے۔

''یہ کیا جہالت ہے؟ کیا تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی مارنا چاہتے ہو؟ تم جیسے پاگل آدمی کو گاڑی چلانے کی اجازت کس نے دی ہے؟'' دونوں گاڑیاں چند فٹ کی دوری سے ایک دوسرے کے سامنے رکیں تو کلٹس والا دہاڑتا ہوا باہر نکلا۔ وہ اپنے رویے سے بالکل ایسا ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ اس سے قطعی انجان ہو اور سڑک پر ایک انجان آدمی کی فاش غلطی پر اسے غصے سے ٹوک رہا ہو۔ اس کے ہر ردِعمل سے بے نیاز شہریار پُرسکون انداز میں اپنی گاڑی سے باہر آیا اور اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اس بات کا اندازہ لگا لیا کہ اس کی دائیں جانب کی ابھری ہوئی جیب میں کوئی ہتھیار موجود ہے۔

''میری شکل کیا دیکھ رہے ہو، اپنی گاڑی ایک طرف کرو تا کہ میں اپنی گاڑی آگے نکال سکوں۔'' اس کے پُرسکون انداز نے اس شخص کو تھوڑا سا گڑبڑا دیا تھا لیکن وہ اپنی کیفیت کو طیش دکھا کر چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم اتنے ناراض کیوں ہو رہے ہو مسٹر! میں نے تو تمہارے ساتھ تعاون کے لیے گاڑی روکی ہے۔ مجھے تم پر رحم آ رہا تھا کہ خوامخواہ پچھلے کئی گھنٹوں سے میرے پیچھے گھومنے میں اپنا پیٹرول پھونک رہے ہو۔ ایسا کرو کہ تم میری گاڑی میں ہی آ کر بیٹھ جاؤ اس طرح تم زیادہ زحمت سے بچ جاؤ گے۔'' اس کا لہجہ بے شک پُرسکون اور ٹھہرا ہوا تھا لیکن انداز میں ایسی کاٹ تھی کہ وہ شخص بوکھلا کر رہ گیا۔

''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے..... مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں تمہارے پیچھے گھوموں؟'' وہ بظاہر اپنی مدافعت کر رہا تھا لیکن اس کا جسم اس طرح سے تن گیا تھا کہ لگتا تھا وہ ضرورت پڑنے پر کچھ بھی کر گزرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

''میرے پاس اس غلط فہمی کی بڑی ٹھوس وجہ ہے۔ میں اتنے زیادہ اتفاقات کا قائل نہیں ہوں کہ یہ مان سکوں کہ تم اتفاق سے اس ہوٹل میں میرے ساتھ تھے، اتفاق سے میرے ساتھ ساتھ لاہور پہنچ گئے۔ اتفاق سے اس شاپنگ سینٹر میں بھی پائے گئے جہاں میں موجود تھا اور اب اتفاق سے ہی اس سڑک پر بھی میرے ساتھ موجود ہو۔ صاف صاف بتاؤ کہ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟'' آرام سے بولتے بولتے آخر میں اس کا لہجہ بالکل سرد ہو گیا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہتے ہوئے وہ اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔

''میں اپنی اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا ہوں۔ تم میرے ساتھ میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ اگر میری تسلی ہو گئی تو تمہیں چھوڑ دوں گا۔'' وہ اس وقت بالکل مختلف موڈ میں تھا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں

گا۔'' اس شخص نے ہیجان زدہ ہو کر جیب سے ریوالور نکال لیا۔

''تو ٹھیک ہے۔ مار دو گولی۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

اب وہ بے چارہ عجیب تذبذب کے عالم میں تھا۔ یقیناً اس کی ڈیوٹی صرف تعاقب اور نگرانی تک تھی اور وہ کسی پھڈے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا لیکن یہاں عجیب مشکل میں پڑ گیا تھا۔ اسے اور کچھ سمجھ نہیں آیا تو دفعتاً اپنے ریوالور کا رخ اوپر کی طرف کیا اور چند ہوائی فائر داغ دیے۔ شہریار گویا موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے پھرتی سے اس شخص پر جست لگائی اور ایک زوردار گھونسا اس کی ٹھوڑی پر رسید کیا۔ وہ شخص لڑکھڑایا اور اس سے قبل کہ سنبھلتا، شہریار نے اس کے ریوالور والے ہاتھ پر کھڑی ہتھیلی کا زوردار وار کیا۔ ضرب اتنی زوردار تھی کہ اس کے ہاتھ سے ریوالور نکل کر دور جا گرا۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ خود بھی مقابلے پر ڈٹ جاتا چنانچہ پلٹ کر شہریار پر حملہ آور ہوا۔ وہ یقیناً اس کے پیٹ میں اپنے سر سے ٹکر مارنا چاہتا تھا لیکن وہ عین وقت پر جھکائی دے گیا اور دونوں ہاتھ آگے پھیلا کر اس کے بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ مقابل دبلا پتلا اور درمیانی قامت کا تھا پھر وہ باقاعدہ ورزش کا عادی مارشل آرٹس کا تربیت یافتہ تھا چنانچہ بازو گرفت میں آئے تو پھر اسے بخشا نہیں اور دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر اپنے سر سے گزارتے ہوئے عقب میں پٹخ دیا۔ عقب میں پھینکے گئے دشمن کا انجام دیکھنے کے لیے وہ فوراً ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف رخ کیا۔ اتنی بیدردی سے پھینکے جانے پر اس کا خاصا برا حشر ہوا تھا۔ پکی سڑک سے ٹکرا کر سر پھٹ گیا تھا اور ہاتھ پیروں میں بھی خراشیں آئی تھیں۔

''بہتر ہے کہ اب تم شرافت سے میری گاڑی میں بیٹھنے کے لیے تیار ہو جاؤ ورنہ ابھی صرف ڈینٹ پینٹ ہی پڑے ہیں، مزید گڑبڑ کرنے کی صورت میں، میں تمہیں کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر کے بھی اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔'' اس نے مار دھاڑ کے سلسلے کو طول دینے کے بجائے جیب سے پسٹل نکالا اور اسے سرد مہری کے ساتھ حکم دیا۔

''میں بے قصور ہوں۔ تم خوامخواہ میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔'' وہ سڑک پر اٹھ بیٹھا تھا اور سر سے بہتے خون کو آنکھوں میں جانے سے روکنے کے لیے بازو کو ماتھے پر پھیلا لیا.... اپنی اس ہیئت کذائی کے بعد بھی وہ اس بات پر مصر تھا کہ شہریار اسے ایک غیر متعلق شخص مان کر چھوڑ دے لیکن ایسا کہاں ممکن تھا۔ چنانچہ بے پروائی کے انداز میں بولا۔ ''چلو خوامخواہ ہی سہی لیکن اب جبکہ میں تمہارے پیچھے پڑ ہی گیا ہوں تو اپنی تسلی کیے بغیر ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ چلو اب سیدھے

حساب

''اگر میں تمہیں دو خرگوش دوں اور پھر دو خرگوش اور دوں تو تمہارے پاس کتنے خرگوش ہو جائیں گے؟'' ایک استاد نے بچے سے پوچھا۔

''پانچ۔'' بچے نے جواب دیا۔

''نہیں..... غور سے سنو، اگر میں تمہیں دو سیب دوں اور پھر دو سیب اور دوں تو تمہارے پاس کتنے سیب ہو جائیں گے؟''

''چار۔''

''شاباش۔ اب بتاؤ اگر میں تمہیں دو خرگوش دوں اور پھر دو خرگوش دوں تو تمہارے پاس کتنے خرگوش ہو جائیں گے؟''

''پانچ۔'' لڑکے نے کہا۔

''بھلا وہ کیسے؟'' استاد نے زچ ہو کر پوچھا۔

''اس لیے کہ میرے پاس ایک خرگوش پہلے ہی سے ہے۔'' بچے نے فخریہ انداز میں کہا۔

سکھر سے نعیم احمد کا حساب

کھڑے ہو جاؤ اور اپنے دونوں ہاتھ پشت پر کر کے میری طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ یہ مت سوچنا کہ یہاں کوئی تمہاری مدد کے لیے آ جائے گا۔ میں لاہور کی پیداوار ہوں اور یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس راستے پر مشکل ہی سے کوئی گاڑی آتی ہے۔ اور آئی بھی تو یقین کرو کہ آنے والا صورتِ حال دیکھ کر دور ہی سے پلٹ جائے گا۔ کوئی نہیں بھی پلٹا تو تم یہ بات سمجھ سکتے ہو کہ ایک سرکاری افسر کی حیثیت سے میں تمہارے مقابلے میں بہت مضبوط پوزیشن پر ہوں۔ اور ہاں، تمہاری طرح میں ہتھیار کا استعمال کرنے میں بھی کسی تردد کا شکار نہیں ہوں گا۔ میرے پسٹل سے اگر فائر ہوا تو وہ لازماً تمہارے جسم کے کسی حصے میں چھید کرے گا، آگے تمہاری مرضی ہے کہ کیا کرتے ہو۔'' وہ واضح طور پر اسے ہمکا رہا تھا اور مقابل کو بھی اپنی کمزور پوزیشن کا احساس ہو چکا تھا چنانچہ چپ چاپ پلٹ گیا۔ اس کے پلٹتے ہی شہریار نے اپنے گلے سے ٹائی نکالی اور اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پشت پر باندھ دیے۔ اس سے مار دھاڑ میں لباس کی حالت پہلے ہی تھوڑی سی خراب ہو گئی تھی، اب رسی کی عدم موجودگی کے باعث ٹائی سے ہاتھ دھونے پڑے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''آگے بڑھو۔'' اس نے حکم دیا تو وہ ناچار آگے بڑھا۔

''پائدان میں جھک کر بیٹھ جاؤ۔'' گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر اس نے ایک اور نادر شاہی حکم جاری کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس شخص کے زخمی تھوبڑے کی وجہ سے راستے میں کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے اس لیے اس کا پائدان میں ہی فٹ ہونا مناسب تھا۔ اس شخص نے مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر شہریار نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ آگے کلٹس کی موجودگی کے باعث وہ سیدھا گاڑی نکال کر نہیں لے جاسکتا تھا چنانچہ ریورس گیئر میں ڈال کر دائیں جانب کے موڑ تک گیا اور پھر وہاں سے گاڑی کو سیدھی سڑک پر ڈال دیا۔ اب اس کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ اس شخص کو کہاں لے جائے؟ لاہور میں اس کا واحد ٹھکانا رانا ہاؤس تھا جہاں کا وہ ظاہر ہے رخ نہیں کرسکتا تھا۔ ایسے میں اس کا دھیان ذیشان کی طرف گیا تو اس نے فوراً اسے کال ملادی۔

''میں ایک مشتبہ شخص کو پوچھ گچھ کے لیے کسی محفوظ مقام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ تم بتاؤ کہ کیا میں تمہارے دفتر کا رخ کرسکتا ہوں؟'' بنا کسی رسمی گفتگو کے اس نے اپنے مطلب کا سوال کیا۔

''کیا مطلب؟ کیا تم لاہور میں ہو؟'' ذیشان نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، میں کچھ دیر قبل ہی ایک نجی کام سے یہاں پہنچا ہوں لیکن یہاں پہنچتے ہی ایک مصیبت گلے پڑگئی۔ میرے خیال میں اس شخص سے کافی کارآمد معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں لیکن میں ایسے کسی ٹھکانے سے محروم ہوں جہاں اسے رکھ سکوں اس لیے تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں۔'' اس نے مختصراً اپنا مقصد بیان کیا۔

''چلے آؤ۔ پچھلی طرف کے گیراج کا دروازہ تمہیں اپنے لیے کھلا ملے گا۔'' ذیشان نے حسب توقع امید افزا جواب دیا تو اس نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے موبائل آف کردیا اور پوری توجہ ڈرائیونگ کی طرف مبذول کرلی۔ راستوں کو دھیان میں رکھ کر گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اس کے ذہن میں ماہ بانو کا بھی خیال تھا۔ وہ یقیناً اس کی منتظر ہوگی اور تیزی سے گزرتا وقت اسے تشویش میں مبتلا کررہا ہوگا لیکن وہ جس جنجال میں پھنس گیا تھا، اس سے جان بھی تو نہیں چھڑا سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوسکتا تھا کہ وہ فوری طور پر اس شخص سے پوچھ گچھ میں الجھنے کے بجائے اسے ذیشان کے حوالے کرے اور پھر خود ماہ بانو سے رابطہ کرے۔ اسی نوعیت کی سوچوں میں الجھا وہ ذیشان کے دفتر تک کا راستہ طے کرتا رہا۔ اس دوران پائدان میں پھنسا شخص اگر ذرا بھی ہلتا جلتا تو وہ اپنے پسٹل کی نال اس کی پیٹھ میں چبھو کر اسے احساس دلا دیتا کہ وہ اس سے غافل نہیں ہے اس لیے وہ کسی حماقت کی کوشش نہ کرے۔ آخرکار راستہ تمام ہوگیا اور ذیشان نے خود گیراج میں اس کا استقبال کیا۔

''کسے اٹھا لائے؟'' اس سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے خوش دلی سے دریافت کیا اور ساتھ ہی اپنے ساتھ موجود ماتحت کو اس کی گاڑی میں موجود شخص کو اتارنے کا اشارہ بھی کیا۔

''حدود اربع تو فی الحال مجھے بھی موصوف کا معلوم نہیں، بس اس لیے اٹھا لایا ہوں کہ جناب منکر نکیر کی طرح میرے ساتھ ساتھ لگے ہوئے تھے۔'' اس نے بھی جواباً خوش گوار لہجہ اختیار کیا۔ حالانکہ وہ اندرونی طور پر اچھا خاصا ڈسٹرب تھا اور ماہ بانو کے نکاح کی ٹینشن اس کے سر پر سوار تھی۔

''حدود اربع ہم ابھی تمہارے سامنے اگلوا لیتے ہیں۔ ہمارے پاس تاریخ و جغرافیے کے بڑے بڑے محقق موجود ہیں جن کے سامنے بندے کے لیے کچھ بھی چھپانا ممکن نہیں رہتا۔'' ذیشان نے ذو معنی لہجے میں جواب دیا۔

''یہ کام تم اپنی نگرانی میں کروالو۔ میں جس کام کے لیے آیا تھا، وہاں پہنچنے میں پہلے ہی کافی لیٹ ہوگیا ہوں۔'' اس نے رسٹ واچ میں وقت دیکھتے ہوئے رکنے سے معذوری ظاہر کی۔

''ہاں، تم نے بتایا تو تھا کہ کسی ذاتی کام سے لاہور آئے ہو۔ خیریت .... فیملی میں سب ٹھیک ٹھاک تو ہیں؟'' وہ اس کے فیملی ممبرز سے زبانی ہی سہی، خاصا واقف ہوگیا تھا اس لیے ذرا تشویش سے پوچھا۔

''الحمدللہ، سب ٹھیک ہیں۔ میں تو یہاں ایک شادی میں شرکت کے لیے آیا تھا۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''شادی میں آئے ہو تو پھر جلدی کس بات کی؟ اس وقت تک تو شادی ہالز میں میزبان خود بھی نہیں پہنچتے۔'' ذیشان نے حیرت کا اظہار کیا۔

''جلدی اس لیے ہے کہ یہ شادی کسی ہال وغیرہ میں نہیں بلکہ کورٹ میں انجام پانی تھی اور میں شاید وہ واحد مہمان ہوں جسے مدعو کیا گیا ہے۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ اس وقت تو کورٹ بند ہوچکا ہوگا اس لیے مجھے اپنی تاخیر کے ازالے میں خود کوئی متبادل انتظام کرنا ہوگا۔''

''اوہ! یہ تو بڑی عجیب شادی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ

دلہن یا دولہا میں سے کوئی ایک یقیناً بہت خوش قسمت ہے جس کے بلاوے پر تم نے اتنی دور سے دوڑ لگائی ہے۔'' وہ لوگ ابھی تک گیراج میں ہی کھڑے باتیں کررہے تھے البتہ اس کا لایا ہوا آدمی اندر کہیں منتقل کیا جاچکا تھا۔

''تمہیں وہ لڑکی ماہ بانو تو یاد ہوگی جسے بلتستان کی پہاڑیوں میں قائم دشمنوں کے ایک خفیہ کیمپ میں قید کیا گیا تھا اور وہ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہونے کے بعد تمہارے پاس پہنچ گئی تھی؟'' اس نے سوچا کہ اس معاملے میں ذیشان کو شریکِ راز کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اس لیے اسے تفصیل سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''اوہ یس، مجھے اچھی طرح وہ لڑکی اور تمہارا ڈرائیور مشابرم خان یاد ہیں۔ تم نے ان دونوں کو انٹیلی جنس کی تحویل سے چھڑانے کے لیے سخت جدوجہد کی تھی۔'' ذیشان کو فوراً ہی یاد آگیا۔

''بالکل، میں اسی لڑکی کا ذکر کررہا ہوں۔ دراصل وہ ایک تنہا اور پریشان حال لڑکی ہے جس کا اپنوں سے رابطہ بالکل ٹوٹ چکا ہے۔ اس نے اپنے لیے کسی شخص کا انتخاب کرلیا ہے اور چونکہ یہ اس کی خواہش اور میرا وعدہ تھا کہ میں اس کی شادی میں ضرور شرکت کروں گا، سو میں تمہیں یہاں نظر آرہا ہوں لیکن جس نابکار کو میں اپنے ساتھ لایا ہوں، اس نے میرا سارا پروگرام چوپٹ کردیا ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ اب مجھے اکلوتے مہمان کے علاوہ منتظم کی ذمے داریاں بھی سنبھالنی ہوں گی اور نکاح خواں وغیرہ کے لیے دوڑ دھوپ کرنی پڑے گی۔'' اس نے ذیشان کو اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔

''اگر یہ مسئلہ ہے تو میں اسے حل کردیتا ہوں۔ تم میرے ساتھ اندر چلو اور چائے شائے پیو۔ نکاح خواں اور گواہان کا بندوبست میرے ذمے لیکن دولہا اور دلہن بہرحال تمہیں ہی فراہم کرنے ہوں گے۔'' ذیشان نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اندر کی طرف لے جانے لگا۔

''کیا یہ کام اس جگہ ہوگا؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''کیا حرج ہے۔ سی ایف پی والے بھی آخرکار انسان ہی ہیں۔ انہیں بھی حق ہے کہ ایسی خوشی کی تقریبات میں شرکت کرسکیں۔ اپنے کرنل توحید بھی کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے آج کل لاہور آئے ہوئے ہیں۔ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ہم کوئی دنیا سے ماورا لوگ نہیں ہیں۔ جو کام تم اور دوسرے لوگ کرسکتے ہیں، وہ ہم بھی کرسکتے ہیں۔'' وہ اسے اپنے کمرے تک لاچکا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر سب تمہارے ہاتھ میں دیا۔ دولہا، دلہن کو میں ہدایت دے دیتا ہوں۔ تمہیں اپنا کوئی آدمی گاڑی سمیت مینار پاکستان پر بھیج کر انہیں یہاں بلوانا ہوگا۔ پہچان کے لیے کوئی شناختی علامت اور بالکل درست مقام کا تعین کرکے میں تمہیں ابھی بتادیتا ہوں تاکہ تمہارے آدمی کو بھٹکنا نہ پڑے۔ تم بھی مجھے بھیجے جانے والے آدمی اور گاڑی کا مختصر تعارف کروادو تاکہ میں دوسری پارٹی کو آگاہ کرسکوں۔'' اتنی آسانی سے اور انوکھے انداز میں اپنے مسئلے کو حل ہوتا دیکھ کر وہ پُرجوش ہوگیا۔ پھر گویا بہت سے کام خود بخود ہی ہوتے چلے گئے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اور ذیشان اپنے اپنے موبائلز پر خاصے مصروف رہے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد جب ماہ بانو اور اسلم کو وہاں پہنچایا گیا تو پھولوں اور مٹھائیوں کے ساتھ ساتھ کئی دوسری اشیائے خورونوش بھی آچکی تھیں جنہیں دو اہلکار ٹیبل پر سجارہے تھے۔ وہ دونوں اس کے کہنے پر یہاں آتو گئے تھے لیکن کچھ حیران پریشان سے نظر آرہے تھے۔ البتہ ماہ بانو نے معاملہ فہمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی قسم کے سوال جواب نہیں کیے کہ وہ اس پر جس طرح کا اعتماد کرتی تھی، اس میں ایسی کوئی گنجائش نکلتی ہی نہیں تھی۔ اب بھی اس نے اپنی الجھن کا اظہار کرنے کے بجائے اس کا اور اسلم کا باہمی تعارف کروانا شروع کردیا۔ میجر ذیشان اس وقت کمرے میں موجود نہیں تھا ورنہ وہ اسے بھی شناخت کرلیتی اور وہ بھی اس رسم تعارف میں شامل ہو جاتا۔ بہرحال، اس وقت اس نے ان دونوں کو باہم متعارف کروایا۔

''ماہ بانو سے آپ کا کافی ذکر سنا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ سے اس اہم موقع پر ملاقات بھی ہوگئی۔'' اسلم نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے خوش اخلاقی سے کہا۔ اس کی آواز سن کر شہریار بری طرح چونکا۔ یہ آواز اپنی انفرادیت کے ساتھ اس کے لیے شناسا تھی۔

''مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے، یہ ہماری تیسری ملاقات ہے۔ اس سے قبل بھی ہم دو بار مل چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان دونوں مواقع پر آپ نے اپنا تعارف کروانا پسند نہیں کیا تھا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ در آئی کیونکہ اسلم کی آواز سنتے ہی اسے وہ دونوں ناخوش گوار واقعات یاد آگئے تھے۔ اسے تقریباً سو فیصد یقین تھا کہ ایک بار جب اسے اغوا کرکے جنگل میں رکھا گیا تھا اور دوسری بار جب اس کے نورکوٹ والے بنگلے پر ڈاکا پڑا تھا،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہی شخص تھا جو حملہ آوروں کی کمانڈ سنبھالے ہوئے تھا۔

”آپ کی یادداشت یقیناً اچھی ہے لیکن میں اپنی زندگی کے وہ ابواب اپنی کتاب زندگی سے پھاڑ کر پھینک چکا ہوں اور اب میرا آپ سے واحد تعارف یہی ہے کہ آپ ماہ بانو کے ہمدرد ہیں۔ اور چونکہ ماہ بانو مجھے اپنی جان سے بھی بڑھ کر عزیز ہے اس لیے میرے لیے آپ بھی واجب الاحترام ہیں۔ ماضی میں آپ کو مجھ سے جو بھی تکلیف پہنچی اس کے لیے میں آپ سے صرف معذرت ہی طلب کر سکتا ہوں۔“ اسلم نے اس کے اندازے کی تردید نہیں کی بلکہ بہت شائستگی سے سب کچھ قبول کرتے ہوئے معافی بھی مانگ لی۔

البتہ ماہ بانو ذرا سی ہونق ہوگئی تھی کہ یہ کیا چکر ہے۔ اسے اسلم کے شہریار کے بنگلے پر ڈاکا مارنے کا تو علم تھا لیکن دوسرے واقعے سے ناواقف تھی اس لیے حیران ہو رہی تھی۔ پھر اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ شہریار وارداتوں کے وقت نقاب میں رہنے والے اسلم کو صرف آواز کی وجہ سے پہچان چکا تھا۔

”تم احمقوں کی طرح یہاں کیا کھڑی ہو؟ اتنی سادہ اور سج دھج سے عاری دلہن میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ قاضی صاحب بس پہنچنے ہی والے ہیں۔ تم ساتھ والے کمرے میں جا کر جلدی سے لباس تبدیل کر لو۔ میں اندازے سے تمہارے لیے ویڈنگ ڈریس لایا ہوں۔ امید ہے کہ تمہیں صحیح آجائے گا۔“ شہریار نے اسے گھرکا تو وہ اسی طرح حیران پریشان اس کے حکم کی تعمیل کے لیے روانہ ہوگئی۔

”ماہ بانو آپ کو بہت اہمیت دیتی ہے۔ میں خوش ہوں کہ آپ نے اس کی فرمائش پر ہماری شادی میں شرکت پر ہامی بھر لی ورنہ وہ بہت اداس ہوتی۔“ ماہ بانو کے جانے کے بعد اسلم نے اس سے کہا۔ اب وہ دونوں کمرے میں موجود نشستیں سنبھال چکے تھے اور واقعی ہر پرانی بات بھول کر نئے حوالے سے ایک دوسرے سے مخاطب تھے۔

”میرے لیے بھی وہ بہت اہم ہے۔ مجھے اس کا اداس ہونا بالکل اچھا نہیں لگتا۔ تم اس سے شادی کر رہے ہو تو خیال رکھنا کہ اسے خوش بھی رکھ سکو۔“ اسلم کی بات کے جواب میں ہی کہیں اس کی زبان سے اظہار کے چند لفظ پھسل گئے تھے جنہیں وہ خود محسوس نہیں کر سکا تھا لیکن اسلم نے ان الفاظ کو اپنی پوری معنویت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ البتہ اسی وقت ذیشان قاضی صاحب کے ساتھ وہاں آگیا تو ان کی گفتگو کا موضوع ہی بدل گیا۔ قاضی صاحب شہریار کے فراہم کردہ شناختی کاغذات کی مدد سے نکاح نامے کا فارم پُر کرنے لگے۔ فارم پر ہونے تک ماہ بانو بھی وہاں چلی آئی۔ بھاری عروسی جوڑے کا دوپٹا اس کے سر پر تھا۔ اس سرخ عروسی لباس کے علاوہ اس نے کسی قسم کا زیور یا میک اپ استعمال نہیں کیا تھا پھر بھی اس پر ٹوٹ کر دلہناپے کا روپ آیا تھا اور وہ اتنے مردوں کے درمیان ذرا شرمائی لجائی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اسلم تو اسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا تھا البتہ شہریار نے دھیرے سے نظروں کا زاویہ بدل لیا تھا۔ وہ اس روپ کو اپنی نظروں میں سمونے کا کوئی حق نہیں رکھتا تھا البتہ اسے یہ اندازہ تو خوب اچھی طرح تھا کہ وہ اس لباس میں کیسی قیامت ڈھائے گی۔ ماہ بانو وہ لڑکی تھی جسے بہت دن قبل اس نے بشام ہوٹل کے ایک ویٹر سے نیلے پھولوں والی سیاہ چادر خرید کر دی تھی تو وہ اس عام سی چادر میں بھی چودھویں کے چاند کی طرح نظر آنے لگی تھی۔ پھر اس بیش قیمت و خوب صورت عروسی لباس کی تو بات ہی الگ تھی۔

ماہ بانو کے اندر آتے ہی ذیشان نے اسے احترام سے ایک خالی کرسی بیٹھنے کے لیے پیش کی اور پھر قاضی صاحب نے اس کی اجازت سے نکاح کی کارروائی شروع کر دی۔ اس نکاح میں شہریار اس کے وکیل کے طور پر شریک تھا جبکہ گواہان کے لیے ذیشان سمیت سی ایف پی کے اہلکار موجود تھے۔ نکاح کی کارروائی شروع ہوئی تو حسبِ قاعدہ سب سے پہلے دلہن کی اجازت کے حصول کے لیے اسے کاغذات پیش کیے گئے۔ شہریار چونکہ دلہن کا وکیل تھا اس لیے نکاح کا فارم اور قلم اس نے ہی ماہ بانو کے سامنے رکھے تھے۔ اس سے یہ دونوں چیزیں وصول کرتے ہوئے ماہ بانو نے اپنی نظریں جھکا رکھی تھیں۔

”ان کاغذات پر دستخط کر دیں بیٹی تاکہ نکاح کی کارروائی کو آگے بڑھایا جا سکے۔“ کاغذات ہاتھ میں لینے کے باوجود ماہ بانو نے ان پر دستخط نہیں کیے تو قاضی صاحب نے اس کے گریز کو فطری شرم و حیا پر محمول کرتے ہوئے شفقت سے ہدایت دی۔ اس موقع پر شہریار اس کے عین سامنے کھڑا تھا اور اس کی انگلی فارم پر اس جگہ رکھی ہوئی تھی جہاں ماہ بانو نے اپنے دستخط ثبت کرنے تھے۔ قاضی صاحب کی آواز سن کر وہ گویا سکتے کی سی کیفیت سے باہر نکلی اور نظریں اٹھا کر شہریار کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی پل قلم اس کی انگلیوں کی گرفت سے نکل کر نیچے جا گرا اور وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یہ پرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

اس قاتل کی تلاش کا قضیہ جسے واردات کے لیے چھٹی کا دن ملا تھا

چھٹی کا دن عموماً ہر شخص کے لیے خاص اور اہم ہوتا ہے... کیونکہ اس دن کا تمام وقت وہ ان کی معیت میں گزارنا چاہتا ہے... جو اس کی زندگی میں چاہتوں اور محبتوں کے پیامبر ہوتے ہیں مگر افسوس... اس کی قسمت میں یہ چھٹی کا دن بھی کام کی نذر ہو گیا...

چھٹی کا دن

دانش اظہار

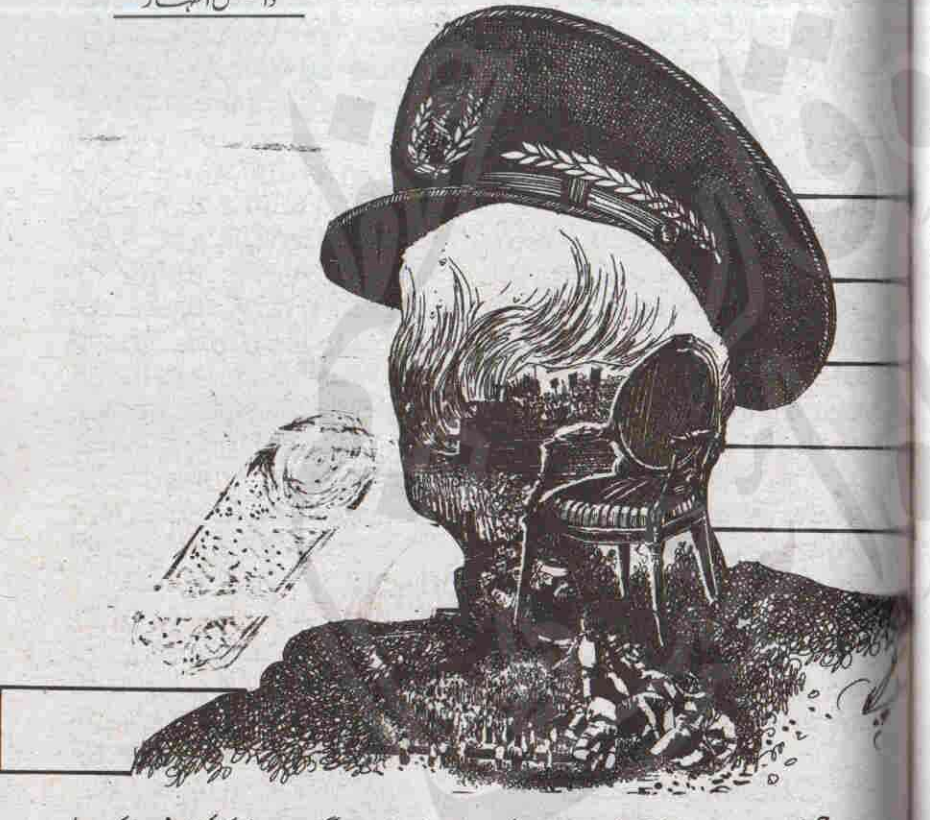

چھٹی والے دن کام کا کوئی تصور نہیں۔ اس روز لوگ عام طور پر آرام کرنے یا تفریح کے لیے نکل جاتے ہیں لیکن موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ اس کے لیے چھٹی کا ہونا یا نہ ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اسی لیے چھٹی والے دن میں صبح سے شام تک یہی دعا مانگتا رہتا ہوں کہ کوئی بُری خبر سننے کو نہ ملے اور چھٹی کا دن خیریت سے گزر جائے۔ کبھی یہ دعا قبول ہو جاتی ہے اور کبھی نہیں۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ میں غسل سے فارغ ہونے کے بعد کچن ٹیبل پر بیٹھا ناشتا کر رہا تھا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے سامنے سان فرانسسکو کرانیکل اور نیویارک ٹائمز کے ضخیم اتوار ایڈیشن رکھے ہوئے تھے۔ ان کی ضخامت اتنی زیادہ تھی کہ اگر ان کا بنڈل بنا کر کسی کے سر پر مارا جائے تو وہ اس کی ضرب سے لڑکھڑا کر گر پڑے۔ ابھی میں اخبار کا مطالعہ کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے سان فرانسسکو پولیس ڈپارٹمنٹ کے کیپٹن اسٹاٹ کی کال موصول ہوئی جو مجھے قتل کی ایک واردات کے بارے میں مطلع کر رہا تھا۔

میں کوئی پولیس والا نہیں ہوں لیکن اس کے باوجود ہفتے کے سات دن اور دن کے چوبیس گھنٹے آن کال رہتا ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں سان فرانسسکو پولیس کے ذہین ترین سراغ رساں ایڈریان مونک کا ذاتی معاون، ڈرائیور، سیکریٹری، بازار سے سودا لانے والا اور ہر طرح کا بوجھ اٹھانے والا جانور ہوں۔ مونک کو ان خدمات کے عوض جو معاوضہ ملتا ہے، وہ ایک آدمی کی ضروریات کے لیے بھی ناکافی ہے۔ اس لیے مجھے تنخواہ کے نام پر جو رقم ملتی ہے، اس کا تذکرہ کر کے میں اپنے آپ کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔

میری مجبوری یہ ہے کہ کسی دوسری جگہ کام نہیں کر سکتا۔ مونک نے مجھے ابتدا میں گھر کے کام کاج کے لیے ملازم رکھا تھا اور میری ذمے داری یہ تھی کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے دوں جس سے وہ پریشان ہو جائے۔ وہ انتہائی نفاست پسند شخص ہے اور ذرا سی بے ترتیبی دیکھ کر اس کا ذہن منتشر ہونے لگتا ہے۔ اگر صوفے پر ٹائی یا فرش پر کوئی دھبا نظر آ جائے تو اس کے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتی ہیں۔ یہ میرے فرائض میں شامل ہے کہ نہ صرف گھر کو صاف ستھرا رکھوں بلکہ اس کے معمولات میں بھی خلل نہ پڑنے دوں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری ذمے داریاں بڑھتی گئیں اور میں وہ تمام فرائض انجام دینے لگا جن کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ اب وہ مجھے ہر کام میں اپنے ساتھ ساتھ رکھتا ہے۔ اس طرح مجھے سراغ رسانی کے امور سے بھی واقفیت ہونے لگی۔ میں نے اس کے ساتھ رہ کر بہت کچھ سیکھا۔ مثلاً یہ کہ جائے واردات کا معائنہ کس طرح کیا جاتا ہے، ثبوت اور شہادتوں کو پرکھنے کا طریقہ کیا ہے اور یہ کہ گواہوں یا مشتبہ افراد سے کس طرح پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ اس مشق کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھ میں سراغ رسانوں جیسی کئی خصوصیات پیدا ہوتی چلی گئیں۔ اب میں نہ صرف جائے واردات کا معائنہ کر کے کئی نتائج اخذ کر سکتا ہوں بلکہ کیس کے بارے میں اپنے خیالات بھی دوسرے لوگوں سے شیئر کر سکتا ہوں بشرطیکہ کوئی انہیں سنجیدگی سے سننے کے لیے تیار ہو۔

اب میں محض ایک خاموش تماشائی نہیں رہا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے خود بھی اس کام میں مزہ آنے لگا تھا۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ اپنے طور پر کسی معمے کو حل کرنے کی کوشش کروں۔ میں نے مونک سے بہت کچھ سیکھا خاص طور پر جب وہ کوئی ایسا حل دریافت کرتا جو دیکھنے میں ناممکن نظر آ رہا ہو۔ مونک نے گزشتہ دنوں کچھ بڑے کیسز حل کیے تھے۔ ان سے حاصل ہونے والے تجربات کے بعد سراغ رسانی کی جانب میرے رجحان میں بڑی تبدیلی آ گئی تھی اور اب میں اپنے آپ کو اچھا خاصا سراغ رساں سمجھنے لگا تھا۔ گوکہ ابھی تک میں نے کسی دوسرے کے سامنے اس خیال کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اپنے طور پر مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

گوکہ مجھے کبھی سراغ رساں بننے کی خواہش نہیں تھی اور نہ ہی مجھے اس فیلڈ سے کوئی دلچسپی تھی لیکن مونک کے ساتھ رہتے ہوئے میں آہستہ آہستہ اور غیر شعوری طور پر اس جانب مائل ہوتا گیا۔ اب میری خواہش تھی کہ مجھے آزادانہ طور پر اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملے حالانکہ میں جانتا تھا کہ مونک کے ہوتے ہوئے یہ اتنا آسان بلکہ شاید ممکن ہی نہیں۔ اس کا مشاہدہ اور قیاس غیر معمولی قوت کا حامل تھا اور بعض اوقات وہ جائے واردات پر پہنچنے کے چند منٹوں کے اندر ہی کیس حل کر لیا کرتا تھا، چاہے وہ کتنا ہی الجھا ہوا کیوں نہ ہو۔ ایسی صورت میں مجھ جیسے نوآموز شخص کے لیے کچھ کر دکھانے کی گنجائش کہاں رہتی تھی۔

اس اتوار کی صبح کیپٹن اسٹاٹ کا فون سننے کے بعد میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور پائن اسٹریٹ کی طرف چل دیا جہاں ایڈریان مونک ایک چار منزلہ عمارت کے دوسرے فلور پر واقع ایک اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ کچن میں کھڑا صفائی کر رہا تھا۔ اس نے سفید ایپرن اور زرد رنگ کے ربر کے دستانے ہاتھوں پر چڑھائے ہوئے تھے اور جھوم جھوم کر اپنا پسندیدہ گانا گا رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''بس ایک منٹ۔۔۔ میں ذرا فارغ ہو لوں۔''

''اتوار ہونے کی وجہ سے میں نے اپنی گاڑی بلڈنگ کے سامنے ڈبل پارک کر دی ہے۔ ویسے بھی موقع واردات پر ہمارا انتظار ہو رہا ہوگا جہاں پولیس والوں نے اطراف کے تمام راستے بند کر دیے ہوں گے لیکن ایسا لگتا ہے کہ تمہیں کوئی جلدی نہیں ہے۔''

میری نکتہ چینی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور اپنے کام میں مصروف رہا۔ مجھے اس کے انداز پر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ میں ایسی باتوں کا عادی تھا۔

''آخری بار تم نے اپنی صفائی کرنے والی اشیا کی کب صفائی کی تھی؟'' اس نے اچانک ہی مجھ سے غیر متوقع سوال کر دیا۔

''مجھے کچھ سوچنے دو۔'' میں نے اپنے پیروں پر نظر ڈالی اور ظاہر کیا جیسے میں اس کا سوال سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں پھر ایک طویل وقفے کے بعد میں نے اپنا سر اٹھایا اور بولا۔ ''کبھی نہیں۔''

''کیا کہا۔۔۔ کبھی نہیں۔ یعنی تم اپنی صفائی کرنے والی چیزوں کی کبھی صفائی نہیں کرتے؟''

''مسٹر مونک! ایسی چیزوں کو کتنا صاف رکھا جا سکتا ہے۔''

''کیا تم اپنا ویکیوم کلینر صاف کرتے ہو؟''

''میں اسے خالی کرتا رہتا ہوں۔''

''یہ ایک الگ بات ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کیا تم اپنی جھاڑو صاف کرتے ہو؟''

میں نے اسے چونک کر دیکھا۔ وہ کیسی پاگلوں جیسی باتیں کر رہا تھا۔ کیا کبھی کسی نے جھاڑو بھی صاف کی ہے؟ تاہم میں نے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جب جھاڑو گندی ہو جائے تو میں اسے پھینک دیتا ہوں اور نئی جھاڑو لے آتا ہوں۔''

میرا خیال تھا کہ وہ اس بات پر میری تعریف کرے گا لیکن وہ بولا۔ ''جھاڑو تو ہر بار گندی ہو جاتی ہے۔''

''میرا مطلب ہے جب وہ بہت زیادہ گندی ہو جائے۔''

''آخری بار تم نے جھاڑو کب پھینکی تھی؟''

اس کا سوال سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ بھلا ایسی باتیں بھی یاد رکھی جاتی ہیں؟ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''ایک یا دو سال ہو گئے۔''

مونک نے ایک بڑی سی الماری کھولی اور اس میں سے ایک جھاڑو نکال کر بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم یہ رکھ لو۔''

''میرے پاس جھاڑو ہے۔'' میں نے کہا۔

''گندی چیزوں سے گھر صاف کرنا ایسا ہی ہے جیسے تم نے اپنے ہاتھ گندے پانی سے دھو لیے ہوں۔ یہ ایک معجزہ ہی ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو۔''

میں نے اس کی زبان بند کرنے کے لیے وہ جھاڑو پکڑ لی اور بولا۔ ''کیا اب ہم چل سکتے ہیں؟''

اس نے اپنی صفائی کی اشیا ایک ربر کے تھیلے میں ڈالیں اور اسے الماری میں رکھ دیا پھر اپنا ایپرن اتار کر سلیقے سے اسے تہ کیا اور بولا۔ ''مجھ سے وعدہ کرو کہ گھر جاتے ہی پرانی جھاڑو پھینک دو گے۔''

میں نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

☆☆☆

میر نیا ڈسٹرکٹ کے مکان باہر سے بہت خوب صورت دکھائی دیتے تھے۔ انہیں مختلف شوخ رنگوں میں اس طرح پینٹ کیا گیا تھا کہ دور سے دیکھنے پر سالگرہ کے کیک کا گماں ہوتا تھا۔ گلی کے دونوں سروں پر زرد رنگ کا ٹیپ باندھ کر جائے واردات کی نشان دہی کر دی گئی تھی۔ گلی کے درمیان میں پولیس اور سرکاری حکام کی گاڑیاں بڑے بے ہنگم طریقے سے پارک کی گئی تھیں جن کی وجہ سے جائے واردات تک پہنچنے میں دشواری ہو رہی تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیپٹن اسٹاٹ نے اس طرح گاڑیاں پارک کرنے کی اجازت کیسے دے دی؟'' مونک نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''اس طرح وہ کیسے اپنی توجہ دوسری چیزوں پر مرکوز کر سکتا ہے۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے معصومیت سے کہا اور اپنی گاڑی گلی کے باہر ہی کھڑی کر دی اور کار سے باہر آ گیا۔ اب ہمیں پولیس والوں تک پہنچنے کے لیے ان گاڑیوں کے درمیان سے راستہ بنانا تھا جو بے ہنگم طریقے سے کھڑی کی گئی تھیں۔ یہ دیکھ کر مونک کی جھنجلاہٹ بڑھ گئی اور وہ بولا۔

''اگر یہ گاڑیاں ایک قطار میں کھڑی کی جاتیں تو ہم جائے واردات تک سیدھے سیدھے پہنچ سکتے تھے مگر اب ہمیں ان گاڑیوں کے درمیان سے راستہ بنانا ہوگا جس سے فاصلہ دگنا ہو جائے گا۔''

''کوئی بات نہیں۔ اس طرح تھوڑی سی ورزش ہی ہو جائے گی۔''

''تم اپنی فکر کرو۔'' وہ جھلاتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہاری طرح نہیں ہوں جس نے گزشتہ آٹھ ہفتوں میں دو اعشاریہ تین پونڈ وزن بڑھا لیا ہے۔''

''ہاں، میرا دو پونڈ وزن بڑھ گیا ہے۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''دو پونڈ اور تین اونس۔'' اس نے تصحیح کی۔ ''بے فکر رہو۔ کوئی اس پر توجہ نہیں دے گا۔''

''لیکن تم تو دے رہے ہو۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میری بات رہنے دو۔ میں تو ایسی کئی چیزوں پر توجہ دیتا ہوں جن کی جانب دوسرے لوگوں کا دھیان نہیں جاتا۔''

ہم باتیں کرتے کرتے جائے واردات تک پہنچ گئے۔ کیپٹن اسٹاٹ وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر زرد فیتہ تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور بولا۔ ''گڈ مارننگ مونک، نتالی... تم لوگوں کے آنے کا بہت بہت شکریہ۔''

''کیا تم نے اسی مقصد کے لیے ہمیں بستر سے باہر نکالا ہے؟'' میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جانتا ہوں کہ یہی ایک دن سونے کے لیے ملتا ہے اور میں بھی پورے ہفتے اس کا انتظار کرتا رہتا ہوں لیکن شاید قاتل کسی روز بھی چھٹی نہیں کرتے۔''

میں ٹیپ کے نیچے سے سر جھکا کر اندر چلا گیا لیکن مونک اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ اسٹاٹ نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''کیا تم ہمارے ساتھ شامل نہیں ہو گے؟''

''نہیں... جب تک تم اس بے ترتیبی کا کوئی علاج نہیں کرتے۔'' اس نے بے ہنگم پارکنگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''دراصل یہ سب لوگ جلدی میں تھے۔ انہیں موقعِ واردات پر جو پہنچنا تھا۔''

''معاف کرنا۔ گاڑی کو سیدھا اور قطار میں کھڑی کرنے میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگتا۔ پولیس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ قانون پر عمل درآمد کروائے نہ کہ خود اس کی خلاف ورزی کرے۔ یہ ایک بہت ہی بُری مثال ہے اور اس سے دوسرے لوگوں پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑے گا۔''

اسٹاٹ نے ایک گہری سانس لی۔ وہ جانتا تھا کہ مونک کے اس اعتراض کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں کسی سپاہی کو بھیج کر ان گاڑیوں کو ترتیب سے پارک کرواتا ہوں۔ اس کے بعد تو تمہیں ہمارے ساتھ آنے پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔''

''جب تک یہ گاڑیاں اس طرح کھڑی ہیں، میرے لیے کام کرنا آسان نہیں ہوگا۔'' مونک اپنی بات پر قائم رہا۔

''یہ کام ہوتا رہے گا۔ تم جلدی سے اندر آجاؤ۔'' اسٹاٹ زرد ٹیپ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''لاش ابھی تک سڑک پر پڑی ہوئی ہے اور میڈیکل آفیسر اسے مُردہ خانے لے جانے کے لیے بے چین ہے۔''

''یہ میرے اصول کے خلاف ہے لیکن صرف تمہارا وقت بچانے کی خاطر ایسا کر رہا ہوں۔''

''شکریہ۔'' اسٹاٹ نے کہا پھر ایک نوجوان آفیسر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم جا کر ان گاڑیوں کو ترتیب سے پارک کرواؤ۔''

''او کے سر!'' نوجوان آفیسر نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

مقتول کا کیشیا کا باشندہ تھا جو ڈرائیو وے میں کھڑی کار کے ساتھ ہی منہ کے بل فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ کار کی ہیڈ لائٹس ٹوٹی ہوئی تھیں۔ مرنے والے کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ چھ فٹ لمبا اور قدرے فربہ نظر آرہا تھا۔ اس نے نیلے رنگ کا گاؤن اور لمبا پاجامہ پہن رکھا تھا اور اس کا سر خون میں لت پت تھا۔

میں نے لاش پر نظریں جما دیں اور اپنی فطری صلاحیتوں کو آزمانے کی کوشش کرنے لگا۔ مقتول کا تعلق شاید ڈاکٹر، وکیل یا بینکر جیسے کسی پیشے سے تھا اور بظاہر یہی لگتا تھا کہ کسی شخص نے ناراض ہو کر اس کی کار کو تباہ اور اسے قتل کر دیا تھا۔

لیفٹیننٹ ایمی ڈیولن اس کی لاش کے پاس گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی بیٹھی تھی اور کسی گہری سوچ میں غرق نظر آرہی تھی۔ وہ پہلے خفیہ پولیس میں خدمات سرانجام دے رہی تھی لیکن حال ہی میں اس کا تبادلہ ہومی سائڈ ڈویژن میں ہوا تھا۔ اس نے بھی ہماری طرح ٹی شرٹ، وی گلے کا سوئٹر اور جینز پہن رکھی تھی۔ البتہ دبلی پتلی ہونے کی وجہ سے اسے شاید زیادہ سردی لگتی تھی اسی لیے اس نے اوپر سے چمڑے کی جیکٹ پہننا ضروری سمجھا ہوگا۔

اس نے ہمیں لمحہ بھر کے لیے دیکھا اور اپنی نظریں اسٹاٹ پر جما دیں۔

''میں سمجھتی ہوں کہ تم مونک کو انہی قتل کے کیسز میں بلاتے ہو جنہیں ہم حل نہیں کر سکتے لیکن یہ کیس اتنا پیچیدہ نظر نہیں آتا۔''

''کیونکہ تم اسے محض ایک پولیس والے کی نظر سے دیکھ رہی ہو۔'' اسٹاٹ نے کہا۔ ''جبکہ اسے سمجھنے کے لیے ایک سیاست داں جیسے ذہن کے حامل شخص کی ضرورت ہے۔''

''ظاہر ہے کہ میرا تعلق پولیس سے ہے لہٰذا میں اسی انداز سے سوچتی ہوں۔ کیا تم ایسا نہیں کرتے؟''

''اگر تمہیں مستقبل میں میری جگہ لینی ہے تو دونوں انداز سے سوچنا پڑے گا۔'' اسٹاٹ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''مرنے والا ڈپٹی ڈسٹرکٹ اٹارنی، گریسن ڈچ ہے۔ لہٰذا ہمیں تو یہ کیس ایک گھنٹا پہلے ہی حل کر لینا چاہیے تھا۔''

میرا اندازہ تھا کہ ڈچ اس شخص سے لڑنے کے لیے باہر آیا ہوگا جو اس کی کار کو نقصان پہنچا رہا تھا اور نتیجے میں خود ہی مارا گیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ قاتل کون ہے اور اس نے ایسا کیوں کیا؟

''مرنے والا تو مر گیا۔'' ڈیولن نے کہا۔ ''اس قتل میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ اسے دوسروں پر ترجیح دی جائے؟''

''اگر تمہارے سوچنے کا یہی انداز رہا تو بقیہ ملازمت اسی تنخواہ پر کام کرتی رہو گی۔'' اسٹاٹ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔

''میں اسی میں خوش ہوں۔'' ڈیولن نے جواب دیا۔ ''میں پولیس میں اس لیے نہیں آئی تھی کہ لوگوں کا رتبہ اور حیثیت دیکھ کر معاملات حل کروں۔ میری نظر میں سب مرنے والے برابر ہیں۔''

''تب تو تم بڑی ذہانت سے آگے بڑھ رہی ہو۔'' اسٹاٹ نے کہا پھر اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔ ''مونک کہاں ہے؟''

میں نے گھوم کر دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ گاڑیوں کے درمیان کہیں ہوگا لیکن وہ پڑوسی کی باڑھ کے سامنے کھڑا ہوا سان فرانسسکو کرانیکل اتوار ایڈیشن پر نظریں جمائے ہوئے تھا جو باڑھ کے اوپر پڑا ہوا تھا۔

''تم کیا کر رہے ہو؟''

''جائے وقوعہ کو دیکھ رہا ہوں۔''

''لیکن قتل تو یہاں ہوا ہے۔'' کیپٹن نے ڈرائیو وے میں پڑی ہوئی لاش کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں اس کی بات کر رہا ہوں۔'' مونک نے اخبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کوئی جرم نہیں ہے۔''

''یہ دیکھو کہ اخبار والے نے اخبار کہاں پھینکا ہے۔ وہ کبھی باڑھ پر اخبار پھینکتا ہے تو کبھی لان میں... کبھی ڈرائیو وے پر تو کبھی کار کی چھت پر... میری نظر میں یہ بے پروائی بھی جرم ہے۔''

''وہ اپنی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی اخبار اچھال دیتا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں صحیح جگہ پر اخبار ڈالنا ممکن نہیں۔'' اسٹاٹ نے اخبار والے کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔

''اگر وہ صحیح جگہ کا اندازہ نہیں کر سکتا تو اسے چاہیے کہ گاڑی سے باہر آئے اور سامنے والے پورچ میں اخبار رکھ کر چلا جائے۔ اس بے پروائی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شہری اصولوں کی پروا نہیں کرتا۔''

''اگر وہ میرے سامنے ایسی حرکت کرتا تو میں اسے موقع پر ہی گولی مار دیتی۔'' ڈیولن نے کہا۔

مونک پر اس کے طنز کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم کیا محسوس کر رہی ہو لیکن میرے خیال میں اس مرحلے پر اسے تنبیہ کر دینا ہی کافی ہوگا۔ ممکن ہے کہ ہم اسے سیدھا کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔''

کیپٹن اسٹاٹ کو اس غیر متعلقہ بحث سے اُلجھن ہو رہی تھی۔ وہ دخل اندازی کرتے ہوئے بولا۔ ''پہلے ہمیں قتل کے کیس کو دیکھنا چاہیے۔''

''وہ اخبار والا اب بھی اسی طرح اخبار پھینکتا پھر رہا ہو گا۔ اسے روکا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی نقصان کرے۔''

''وہ قاتل بھی یہیں کہیں موجود ہوگا اور اگر اسے روکا نہ گیا تو وہ مزید قتل کر سکتا ہے۔ میں اس بارے میں فکرمند ہوں۔''

''یہاں بہت کچھ قانون، ضابطوں اور اصولوں کے خلاف ہو رہا ہے۔ اس کی کچھ نہ کچھ سزا تو ہونی چاہیے۔'' مونک بولا۔

''بالکل، میں تم سے اتفاق کرتا ہوں اور یہ شخص ایسے ہی واقعات کی روک تھام میں مصروف تھا۔'' اسٹاٹ نے

ایک دانشور کے ساتھ ایک شام منائی گئی تقریب کے آخر میں انہیں بتایا گیا کہ لوگ ان سے کچھ سوال کرنا چاہتے ہیں۔

انہوں نے کہا۔ ''لوگ کاغذ پر لکھ کر سوال بھیجیں میں ان کے سوال کا مائیک پر بیٹھ کر جواب دوں گا۔'' سوالوں کے بعد صرف ایک لفظ لکھا تھا۔ ''گدھا۔'' دانشور تھوڑی دیر کے لیے حیران رہ گئے کہ معاملہ کیا ہے، بولے۔ ''اب میرے پاس ایسا کاغذ آیا ہے جس میں کسی صاحب نے اپنا نام تو لکھ دیا مگر سوال لکھنا بھول گئے۔''

❖❖❖

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈپٹی ڈسٹرکٹ اٹارنی کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے گریسن ڈچ نے کئی ایسے افراد کو سزا دلوائی جو ناپسندیدہ سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ لگتا یہی ہے کہ ایسے کسی شخص نے اسے انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا ہے۔''

مونک آہستہ آہستہ چلتا ہوا کار تک آیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو سامنے کی طرف پھیلا کر اس طرح حرکت دینے لگا جیسے کوئی فلم ڈائریکٹر سین کا فریم بنا رہا ہو۔

''اس طرح ہم بہ آسانی قاتل تک پہنچ سکتے ہیں۔'' ڈیولن بولی۔ ''ہمیں صرف ان لوگوں کی فہرست بنانی ہوگی جنہیں ڈچ نے سزا دلوائی تھی اور وہ حال ہی میں رہا ہوئے ہیں۔ پھر آج صبح ان کی نقل و حرکت کا ریکارڈ دیکھنا ہوگا۔ اگر مجھے ایک یا دو دن مل جائیں تو میں قاتل کو حوالات میں بند کر سکتی ہوں۔''

''تمہارے خیال میں یہاں کیا واقعہ پیش آیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''سیدھی سی بات ہے۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''جب ڈچ نے دیکھا کہ کوئی شخص اس کی کار کو نقصان پہنچا رہا ہے تو وہ احمقانہ انداز میں اس کی جانب لپکا۔ اس شخص نے جوابی کارروائی کے طور پر بیس بال بیٹ یا کسی اور کندشے سے اس کے سر پر ضرب لگائی جس کے نتیجے میں ڈچ کی موت واقع ہو گئی۔''

پہلے ہم بھی اسی انداز میں سوچ رہے تھے لیکن ڈیولن کی زبان سے یہ تھیوری سن کر مجھے یوں لگا کہ کہیں نہ کہیں اس میں کوئی جھول موجود ہے۔

''میرا خیال ہے کہ وہ ایک ہوشیار شخص تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اسے براہِ راست حملہ آور سے الجھنے کے بجائے فوری طور پر پولیس کو اطلاع دینی چاہیے تھی یا کم از کم اپنے دفاع کے لیے ہتھیار لے کر باہر نکلنا چاہیے تھا۔''

''میں نے یہ کب کہا کہ وہ ہوشیار شخص تھا؟'' ڈیولن بولی۔

''کم عقل لوگ ڈپٹی اٹارنی نہیں بن سکتے۔'' میں نے جل کر کہا۔

''عدالت میں ہوشیاری دکھانا اور سڑک پر اپنے حواس پر قابو رکھنا دو مختلف باتیں ہیں۔ ممکن ہے کہ فوری ردِعمل کے طور پر اس نے خود ہی حملہ آور سے الجھنا مناسب سمجھا ہو۔ شاید اس کا خیال تھا کہ وہ حملہ آور پر آسانی سے قابو پا سکتا ہے۔'' ڈیولن لمحہ بھر کو رکی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ حملہ آور صرف اس کی کار کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا لیکن جب اس نے ڈچ کو ہاتھ میں بیس بال بیٹ پکڑے اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ بھی مدافعت پر اتر آیا اور اس نے ڈچ سے بلا چھین کر اس کے سر پر وار کر دیا۔''

''کیا تم ڈچ کو جانتی ہو؟'' اسٹاٹ نے ڈیولن سے پوچھا۔

''نہیں، آج پہلی بار اس سے ملی ہوں۔'' اس نے لاش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پھر تم نے اس کے بارے میں یہ کیسے سوچ لیا کہ وہ ایک خود پسند شخص تھا؟''

''وہ ایک مرد ہونے کے ساتھ ساتھ وکیل بھی تھا اور ایسے لوگ اپنے آپ کو بہت عقل مند سمجھتے ہیں۔''

''سب سے پہلے لاش کس نے دیکھی؟'' مونک نے پوچھا۔

''ایک عورت نے جو صبح کی سیر کے لیے نکلی تھی۔'' اسٹاٹ نے جواب دیا۔

مونک نے جھک کر اطراف کا جائزہ لیا اور کار کے گرد گھوم کر اسے مختلف زاویوں سے دیکھنے لگا۔

''ممکن ہے کہ یہ قتل اسی نے کیا ہو۔'' میں نے کہا۔ ''شاید وہ اس کی سابق محبوبہ یا کسی ایسے شخص کی رشتے دار ہو جسے ڈچ نے جیل بھجوایا تھا۔''

''تم یہ کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟'' اسٹاٹ نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ لاش دیکھنے کا بہانہ کر کے اس نے اپنا جرم چھپانے کی کوشش کی ہے۔ بظاہر چہل قدمی کے لیے نکلنے والی عورت پر اس طرح کا شک نہیں کیا جا سکتا۔''

''اچھا نکتہ ہے۔'' اسٹاٹ بولا۔ ''ہم اس پر بھی غور کریں گے۔''

اس کے ساتھ ہی اسٹاٹ اور ڈیولن کے درمیان نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا چہرہ شرمندگی کے احساس سے سرخ ہو گیا ہو چنانچہ میں نے جھینپ مٹانے کے لیے ڈیولن سے کہا۔

''غالباً تم نے پہلے ہی اس سے پوچھ گچھ کر لی ہوگی؟''

''یہ معمول کی کارروائی ہے۔'' ڈیولن نے جواب دیا۔ ''ہم ہمیشہ لاش دریافت کرنے والے سے مناسب پوچھ گچھ کر کے اس کی سنائی ہوئی کہانی کی تصدیق کرتے ہیں۔''

''پھر تم نے اس بارے میں کیوں نہیں سوچا؟'' میں نے اسٹاٹ سے پوچھا۔

''میں سننا چاہ رہا تھا کہ تمہارے پاس ایسا سوچنے کی

کوئی معقول وجہ ہے۔ شاید تم کوئی ایسی بات بتا سکو جو ہماری نظروں سے اوجھل رہی ہو۔''

''لیکن تم نے ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔'' ڈیولن نے کہا۔

''ہاں واقعی۔ ابھی اس بارے میں کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔''

''ٹھیک ہے نتالی۔'' اسٹاٹ نے کہا۔ ''میں تمہارے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔''

''لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم ان سے متفق بھی ہیں۔'' ڈیولن بولی۔

میں جانتا تھا کہ وہ اپنی تحقیقات میں ہم دونوں کی دخل اندازی پر ناراض ہے اس لیے میں نے اس کی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اسی وقت مونک بھی ہمارے پاس آ گیا اور ڈچ کے گھر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''جب پولیس یہاں آئی تو کیا سامنے کا دروازہ کھلا ہوا تھا؟''

''ہاں۔'' ڈیولن نے جواب دیا۔ ''لیکن ڈچ گھر میں اکیلا رہتا تھا اور ہمیں ایسی کوئی علامات نہیں ملیں جن سے لگتا ہو کہ کسی چیز کو چھیڑا گیا ہے۔''

یہ سن کر مونک گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ ڈیولن اسے پکارتے ہوئے بولی۔ ''جائے واردات یہاں ہے۔''

''وہ یہ بات جانتا ہے۔'' اسٹاٹ نے کہا۔

''پھر وہ گھر میں کیا دیکھنا چاہتا ہے؟''

''مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔'' اسٹاٹ نے کہا۔ ''لیکن میں یہ جاننے کا خواہش مند ہوں۔''

ہم بھی مونک کے پیچھے پیچھے گھر میں چلے گئے۔ سب سے پہلے ہم نے ایک راہداری میں قدم رکھا جس کے دائیں جانب لیونگ روم اور بائیں جانب باورچی خانہ تھا جبکہ سامنے کی جانب ایک فیملی روم اور سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ گھر کی چھت نیچی تھی اور راہداری پر محراب بنی ہوئی تھی۔ آتش دان کے باہر سفید اینٹیں لگائی گئی تھیں اور فرش لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ فرنیچر اور دیگر آرائشی اشیا بھی معمولی نوعیت کی تھیں۔ دیکھنے میں یہ گھر کسی سرکاری دفتر کی انتظار گاہ لگ رہا تھا۔

مونک اپنے سر کو دائیں بائیں گھماتا اور اپنے دونوں ہاتھ سامنے کی جانب پھیلاتا ہوا آہستہ آہستہ کچن کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ڈیولن کو اس کا یہ انداز پسند نہیں آیا اور وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

سچی کہانیوں آپ بیتیوں جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت کراچی

**

مارچ 2012ء کے نئے شمارے کی جھلکیاں

**

سوز و ساز

اردو ادب میں غزل گوئی کی ابتدا کرنے والے ایک باکمال شاعر کا زندگی نامہ

لینس ڈاؤن برج

پاکستان کی شان کہے جانے والے پل کا تاریخی پس منظر

چلبلا

بولی وڈ کے ایک معروف اداکار کے حالاتِ زندگی

پراسرار مخلوق

امریکا اسپیس ریسرچ سینٹر میں کیا واقعی ایلیئن قید ہیں؟ کیا دوسرے سیاروں کی کسی مخلوق کا زمین سے رابطہ ہے؟

ان کے علاوہ

پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کر کے بدنامی اٹھانے والے شخص کی روداد ''سربلند'' یورپ سے درآمد ایک پراسرار واقعہ ''دوسری زندگی'' افریقا کی سفر کہانی ''شب رنگیں'' اور بھی بہت سی سچ بیانیاں، سچے واقعات، معلوماتی قصے

خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ کیا کر رہا ہے؟"

"وہ کوئی ایسی چیز تلاش کر رہا ہے جو ناہموار، غیر متوازن اور عجیب ہو۔"

باورچی خانہ چھوٹا لیکن صاف ستھرا تھا۔ اس کا فرش ٹائلوں سے بنا ہوا تھا اور وسط میں ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی۔ سفید ٹائلوں سے بنے ہوئے کاؤنٹر پر کافی میکر، ٹوسٹر اور اسی طرح کی دوسری اشیا رکھی ہوئی تھیں جبکہ چولہے کے اوپر بنی ہوئی الماری میں کئی قسم کی بوتلیں نظر آ رہی تھیں جن میں جام، جیلی وغیرہ بھری ہوئی تھی۔ میں نے پہلی نظر میں ہی اندازہ لگالیا کہ یہ سب دکھاوے کے لیے ہے اور انہیں برائے نام ہی استعمال کیا گیا ہے۔

"یہاں تو کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جس سے ہمیں کچھ مدد مل سکے۔" مونک نے میز کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہم یہاں وقت ضائع کر رہے ہیں۔" ڈیولن بولی۔ "لاش تو باہر پڑی ہوئی ہے۔"

مونک نے اس کی بات سنی اَن سنی کر دی اور کچن کے عقب میں چلا گیا جہاں سے ایک راستہ چھوٹے سے لانڈری روم کی طرف جاتا تھا۔ وہیں کوڑے کے دو ڈرم بھی رکھے ہوئے تھے۔ مونک نے لمحہ بھر رک کر ان کا جائزہ لیا۔

"یہ محض وقت کا زیاں ہے۔" ڈیولن ایک بار پھر بولی۔ اسٹاٹ نے اس کے احتجاج کو نظر انداز کر دیا اور مونک کی طرف دیکھنے لگا جو اپنی جیب سے قلم نکال کر ہر ڈرم کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے تیزی سے کوڑے کے ڈرم کا ڈھکنا بند کیا جیسے اسے ڈر ہو کہ کہیں کوئی چیز باہر آ کر اسے جکڑ نہ لے۔ البتہ اس نے ردّی اشیا کے ڈرم کو لمحہ بھر کے لیے غور سے دیکھا جس میں پرانے اخبارات رکھے ہوئے تھے۔

مونک ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اپنے کندھے اچکائے اور میری طرف دیکھا۔ میں اس کا اشارہ سمجھتا تھا لہٰذا فوراً اپنی جیب سے ایک ٹشو پیپر نکال کر اسے پکڑا دیا۔ اس نے اپنے قلم کی نوک صاف کی۔ اسے دوبارہ اپنی جیب میں رکھا اور ٹشو پیپر کوڑے کے ڈرم میں پھینک دیا۔

"اخبار والے لڑکے کو گرفتار کر لو۔" مونک نے کہا۔

ڈیولن نے اپنا سر جھکا لیا اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔ اسٹاٹ نے سیدھے ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے سے اپنا ماتھا رگڑا اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم اس لڑکے کے بارے میں پہلے بھی بات کر چکے ہیں اور اب قتل کا معما حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"میں یہ معما حل کر چکا ہوں۔" مونک نے کہا۔

ڈیولن نے ایک جھٹکے سے اپنا سر اوپر اٹھایا اور بولی۔ "کیا کہا تم نے؟"

"اخبار والے لڑکے کو گرفتار کر لو۔" مونک نے ایک بار پھر کہا۔

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔" اسٹاٹ نے کہا۔ "مجھے قاتل کا نام بتا دو۔ اسے گرفتار کرنے کے بعد میں اس لڑکے کو بھی بند کر دوں گا۔"

"تم بیک وقت دونوں کام کر سکتے ہو۔" مونک نے کہا۔ "وہ لڑکا ہی قاتل ہے۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔" اسٹاٹ نے کہا۔

"یہ شخص پاگل ہو گیا ہے۔" ڈیولن نے کہا پھر وہ مونک کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اتنی دیر کی مغز ماری کے بعد تم نے یہ نتیجہ اخذ کیا؟ اگر وہ لڑکا پورچ میں اخبار ڈالنے کے قابل نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے قاتل سمجھ لیا جائے۔"

"اس معاملے میں ایسا ہی ہوا ہے۔" مونک نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟" ڈیولن نے پوچھا۔

"ردّی اشیا کے ڈرم میں کل کا اخبار تو موجود ہے مگر آج کا نہیں۔"

"شاید اس لیے کہ ابھی تک اس نے آج کا اخبار پڑھا ہی نہیں ہوگا۔" ڈیولن بولی۔

"پھر وہ اخبار کہاں ہے؟" مونک نے پوچھا۔

"ممکن ہے کہ وہ ٹوائلٹ میں بیٹھ کر اخبار پڑھنے کا عادی ہو۔" ڈیولن بولی۔ "وہ اخبار باتھ روم میں ہوگا۔"

"وہاں بھی نہیں ہے۔" مونک نے کہا۔

"کیا تم نے دیکھا تھا؟" ڈیولن نے پوچھا۔

"نہیں مگر تم دیکھ سکتی ہو۔ میں انتظار کر لوں گا۔"

"چلو، مان لیا... تمہارا کہنا درست ہے کہ اخبار گھر میں نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ گھر کے باہر پڑا ہوا ہو۔"

"نہیں، اس گلی میں یہ واحد گھر ہے جہاں اخبار نہیں دیا گیا۔"

"چلو، یہ بھی مان لیتے ہیں کہ ڈچ کو آج کا اخبار نہیں ملا۔ ممکن ہے کہ قاتل یا کوئی اور شخص باہر سے ہی وہ اخبار اٹھا کر لے گیا ہو۔ شاید اسے کسی خاص خبر کی تلاش ہو۔" ڈیولن نے کہا۔

"قاتل وہ اخبار اپنے ساتھ ضرور لے گیا لیکن پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ اپنا جرم چھپانے کے لیے۔" مونک نے

وضاحت پیش کی۔ "ڈچ کو ناشتے پر اخبار پڑھنے کی عادت تھی۔ لہٰذا اس نے اپنا ناشتا تیار کیا اور اخبار لینے کے لیے گھر سے باہر آ گیا لیکن جیسے ہی اس نے باہر قدم رکھا، اس کی نظر اپنی کار پر گئی جو بُری طرح برباد ہو چکی تھی۔ وہ تیزی سے اس جانب لپکا اور جھک کر ٹائروں اور ہیڈ لائٹس کو پہنچنے والے نقصان کا اندازہ کرنے لگا۔ عین اسی وقت اخبار والا وہاں سے گزرا۔ اس نے ڈچ کو نہیں دیکھا تھا۔ لہٰذا معمول کے مطابق اس نے چلتی گاڑی سے اخبار باہر اچھال دیا جو ڈچ کے سر پر آ کر لگا۔"

"اتوار کا اخبار غیر معمولی ضخامت کا اور کافی وزنی ہوتا ہے اور اس کی ضرب پتھر کی سل جیسی ہوتی ہے۔" اسٹاٹ نے کہا۔

مونک نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ ڈچ فوراً ہی فرش پر گر گیا اور اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ اخبار والا گاڑی سے اتر کر اس کے پاس آیا۔ نبض دیکھی اور سمجھ گیا کہ وہ مر چکا ہے۔ اس نے فوراً وہ اخبار اٹھایا اور وہاں سے چل دیا۔ اس نے جلدی جلدی افراتفری میں بقیہ اخبار پھینکے اور گھبراہٹ کے عالم میں دیکھ ہی نہ سکا کہ وہ کہاں کہاں اخبار پھینکتا جا رہا ہے۔"

"اسے ہم ایک حادثہ بھی کہہ سکتے ہیں۔" اسٹاٹ نے کہا۔

"اگر وہ اسے چھپانے کی کوشش نہ کرتا تو حادثہ ہی کہلاتا لیکن اب یہ جرم بن گیا ہے۔"

"رہنے بھی دو۔" ڈیولن تمسخرانہ انداز میں بولی۔ "یہ محض قیاس آرائی ہے۔ ایک ایسا اندازہ جس کی بنیاد نہ ملنے والے اخبار پر ہے۔"

"ایک اور بات بھی غور طلب ہے۔" مونک نے کہا۔ "اس سے پہلے اخبار والے نے جتنے بھی اخبار پھینکے، وہ سب صحیح جگہ پر گرے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں سے گزرنے سے پہلے وہ کسی افراتفری کا شکار نہیں ہوا تھا۔"

"یہ بھی ایک اندازہ ہے اور اس سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" ڈیولن نے کہا اور ساتھ ہی تائید طلب انداز میں اسٹاٹ کی طرف دیکھا۔

"مونک صحیح کہہ رہا ہے۔" اسٹاٹ نے اس کی توقع کے برعکس مونک کے مؤقف کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ "اب تمہیں جلد از جلد اس اخبار والے کو پکڑنا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ خون آلود اخبار اب بھی اس کے پاس ہو۔ اس طرح تمہیں اس جرم کا اہم ثبوت مل جائے گا۔"

ڈیولن نے اس کا حکم سن کر تیوری چڑھائی اور کچھ کہے بنا وہاں سے چل دی۔ بہر حال اسے اپنے باس کے حکم کی تعمیل تو کرنا ہی تھی۔

اس کے جانے کے بعد اسٹاٹ نے کہا۔ "مونک! تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے اتنی جلدی یہ کیس حل کر دیا۔ اب میں شاید دوپہر کے کھانے سے پہلے گھر جا سکوں گا۔"

"ابھی تمہیں اس شخص کو بھی پکڑنا ہے جس نے ڈچ کی گاڑی کو نقصان پہنچایا تھا۔" مونک نے اسے یاد دلایا۔

"ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔" اسٹاٹ نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ ڈیولن یہ کام پیر کو بھی کر سکتی ہے۔"

"تم اخبار والے پر کیا الزام عائد کرو گے کیونکہ اس نے جان بوجھ کر تو ڈچ کو نشانہ نہیں بنایا تھا؟" میں نے پوچھا۔

اسٹاٹ نے کندھے اچکائے اور لاش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ کام ڈپٹی اٹارنی کا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے کے بعد وہ اس بارے میں کوئی بہتر فیصلہ کر سکیں گے۔"

"الزام خواہ کچھ بھی ہو لیکن اب وہ کبھی اخبار تقسیم نہیں کر سکے گا۔" مونک نے کہا۔ "اور اس طرح دوسرے لڑکوں کو بھی سبق مل جائے گا جو بے پروائی سے گھروں کے سامنے اخبار پھینکتے ہیں۔ ڈچ کی موت رائگاں نہیں جائے گی۔"

ابھی اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ اسٹاٹ کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ فون سننے کے لیے ایک طرف چلا گیا اور ہم بھی اپنی کار کی طرف بڑھنے لگے۔ میں نے سرگوشی میں مونک سے کہا۔

"اب یہاں سے جلدی نکل چلو۔ میری تو نیند بھی پوری نہیں ہوئی۔ اس کام میں اتوار کے دن بھی آرام نصیب نہیں۔"

"قاتلوں کے یہاں چھٹی کا کوئی تصور نہیں۔" مونک مسکراتے ہوئے بولا۔

عقب سے اسٹاٹ کی آواز آئی۔ "اوہ، میرے خدا۔"

ہم دونوں نے مڑ کر دیکھا اور اس کے چہرے پر چھائی افسردگی دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ وہ بلکہ ہم لوگ بھی دوپہر کا کھانا گھر پر نہیں کھا سکیں گے کیونکہ ایک اور قتل کی اطلاع آ گئی تھی۔ میں نے مونک کی طرف دیکھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ قاتل کبھی چھٹی نہیں کرتے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پردیس کی فضاؤں سے ایک زہریلا جھونکا

تین مقتول

مختار آزاد

قوم پرستی ... اگر نسل پرستی میں بدل جائے ... تو تعصّب اور نفرت کا زہر رگوں میں سرایت کرتا چلا جاتا ہے ... جو بڑھتے بڑھتے دل ودماغ کو اس قدر آلودہ کردیتا ہے کہ اپنے اور اپنوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ... ایسے ماحول میں پروان چڑھنے والی کہانی جس میں بسے مکین اپنے اعلیٰ النسل ہونے کے زعم میں ہر حد سے گزرنے کے عادی تھے ... گزرے ہوئے کل ... آج اور آنے والے کل کی عکاس ... ایک پُرانتقام مگر خیال انگیز تحریر ...

محبت کی شکست ... جس کا ہر زاویہ اپنے ہدف سے ہٹتا چلا گیا

اُس کا اصل نام کیتھرین میک آئیوان تھا مگر سب بچپن سے ہی اُسے کیٹین پکارتے تھے۔ اب وہ خود ایک سات سالہ پیارے سے بچے کی ماں تھی۔ اس وقت بچہ باہر کھیلنے نکلا ہوا تھا، شوہر اپنی دکان پر تھا اور وہ ڈنر بنانے کی تیاری کررہی تھی۔ سبزی کی ٹوکری اس کے سامنے تھی اور وہ آلو چھیل رہی تھی۔

کیٹین کا گھر آئرلینڈ کے ایک دور دراز ساحلی قصبے کے کنارے پہاڑی ڈھلوان پر نہایت خوبصورت جگہ پر تھا۔ یہاں سے قصبے کا منظر بہت دلفریب دکھائی دیتا تھا۔ کچن کی کھڑکی سے، بندرگاہ سے آنے والی بل کھاتی سڑک موڑ پر سے صاف نظر آتی تھی۔

دسمبر کا مہینہ شروع ہوچکا تھا۔ پچھلے دو روز سے برفباری ہورہی تھی۔ برف گرنے کا سلسلہ کچھ دیر کے لیے تھما تو ڈینی اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے باہر نکل گیا۔ اُس نے آلو چھیلتے ہوئے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ برف کے گالے ایک بار پھر گرنے لگے تھے۔ اس نے کھڑکی سے باہر کا بغور جائزہ لیا۔ ڈینی دور دور تک نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے سکھ کا سانس لیا۔ اس کا خیال تھا کہ ڈینی اپنے دوستوں میں سے کسی ایک کے گھر پر اُن کے ساتھ کھیل رہا ہوگا۔

اچانک باہر اسے کسی گاڑی کے ٹائر چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ ایسا لگا کہ کسی ڈرائیور نے تیز رفتار گاڑی کے اچانک بریک لگائے ہیں۔ اس نے تجسس سے کھڑکی سے جھانکا مگر سڑک کے موڑ اور اُس کے اِردگرد سے کوئی گاڑی نظر نہیں آئی۔ باہر ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ برف باری تیز ہوچکی تھی۔ اس نے سر جھکا کر ایک بار پھر آلو چھیلنا شروع کردیے۔ اچانک اسے کسی کے دوڑنے کی آہٹ سنائی دی۔ ایسا لگا کہ کوئی دوڑتا ہوا گھر کی طرف آرہا ہے۔ ”لو... ڈینی آرہا ہے۔“ وہ بڑبڑائی۔ ”ابھی کھانا بنا نہیں، آتے ہی بھوک بھوک کی رٹ لگانا شروع کردے گا۔“ گھر کا داخلی دروازہ کھلا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی ڈینی کو پتا ہے خود ہی اندر آجائے گا۔ وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے بدستور آلو چھیلتی رہی۔

اچانک اسے ایسے لگا جیسے کوئی دروازہ تھپتھپا رہا ہے۔ ”یہ ڈینی تو نہیں ہوسکتا۔“ اس کے دماغ میں فوراً خیال آیا۔ ابھی وہ اپنی جگہ سے ہلنے بھی نہ پائی تھی کہ کسی نے دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹانا شروع کردیا۔ ”مسز فریشٹی، مسز فریشٹی...“ کوئی اونچی آواز میں اُسے پکار رہا تھا۔ آواز کسی بچے کی تھی۔ ”سب خیریت ہو۔“ وہ انجانے خوف سے لرز گئی۔ ”یہ کون ہوسکتا ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ ”جلدی کھولو... وہ ڈینی...“ دروازہ پیٹنے والا بچہ چلّا رہا تھا۔ ڈینی ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ڈینی کا نام سن کر وہ سخت گھبرا گئی۔

”کیا ہوا، کہاں ہے ڈینی؟“ اس نے چھری جلدی سے سنک پر پھینکی اور چلاتے ہوئے دروازے کی طرف دوڑی۔ اس کے ہاتھ سے آلو گر کر لڑھکتا ہوا ڈائننگ ٹیبل کے نیچے چلا گیا تھا۔ اس کا دل انجانے خوف کے باعث تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا ہوچکا یا ہونے والا ہے مگر اُس کی چھٹی حس اسے کسی خطرے کا پتا دے رہی تھی۔

”خدا کرے... سب خیریت ہو۔“ اس نے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے دروازہ کھولا۔

”جلدی چلیں۔“ سامنے اس کے بیٹے کا ہم عمر دوست کھڑا تھا۔ اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں اور آنکھیں خوف کے باعث پھیل چکی تھیں۔ اس کا لباس اور جوتے برف سے اَٹے ہوئے تھے۔ ہاتھوں پر خون کے دھبے بھی نظر آرہے

تھے۔ باہر ہر طرف برف جمی ہوئی تھی۔ اس وقت بھی ہلکی ہلکی برف باری ہورہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی پوری قوت سے دوڑتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔

”انہوں نے ڈینی کو ماردیا، جلدی چلو۔“ کیٹین کو دیکھتے ہی وہ چلّایا۔ خوف سے اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔

”اوہ، میرے خدا۔“ یہ سنتے ہی کیٹین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس نے اور کیوں ڈینی کو مارا ہے۔ وہ اب تک واضح طور پر یہ بھی سمجھ نہ پائی تھی کہ وہ بچہ اسے کیا بتانا چاہتا ہے۔ ڈینی اور مار کا سن کر تو وہ بدحواس ہوگئی۔ ایسا لگا جیسے یہ بات سن کر اس پر سکتہ طاری ہوگیا ہو۔

”جلدی کریں...“ اسے ساکت کھڑا دیکھ کر وہ پھر چلّایا۔

یہ سنتے ہی کیٹین کو ہوش آگیا۔ وہ تیزی سے اندر کی طرف بھاگی۔ اس نے جلدی سے کھونٹی پر ٹنگا اوورکوٹ اتارا اور اسے پہنتے ہوئے لڑکے کے پیچھے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے چلنے لگی۔ وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ چل نہیں رہی بلکہ دوڑتی ہوئی جارہی ہے۔

وہ اونچے نیچے، آڑے ترچھے پہاڑی راستے پر دوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہر طرف برف بکھری ہوئی تھی۔ شدید سردی کا عالم تھا۔ دور دور تک کوئی انسان یا جانور نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ لڑکا کیٹین کے آگے آگے دوڑ رہا تھا۔ دو تین منٹ کے اندر وہ لڑکا کیٹین کو لے کر وہاں پہنچ گیا، جہاں ڈینی تھا۔

”یہ دیکھو۔“ وہ ایک جگہ جا کر کھڑا ہوا۔ کیٹین ابھی اس سے کچھ فاصلے پر تھی۔ اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر وہ اپنی پوری قوت سے اُس طرف دوڑی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی پلکیں نم ہورہی تھیں۔ ”میرے خدا...“ کیٹین کے منہ سے نکلا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”یہ...“ جیسے ہی وہ قریب پہنچی، لڑکے نے زمین کی طرف اشارہ کیا۔ ہر طرف برف کی سفید چادر بچھی ہوئی تھی، جس پر اس کا سات سالہ بیٹا ڈینی آڑھا ترچھا پڑا تھا۔ وہ خون میں لت پت تھا۔ اُس کے جسم سے بہنے والے خون سے اردگرد کا بڑا حصہ سرخ ہوچکا تھا۔ یہ دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈینی اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ اس کے اوسان جواب دے گئے۔ وہ برف پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے۔

سڑک کے ایک کنارے پر چھوٹا ٹرک ترچھا کھڑا ہوا تھا۔ اس پر آٹے کی بوریاں لدی ہوئی تھیں، جسے وہ قصبے کی دکانوں تک پہنچانے جا رہا تھا کہ حادثہ ہوگیا۔ ٹرک کا بمپر ایک طرف سے لٹک رہا تھا۔ اطالوی ڈرائیور سر جھکائے بیٹھا تھا۔ حادثے کی خبر ملتے ہی پولیس بھی موقع پر پہنچ چکی تھی۔ جب کیٹن وہاں پہنچی، تب تک پولیس نے ڈرائیور کو حراست میں لے کر اپنی تفتیش شروع کردی تھی۔ وہ سب کی موجودگی سے بے خبر بیٹے کی لاش کے کنارے گھٹنوں کے بل بیٹھی روئے جا رہی تھی اور بار بار اس کے چہرے اور بالوں پر اپنا ہاتھ پھیر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ بھی خون میں لت پت ہوگئے۔

ڈرائیور نے حادثے کی ذمے داری قبول کرتے ہوئے بتایا، بچہ اچانک ٹرک کے سامنے آگیا تھا اور زیادہ رفتار سے جا رہا تھا۔ جب تک وہ بریک لگاتا، تب تک بچہ ٹرک کے بمپر سے ٹکرا گیا۔ ٹکراتے ہی وہ اچھلا اور زمین پر آگرا۔

"لاش بھجوانے کا انتظام کرو۔" آئرش پولیس افسر نے دستانے اتارتے ہوئے ماتحت کو حکم دیا۔ اس نے ضابطے کی فوری کارروائی مکمل کرلی تھی۔ یہ حکم دینے کے بعد وہ کیٹن کی طرف بڑھا۔ وہ برف پر بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔ پولیس افسر اس کے شوہر کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا مگر اس وقت وہ اپنے حواس میں نہیں تھی۔

ایمبولینس پہنچ چکی تھی۔ دو پولیس والے لاش لے جانے کے لیے اسٹریچر لا رہے تھے۔ اسی دوران میں کیٹن کی نظر ایک جوتے پر پڑگئی۔ وہ ڈینی کا جوتا تھا۔ وہ جھٹ سے اٹھی۔ یہ جوتا حادثے کے وقت اُس کے پیر سے نکل گیا تھا۔ "جوتا پہن لو میرے بچے، ٹھنڈ لگ جائے گی۔" اس سے پہلے کہ لاش کو اسٹریچر پر ڈالا جاتا، وہ اس کے پاؤں میں جوتا پہنانے لگی۔ اس دوران کیٹن کی نظر ڈینی کے موزوں پر پڑ گئی۔ اس میں ایڑی کی طرف ایک سوراخ نظر آرہا تھا۔ "گھر چلو میں سوئی دھاگے سے سی دوں گی۔" وہ لاش کو جوتا پہناتے ہوئے بولی۔ پولیس والے سمجھ گئے کہ کمسن اور اکلوتے بیٹے کی لاش دیکھ کر وہ حواس کھو بیٹھی ہے۔

یہ دیکھ کر پولیس افسر آگے بڑھا۔ اس نے سہارا دے کر اسے اٹھایا اور اس کا رُخ دوسری طرف کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "ابھی گھر چلتے ہیں، پھر تم اس کا موزہ مرمت کردینا۔" اس نے یہ جان بوجھ کر کیا تھا تاکہ وہ لاش کو اسٹریچر پر ڈالتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس وقت یہ بات اس عورت کے لیے بڑے صدمے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔

"ہاں ہاں..." کیٹن نے پولیس افسر سے کہا۔ "ہم گھر جاتے ہیں۔ بہت سردی ہے۔ ڈینی کی طبیعت خراب ہوجائے گی۔ اس کا موزہ بھی پھٹ گیا ہے۔ گھر پر سوئی دھاگا ہے۔ میں فوراً سی دوں گی۔" وہ اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کا بھی دل بھر آیا تھا۔

بچے کی لاش کو اسپتال منتقل کردیا گیا جبکہ پولیس افسر کیٹن کو سہارا دے کر قصبے کے بازار کی طرف بڑھ گیا۔ جو لڑکا کیٹن کو لے کر یہاں پہنچا تھا، اب وہ مسٹر فریشٹی کی دکان کی طرف انہیں لے کر جا رہا تھا۔ دو پولیس والے لڑکے کے ساتھ ساتھ اُن کے آگے آگے تیز تیز چلتے ہوئے جا رہے تھے تاکہ کیٹن کے شوہر کو حادثے کی اطلاع دے سکیں۔

یہ ایک چھوٹا سا دو رویہ بازار تھا۔ جس کا فرش پتھر سے بنا ہوا تھا۔ وہ کیٹن کو لے کر بازار میں داخل ہوا تو ایک دکان کے آگے لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ساری دکانیں خالی تھیں۔ "یہاں کیا ہوگیا؟" وہ ہجوم کی طرف بڑھا۔ ایک دکان کے اندر اُسے وہ دونوں پولیس والے اور لڑکا نظر آگئے، جو ان کے آگے آگے یہاں پہنچے تھے۔ نیلے اوورکوٹ میں ملبوس ایک پولیس والا فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے کوئی شخص زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ دوسرا پولیس والا کھڑا تھا۔ ایک آدمی بھی دکان کے اندر حیران پریشان کھڑا نظر آرہا تھا۔ اس کی آدھی شیو بنی ہوئی تھی اور آدھے چہرے پر شیونگ کا جھاگ دار صابن لگا ہوا تھا۔ آئرش پولیس والے کو آتا دیکھ کر لوگ ایک طرف ہوکر اسے راستہ دینے لگے۔ وہ کیٹن کو لیے لیے دکان کے اندر داخل ہوا۔

"کیا ہوا؟" اسے دیکھ کر ایک پولیس والا آگے بڑھا تو اس نے پوچھا۔

"مر گیا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیسے ہوا یہ سب کچھ؟" اس نے یہ کہہ کر کیٹن کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی سب سے بیگانہ نظر آرہی تھی۔

"یہ شیو بنا رہا تھا۔" اس نے بتانا شروع کیا۔ "جب میں نے اسے پکارا تو وہ گاہک کی شیو ادھوری چھوڑ کر میری طرف بڑھا۔ میں نے اسے بتایا کہ تمہارا بیٹا حادثے میں مر گیا ہے۔ یہ سن کر اس نے منہ سے تو کچھ نہ کہا البتہ خالی خالی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا اور پھر اگلے ہی لمحے اس نے اپنا دل پکڑا اور زمین پر گر گیا۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور پھر کیٹن کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "میرا

خیال ہے کہ اسے دل کا دورہ پڑا تھا، فوراً ہی چل بسا۔"

اسی دوران میں فریشٹی کی لاش کے پاس بیٹھا پولیس والا بھی اٹھ کر کھڑا ہوا اور اُن کی طرف دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ اسی دوران میں کیٹن کی نظر فرش پر گرے شوہر پر پڑی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔

"سنو، وہ ڈینی..." یہ کہتے ہوئے وہ فرش پر اکڑوں بیٹھ کر اُسے ہلانے جُلانے لگی۔ "یہ مر گئے؟" جب فریشٹی نے کوئی حرکت نہ کی تو اس نے لوگوں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سب کی نگاہیں فرش پر گڑ گئی تھیں۔ ایک حادثہ... دو اموات اور لمحہ بھر میں ہنستا بستا گھرانا برباد ہوچکا تھا۔

کیٹن بڑی مشکل سے کھڑی ہوئی۔ اب اس کے آنسو تھم چکے تھے۔ وہ سانس لے رہی تھی مگر اس کی حالت مُردوں سے بھی بدتر ہوچکی تھی۔ آئرش پولیس افسر آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ پولیس والے فریشٹی کی لاش کے ہاتھ پاؤں سیدھے کر رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے فریشٹی شیو بنا رہا تھا۔ اب وہ گاہک منہ پر لگے صابن کا جھاگ ایک تولیے سے صاف کر رہا تھا۔ اسے شیو مکمل کروانے کے لیے دوسری دُکان میں جانا تھا۔

☆☆☆

یہ ستمبر 1946ء کی ایک صبح کا ذکر ہے جب آئرلینڈ کے دور دراز واقع ساحلی قصبے نیروگیٹ کے رہائشی آئرش باشندوں کو مائیکل آئیوان کی موت کا علم ہوا۔ وہ نیلے رنگ کی یونیفارم میں ملبوس پینسل ٹاور کے قریب ویرانے میں مردہ پایا گیا تھا۔ اس کے کوٹ سے ایک خط بھی برآمد ہوا تھا جس میں اس کی طرف سے خودکشی کا اعتراف کیا گیا تھا مگر کوئی بھی آئرش باشندہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ خط اس نے لکھا تھا۔ خط کی تحریر بے حد خراب تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی غیر ملکی نے آئرش انگریزی لکھنے کی کوشش کی تھی۔ خط میں گرامر کی کئی فاش غلطیاں تھیں اور کوئی بھی آئرش باشندہ جو اسکول گیا ہو، اس چند سطر کے ایک خط میں گرامر کی اتنی زیادہ غلطیاں سرزد ہونا، اُن کے خیال میں ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دوپہر تک پورے قصبے میں اس کی موت کو خودکشی کے بجائے قتل تسلیم کرلیا گیا تھا۔ مائیکل کو کس نے اور کیوں قتل کیا؟ اس حوالے سے پورے علاقے میں طرح طرح کی باتیں گردش کرنے لگی تھیں۔

مائیکل آئیوان پولیس افسر تھا اور ایک پولیس والے کے قتل کی خبر بہت جلد وہاں کے سیاستدانوں کے کانوں میں بھی پہنچ گئی لیکن انہوں نے اسے نیا موڑ دے دیا۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ ایک خودمختار علاقے کے قیام کے حامیوں کی کوئی چال ہوسکتی ہے۔ جو اس واقعے کی آڑ میں لوگوں کے جذبات مشتعل کرکے خود کو منظرِ عام پر لانا چاہتے ہیں۔ آئرلینڈ کے بالائی علاقوں کے رہائشی سیاستدانوں کی نظر میں اگر یہ خودکشی نہیں تھی تو پھر نئے آزاد علاقے کے قیام کی سازش تھی۔

جن دنوں مائیکل آئیوان کا قتل ہوا، اُن دنوں اطالوی باشندے آئرلینڈ کے مختلف ساحلی علاقوں پر جبری طور پر اپنا تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ اُن اطالویوں نے اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد اپنی مرضی کے قوانین نافذ کردیے تھے۔ مقامی آئرش اُن کے قوانین اور خود اُن سے شدید نفرت کرتے تھے۔ نیروگیٹ قصبہ بھی انہی علاقوں میں سے ایک تھا۔ وہ اُن کے خلاف نفرت کے علاوہ مزاحمت بھی کرنا چاہتے تھے مگر اُن کی قوت اطالویوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ یہ قصبہ بھی دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ ایک طرف اطالوی باشندے اکثریت میں تھے تو دوسرے حصے میں مقامی آئرش رہتے تھے۔ اطالویوں کے خلاف نوجوانوں نے درپردہ طور پر مزاحمت شروع کردی تھی مگر اب تک انہیں کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکی تھی۔

مائیکل آئیون بھی پولیس کے ان چند افسران میں سے تھا جو اس بات کی کوشش کر رہے تھے کہ کس طرح ان اطالویوں کو مار بھگایا جائے۔ اس نے میئر کی مالی مدد سے نوجوانوں کا ایک جتھا ترتیب دیا تھا جن کا کام ان پر حملے کرنا تھا۔ میئر نسلاً آئرش تھا۔ وہ بھی اپنی سرزمین پر غیر ملکیوں کے وجود سے نفرت کرتا تھا۔ اس نے دل کھول کر مدد کی مگر یہ منصوبہ ناکام ہوا۔ کچھ آئرش مزاحمت کار اطالویوں کے ہاتھوں پکڑے گئے، کچھ نے ہتھیار ڈال دیے اور جو باقی بچے، انہوں نے لڑنے سے صاف انکار کردیا۔ یہ دیکھ کر مائیکل نے بھی ہار مان لی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اُن کے خلاف بڑے پیمانے پر کارروائی کرنی ہوگی۔ آئرلینڈ کے بالائی حصے میں رہنے والوں کی مدد کے بغیر وہ کامیاب نہیں ہوسکتے۔ معاملہ اس کی دسترس سے بہت آگے کا تھا۔ اس لیے اس نے خاموشی اختیار کرلی اور چپ چاپ نوکری کرنے لگا۔

اسی دوران میں ایک ایسا ہنگامہ اٹھا، جو پورے قصبے میں کینسر کی طرح پھیل گیا۔ یہ خبر شاید اتنی اہم نہ ہوتی اگر مائیکل آئیوان کے گھر کی نہ ہوتی۔ سب اس بات پر حیرت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زدہ تھے۔ ہوا یہ کہ مائیکل کی اُنیس سالہ پوتی کیتھن نے اپنی چھوٹے بھائی ہنی سے ذکر کر دیا تھا کہ وہ اطالوی حجام ڈینس فریشٹی سے شادی کرنے والی ہے۔ اس نے اعتراف کیا کہ ان دونوں کے درمیان کئی مہینوں سے خط و کتابت اور راز و نیاز ہو رہے تھے۔ یہ خبر بھلا کہاں رکتی، بہت جلد یہ بات گھر سے نکل کر پورے قصبے میں پھیل گئی۔

مائیکل نے پوتی کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانی۔ اس نے بائیکاٹ کی دھمکی دی مگر اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ جس روز فریشٹی اور کیتھن کی شادی تھی، اُس روز چرچ میں صرف چند لوگ موجود تھے وہ بھی فریشٹی کے رشتے دار اور دوست۔ کیتھن کے خاندان کو تو چھوڑیے، قصبے کے دوسرے لوگوں نے بھی شادی کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ چرچ میں تقریب کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ سینٹ فرانسیس میں واقع گھر منتقل ہو گئی۔ یہ علاقہ اطالوی باشندوں نے آباد کیا تھا۔ یہ نام بھی اُنہی کا دیا ہوا تھا۔ یہاں دوا کے نام پر بھی کوئی ایک آئرش نہیں ملتا تھا۔ اطالویوں کی اس بستی کی پہلی آئرش رہائشی کا اعزاز کیتھن کو ملنے والا تھا۔ اسے اپنی محبت چاہیے تھی، سو اس نے حاصل کر لی۔

فریشٹی محبت کرنے والا نرم خو انسان تھا۔ وہ دوسرے اطالویوں سے بہت مختلف تھا۔ بہت جلد کیتھن کو اندازہ ہو گیا کہ نیرو گیٹ کی اطالوی آبادی کا مزاج کیسا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے تھے، بلا کے کنجوس تھے، بیویوں کو مارتے تھے اور شراب خانوں میں اپنی شامیں بتاتے تھے مگر فریشٹی ایسا نہیں تھا۔ وہ کیتھن سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال کرتا۔ ہر شام وہ اسے ساحل کی طرف ٹہلنے کے لیے لے جاتا تھا۔ اس کے سر میں ذرا سا بھی درد ہو تو وہ ساری ساری رات جاگ کر اس کے سرہانے بیٹھا رہتا۔ وہ بہت خوش تھی کہ اسے پیار کرنے والا شوہر ملا ہے۔ اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا کہ اس نے روایت پسند خاندان سے بغاوت کی۔ اسے اپنے کسی کے قطع تعلق پر کبھی دکھ کا احساس نہیں ہوا۔ فریشٹی کی محبت کے آگے ہر چیز ماند پڑ چکی تھی۔

اگرچہ بہت سارے اطالوی نسل پرست کیتھن کو پسند نہیں کرتے تھے مگر فریشٹی کو بھی اس بات کی پروا نہیں تھی۔ اس کے لیے کیتھن کے آگے ہر بات بہت ہی معمولی تھی۔

اُن دونوں کی شادی کو کئی ماہ گزر چکے تھے۔ نسل پرست اطالوی پہلے تو دبے دبے لہجے میں اس سے نفرت کا اظہار کرتے تھے لیکن اب وہ ذرا کھل کر اس کے خلاف باتیں کرنے لگے تھے۔ راہ چلتے کیتھن پر طنزیہ جملے کسے جاتے۔ حتیٰ کہ کچھ شدت پسندوں نے تو فریشٹی کے خاندان کو غیر نسل سے تعلق قائم کرنے کی سزا بھی دے دی تھی۔

فریشٹی کا باپ علاقے میں چھوٹا سا جنرل اسٹور چلاتا تھا۔ پہلے تو کچھ لوگوں نے اس سے خریداری کا بائیکاٹ کر دیا مگر جب اس سے بھی بات نہیں بنی تو ایک رات شدت پسندوں نے اسٹور لوٹ لیا۔ سب کو پتا تھا کہ یہ کارروائی کس نے کی ہے لیکن کوئی بھی شخص زبان پر اُن لٹیروں کا نام لانے کو تیار نہیں تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، کیتھن کی زندگی کو دوبھر بنانے کی کوششوں میں ان کی کارروائیاں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ کیتھن اس صورتِ حال سے پریشان تھی لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی اس لیے خاموش تھی۔ وہ جانتی تھی کہ صرف اُس کی ذات ہی نہیں خود فریشٹی اور اس کا خاندان بھی نسل پرست ہم وطنوں کی زیادتیوں کا نشانہ بن رہا ہے۔

فریشٹی اچھی طرح جانتا تھا کہ کیتھن کو کس طرح کے شدید ذہنی دباؤ کا سامنا ہے۔ وہ خود اس صورتِ حال سے پریشان تھا۔ فریشٹی ایک امریکی بحری جہاز پر حجام کی ملازمت کرتا تھا لیکن شادی سے کچھ پہلے ہی اس نے ملازمت چھوڑ کر قصبے میں دُکان کھول لی تھی۔

اُس دن وہ ایک اطالوی کی شیو بنا رہا تھا۔ یہ نسل پرستوں کے ٹولے سے تھا۔ شیو بنواتے ہوئے وہ مستقل بولے جا رہا تھا۔ اسی دوران اس نے کیتھن کے بارے میں کچھ کہنا چاہا۔ اُس وقت اُسترا اس کی گردن پر تھا۔ جیسے ہی اس نے کیتھن کا نام لیا۔ فریشٹی کے جسم میں آگ لگ گئی۔ اُس کا خون کھول اٹھا۔ اگرچہ وہ اطالوی بہت بڑا بدمعاش تھا اور یہ شریف آدمی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا مگر اچانک غصے کے باعث اس کے جسم میں تناؤ پیدا ہوا، ہاتھ ذرا سا چوک گیا اور اُسترے نے اُس کی گردن پر ہلکا سا گھاؤ ڈال دیا۔ اگرچہ یہ سب کچھ جان بوجھ کر نہیں ہوا تھا مگر پھر بھی اُس شخص نے اتنا ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ بڑی مشکل سے اس کی جان چھوٹی۔ اُس کے بعد اس کا دل کام میں لگا نہیں اور وہ دُکان بند کر کے گھر چلا آیا۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ یہ لوگ انہیں چین سے جینے نہیں دیں گے۔

یہ پہلا واقعہ تھا لیکن آخری نہیں۔ یکے بعد دیگرے کئی ایسے واقعات ہوئے جب اُس کا اپنے ہم وطنوں سے کئی بار جھگڑا ہوا۔ ہر بار اُس کے باپ نے بیچ میں پڑ کر اُس کی جان چھڑوائی۔ جنرل اسٹور لوٹ لیے جانے کے بعد فریشٹی کا باپ بے روزگار تھا۔ اس واقعے کے بعد اُس نے بھی دُکان پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ پہلے وہ بھی حجام تھا۔ اسے یقین تھا کہ

اس طرح ایک تو اس کی بے کاری دور ہو جائے گی، دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ شاید اُس کی وجہ سے شدت پسند اطالوی اس کے بیٹے کو تنگ کرنا کچھ کم کر دیں۔ جب سے ڈینی سینئر نے دُکان پر بیٹھنا شروع کیا، لڑائی جھگڑے کے واقعات کچھ کم ہو گئے تھے مگر ان کے خلاف لوگوں کے دل اور دماغوں میں جو نفرت موجود تھی، وہ بدستور بڑھتی جا رہی تھی۔

اُنہی دنوں میں سے ایک دن کی بات ہے۔ کیتھن ضرورت کا کچھ سامان خریدنے کے لیے قصبے کے بازار گئی تھی۔ اچانک اُس کا سامنا لفنگوں کے ایک گروپ سے ہو گیا۔ یہ ٹولہ نیرو گیٹ میں بدنام تھا۔ گروہ کا سربراہ گیلو تھا جو اپنی حرکتوں کی وجہ سے ہر جگہ بدنام تھا۔ کیتھن کو دیکھا تو ان کے شیطانی دماغ میں وقت گزاری کا ایک نیا خیال آ گیا۔ گیلو اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ اس پر گھٹیا جملے کس رہا تھا۔ ایک دو بار گیلو نے اسے کندھا بھی مارا لیکن وہ اپنے آپ میں سمٹی سمٹائی چلتی رہی۔ اسے یقین تھا کہ ان اطالوی لفنگوں کو کوئی نہیں روکے گا۔ یہاں سب اطالوی ہیں اور وہ آئرش سے سخت نفرت کرتے تھے۔ کیتھن کا لب و لہجہ، چہرے کے خدوخال اور لباس چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ میں آئرش ہوں۔ یہی بات اُنہیں اور بھی بھڑکا رہی تھی۔

بازار دریا کے سامنے بنا ہوا تھا۔ تھوڑی دور تک تو وہ چلتی رہی لیکن اچانک گیلو نے ایسی حرکت کی وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ اُس وقت وہ علاقہ خاصا سنسان تھا۔ گیلو نے آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور اس کے گالوں کو چوم لیا۔ کیتھن کے لیے گیلو کی یہ حرکت غیر متوقع تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی ہمت اتنی بڑھ جائے گی۔ اس نے خود کو اس کے بازوؤں سے چھڑایا اور اپنا ہینڈ بیگ ہوا میں لہراتے ہوئے اس پر دے مارا اور چلائی۔ ”پیچھے ہٹ کمینے انسان۔“ اس سے پہلے کہ ہینڈ بیگ گیلو کے چہرے پر لگتا، اس نے پکڑا اور چھین کر ہنستا ہوا دریا کی طرف بھاگ گیا۔ گیلو کے پیچھے پیچھے اُس کے چیلے آ رہے تھے، وہ بھی دریا کی طرف دوڑ پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ وہاں کھڑی کشتی میں بیٹھے اور دوسرے کنارے کی طرف چل دیے۔ کیتھن چلاتی رہی لیکن لوگ اس کی مدد کرنے کے بجائے اس پر ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اُن کے نزدیک تو یہ تماشا تھا ایک آئرش عورت کی بے عزتی کا۔ اس بے عزتی پر کیتھن کا خون کھول اٹھا۔ اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ بیگ میں ساری رقم تھی۔ وہ اب کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ روتی ہوئی گھر لوٹ گئی۔

”کیا ہوا؟“ جب وہ لوٹی تو فریشٹی کا بھائی گھر پر موجود تھا۔

”وہ گیلو...“ اُس نے روتے ہوئے ساری بپتا بتانی شروع کی۔

”وہ بہت کمینے ہیں۔“ اس نے دلاسا دیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بہتر ہے کہ اس بات کو بھول جاؤ۔“

یہ سُن کر وہ مرے مرے قدموں سے کمرے کی طرف چل دی۔

دوسری طرف کیتھن کو سرِ عام تنگ کرنے اور اس کا بیگ لوٹنے کے بعد گیلو دوپہر کے وقت فریشٹی کی دُکان پہنچا۔

”جلدی سے شیو بناؤ۔“ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی حکم دیا۔

اس وقت فریشٹی فارغ تھا۔ اس کا باپ باہر دھوپ میں کرسی ڈالے اخبار پڑھ رہا تھا۔

”یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟“ وہ گیلو کی شیو بنا رہا تھا کہ اسی دوران گیلو کا لفنگا دوست اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں وہ بیگ تھا جو اس نے کیتھن سے چھینا تھا۔ بیگ دیکھتے ہی وہ پہچان گیا۔ ایک ماہ پہلے اس نے یہ اپنی بیوی کو اُس کی سالگرہ پر تحفے میں دیا تھا۔ بیگ دیکھ کر وہ جس انداز سے چونکا، اس کے باعث اس کا استرا اس کے گال پر ہلکا سا کٹ ڈال گیا۔

”اُف... مار ڈالا۔“ گیلو کے منہ سے نکلا۔ اگلے ہی لمحے اس نے فریشٹی کے ہاتھ سے استرا چھینا اور اس کے ہاتھ پر کھڑے رخ مار دیا۔ بس، اس کے بعد پھر کیا تھا، دکان میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔

گیلو اور اس کے ساتھیوں نے فریشٹی کو خوب مارا۔ استرا لگنے سے اُس کے ہاتھ پر پون انچ کے قریب گھاؤ پڑ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب فریشٹی کے بوڑھے باپ کی معافی تلافی کے بعد معاملہ رفع دفع ہوا تو اُس نے بیٹے کے گھاؤ پر دوا لگا کر پٹی باندھی۔

”چلو... شیو پوری کرو۔“ گیلو ایک بار پھر کرسی پر براجمان تھا۔ لڑکے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے بے دلی سے شیو بنانی شروع کر دی۔ ”اب کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے، سمجھے۔“ اس نے غراتے ہوئے دھمکی دی۔ وہ بے چارہ بیگ کے بارے میں بھول چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں درد ہو رہا تھا لیکن پھر بھی وہ شیو بناتا رہا۔ گیلو کے ساتھی دکان کے باہر کھڑے تھے۔

گیلو کے بعد اس کے پانچ ساتھیوں نے شیو بنوائی اور پھر بنا پیسے دیے منہ اٹھا کر چل دیے۔ ”آئندہ شیو دھیان سے بنانا ورنہ...“ وہ دھمکی دیتا ہوا دکان سے نکلا۔ بوڑھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باپ اور کمزور بیٹا چپ چاپ ان کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ گیلو بازار کی اُس دکان کی طرف بڑھ رہا تھا، جہاں وہ اکثر چوری کا سامان بیچا کرتا تھا۔ اسے کیٹن کے بیگ سے نقدی مل گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ بیگ کے بھی اچھے دام مل جائیں گے۔ ''نیا لگتا ہے۔'' اس نے چلتے چلتے بیگ ساتھی کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ ''اچھے پیسے ملیں گے۔''

''اچھے نہ ملے تب بھی کچھ تو ملے گا۔'' اس کے ساتھی نے کہا تو وہ سب نہایت خبیث انداز میں قہقہے لگانے لگے۔

اس واقعے کے بعد کیٹن اور فریشٹی کو ہی نہیں، اس پورے خاندان کو یقین ہو چکا تھا کہ اب ان کا یہاں کیٹن کے ساتھ رہنا ممکن نہیں۔ اور تو اور فریشٹی کا بڑا بھائی بھی اُن سے نفرت کرنے لگا تھا۔ وہ برملا سب کے سامنے تمام مصیبتوں کی جڑ کیٹن کو قرار دیتا تھا۔ خود فریشٹی کی ماں بھی بڑے بیٹے کی ہمنوا تھی۔ کیٹن سے نفرت کی ہوا اب نیروگیٹ کے باہر ہی نہیں، خود ان کے گھر میں بھی چلنے لگی تھی۔

جن دنوں کی یہ بات ہے اُن دنوں کیٹن امید سے تھی۔ فریشٹی پہلی بار باپ بننے والا تھا، اسے یقین تھا کہ جو نفرت کیٹن سے شادی کے بعد اس کے ہم وطنوں اور اب خود گھر والوں کے دلوں میں پیدا ہوئی ہے، وہ اس کی اولاد کے لیے محبت میں کبھی بھی تبدیل نہیں ہو سکتی۔ کئی روز کی سوچ بچار کے بعد انہوں نے قصبے کو چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا، ایسی جگہ جہاں انہیں نفرت کی ہوا چھو نہ سکے اور پھر ایک روز وہ دونوں قصبے کو خیرباد کہہ گئے۔

☆☆☆

یہ جگہ نیروگیٹ سے دس میل کے فاصلے پر تھی۔ نئی جگہ اور نئے لوگوں میں اُن دونوں نے خود کو گم کر لیا۔ اس دوران میں کیٹن اور فریشٹی، دونوں کا اپنے اپنے خاندانوں سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ان کا بیٹا ڈینی چار سال کا ہونے والا تھا۔ قصبے میں فریشٹی کی حجام کی دُکان تھی، جو ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ گھر کے تینوں افراد ناشتے کی میز پر موجود تھے۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ''کون آ گیا ہے اِس وقت۔'' کیٹن بڑبڑاتی ہوئی اٹھی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ ''اوہ تم۔'' وہ خوشی سے چلائی۔

سامنے اُس کا چھوٹا بھائی ہنی کھڑا تھا۔ اُس کا سب سے پیارا بھائی مگر شادی کے بعد اس نے بھی خاندان کے دوسرے رشتے داروں کی طرح اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ وہ کشمش کلر کے ڈبل بریسٹ کوٹ سوٹ میں ملبوس تھا۔ کیٹن کو اس لباس میں دیکھ کر خیال آیا کہ اب تک شاید اس نے پولیس اکیڈمی جوائن نہیں کی ہے۔ ''اندر آ جاؤ۔'' کیٹن نے اپنی حیرانی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ بھائی کو دیکھ کر وہ خوشی سے جھوم گئی تھی مگر اُس کے چہرے پر بدستور سنجیدگی طاری تھی۔

''تمہارے سسر کا انتقال ہو گیا۔'' وہ کیٹن کے پیچھے پیچھے کچن میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''کیا...'' یہ سنتے ہی کیٹن تیزی سے مڑی۔ اس کے چہرے پر بے یقینی کا تاثر تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہیں وہاں چلنا چاہیے، ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ۔'' اس نے کیٹن کی بات کا جواب دینے میں وقت ضائع کیے بغیر کہا۔ یہ کہہ کر اس نے فریشٹی کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں کہنیاں میز پر ٹکا کر بیٹھا ہوا تھا۔ ہنی نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔ ''کیا تمہیں وہاں جانے میں کچھ مسئلہ ہے۔'' اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔ وہ باپ کی موت کی خبر سن کر یوں چپ چاپ اسے بیٹھا دیکھ کر کچھ پریشان ہو گیا۔

ہنی نے بتایا کہ فریشٹی کے باپ کو گزشتہ روز سہ پہر کو دُکان میں کام کے دوران میں دل کا دورہ پڑا اور اس کے بعد سے وہ شام تک بے ہوش رہا۔ رات آٹھ بجے اُس کا انتقال ہو گیا۔ اسے جیسے ہی آج صبح یہ اطلاع ملی وہ ان کے پاس چلا آیا تا کہ وہ دونوں جنازے میں شرکت کر سکیں۔ تدفین آج صبح دس بجے ہونی ہے۔ ''مجھے یقین ہے کہ تمہیں کسی نے اس واقعے کی اب تک اطلاع نہیں دی ہوگی۔'' ہنی نے کیٹن کی طرف دیکھ کر کہا۔

''نہیں۔'' کیٹن نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''شاید انہوں نے مناسب نہ سمجھا ہو۔'' اس کا لہجہ افسردہ تھا۔ وہ تینوں ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے تھے۔ ننھا ڈینی ماں کی گود میں بیٹھا ہنی کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ماحول پر شدید افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ فریشٹی غم میں ڈوبا ہوا، بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

''میرے خیال میں اب ہمیں چل دینا چاہیے۔'' ہنی نے کمرے میں چھائی ہوئی خاموشی کو توڑتے ہوئے استفساریہ نظروں سے اُن دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں...'' پہلی بار فریشٹی نے لب کھولے۔ یہ سن کر کیٹن اور ہنی کی نظریں اس پر جم گئیں۔ ''اٹھو، ہمیں فوراً وہاں پہنچنا چاہیے۔'' وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

کچھ دیر بعد ہنی کی کار تیزی سے نیروگیٹ قصبے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ آدھا گھنٹے کا راستہ تھا مگر ہنی کو یقین تھا کہ اگر وہ کچھ زیادہ رفتار سے گاڑی چلائے تو آخری رسومات سے پہلے

ہی قصبے پہنچ سکتے ہیں۔ یہ سوچتے ہی اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ وہ چاہتا تھا کہ پہلے سینٹ پیٹرک اسپتال جائے گا، جہاں میت کو تدفین کے لیے تیار کیا جانا تھا۔ وہ سیدھے اُن کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ قصبے کے لوگوں کی نسل پرستی سے اچھی طرح واقف تھا۔ سینٹ پیٹرک اسپتال پہنچنے کے لیے انہیں قصبے کے دورویہ مرکزی بازار سے گزرنا تھا۔

بازار سے گزرتے ہوئے گاڑی کی رفتار بہت ہی کم تھی۔ یہاں کی دو میں سے ایک بیکری کا اطالوی مالک کارلو دکان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے دور سے ہی آگے بیٹھے فریشٹی کو پہچان لیا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا اور ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ''جلدی پہنچو، میت چرچ میں ہے۔'' اس نے ہنی کے چہرے پر نظریں گڑاتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھا کہ شاید انہیں علم نہیں ہوگا۔ یہ سن کر اس نے سر ہلا دیا۔ ''میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔'' ہنی نے گاڑی آگے بڑھائی تو وہ چلا کر کہنے لگا۔

چرچ میں لاش موجود تھی۔ جنازے میں شرکت کے لیے آنے والے سب ہی اطالوی تھے ماسوائے ہنی اور کیٹن کے۔ سینٹ پیٹرک چرچ میں خاصے لوگ موجود تھے۔ یہ چرچ آئرش فلاحی ادارے 'چیریٹی سسٹرز' کے زیرِ انتظام تھا۔ کیٹن اور ڈینی کئی سال کے بعد نیروگیٹ آئے تھے۔ تمام مقامی لوگ انہیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ کیٹن کا دکھ کے مارے بہت برا حال تھا۔ ننھا ڈینی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ ہنگامہ کیوں برپا ہے۔ وہ بے چارہ حیرت سے سب کو تک رہا تھا۔ دکھ کے مارے کیٹن کا بہت بُرا حال تھا۔ جب تک وہ قصبے میں رہی، مرحوم سسر نے اس کا ہر طرح سے بہت خیال رکھا تھا۔ اب اسے گزرا وقت بری طرح یاد آ رہا تھا۔ ہنی بہن کے ساتھ تھا۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور تھوڑا سا آگے بڑھا۔

''یہ مائیکل آئیوان کی پوتی ہیں۔'' اس نے ایک نن سے کہا۔ ''اس کی طبیعت بگڑ رہی ہے۔''

''اوہ...'' نن نے یہ کہتے ہوئے کیٹن کا ہاتھ تھام لیا اور آگے بڑھ گئی۔

ہنی اور کیٹن کی عمروں میں صرف ڈیڑھ سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ میت اور تدفین دیکھ کر اس پر دورے پڑنے لگتے تھے، اس لیے گھر والے اسے کبھی بھی تدفین میں شرکت نہیں کرنے دیتے تھے مگر یہاں مجبوری تھی۔ معاملہ سسر کی موت کا تھا۔ ہنی اپنی بہن سے بہت محبت کرتا تھا، جب سے اُس کی شادی ہوئی تھی، سب گھر والوں کی طرح وہ بھی اس سے لاتعلق ہو گیا تھا مگر جب یہ خبر ملی تو اس نے ضروری سمجھا کہ وہ جا کر بہن کو اطلاع دے۔ کئی برسوں کے بعد ان کی ملاقات ہوئی تو ہنی کے دل میں ایک بار پھر بہن کے لیے پہلے جیسا پیار اُمڈ آیا۔ ہنی نے فریشٹی سے شادی کے فیصلے کے بارے میں بھی سب سے پہلے اسے ہی بتایا تھا۔ وہ آئیوان فیملی کا واحد شخص تھا جو سب کی مخالفت مول لے کر بہن کی شادی میں شریک ہوا تھا مگر بعد میں دوسروں کے زور دینے پر اس نے بھی قطع تعلق کر لیا تھا۔ ہنی فطری طور پر بہادر نوجوان تھا۔ وہ یہاں کا ماحول بھی جانتا تھا۔ وہ تدفین میں شرکت کرنے سے کیٹن کو نہیں روکنا چاہتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اس کا قبرستان نہ جانا ہی مناسب ہوگا۔ اس کی وجہ ایک تو اس کے دورے تھے، دوسرا یہ کہ شاید نسل پرست اطالوی اسے وہاں بھی اپنے طنز کا نشانہ بنانے سے نہ چوکتے اس لیے ہنی نے خود جنازے میں شرکت کا فیصلہ کیا۔

تدفین کے بعد کیٹن اور فریشٹی بھی گھر لوٹ آئے۔ ہنی بھی ان کے ساتھ تھا۔ ماحول پر شدید اداسی طاری تھی۔ وہ باپ کا بہت لاڈلا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا جب ہنی انہیں لے کر واپس روانہ ہوا۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔

''میں واپس نیروگیٹ منتقل ہونا چاہتا ہوں۔'' طویل خاموشی کے بعد فریشٹی نے زبان کھولی اور گردن موڑ کر کیٹن کی طرف دیکھا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب کو خاندان کے ساتھ اکھٹے مل کر رہنا چاہیے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' ہنی نے جواب دیا۔

''میرے خیال میں یہ بات کچھ غلط بھی نہیں۔'' کیٹن نے بوجھل دل سے کہا۔ آج جب اس نے برسوں بعد اپنے بھائی کو دیکھا تو اسے بھی اپنے سارے گھر والے یاد آنے لگے۔

ڈینی سینئر کی موت کو چند روز ہی گزرے تھے، جب وہ ایک شام اپنے مختصر سے سامان اور بیوی بچے کو لے کر واپس نیروگیٹ میں واقع اپنے گھر لوٹ آیا۔ سب نے بظاہر گرمجوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ فریشٹی کے چلے جانے کے بعد اس کی دکان باپ نے سنبھال لی تھی۔ اسے دل کا دورہ بھی دکان میں ہی پڑا تھا۔ فریشٹی کا خیال تھا کہ یہ کام اس کے کسی اور بھائی کو تو آتا نہیں تھا اس لیے دکان کا بند ہو جانا یقینی تھا۔ اسی لیے خود اُس نے دکان سنبھالنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اگلے دن کا سورج طلوع ہوا تو ناشتے سے فارغ ہو کر وہ دکان پر چل دیا۔ دکان کھولتے ہی اس کا دل بوجھل ہو گیا۔ ہر چیز جانی پہچانی تھی۔ وہ کافی دیر تک دکان کی ایک ایک شے کو اس طرح دیکھتا رہا جیسے کوئی پرانے دوستوں سے مدتوں بعد ملا ہو۔ اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اس دکان میں اس کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باپ دل کے دورے کے باعث فرش پر گرا تھا۔ اس خیال کی وجہ سے اس کی طبیعت اور بوجھل ہو چکی تھی۔ وہ دکان کے ایک کونے میں رکھی ہوئی آرام کرسی کو کافی دیر تک غور سے دیکھتا رہا۔ یہ اس کے باپ کی پسندیدہ کرسی تھی جس پر وہ بیٹھ کر اخبار پڑھتے ہوئے فارغ وقت گزارتا یا سردیوں میں جب کبھی سورج نکلتا تو وہ کرسی باہر رکھ کر دھوپ تاپتا تھا۔ گزرے دنوں کی ایک ایک بات اس کے ذہن پر فلم کی طرح چل رہی تھی۔ وہ گھنٹا بھر انہی سوچوں میں ڈوبا رہا، آخر اس نے سامان کی جھاڑ پونچھ کی۔ وہ جانتا تھا کہ دکان کھلی ہے تو گاہک بھی آئیں گے۔ گاہکوں کو اپنے کام سے مطلب ہے، اس کے جذبات سے نہیں۔

دکان کھلنے کی دیر تھی کہ کئی گاہک آ گئے اور فریشٹی مصروف ہو گیا۔ کام کی طرف ذہن ہونے کی وجہ سے اس کا دکھ بھی کچھ کم ہو گیا۔ جتنے لوگ آئے وہ اسے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ سب اس کے باپ کی موت پر دکھ کا اظہار کر رہے تھے۔ ساڑھے دس بجے کا وقت ہوگا۔ فریشٹی نے فرش پر سے کٹے ہوئے بال برش سے جھاڑ دے کر اکھٹے کیے۔ اُس وقت دکان پر کوئی گاہک نہیں تھا۔ وہ اپنے استرے اور قینچیاں قرینے سے رکھ کر بیٹھنے جا رہا تھا کہ گیلو دُکان میں داخل ہوا۔

''اے...'' اس نے اندر داخل ہوتے ہی انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے دھمکانے والے انداز میں کہا۔ ''دکان کھولی ہے تو ہر ہفتے پچیس...''

''کیا...'' فریشٹی نے یہ سن کر حیرت سے کہا۔

''سمجھا نہیں...'' اس نے ہاتھ سے نوٹ گننے کا اشارہ کیا۔ ''ہر ہفتے پچیس اور وہ بھی ہر جمعے کو دوپہر تک۔''

''مگر کیوں...'' فریشٹی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کیا چاہ رہا ہے۔

''زندہ رہو گے تو دُکان کھولے گے اور دکان کھلی تو پچیس، ہر ہفتے...'' یہ کہہ کر گیلو نے اُنگلی سے گولی مارنے کا اشارہ کیا۔ ''سمجھ گئے ورنہ تو پھر...''

''کیا میرا باپ بھی...'' اس نے دبے دبے لہجے میں پوچھا۔

''اس کی بات اس ٹھ کے ساتھ ختم۔ اب نیا کھاتہ شروع۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنستا ہوا دکان سے باہر نکل گیا۔

''ہرگز نہیں۔'' فریشٹی بڑبڑایا اور سر جھٹکا۔ ''قطعی نہیں، ایک پیسا نہیں دوں گا ان کتوں کو'' کو۔''

گیلو شروع سے ہی آوارہ تھا لیکن پچھلے تین چار سالوں کے دوران اس نے اپنا گروہ بنا کر خود کو ان کا سرغنہ بنا لیا تھا۔ اسے ان نسل پرست اطالوی شدت پسندوں کی کھلی حمایت حاصل تھی جو آئرش باشندوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ گزرے سالوں کے دوران گیلو نے جہاں اور کئی طرح کی مجرمانہ سرگرمیوں میں نام پیدا کر لیا تھا، وہیں وہ دھونس دھمکی سے مال بھی بٹورتا تھا۔ البتہ وہ بازار کے ایسے دکان داروں سے دور رہتا تھا، جو اطالوی شدت پسند خیالات کے حامی تھی۔ فریشٹی سے تو وہ بے حد نفرت کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسا شخص اطالوی ہو ہی نہیں سکتا جو آئرش لڑکی سے شادی کر لے۔ اس لیے وہ پہلے بھی فریشٹی کو گالیاں دیتا تھا اور اس دن بھی جب دکان سے باہر نکلا تو اس نے زمین پر تھوکتے ہوئے یہی کہا۔ یہ فریشٹی نے بھی سن لیا تھا مگر وہ غصہ پی گیا۔ جانتا تھا کہ ان لوگوں کے منہ لگنا اس کے بس کی بات نہیں۔ گیلو کو بھی آج صبح ہی پتا چلا تھا کہ فریشٹی لوٹ آیا ہے اور اس نے اپنے باپ کی دکان کھول لی ہے۔ اسی لیے وہ فوراً اُسے دھمکانے اور بھتہ وصول کرنے پہنچ گیا۔

گیلو کو بھتے کی دھمکی دیے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اُس دن جمعہ تھا۔ فریشٹی نے دکان کھولی ہی تھی کہ ایک نوجوان بال ترشوانے آ گیا۔ وہ جیسے ہی فارغ ہوا، گیلو پہنچ گیا۔

''ہاں بھئی... چلو نکالو جلدی سے پورے پچیس۔'' اس نے فریشٹی سے ایسے رقم طلب کی جیسے بھتہ نہیں بلکہ دیا ہوا اُدھار واپس مانگ رہا ہو۔

''یہ لو۔'' فریشٹی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چند نوٹ اور کچھ سکے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

''یہ کیا ہے؟'' گیلو نے پیسے ہاتھ میں لے کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس یہی کچھ ہے۔'' اس نے خوف زدہ لہجے میں جواب دیا۔

''کیا بکواس ہے۔'' گیلو نے وہ نوٹ اور سکے اس کے منہ پر مار دیے۔

اسی دوران ہنی دکان میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دو نال والی بندوق تھی۔ اس نے سیاہ چمڑے کی جیکٹ اور لانگ بوٹ پہن رکھے تھے۔ جب وہ اندر داخل ہوا، اس وقت دکان میں نیرو گیٹ کی 'سویٹ اینڈ سویٹ بیکری' کا مالک مارکو بھی موجود تھا۔ وہ ہنی کا بہت پرانا دوست تھا۔ گیلو کو اندر آتا دیکھ کر وہ ممکنہ گڑبڑ کو روکنے کے لیے خود بھی آ گیا۔ مارکو اور فریشٹی بھی ہنی کو اندر آتا دیکھ چکے تھے مگر گیلو کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔ ''ہے مسٹر۔'' ہنی نے اس کے

کندھے پر ہاتھ رکھ کر دباتے ہوئے کہا۔

''کیا ہے؟'' اس نے درشت لہجے میں کہا اور جیسے ہی گردن موڑی، ہنی نے بندوق کی نال اس کی پیشانی کے عین درمیان، دونوں بھوؤں کے بیچ گڑا دی۔ گیلو گڑبڑا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا۔ ''کیا بات ہے؟'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے گھگیائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''فریشٹی...'' ہنی نے گیلو پر سے نظر اٹھائے بغیر اسے پکارا۔ ''دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دو۔''

''کیا کرنا چاہتے ہو تم؟'' یہ سن کر وہ خوف زدہ لہجے میں چلّایا۔

''کچھ خاص نہیں۔'' ہنی یہ سن کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''بس تمہیں ذرا سا سبق سکھانا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ بند دکان میں تمہیں مزہ چکھانا چاہیے، البتہ تم چاہو تو سب کے سامنے بھی...''

''میرا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔'' گیلو کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

''غلط کہہ رہے ہو۔'' ہنی مسکرایا۔ 'میں آئیوان خاندان سے ہوں اور ہمارے خاندان کی وجۂ شہرت پولیس، شکار اور بہادری ہے اور یہ میری بہن کا شوہر ہے۔'' اس نے فریشٹی کی طرف سر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے دھمکاؤ گے تو...''

''دیکھو، اسے چھوڑ دو۔'' فریشٹی نے پہلی بار لب کھولے۔ اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ مارکو بھی حیرت سے یہ ماجرا دیکھ رہا تھا۔ گیلو کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ زندگی میں پہلی بار سیر کو سوا سیر ٹکرایا ہے۔ ''تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔'' اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں ہاں، یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' گیلو نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''تعلق تم سے نہیں مگر تمہارے بچے اور بیوی سے ہے۔'' ہنی نے غراتے ہوئے کہا۔ اسے غصے میں دیکھ کر فریشٹی بھی ڈر گیا۔

''یہ لو پورے پچیس...'' ہنی نے ایک ہاتھ سے بندوق پکڑی اور دوسرا ہاتھ جیب میں ڈال کر نوٹ نکالے۔ ''یہ لو پورے پچیس...'' یہ کہتے ہوئے اس نے نوٹ اُس کے منہ پر دے مارے۔

''مجھے نہیں چاہئیں۔'' اس نے گھگیائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''شاباش...'' ہنی یہ سن کر مسکرا دیا۔ ''اس دکان کو ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ۔'' اس نے بندوق نیچے کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' پہلی بار گیلو کی جان میں جان آئی۔ اس نے باہر نظر ڈالی کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔

''اب یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' ہنی نے گیلو کے قیمتی کوٹ کا کالر پکڑ کر اسے دروازے سے باہر دھکیلتے ہوئے کہا۔

گیلو پیچھے مڑ کر دیکھنے کے بجائے ناک کی سیدھ میں تیزی سے چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ فریشٹی جس قدر بزدل تھا، ہنی اس سے کہیں زیادہ بہادر اور لڑاکا تھا۔ ویسے وہ آئیوان فیملی کی شہرت جانتا تھا۔ اسے علم تھا کہ وہ ہنی سے کھلے بندوں دشمنی مول نہیں لے سکتا۔ ہنی قانون پسند شہری تھا ورنہ وہ چاہتا تو اسے چیونٹی کی طرح مسل کر پھینک سکتا تھا۔ یہ بات گیلو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

جب ہنی نے گیلو پر بندوق تانی تب اسے یقین تھا کہ گولی نہیں تو کم از کم تھپڑ اور لاتیں ضرور پڑیں گی مگر وہ خوش تھا کہ اس خطرناک صورتِ حال سے مکھن میں پڑے بال کی طرح باہر نکل آیا تھا۔ وہ اس لیے اور بھی زیادہ خوش تھا کہ اسے کسی اور نے اُس حالت میں نہیں دیکھا ورنہ اس کا رعب ماند پڑ جاتا۔ ویسے بھی گیلو دھونس دھمکی سے ہی مال بٹورتا تھا۔ اگر یہی نہ رہتا تو وہ بھوکوں مر جاتا۔ رہ رہ کر اسے مارکو کا خیال رہا تھا کہ کہیں وہ بازار میں اس واقعے کا تذکرہ نہ پھیلا دے۔ اس کے لیے ایک اور پریشانی تھی اور وہ یہ کہ کہیں ہنی کسی اور جگہ اس کے معاملے میں ٹانگ نہ اڑائے۔

ہنی نے گیلو کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، وہ اس کی زندگی کا بدترین واقعہ تھا۔ وہ رہ رہ کر تلملا رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ ہنی سے کس طرح اپنی اس بے عزتی کا بدلہ لے۔ گیلو نہایت مکار اور کینہ پرور شخص تھا۔ اُس کے دل میں آئرش لوگوں کے خلاف نفرت کا زہر تو پہلے سے ہی بھرا ہوا تھا، اب ہنی نے جو کچھ کیا تھا، اس کے باعث نفرت کا زہر انتقام کے لاوے میں بدل رہا تھا۔

جب سے ہنی پہلی بار اپنی بہن اور اس کے شوہر سے ملا، تب سے وہ فریشٹی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ نیرو گیٹ منتقل ہونے کے بعد مارکو، ہنی کو اس کے پل پل کی اطلاع دیتا تھا۔ ہنی کو اندازہ ہو چکا تھا کہ کیٹن کے باعث فریشٹی کو نسل پرست اطالویوں کی نفرت کا سامنا ہے۔ اسی لیے جب گیلو نے اسے بھتہ دینے کی دھمکی دی تو یہ بات بھی مارکو کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ذریعے ہی فوراً اس کے علم میں آ گئی۔ اگر چہ یہ واقعہ فی الوقت تو نمٹ گیا تھا لیکن ہنی اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اوباش اور جرائم پیشہ گروہ تھا۔ گیلو کو جب بھی موقع ملا وہ فریشٹی، اس کے بہن یا بچے کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ کئی روز کی سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ فریشٹی کو کہیں اور دکان کھولنی چاہیے۔ اس نے فریشٹی کو بھی اس بات پر راضی کر لیا اور کچھ ہی دنوں کے اندر اندر اس نے نیرو گیٹ کے علاقے میں ایسی جگہ ایک دکان منتخب کر لی جو فریشٹی کے لیے نہایت موزوں تھی۔

یہ کلیولینڈ اسٹریٹ پر واقع بازار تھا۔ یہ بازار ایک طرح سے نیچے رہنے والے اطالویوں اور بالائی حصے میں آباد آئرش باشندوں کے درمیان سرحد تھی۔ اسے یقین تھا کہ فریشٹی یہاں زیادہ مناسب انداز میں کام کر سکتا ہے۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں سے اطالوی بدمعاش کترا کر گزرا کرتے تھے۔ فریشٹی کی دکان کا پہلا گاہک خود ہنی تھا۔ یہ نومبر کے اوائلی دن تھے جب پہلی بار فریشٹی نے اپنی نئی دکان کھولی۔ اسے یقین تھا کہ اب اس کی جان بدمعاشوں سے چھوٹ گئی ہے۔

”تمہیں دکان بدلنے کی کیا ضرورت ہے؟“ دو روز پہلے جب فریشٹی نے کیٹین کو یہ بات بتائی تو اس نے پوچھا۔

”تاکہ زیادہ پیسے کما سکوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”مگر نئی دکان کے لیے پیسے کہاں سے آئے؟“ کیٹین نے حیرانی سے پوچھا۔

”بس آ گئے کہیں سے۔“ وہ بیوی کے سوال کا جواب نہایت صفائی سے گول کر گیا۔

فریشٹی خود دار انسان تھا۔ وہ اس دکان میں آنے پر تیار نہ تھا لیکن جب ہنی نے کہا کہ وہ یہ سب کچھ اپنی بہن اور اس کے بچے کے لیے کر رہا ہے، تو اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ ہنی نے اسے سختی سے تاکید کی تھی کہ کیٹین کو کچھ علم نہ ہونے پائے۔ اس لیے اس نے بیوی کو بھی اصل بات بتانے سے گریز کیا کہ وہ زیادہ پیسوں کے لیے بلکہ گیلو سے جان چھڑانے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے اور اس کے پیچھے خود اُس کا بھائی ہے۔

کلیولینڈ کی اس دکان میں اب فریشٹی کو اپنی آخری سانسوں تک کام کرنا تھا۔

☆☆☆

فریشٹی اور اس کے بیٹے کی تدفین میں بہت تھوڑے لوگوں نے شرکت کی تھی۔ ڈینی کی موت کی خبر دینے والا اس کا ہم عمر دوست میلزون اور اسکول کے دیگر بچے بھی جنازے میں شریک تھے۔ کئی بچوں کی مائیں بھی آئی ہوئی تھیں۔ کیٹین کے گھر والوں میں سے کوئی شریک نہیں ہوا تھا سوائے ہنی کے۔ اُس کے ساتھ اس کے کئی دوست بھی آئے تھے۔ میک آئیوان فیملی کو جاننے والے کچھ آئرش پولیس والے بھی تدفین میں موجود تھے۔ فریشٹی کے کئی مستقل گاہک بھی آئے تھے۔ قصبے کے اطالوی لوگوں میں زیادہ تر بوڑھے لوگ تھے۔ جن کے بارے میں خود ان کے ہم وطنوں کا خیال تھا کہ وہ اپنے خون کے مخالف ہو چکے ہیں۔ نسل پرستوں کی نفرت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ان کے کئی ہمسائے بھی جنازے میں اس لیے نہیں آئے تھے کہ مرنے والے ایک آئرش عورت کا شوہر اور بیٹا ہے۔

تدفین کے موقع پر کیٹین نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا ہوا تھا۔ شوہر اور بیٹے کی ناگہانی موت نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ اس کا چہرہ زرد اور آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا۔ روتے روتے آنکھیں سوج چکی تھیں۔

تدفین سے لوٹتے ہوئے ہنی نے اپنی بہن کا ہاتھ تھام کر اسے سہارا دے رکھا تھا۔ دکھ کی اس گھڑی میں کیٹین کے گرد کئی لوگ موجود تھے۔ ہنی واحد خونی رشتے دار تھا مگر اس کے باوجود وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ اب وہ اس بھری دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تنہا ہو گئی ہے۔ بیٹے اور شوہر کی المناک موت سے اس کے دل میں دکھوں کا جوالا مکھی پھوٹ رہا تھا۔ پچھلے دو روز میں وہ سب کچھ جان چکی تھی۔ کیٹین کو علم ہو گیا تھا کہ فریشٹی نے دکان کیوں بدلی تھی اور ڈینی کسی آئرش کے ٹرک کی ٹکر سے نہیں بلکہ قصبے کے ہی ایک نسل پرست اطالوی ڈرائیور کی ٹکر سے ہلاک ہوا تھا۔ پولیس کا کہنا تھا کہ حادثے کے وقت ڈرائیور نشے میں تھا۔

شکستہ دل کیٹین جب بیٹے اور شوہر کی تدفین سے لوٹی تو اس کی زندگی محبت سے خالی ہو چکی تھی۔ اُس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ وہ بلا کی خود دار عورت تھی۔ کئی سال پہلے جب اس کی شادی میں کوئی گھر والا شریک نہ ہوا تو اس نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بھی اُن کے در پر پاؤں نہیں رکھے گی۔ صرف ایک ہنی تھا جو اس کی ہر ممکن مدد کرنا چاہتا تھا۔ اُسے واپس اپنے محل نما خاندانی گھر میں لے جانا چاہتا تھا مگر وہ تیار نہ ہوئی۔ کیٹین نے بھائی سے کسی بھی قسم کی مدد لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ فریشٹی کی ایک بڑی بہن تھی لیکن بھائی کی موت کے بعد جب وہ پہلی بار اس سے ملی تو کیٹین سے اُس کا رویہ ہمدردانہ نہیں بلکہ تضحیک آمیز تھا۔ اُسی لمحے کیٹین نے فیصلہ کر لیا وہ اس سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھے گی۔

فریشٹی کے بڑے بھائی نے شروع شروع کے چند مہینے اُس کا ساتھ دیا مگر پھر اُس نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ کیٹین نے یہ مدد بھی اس لیے قبول کر لی تھی کہ وہ اپنے بھائی کا مقروض تھا۔ اس کی موت کے بعد کیٹین نے اس سے ادائیگی کا مطالبہ بھی کیا تھا۔

کیٹین کے گھر کا باغیچہ بہت بڑا تھا۔ اُس نے چند پیسے کما لینے کے لیے وہاں ٹماٹر اور کچھ دوسری سبزیاں اُگا لی تھیں۔ فریشٹی نے مرتے وقت کچھ رقم چھوڑی تھی۔ اُسے امید تھی کہ جب تک اس رقم کا سہارا ہے، تب تک اس کی سبزیاں بھی تیار ہو جائیں گی۔ ویسے بھی بیٹے اور شوہر کی موت کے بعد اب اس کا دل پوری دنیا سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ زندہ تھی مگر مردوں سے بدتر۔ وہ اکثر گہری سوچ میں ڈوبی رہتی تھی۔ شاید ہی کوئی ایسا لمحہ ہو جب اس کی یاد میں ڈینی کا ساتھ نہ ہو۔ شوہر سے زیادہ اکلوتے بیٹے کی موت نے اسے زندہ در گور کر دیا تھا۔

”میں کیوں زندہ ہوں؟“ وہ اکثر خود کلامی کرتی اور پھر گہری سوچ میں ڈوب جاتی۔ اکثر ہنی اس کی خیر خبر کے لیے گھر آتا جاتا تھا۔ اسے بھی بہن کی حالت کا سخت افسوس تھا۔ وہ ہر طرح سے اس کا ساتھ دینے کا خواہاں تھا مگر وہ کیٹین کی ضد سے مجبور تھا۔ کیٹین اور اس کی عمر میں صرف دو سال کا فرق تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کیٹین کتنی ضدی ہے۔ ایک بار جو ٹھان لے، اُسے کرنے سے روکنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

فریشٹی اور ڈینی کی موت کو یہ دوسرا مہینہ تھا۔ سردیاں ڈھل رہی تھیں مگر پھر بھی موسم کا انداز زیادہ نہیں بدلا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی وہ اپنے باغیچے سے لوٹی تھی۔ وہ کچن میں آئی اور چولہا جلا کر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ وہ کھانا پکانے آئی تھی لیکن اچانک اس نے ارادہ بدل دیا۔ وہ چولھے میں اٹھتی آگ کی لپٹوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ کچن کی کھڑکی سے آسمان نظر آ رہا تھا۔ اماوس کی رات تھی۔ ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ آسمان پر بھی ستاروں کی چمک کے بجائے تاریکی کا غلاف تھا۔

دوپہر کو اس سے ملنے ہنی آیا تھا۔ وہ بہن کے ساتھ کافی دیر تک رہا۔ وہ اس کی دلجوئی کی خاطر بچپن کی باتوں کو دہراتا رہا مگر ایک دو بار کے سوا کیٹین کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی نہیں آئی۔ سیاہ لباس میں ملبوس کیٹین کے چہرے کی تازگی ڈھل چکی تھی، آنکھوں کے گرد لباس کے ہم رنگ حلقے پڑ چکے تھے۔ وہ چند مہینوں میں ہی بہت کمزور اور بوڑھی نظر آنے لگی تھی۔

”میں آخری بار کب خوش ہوئی تھی؟“ کافی دیر بعد اس نے خود کلامی کی۔ یہ بڑبڑانے کے بعد وہ ایک بار پھر سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ بیٹے اور شوہر کی موت کے بعد اب وہ اکثر بے مقصد طور پر بڑبڑانے لگی تھی۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ چولھا سرد ہو چکا تھا۔ سردی سے جسم کپکپانے لگا تو وہ اٹھی۔ ”اب مجھے کچھ کرنا ہی ہوگا۔“ وہ لڑکھڑاتی آواز میں بڑبڑائی اور کمرے کی طرف چل دی۔ اس کی چال بھی بہت مضمحل تھی۔

وہ سو کر اٹھی تو دن چڑھ چکا تھا۔ وہ دل پر جبر کر کے اٹھی۔ ہلکا پھلکا ناشتا کیا اور بازار کی طرف چل دی۔ وہ مارکو کی طرف جا رہی تھی۔ مارکو کہنے کو تو اطالوی تھا مگر اس کی پیدائش آئرلینڈ کی ہی تھی۔ وہ ہنی کا بہت پرانا دوست تھا۔ دونوں اسکول میں ساتھ پڑھے تھے۔ کارلو کئی کاروبار کر چکا تھا۔ حال ہی میں اس نے بیکری کھولی تھی۔ اس نے دکان کی آرائش پر خاصی توجہ دی تھی۔

”مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے؟“ کیٹین نے آہستہ سے کہا۔

”ٹھیک ہے، تم پچھلے کمرے میں چل کر بیٹھو۔ گاہک کو نمٹا کر ابھی آتا ہوں۔“ اس نے جلدی سے کہا اور پیکٹ میں بسکٹ ڈالنے لگا۔

کمرا خاصا کشادہ تھا۔ درمیان میں لکڑی کی ایک بڑی میز رکھی ہوئی تھی۔ جس کے قریب تین چار کرسیاں بھی تھیں۔ کیٹین نے ایک کرسی گھسیٹی اور بیٹھ کر اُس کا انتظار کرنے لگی۔

”سوری کیٹین... ذرا سی دیر ہو گئی۔“ وہ ہڑبڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے گلے میں ایپرن جھول رہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ کام میں مصروف تھا۔ ”تم کچھ کہنا چاہتی تھیں؟“ اس نے کرسی کھینچی اور کیٹین کے مقابل بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ہاں“ اس نے آہستہ آواز میں کہا۔ ”بات یہ ہے کہ ڈینی اور فریشٹی کی موت...“

”پلیز پلیز...“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ”اُن دونوں کا ذکر مت کرنا۔“

”کیا ہوا؟“ دراصل کیٹین اس کے پاس بسکٹ خریدنے کے بہانے کام مانگنے آئی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ بیٹے اور شوہر کی موت کے بعد وہ خود کو مصروف رکھنے کے لیے کام کی تلاش میں ہے لیکن جس طرح مارکو نے گھبرا کر اُسے روکا، اس سے وہ پریشان ہو گئی۔

”بات کیا ہے، سچ سچ بتاؤ۔“ کیٹین نے استفساریہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سب کچھ سچ سچ بتادوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ چپ ہو کر خلا میں گھورنے لگا۔ اس کی پلکوں پر دو آنسو نمودار ہوگئے۔ کیٹین بھی اسے شدید حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اُس بے چاری کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ مارکو اسے دیکھ کر اس قدر کیوں گھبرا رہا ہے۔

''مجھے معاف کردو۔'' اچانک اس نے زاروقطار رونا شروع کردیا۔

''ہوا کیا ہے؟'' اسے روتا دیکھ کر وہ اور پریشان ہوگئی۔

''مجھے سب کچھ معلوم ہوگیا تھا مگر میں کچھ نہیں کرسکتا۔''

''کیا معلوم ہوگیا تھا؟'' یہ سن کر کیٹین چونک گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ ایسی کچھ غیر معمولی بات ہے جس کا تعلق اس کی ذات سے ہے۔

''ڈینی کو گیلو کے آدمی نے مارا ہے جان بوجھ کر، وہ کوئی حادثہ نہیں تھا۔ سب سوچی سمجھی سازش تھی۔'' مارکو نے گلوگیر آواز میں بتانا شروع کیا۔ ''وہ تم لوگوں سے نفرت کرتا تھا۔ وہ ہنی سے نفرت کرتا تھا۔ اس کا ہنی پر تو بس نہیں چل سکا مگر وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ڈینی کی موت سے تمہیں، فریشٹی اور ہنی کو جو تکلیف پہنچے گی، اس سے بڑا انتقام کوئی نہیں ہوسکتا۔''

''اوہ میرے خدا۔'' وہ میز پر سر رکھ کر رونے لگی۔

کافی دیر تک وہاں خاموشی طاری رہی۔ آخر کیٹین اٹھنے لگی تو مارکو بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''دیکھو، یہ بات کسی سے نہ کہنا کہ یہ سب کچھ میں نے تم سے کہا ہے۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کیٹین سے کہا۔ ''اگر گیلو کو اس بات کی بھنک مل گئی تو نہ میں بچوں گا اور نہ ہی میری دکان۔ بہتر ہے کہ ہنی سے بھی نہ کہنا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا چہرہ اس کے قریب کیا۔ ''وہ پولیس اکیڈمی جوائن کرنے والا ہے۔ اگر اس نے غصے میں کچھ کردیا تو...'' یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگا اور پھر بولا۔ ''اب دیکھ لو نا پولیس نے ڈینی کی موت کو حادثہ قرار دے دیا ہے۔ فریشٹی دل کے دورے سے مرا۔ اب پولیس گیلو کے خلاف اس کیس میں کیا کر پائے گی۔''

''اچھی طرح جانتی ہوں۔ ویسے بھی مجھے اپنے کام خود کرنا آتے ہیں۔'' وہ سیدھی تن کر کھڑی ہوگئی۔ ''میں آئیوان فیملی کی بیٹی ہوں۔ ابھی اتنی کمزور نہیں پڑی ہوں کہ میرے بازو سہارے تلاش کرتے پھریں۔'' اس کے چہرے پر ارادے کی پختگی نظر آرہی تھی۔ بڑی بڑی اُداس سیاہ آنکھیں پھیل چکی تھیں۔ آج ان آنکھوں میں شوہر اور بیٹے کی بے وقت موت کا دکھ دور دور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ''یہ بات صرف میرے اور تمہارے درمیان رہے گی۔'' اس نے باہر جاتے جاتے مڑ کر مارکو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بہت اچھا۔'' اس نے آستین سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆

مارکو کے انکشاف کو کئی دن گزر چکے تھے۔ اس دوران میں کیٹین نے پتا چلالیا کہ اطالوی آبادی میں دریا کے کنارے والے بازار کے کھلے حصے میں گیلو کا نائٹ کلب واقع ہے۔ جس کا نام ڈیبونائر ہے۔ وہ کئی روز تک سہ پہر سے لے کر شام ڈھلے تک یہ پتا چلانے میں مصروف رہی کہ وہ کس وقت کلب آتا ہے اور کب تک یہاں رہتا ہے۔ اس نے یہ بھی معلوم کرلیا تھا کہ اس کے پاس کالے رنگ کی گاڑی ہے جو پارکنگ میں ایک مخصوص مقام پر کھڑی رہتی ہے۔ اس نے اپنی شناخت کو پوشیدہ رکھنے کے لیے پھول بیچنے والی عورت کا روپ دھارا ہوا تھا۔ ہر شام اس کے ہاتھ میں زرد پھول ہوتے تھے اور وہ ڈیبونائر نائٹ کلب کے سامنے انہیں فروخت کرتی تھی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر اس نے گیلو کے معمولات کا اندازہ لگا کر اپنے انتقام کا منصوبہ تیار کرلیا تھا۔

وہ موسمِ بہار تھا۔ منگل کی شام ڈھل رہی تھی۔ رات جوبن پر تھی، جب کیٹین ہاتھوں میں زرد پھولوں کے تین بڑے بڑے گلدستے تھامے قبرستان کی طرف جارہی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی شال اوڑھ رکھی تھی۔ اس کی چال میں استقامت اور چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے ڈینی کی قبر پر پہنچی۔ سرہانے گلدستہ رکھا اور پھر صلیب کو بوسہ دیا۔ اس کے بعد دوسرا گلدستہ اس نے فریشٹی کی قبر پر رکھا اور آنکھیں بند کرکے دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ کافی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور کھڑی ہوگئی۔

''ملتی ہوں بہت جلد۔'' یہ کہہ کر وہ ہلکے سے مسکرائی۔

''بائے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ واپسی کے لیے چل دی اور چند قدم آگے بڑھ کر مڑی اور اس طرح ہاتھ ہلایا جیسے بچے کو گھر پر چھوڑ کر جانے والی ماں اسے دلاسا دینے کے لیے اشارہ کرتی ہے کہ خبردار! ڈرنا مت۔ بس! میں ابھی گئی اور ابھی آئی۔ وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔

کیٹین قبرستان سے باہر نکلی اور ڈیبونائر نائٹ کلب کی طرف چل دی۔ یہاں سے وہ جگہ دس منٹ کی پیدل مسافت

پر تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے زرد پھولوں کا ایک بڑا گلدستہ تھام کر سینے سے لگا رکھا تھا۔ وہ کلب سے کچھ فاصلے پر تھی جب وینس پینسل ٹاور سے گیارہ گھنٹے بجے۔ منگل کا روز ختم ہونے میں صرف ایک گھنٹا باقی رہ گیا تھا۔

کیٹین تصدیق کے لیے کار پارکنگ میں پہنچی، وہاں گیلو کی سیاہ گاڑی سب سے الگ تھلگ کھڑی تھی۔ وہ مسکرائی۔

''کمینہ اندر ہے۔'' وہ زیرِ لب بڑبڑاتی ہوئی کلب کے اندر داخل ہوئی۔ سرخ مدھم روشنی کے باعث اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ کونے میں کھڑی ہوگئی۔ کچھ دیر بعد جب اس کی نگاہیں مدھم روشنی میں اچھی طرح دیکھنے کے قابل ہوئیں تو وہ آگے بڑھی۔

ہال میں ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ ہر طرف گلاس کھنکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سگار اور سگریٹ کے دھوئیں کے باعث اس کا سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ چہار سو بے فکرے مرد و زن کے قہقہے گونج رہے تھے۔ وہ چاروں طرف نظریں دوڑاتی، اُن کے بیچ سے بچتی بچاتی احتیاط سے آگے بڑھتی رہی مگر وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا۔

''ہے سنو...'' کیٹین نے ایک بارٹینڈر سے پوچھا۔ ''گیلو کہاں ہے، اس نے یہ پھول منگوائے تھے۔''

''باہر نکل کر کلب کے عقبی حصے میں جاؤ، وہ فون بوتھ پر ہے۔''

''او کے۔'' یہ سنتے ہی کیٹین تیزی سے باہر نکلی۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں وہ فون بوتھ تک پہنچ گئی۔ گیلو کی پشت کیٹین کی طرف تھی۔ اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی، دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ ویسے بھی بوتھ کے اردگرد مکمل سناٹا اور خاصا اندھیرا تھا۔ کیٹین نے جھک کر زمین پر گلدستہ رکھا اور گلدستے کے نیچے سے کھینچ کر اُسترا نکالا۔ وہ اسے گلدستے کے اندر چھپا کر لائی تھی تاکہ عمل درآمد سے پہلے اگر کوئی اسے پکڑ بھی لے، تب بھی وہ تیز دھار آلہ نہ پکڑ پائے۔ اب اس کے ہاتھ میں فریشٹی کا تیز دھار استرا موجود تھا۔ اس نے کئی روز کی محنت کے بعد اسے مزید تیز دھار بنادیا تھا۔ اس نے استرے کی دھار پر شہادت کی اُنگلی پھیر کر ایک بار پھر اس کے تیز دھار ہونے کی تسلی کی۔

گیلو کسی سے چیخ چیخ کر فون پر بات کررہا تھا۔ وہ دبے دبے قدموں سے اس کی طرف بڑھی اور عین اس کے پیچھے جا کر کھڑی ہوگئی۔ وہ باتوں میں اتنا منہمک تھا کہ اسے اُس کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوسکا۔ کیٹین دل ہی دل میں خود کو اگلے لمحے کے لیے تیار کرچکی تھی۔ استرے کے دستے پر

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

مارچ 2012ء بہار کے خوشنما رنگ لیے

عمیرہ احمد...... عکس
عکس در عکس پھیلے سلسلۂ زندگی کے
پوشیدہ پہلوؤں کی کھوج و جستجو کا سفر

شیریں حیدر
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
اپنے مخصوص کرداروں کے ساتھ
مسلسل ناول کے پُرتحیر نشیب و فراز

ناہید سلطانہ اختر...... زندگی
زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتوں سے روشناس کراتا آپ
کی پسندیدہ مصنفہ کے قلم سے لکھا نیا سلسلے وار ناول

راحت وفا...... ایک تھی نیناں
انسانی ذہن کی نفسیاتی الجھنوں کیفیات اور
احساسات کے گرد گھومتا سلسلے وار ناول

انجم انصار اور سکینہ فرخ
کے دلکش و خوب صورت ناولٹ

سعدیہ رئیس، سیما یاسمین مجتبیٰ،
زاہدہ پروین، نظارت نصر، کرن احمد،
عظمیٰ سید افتخار، تابندہ جبین،
نزہت جبین ضیا، عائشہ خان اور
بشریٰ گوندل کی دلچسپ و پُراثر تحریریں

آپ کی آرا و نگارشات سے سجے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی گرفت سخت ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر غصے کے باعث سخت تناؤ نظر آ رہا تھا۔ گیلو کو اتنے قریب اور فیصلے پر عمل کی گھڑی سامنے دیکھ کر اس کے کمزور جسم میں نہ جانے کہاں سے کئی مردوں کے برابر طاقت آ گئی۔ وہ سانس روکے، تن کر کھڑی تھی۔ گیلو نے جیسے ہی ریسیور کو کریڈل پر کر کے پلٹا، کیٹن نے استرے سے اس کی گردن پر بھرپور وار کیا۔ وہ اپنے نشانے کا تعین کئی لمحے پہلے کر چکی تھی۔ وار عین نشانے پر لگا تھا۔ یہ پہلا وار تھا مگر آخری نہیں۔ کیٹن نے یہ بات اچھی طرح جانتی تھی۔

''اوہ...'' پہلے وار پر ہی گیلو تکلیف سے پورا حلق پھاڑ کر چلاّیا مگر بے سود۔ کیٹن نے اسے مہلت ہی نہ دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے گیلو کی گردن پر مزید تین چار وار کیے۔ گیلو کی سفید شرٹ خون سے سرخ ہونے لگی۔ اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر تکلیف کی شدت کے باعث وہیں بیٹھ گیا۔ وہ منہ کے بل زمین پر گر رہا تھا۔ خون ابل ابل کر کے اس کی گردن سے بہہ رہا تھا۔ کیٹن کے ایک وار نے اس کی شہ رگ کاٹ دی تھی۔ دوسرا وار نرخرے پر پڑا تھا۔ دونوں وار خاصے کاری اور زخم بہت گہرے تھے۔ یہ وہی اُسترا تھا، جسے کبھی گیلو نے شیو بنواتے ہوئے کٹ لگ جانے پر فریشٹی کے ہاتھ سے چھین کر اُلٹا اس پر وار کر کے زخمی کر دیا تھا۔ آج وہی اُسترا تھا مگر ہاتھ کیٹن کا تھا۔ وہ کیٹن جس کے معصوم بچے کو گیلو نے اپنی سازش کے ذریعے قبر کی گود میں سلا دیا تھا۔ کیٹن کے وار میں ماں کی محبت کی شدت بھی شامل تھی، تبھی تو وہ جو ایک بار زمین پر بیٹھا تو پھر نہ اٹھنے پایا۔

''مرتے ہوئے تکلیف ہو رہی ہے نا۔'' وہ زمین پر گر چکا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن پکڑ رکھی تھی۔ کیٹن آگے بڑھی اور اس کے قریب دوزانو بیٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''دفع ہو جاؤ۔'' گیلو بڑی مشکل سے چلاّیا۔ اس کی آواز میں بہت خرخراہٹ تھی۔

کیٹن خاموشی سے آگے بڑھی۔

اسی دوران میں گیلو چلاّیا۔ اس کی چیخ قریب سے گزرنے والے کلب کے ایک ملازم نے بھی سن لی۔ وہ اس کی طرف دوڑا لیکن اس سے پہلے کہ وہ گیلو سے کچھ پوچھتا یا کیٹن کی طرف بڑھتا، وہ دوزانو ہو کر زمین پر بیٹھ گئی۔ اس نے گہری نظر آسمان پر ڈالی۔ سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور گردن کو جتنا پیچھے جھکا سکتی تھی، جھکا لی اور پھر اس نے وہی استرا اپنی تنی ہوئی گردن پر پوری قوت سے پھیر لیا۔ خون فوارہ کی طرح بہہ نکلا۔ اس نے اپنی بھی شہ رگ کاٹ لی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد ڈیبوناڑ کلب کے باہر ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ زمین پر دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ پولیس پہنچ چکی تھی۔ ایمبولینس بلوالی گئی تھیں اور اب لاشوں کو اسپتال منتقل کیا جا رہا تھا۔

واقعے کی اطلاع ملتے ہی مارکو اور ہنی بھی موقع پر پہنچ گئے۔ ان دونوں کے سامنے ہی لاشیں ایمبولینس میں رکھی گئی تھیں۔

''شکریہ مارکو...'' ہنی نے پارکنگ کے قریب آ کر اس سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ افسردہ سے انداز میں مسکرایا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ تم نے جو کچھ کیا، وہ بالکل ٹھیک تھا۔ گیلو اسی قابل تھا۔''

''وہ ڈینی اور فریشٹی کا ہی نہیں مائیکل آئیوان کا بھی قاتل تھا۔ وہ سامنے، اُس جگہ پر ہی اس نے گلے میں پھندا ڈال کر، اسی طرح رات کی تاریکی میں اسے قتل کیا تھا۔'' ہنی نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''پر کیا کرتے پولیس کے پاس ثبوت جو نہ تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ مائیکل آئیوان کا خاندان ابھی کمزور نہیں ہوا۔''

''مگر ہنی...'' مارکو نے کچھ کہنا چاہا۔

''میں اس کو تکلیف بھری زندگی بسر کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔'' ہنی نے قطع کلامی کی۔ ''میں اسے کبھی بھلا نہ پاؤں گا مگر کیا کرتا...'' ہنی کی آواز بھرّا رہی تھی۔ ''گیلو کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اگر تم ساری حقیقت اسے نہ بتاتے تو شاید وہ کبھی یہ قدم نہ اٹھاتی۔ اچھا کیا جو تم نے ساری حقیقت اسے بتا دی۔''

''کیوں نہ بتاتا، تم نے جو کہا تھا۔'' مارکو نے افسردگی سے جواب دیا۔

''مجبوری تھی میرے دوست...'' ہنی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس زندگی سے اس کا مر جانا اچھا تھا۔ خوشی ہے کہ اس نے صرف بیٹے اور شوہر کے قاتل سے ہی نہیں اپنے دادا کے قاتل سے بھی بدلہ لے لیا۔''

''چلو...'' مارکو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''ہمیں اسپتال پہنچ کر کیٹن کی لاش بھی وصول کرنی ہے۔''

''چلو...'' ہنی نے گلوگیر لہجے میں کہا اور دونوں سامنے کی طرف چل دیے۔

فون کال

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مجرموں کے لیے کسی واردات میں کامیابی ان کا خوش قسمت دن گردانا جاتا ہے... ان دونوں نے بھی اپنی کارروائی کے لیے صحیح وقت اور دن چنا تھا... مگر بدقسمتی سے وہ ان کا خوش قسمت دن نہ تھا...

ایک ہی نشست میں کامیابی اور ناکامی کا سامنا کرنے والے کا مختصر احوال

رات کی تاریکی میں اس مکان کے ٹیرس کے نیچے عقبی دیوار کے ساتھ وہ بلی کی طرح دبے قدموں آگے بڑھ رہا تھا۔

چوری کی نیت سے پرائے مکان میں داخل ہونے کا اعصابی تناؤ تو اپنی جگہ تھا ہی لیکن راشد اس کے علاوہ بھی ایک عجیب طرح کی بے چینی محسوس کر رہا تھا... فی الحال جس کی وجہ جاننے سے وہ قاصر تھا۔ ریاض عرف راجا سے اس کی ملاقات ٹیرس پر طے تھی اور راشد مقررہ وقت سے ذرا سا لیٹ ہو چکا تھا۔ وہ ڈر بھی رہا تھا کہ اس تاخیر کی وجہ سے وہ برہم نہ ہو، وہ خاصا آتش مزاج، غصیلا اور ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ ویسے بھی راجا ہمیشہ تنہا ہی واردات کرتا آیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے راشد کو نصف حصے کی بنیاد پر اپنے ساتھ شریک کیا تھا۔ راشد کو بلاشبہ اس کی پیشکش پر بہت حیرت بھی ہوئی تھی مگر پھر اس نے یہی سوچا کہ شاید راجا کو کوئی مجبوری آن پڑی ہو کیونکہ تجوریاں کھولنے کے معاملے میں راشد زیادہ تجربے کار تھا۔

مسز شائستہ عثمانی... کے بارے میں تمام ''معلومات'' راشد نے ہی جمع کی تھیں۔ وہ اس مکان میں تنہا رہتی تھیں اور گھر میں بہت سے زیورات اور نقدی رکھتی تھیں، راجا کو یہ معلومات ایک لڑکی سے حاصل ہوئی تھیں جو اس گھر میں خادمہ کے طور پر کام کر چکی تھی۔

راشد اب ٹیرس پر جا پہنچا تھا۔ اندھیرے میں ایک بغلی دروازے کے قریب سے گزرتے وقت اس کا پاؤں ایک گملے سے ٹکرا گیا اور گملا الٹ گیا۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسا اور وہیں ساکت ہو گیا۔ مگر اس ہلکے شور کا کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا۔ چند لمحے دم بخود رہنے کے بعد راشد ایک بار پھر چوکنے انداز میں آگے بڑھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

راشد اور راجا نے جائے واردات پر الگ الگ آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن اب ٹیرس پر راجا نظر نہیں آرہا تھا۔ راشد کے لیے یہ حیرت کا مقام تھا، اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ راجا ابھی تک نہیں پہنچا جبکہ وہ خود چند منٹ لیٹ ہو چکا تھا۔

وہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے... اچانک ہی اس کی نظر مذکورہ دروازے پر پڑی۔ دروازہ ذرا سا کھلا تھا اور اس کے عقب میں پردہ بھی خاصا ہٹا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ راشد دانت پیس کر رہ گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ راجا نے اکیلے ہی مال پر ہاتھ صاف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

آہستگی سے راشد نے دروازہ کھولا اور تاریک کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے سن گن لینے کی کوشش کی لیکن کسی طرف سے کوئی خفیف سی آواز بھی سنائی نہیں دی۔ تب وہ آہستہ آہستہ کمرے کے دوسرے دروازے کی طرف بڑھا۔ دفعتاً راستے میں وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں سے زیادہ چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا تھا۔

راشد نے اپنی پنسل ٹارچ روشن کی اور دیکھا کہ قالین پر سفید بالوں والی ایک معمر عورت ساکت پڑی تھی۔ اس کی کھلی آنکھیں بے نور تھیں مگر راشد کو یہی محسوس ہوا جیسے وہ اس کی طرف دیکھ رہی ہو۔ جانے کیوں راشد کے رگ و پے میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے الٹے قدموں کمرے سے بھاگ جانا چاہا مگر چند لمحے کے لیے وہ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا اور یہی اس کے حق میں بُرا ہوا۔

اس نے ہلکا سا کھٹکا سنا اور دوسرے ہی لمحے کمرا تیز روشنی سے جگمگا اٹھا۔ راشد دم بخود سا رہ گیا۔ اس کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون تک جیسے خشک ہو گیا تھا۔ آہستگی سے گھوم کر اس نے دیکھا۔ دروازے کے قریب گھنے سیاہ بالوں والا ایک نوجوان کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

"اگر تم نے اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت کی تو میں گولی چلا دوں گا۔" نوجوان نے کہا پھر اس نے قدرے قریب آکر راشد کی طرف سے ہوشیار رہتے ہوئے ایک نظر لاش کو دیکھا اور متوحش لہجے میں بولا۔

"اُف خدایا! تم نے میری آنٹی کو قتل کر دیا؟"

راشد کو اپنا چہرہ پتھرایا ہوا سا محسوس ہونے لگا لیکن کسی نہ کسی طرح وہ اپنے ہونٹوں کو حرکت دینے میں کامیاب ہو گیا۔

"دیکھو نوجوان! میں نے بڑی بی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا... میں تو کمرے میں داخل ہی ہوا تھا کہ یہ مجھے نیچے پڑی ہوئی نظر آئیں... میں قسم کھانے کو تیار ہوں..."

"اپنی جھوٹی قسمیں پولیس کے لیے بچا کر رکھو۔" نوجوان برہمی سے بولا اور محتاط انداز میں الٹے قدموں چلتا ہوا فون تک پہنچا۔ راشد پر نظر رکھتے ہوئے اس نے تین مخصوص ہندسوں والا نمبر ڈائل کیا۔ راشد کا دل سینے میں بُری طرح پھڑک رہا تھا اور دھڑکنیں جیسے سائیں... سائیں کرتی کنپٹیوں پر سنائی دے رہی تھیں۔

پولیس سے بات کرنے کے بعد نوجوان بدستور پستول کا رخ اس کی طرف رکھتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور قدرے پُرسکون لہجے میں بولا۔

"پولیس کے آنے تک یونہی اپنی جگہ کھڑے رہنا اور کوئی حرکت کرنے کا خیال بھی دل میں مت لانا سمجھے...؟"

پولیس، راشد کے اندازے سے بھی جلد پہنچ گئی۔

☆☆☆

انسپکٹر بشیر قریشی اپنے اسسٹنٹ باقر زیدی کے ہمراہ وہاں پہنچا تھا اور ایک پولیس سرجن ڈاکٹر بہرام بھی وہاں موجود تھا۔

انسپکٹر قریشی کا کام کرنے کا اپنا ایک انداز تھا، وہ سہل پسند پولیس آفیسرز کی طرح تھانے میں بیٹھ کر کام نمٹانے کا عادی نہ تھا۔ جائے وقوعہ پر ہی نصف سے زیادہ کام نمٹانے کا قائل تھا۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اس کے خیال کے مطابق "آن دی اسپاٹ" تفتیش کرنے سے اسّی فیصد کیس وہیں حل ہو جایا کرتے تھے، سونے پر سہاگا اگر پولیس سرجن کو بھی وقوعہ کی جگہ پر زحمت دے دی جائے تو یہ کیس فوراً حل ہو جایا کرتا تھا، بہرحال اس نے اے ایس آئی باقر زیدی اور سرجن کو اپنا کام کرنے کا حکم دے دیا۔ انسپکٹر نے تیز نظروں سے راشد کا جائزہ لیا پھر گھنے سیاہ بالوں والے پستول بہ دست نوجوان کی طرف دیکھ کر گہری متانت سے بولا۔

"پہلے یہ پستول مجھے دے دو... کیا تم ہمیشہ پستول اپنے پاس رکھتے ہو؟"

"نہیں، یہ میری آنٹی کا ہے... وہ اس وقت سے پستول گھر میں رکھنے کی عادی تھیں جب وہ آنجہانی انکل کے ساتھ ایک دور دراز کے چھوٹے شہر میں رہتی تھیں۔ یہاں بھی وہ چونکہ تنہا ہی رہتی تھیں اس لیے یہ پستول گھر ہی میں موجود رہا۔ میں یہاں ویک اینڈ گزارنے کے لیے آیا ہوں، بدقسمتی سے جب اس شخص نے ان پر حملہ کیا تو پستول ان کی دسترس میں نہیں تھا۔"

"یہ جھوٹ ہے، میں نے بڑی بی کو قتل نہیں کیا۔" راشد چلّایا لیکن انسپکٹر کے قریب کھڑے ایک کانسٹیبل نے اسے چیخنے سے روک دیا۔ انسپکٹر نے راشد کو کڑوی گولی نگلنے کے

انداز میں دیکھا پھر پولیس سرجن ڈاکٹر بہرام سے پوچھا۔

"جناب! آپ کیا کہتے ہیں؟"

"خاتون کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے۔" ڈاکٹر بہرام نے سرسری لہجے میں بتایا۔

انسپکٹر قہر آلود نظروں سے راشد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اپنا اصل نام بتاؤ، ویسے تم مجھے کچھ جانے پہچانے لگتے ہو۔"

"ہاں... ہو سکتا ہے، میں چھوٹی موٹی چوری کی وارداتیں ضرور کرتا ہوں انسپکٹر صاحب! مگر یقین کیجیے... اس طرح کی خوں ریزی یا تشدد خیز کارروائی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔" راشد نے جواباً کہا۔

"ہر کام کا کوئی نہ کوئی یوم آغاز تو ہوتا ہے نا... !" انسپکٹر نے طنزیہ کاٹ سے کہا۔ "تم نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا...؟"

"راشد نام ہے میرا..."

"اصل نام ہے یہ تمہارا؟" انسپکٹر کے لہجے میں تہدید تھی۔ راشد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟" انسپکٹر نے دانستہ اسے تھانے لے جانے سے قبل گویا سچ بولنے کا ایک موقع دیا۔

راشد کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ کیا بڑی بی کو راجا نے قتل کیا تھا؟ یہ بعید از امکان نہیں تھا کیونکہ راجا اس سے پہلے دو ایک وارداتوں میں تشدد سے کام لے چکا تھا۔ اگر یہ اس کا کام تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اس نے راشد کو ڈبل کراس کیا تھا اور اسے قتل کے الزام میں پھنسا دیا تھا... ظاہر ہے، اس صورت میں اپنی گردن بچانے کے لیے سب کچھ سچ سچ بیان کر دینے ہی میں اس کی عافیت تھی... اور راشد نے ایسا ہی کیا۔ اس نے سب کچھ اگل دیا۔

انسپکٹر مجرم سے زیادہ اس کی نفسیات سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس رو سے وہ ایک بات پر تو صاد رکھتا ہی تھا کہ جب ایسی الجھی ہوئی واردات ہو جائے کہ وقوعہ پر مجرم قتل سے انکار کر رہا ہو تو اگر وہ سچا ہے تو اس کی صفائی میں سچ ضرور محسوس ہوتا ہے، لہٰذا راشد کے سچ اگلنے پر اس نے غور کیا۔ تاہم اس نے کوئی تبصرہ کیے بغیر مڑ کر گھنے سیاہ بالوں والے نوجوان سے نام پوچھا جس نے اپنا نام مسعود خان بتایا۔

"ہاں، مسعود خان! یہ بتاؤ تم... کہ آخری بار اپنی آنٹی کو کب زندہ دیکھا تھا؟"

"تقریباً دس بجے۔" مسعود نے جواب دیا۔ "ہم شطرنج کھیل رہے تھے، دس بجے آنٹی نے کہا کہ وہ اسٹڈی میں جا کر تھوڑا سا لکھنے کا کام کرنا چاہتی ہیں، چنانچہ وہ اسٹڈی میں چلی گئیں اور میں اوپر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میں چونکہ علی الصباح ٹرین سے واپس جانے والا تھا اس لیے میں نے اپنا بیگ تیار کیا اور لیٹ کر ایک ڈائجسٹ پڑھنے لگا۔ یہ آنٹی نے ہی مجھے سفر میں پڑھنے کو دیا تھا، وہ اس میں سچی کہانیاں لکھتی ہیں۔ بہرطور... ڈائجسٹ پڑھنے کے دوران میں ہی میں نے باغیچے میں کچھ کھٹکا سا سنا۔ مجھے یقین تھا کہ آنٹی تو باغیچے میں نہیں نکلی ہوں گی، اس لیے کہ وہ دمے کی مریضہ تھیں، رات کو ٹھنڈ میں باہر نہیں جاتی تھیں۔ میں نے سوچا کوئی چور ڈاکو نہ ہو۔ اس علاقے پر چوروں اور ڈاکوؤں کی کچھ زیادہ ہی نظر رہتی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ آنٹی پستول کہاں رکھتی ہیں۔ میں نے پستول نکالا اور اس کمرے میں آیا تو آنٹی کو مردہ پایا۔ یہ شخص ان کے قریب کھڑا تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے راشد کی طرف اشارہ کیا۔

انسپکٹر نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اسی دوران میں اے ایس آئی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے انسپکٹر کے کان میں کچھ کہا اور دوسرے ہی لمحے انسپکٹر نے اپنی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں کو سکیڑ کر حیرت سے سیٹی بجائی پھر وہ اٹھ کر اے ایس آئی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ اس نے ڈاکٹر بہرام کو بھی اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

اے ایس آئی ان دونوں کو باغیچے میں ایک باڑھ کے قریب لے آیا اور اپنی ٹارچ روشن کی۔ باڑھ کی اوٹ میں ایک اور لاش اوندھی پڑی تھی۔ انسپکٹر نے لاش کو سیدھا کیا اور حیرت سے ایک بار پھر سیٹی کی سی آواز نکالنے پر مجبور ہو گیا۔

"اوہ... یہ تو راجا ہے، وہی بدنام ڈکیت جس کی ہمیں تلاش تھی مگر اسے کس نے مارا؟ اس نے تو راشد کے بہ قول اس کے ساتھ مل کر واردات کرنی تھی۔" اس نے کہا پھر وہ ڈاکٹر کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

"تمہارے خیال میں اس کی موت کس طرح واقع ہوئی ہے؟"

ڈاکٹر نے جھک کر لاش کا معائنہ کیا پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

"اسے بھی گلا گھونٹ کر ہی مارا گیا ہے۔ اس کی گردن کو غالباً عقب سے بازو کے شکنجے میں جکڑا گیا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے باقر...؟ کہیں راشد سچ تو نہیں بول رہا؟" انسپکٹر نے اپنے اسسٹنٹ سے رائے طلب کی۔

"ممکن ہے سر!" وہ ترنت بولا۔ "راشد اور راجا میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چوری کے مال کے حصے بخرے کرنے کے معاملے میں کوئی اختلاف پیدا ہو گیا ہو گا۔'' انسپکٹر نے پُرسوچ انداز میں اپنے سر کو ہولے سے جنبش دی اور کمرے میں واپس آکر راشد کو راجا کی لاش کے بارے میں بتایا تو وہ چکرا گیا۔

پھر وہ بڑبڑانے لگا۔ ''قسم سے مجھے کچھ نہیں معلوم... میں سچ کہہ رہا ہوں... مم... مجھے نہیں معلوم تھا کہ راجا مر چکا ہے۔''

سب کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر قدرت کو گویا اس پر رحم آیا اور فون کی گھنٹی بج اٹھی جس کی وجہ سے وہ کچھ دیر کے لیے سب کی چبھتی ہوئی نگاہوں کا سامنا کرنے سے بچ گیا۔

باقر فون کی طرف بڑھا مگر انسپکٹر نے اسے روک دیا اور خود آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔ اس کی گفتگو سے کسی کے لیے کوئی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''نہیں... میں معذرت خواہ ہوں کہ اس سے بات نہیں کرا سکتا... ایک حادثہ... ہو گیا ہے... ان کا انتقال ہو چکا ہے... مجھے افسوس ہے... کیا؟... اوہ... اچھا... واقعی...؟ میں انسپکٹر ہوں... جی ہاں... بہت اہم ہے... فون کرنے کا شکریہ... اوکے... شب بخیر۔''

ریسیور رکھ کر وہ مسز شائستہ عثمانی کی رائٹنگ ٹیبل کے قریب گیا۔ اس نے پوری میز کا جائزہ لیا۔ پھر درازیں کھول کر انہیں کھنگالا۔ اس نے...... پورے کمرے ہی کو کھنگال ڈالا۔ بالآخر وہ گویا مایوس ہو کر مسعود خان کے سامنے آرکا اور ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''مسعود! کیا میں وہ دستاویز دیکھ سکتا ہوں جو تم نے اپنی آنٹی کی میز سے اٹھائی ہے؟''

ایک لمحے کے لیے مسعود کا چہرہ بھی قریب کھڑے راشد ہی کی طرح زرد پڑ گیا۔ پھر اچانک اس نے میز پر رکھا ہوا پستول اٹھانے کے لیے چھلانگ لگائی لیکن باقر اور کانسٹیبل اس سے زیادہ پھرتیلے ثابت ہوئے۔ انہوں نے اسے میز تک پہنچنے سے پہلے ہی دبوچ لیا اور اس کے بازو پکڑ کر اس کی پشت کی طرف موڑ دیے۔ وہ ان کی گرفت میں بے بس ہو گیا۔

انسپکٹر نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی... پھر اس کے کوٹ کی اندرونی جیب سے اس کا مطلوبہ تہ شدہ کاغذ مل گیا۔

کاغذ کا معائنہ کرنے کے بعد وہ مطمئن ہو کر بہ آوازِ بلند گویا ہوا۔

''... یہ فون کال... امدادِ غیبی ثابت ہوئی۔ اس نے سارا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ مسز شائستہ عثمانی واقعی دس بجے اپنی اسٹڈی میں آئی تھیں لیکن مسعود خان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہاں آنے کے.... کچھ دیر بعد انہیں ایک وکیل کا فون آیا تھا۔ وکیل کو معلوم تھا کہ آج کل مسز شائستہ عثمانی... کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور فون کرتے وقت اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس وقت وہ اسٹڈی میں بیٹھی لکھ رہی ہوں گی۔ مسز شائستہ عثمانی نے اسے بتایا کہ وہ اپنی وصیت میں کچھ تبدیلیاں کر رہی ہیں اور وہ صبح آکر ایک نظر وصیت نامے کو دیکھ لے۔ پہلے ان کی وصیت کی رو سے ان کا بھتیجا ہی ان کا وارث تھا لیکن آج رات فون پر بات کرتے ہوئے انہوں نے وکیل کو بتایا کہ ان کی معلومات کے مطابق ان کا بھتیجا چوروں، بدمعاشوں اور عیش پرستوں کے گروہ میں شامل ہو گیا ہے اس لیے وہ اس کے نام ورثے میں کچھ نہیں چھوڑ رہیں۔ دورانِ گفتگو انہوں نے اچانک ہی وکیل سے کہا کہ شاید ان کا بھتیجا آ رہا ہے... اور یہ کہہ کر انہوں نے یک دم ہی فون بند کر دیا۔

''اسی وقت وکیل کو اپنی بیوی کو ایک پارٹی سے واپس لانے کے لیے جانا پڑ گیا۔ وہ پارٹی سے واپس آیا تو اس نے مسز شائستہ عثمانی کو یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ کل وہ نہیں آسکے گا، یہی وہ ٹیلی فون کال تھی جو میں نے ریسیو کی اور وکیل کی زبانی مجھے اہم حقیقت معلوم ہوئی۔ تبدیل شدہ وصیت نامہ میز پر موجود ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہ غائب تھا تو ظاہر ہے اسے غائب کرنے والا مسعود کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا جسے وراثت سے لاتعلق کیا گیا تھا۔ اس نے غالباً وصیت نامے میں تبدیلی دیکھ لی تھی اور اسی لمحے انتہائی سنگدلی کا ثبوت دیتے ہوئے بڑی بی کا گلا گھونٹ کر وصیت نامہ جیب میں رکھ لیا۔ پھر اچانک اس کی نظر غالباً راجا پر پڑی جو کھڑکی میں کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ راجا الٹے قدموں دوڑا لیکن مسعود نے اس کا تعاقب کیا اور باڑھ کے قریب عقب سے دبوچ کر اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ واپس آیا تو اسے راشد نظر آیا۔ دونوں چور یہی سمجھے تھے کہ بڑی بی اکیلی رہتی ہیں۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ویک اینڈ پر ان کا کوئی بھتیجا بھی یہاں آتا ہے۔ مسعود نے غالباً راشد کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ لیا اور یہ گویا قسمت کی طرف سے اسے سنہری موقع ملا تھا کہ قربانی کا ایک بکرا خود چل کر کمرے میں جا رہا تھا جس پر دہرے قتل کا الزام تھوپا جا سکتا تھا۔ اگر بروقت وکیل کا فون نہ آتا تو مسعود اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر نکل گیا ہوتا۔''

انسپکٹر نے پُرملامت نظروں سے مسعود کی جانب دیکھا اور اسے گرفتار کرنے کا حکم صادر کر دیا...

اکھاڑا

کاشف زبیر

پہلی کہانی

شامی اور تیمور کی ہمراہی ہمیں ہی نہیں آپ قارئین کو بھی ہر دلعزیز ہے... مگر نواب صاحب کو ان دونوں کی یکجائی سے ہمیشہ خطرہ رہتا ہے... اس دفعہ ان دونوں کی مداخلت نواب صاحب کو بھی دشمنوں کے گھیرے میں لے گئی... ملک دشمن عناصر کی ایک نئے انداز سے کی گئی سازش کا پرہنگام سلسلہ...

سرورق کا تحفہ خاص...... اس قلم کا جادو جو ہر ایک کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے

شامی نے نشانہ لے کر فائر کیا تو جھیل کے کنارے بیٹھی مرغابیوں کا جھنڈ تتر بتر ہو گیا۔ لیکن اس میں سے کم سے کم ایک مرغابی گری تھی۔ تیمور نے جوجی کی طرف دیکھا۔

''بیٹا، اب تمہارا کام ہے۔''

''یہ آپ اچھا نہیں کر رہے ہیں۔'' اس نے روانگی اختیار کرتے ہوئے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''مجھے شکار کا شوق نہیں ہے لیکن مجھے یہ معلوم ہے، جو کام آپ مجھ سے لے رہے ہیں وہ کتے سے لیا جاتا ہے۔''

''اگر ہمارے پاس کتا ہوتا تو تم سے کیوں کام لیتے؟'' شامی نے پچکار کر کہا۔ ''اب دوڑ لگاؤ، اس سے پہلے کوئی لومڑی یا گیدڑ ہمارا شکار لے اڑے۔''

جوجی نے منہ بنایا اور روانہ ہو گیا۔ تیمور آنکھوں سے دوربین لگائے ہوئے دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ارے یہ تو کوئی لڑکی ہے۔''

شامی نے جلدی سے رائفل اسے تھمائی اور دوربین لے کر اس سمت دیکھا۔ جھیل کے دوسری طرف وہ ایک لڑکی ہی تھی۔ اس نے جدید فیشن والا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ اس کے سرمئی مائل ہلکے بھورے بال بکھرے ہوئے تھے اور نقوش تیکھے تھے۔ لڑکی کے حلیے سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ شکار پر آئی ہے۔ وہ بیٹھی ہوئی تھی اور شاید کسی سے بات کر رہی تھی۔ شامی نے بھی تائید کی۔ ''واقعی لڑکی تو خوب صورت ہے... لیکن یہاں کیا کر رہی ہے؟''

''ابھی معلوم کرتا ہوں۔'' تیمور نے دوربین واپس لے کر رائفل اسے تھما دی۔ شکار کا پروگرام دو دن پہلے بنا تھا۔ ویک اینڈ پر ان کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا اس لیے انہوں نے شکار کا ارادہ کیا۔ مارچ کے آخر میں وسط ایشیا سے آنے والے پرندے واپسی کا سفر شروع کرتے ہیں اور راستے میں آنے والے پانی کے ذخیروں پر قیام کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ یہ چھوٹی سی جھیل پانی کا ایک ایسا ہی ذخیرہ تھا جہاں مرغابیاں، بگلے اور اس نسل کے دوسرے سیاح پرندے ملتے تھے۔ یہ جگہ اسلام آباد سے بلند تھی اس لیے یہاں سردی زیادہ ہوتی تھی۔ اب یہاں ہر طرف آنکھوں کو تراوٹ دیتا ہوا سبز رنگ تھا۔ جھیل کا پانی گز بھر سے زیادہ بلند سرکنڈوں اور گھاس میں جھلکتا تھا۔ ان سرکنڈوں کے درمیان مرغابیاں اور دوسرے پرندے شکاریوں کی نظروں سے اوجھل تھے اور انہیں سامنے لانے کے لیے باقاعدہ کوششیں کرنا پڑتی تھیں۔

شکار کے لیے روانگی سے پہلے شامی کو جوجی کا خیال آیا اور وہ اسے بھی اپنے ہمراہ شکار پر لے آئے۔

جوجی ان کا احسان مند تھا اور سخت بے چین تھا کہ کسی صورت احسان کا یہ بوجھ ہلکا کر سکے۔ اسی لیے وہ کئی دن سے فون کر کے شامی کا دماغ کھا تا رہا تھا کہ مجھے کام بتاؤ، میں کیا کروں، میں کس کو کھاؤں؟ شامی نے اسے کال کر کے شکار پر چلنے کو کہا تو اس نے اباجی سے اجازت کا مسئلہ اٹھایا اور پھر یہ مسئلہ بھی شامی کو حل کرنا پڑا۔ رشید بلا نے اجازت دے دی۔ وہ شامی اور تیمور کا احسان مند تھا ورنہ اس کا اکلوتا بیٹا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آج اس دنیا میں نہ ہوتا۔ سب سے بڑھ کر اس کی اکرم سے دشمنی ختم ہو گئی تھی یہ اس کا بڑا سر درد تھا۔ اب وہ سکون سے اپنے دھندوں پر توجہ دے سکتے تھے۔ جوجی بہت خوش تھا۔

انہوں نے منی پجیرو لی تھی۔ رات گزارنے کے لیے وہ خیمے اور دوسرا سامان ساتھ لائے تھے۔ وہ دوپہر کے وقت وہاں پہنچے تھے۔ اتنی جلدی اور دن میں شکار مل جانا خوش قسمتی تھی ورنہ عام طور سے پرندے چھپے رہتے اور ان تک رسائی مشکل ہوتی تھی۔ تیمور نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ یہ ڈیٹ پر آئے ہوئے ہیں۔''

''وہ کیسے...؟ ساتھ کوئی مرد ہے؟''

''ہاں، ایک ہاتھ اٹھا تھا اور لڑکی نے اسے کچھ تھمایا تھا۔'' تیمور بولا۔

شامی نے اس طرف دیکھا جہاں اس نے مرغابیوں پر فائر کیا تھا، وہاں اب ایک بھی مرغابی نہیں تھی۔ فائر کی آواز سنتے ہی ہوا میں نظر آنے والے پرندے بھی غائب ہو گئے تھے۔

''اگر دو مرغابیاں بھی ہاتھ آ گئیں تو اچھا باربی کیو ہو جائے گا۔''

''تجھے کھانے کی پڑی ہے۔'' تیمور بدستور دوربین میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''یہاں تو سین کچھ اور ہو رہا ہے... ارے...'' تیمور کہتے ہوئے اچھل پڑا۔ ''میرے خدا! لڑکی نے زمین پر لیٹے آدمی کو گولی مار دی ہے۔''

''گولی مار دی ہے!'' شامی نے بات دہرائی اور جھپٹ کر تیمور سے دوربین لے لی۔ لڑکی اب کھڑی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا جس سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ لڑکی اتنے سکون سے کھڑی تھی جیسے اس نے کسی کو ڈسپرین کی گولی دی ہو اور اب اس کا ردِعمل دیکھ رہی ہو۔ ''تو نے خود دیکھا اسے گولی مارتے ہوئے؟''

''ہاں یار! وہ آدمی سے کچھ کہہ رہی تھی پھر اس نے ہاتھ پیچھے کر کے کہیں سے پستول نکالا اور اچانک ہی نیچے کی طرف رخ کر کے فائر کر دیا۔''

''چل کر دیکھتے ہیں۔'' شامی نے رائفل اٹھائی۔

اسی لمحے جوجی بھاگتا ہوا نمودار ہوا اور پاس آ کر گھاس پر گر پڑا۔ دوڑنے سے کم اور خوف کی وجہ سے اس کا سانس زیادہ پھولا ہوا تھا۔ شامی نے پوچھا۔ ''کیا ہوا کیا تم نے بھی اسے گولی چلاتے ہوئے دیکھا ہے؟''

جوجی اچھل پڑا اور ہکلایا۔ ''کک... کسے جی؟''

''اس لڑکی کو۔'' شامی نے جھیل کے پار اشارہ کیا۔

جوجی کی آنکھیں باہر نکلی پڑ رہی تھیں اور رنگ سفید پڑ گیا۔ ''نن... نہیں جی... وہ... وہاں ایک لاش ہے۔''

''ظاہر ہے جسے لڑکی نے گولی ماری ہے، وہ اب لاش ہی ہوگا۔''

''نہیں جی... اسے آپ نے گولی ماری ہے۔'' جوجی بولا۔

اس بار شامی اچھل پڑا۔ ''میں نے گولی ماری ہے؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔''

''ہاں، آپ نے بطخ پر گولی چلائی تھی لیکن وہ اس آدمی کو لگ گئی۔'' جوجی کی حالت بہتر ہوئی تو وہ جلدی جلدی بولنے لگا۔ ''میں بطخ اٹھانے گیا تو وہاں وہ آدمی پڑا تھا اور اس کے سینے میں سوراخ تھا۔''

شامی پریشان ہو گیا۔ ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ صرف دو سو گز کے فاصلے سے میں نے گولی چلائی اور وہ آدمی بطخوں سے دور ہوگا ورنہ وہ اتنے سکون سے نہ بیٹھی ہوتیں۔''

تیمور ان کی باتیں سن رہا تھا، اس نے جوجی سے کہا۔ ''آدمی اسی جگہ تھا جہاں بطخیں بیٹھی تھیں؟''

جوجی سوچ میں پڑ گیا۔ ''پتا نہیں جی، میں تو اس جگہ پہنچا تھا تو آدمی تھا اور بطخیں غائب تھیں۔''

''ظاہر ہے، فائر کے بعد وہاں بطخیں کہاں ہوں گی۔'' شامی نے بھنا کر کہا۔ ''تم نے غلط دیکھا ہوگا۔''

''غلط...!'' جوجی نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ ''چھ فٹ کا آدمی لیٹا ہوا ہے اور سینے میں سوراخ ہے تو اس میں غلط کیا ہوا؟ آپ نے تو مجھے بھی مروا دیا ہے اپنے ساتھ۔''

''اپنے ساتھ کیسے؟''

''قتل آپ نے کیا ہے اس لیے آپ کو ہوگی پھانسی اور مجھے مدد کرنے کے الزام میں قید کی سزا ہوگی۔'' جوجی دکھی ہو گیا۔ ''میرا تو کیریئر تباہ ہو گیا۔''

''اس کے برعکس تمہارا کیریئر بن گیا ہے برخوردار۔'' تیمور نے اسے تسلی دی۔ ''یہ اعزاز تو تمہارے ابا جی اور ہونے والے سسر کو بھی حاصل نہیں ہوا۔ یعنی جیل جانے کا۔ اب تم جاؤ گے تو خود کو ان کا درست وارث ثابت کرو گے۔''

''اچھا جی۔'' جوجی کو کسی قدر تسلی ہوئی۔ ''ابا جی غصہ تو نہیں کریں گے؟''

''اگر کریں گے تو تم پر کیا اثر پڑے گا؟ تم تو جیل میں ہو گے اور جب واپس آؤ گے تو عین ممکن ہے وہ تمہیں ایم ڈی کی سیٹ پر بٹھا دیں۔''

''اور صوبی...''

اس بار تیمور بھی بھنا گیا۔ ''تمہارے باقی مسائل بعد میں حل کریں گے، پہلے چل کر لاش تو دیکھ لیں۔''

''جسے تم میرے سر مار رہے ہو۔'' شامی نے کہا اور دوربین سے ایک بار پھر جھیل کے پار دیکھ کر اعلان کیا۔ ''لڑکی غائب ہے۔''

''یار! پہلے چل کر اسے تو دیکھ لیں۔ لڑکی اور اس کے مارے کو بعد میں دیکھیں گے۔''

تیمور کی تسلی کے باوجود جوجی فکر مند تھا کہ اگر بات پولیس اور اس کے ابا جی تک چلی گئی تو اس کی خیر نہیں ہوگی اور اس سے بھی بڑھ کر صوبی اس کے بارے میں کیا سوچے گی؟ شامی اور تیمور بے فکری سے چل رہے تھے۔ لاشیں اور غیر متوقع حالات ان کے لیے نئے نہیں تھے۔ اس سے زیادہ انہیں اپنا شکار خراب ہونے کی فکر تھی۔ جھیل کے اس حصے تک پہنچنے کے لیے انہیں خاصا لمبا چکر لگانا پڑا جہاں جوجی کے مطابق لاش پڑی تھی۔ راستے میں تیمور اور شامی نے اس سے پوچھ گچھ بھی کی۔ اس کے مطابق لاش کسی جوان آدمی کی تھی۔ اس نے عام سا لباس اور شکاری جیکٹ پہن رکھی تھی اور اس کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔

وہ پانچ منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ لاش واقعی موجود تھی اور اس کے سینے میں گولی کا نشان بھی تھا۔ اسے مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کیونکہ جسم ابھی گرم تھا اور زخم سے سرخ لہو جھلک رہا تھا۔ آدمی جوان تھا، شاید تیس اور پینتیس کے درمیان تھا۔ رنگت سانولی تھی اور چہرے کے نقوش کسی قدر تبتیوں جیسے تھے۔ خاص طور سے آنکھوں کی بناوٹ ویسی ہی تھی۔ شامی اور تیمور نے اس کے پاس آئے بغیر پہلے دور سے زمین کا معائنہ کیا۔ وہاں زمین صاف تھی، کوئی نشان نہیں تھا۔ پھر وہ جوجی کو دور روک کر خود احتیاط سے لاش تک آئے تاکہ زمین پر ان کے جوتوں کا نشان نہ آئیں۔

''کچھ اندازہ ہے کہ یہ یہاں کیا کر رہا تھا اور کیسے مر گیا؟''

شامی کے سوال پر تیمور نے لاش کا معائنہ کیا اور بولا۔ ''تیرے سوال کا جواب صرف شرلاک ہومز یا ہماری پولیس دے سکتی ہے جو مُردوں سے بھی اقبالِ جرم کروا سکتی ہے۔ ویسے یہ بتاتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ گولی رائفل کی ہے اور شاید بارہ بور کی ہی ہے۔''

شامی نے منہ بنایا۔ ''لیکن اسے قتل میں نے نہیں کیا ہے۔ تُو دیکھ سکتا ہے مرغابیاں یہاں سے کوئی پچاس گز شمال میں تھیں اور میرا نشانہ اتنا خراب نہیں ہے۔''

''جب تقدیر خرابی پر آمادہ ہو تو نشانہ اس سے بھی زیادہ خراب ہو سکتا ہے۔'' تیمور نے فلسفیانہ انداز میں کہا اور لاش کو ہلائے بغیر اس کی تلاشی لینے لگا۔ اس کے پاس پرس یا شناختی کاغذات جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ البتہ اس کی جیکٹ سے ایک عدد پستول اور اس کا ایک فاضل میگزین نکلا۔ یہ امریکن پستول کی چینی نقل تھی اور خاصی اچھی تھی۔ پھر اس نے لاش کو پلٹا اور اس کی پتلون کی عقبی جیبوں کا جائزہ لیا۔ پینٹ کی عقبی چھوٹی جیب سے اسے ایک چھوٹا سا دھاتی سکہ ملا۔ یہ شاید سونے کا بنا تھا۔ اس کا وزن بھی سونے جیسا تھا اور اس پر صرف ایک آنکھ تھی جو سکے کے دونوں طرف یکساں بنی تھی۔ آنکھ میں پتلی کی جگہ سوراخ بنا تھا جو سکے کے آر پار تھا۔ شامی نے غور سے دیکھا۔

''یہ کسی ملک کا سکہ تو نہیں ہے۔''

''درست فرمایا۔'' تیمور نے سکہ جیب میں رکھ لیا اور لاش کی مزید تلاشی لی مگر اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس نے لاش کو پہلے والی پوزیشن میں کر دیا اور کھڑا ہو گیا۔ ''اب دیکھتے ہیں کہ خاتون نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔''

''تجھے یقین ہے کہ وہ آدمی مارا گیا ہے؟'' شامی نے پوچھا۔ ''ممکن ہے خاتون نے کسی اور چیز پر گولی چلائی ہو۔''

جوجی ایک طرف خوف زدہ کھڑا تھا۔ کسی اور لاش کی بات پر وہ مزید سہم گیا۔ ''کوئی اور لاش بھی ہے؟''

''ہاں بیٹا۔'' شامی نے سر ہلایا۔ ''جہاں ہمارے قدم مبارک پڑتے ہیں، وہاں لاشیں اور اس قسم کی چیزیں ملنے لگتی ہیں۔ میرا مطلب ہے، عام حالات سے زیادہ ملنے لگتی ہیں۔''

وہ لوگ گھوم کر جھیل کے دوسری طرف جانے لگے۔ ان کے وہاں سے جانے کے بعد نزدیک ہی جھاڑیاں ہلنے لگیں اور ان میں سے لڑکی نکل کر لاش کی طرف بڑھی۔ اس نے مرنے والے کے لباس کی تلاشی لی اور جب اسے کچھ نہیں ملا تو اس کے چہرے پر تشویش نظر آنے لگی اور وہ بڑی احتیاط سے اس طرف جانے لگی جہاں جیپ کھڑی تھی۔

شامی اس بار آگے تھا۔ تیمور نے لاش سے ملنے والا پستول اور فاضل میگزین اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

تیمور نے اپنی رائفل جوجی کو تھما دی جسے وہ یوں پکڑے ہوئے تھا جیسے رائفل نہیں زندہ سانپ ہو اور ذرا سی گرفت کمزور پڑتے ہی اسے ڈس لے گا۔ شامی نے اپنی رائفل سامنے کی ہوئی تھی۔ انہیں جھیل کے دوسری طرف پہنچنے میں بیس منٹ لگ گئے۔ جھیل زیادہ بڑی تو نہیں تھی لیکن اس کے کنارے سیدھے نہیں تھے بلکہ آڑے ترچھے اور کٹے پھٹے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے۔ ان کے کنارے گھاس اور سرکنڈے بھی تھے اس لیے یہاں چلنا آسان نہیں تھا۔ شامی کے اندازے کے مطابق وہ دوسری طرف پہنچ گئے اور اب انہیں وہ جگہ تلاش کرنی تھی جہاں انہوں نے لڑکی کو دیکھا تھا۔ لڑکی نے جس پر گولی چلائی تھی، اسے بھی وہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ جھاڑیوں اور سرکنڈوں میں جھانکتے پھر رہے تھے۔ جوجی نے پوچھا۔

''آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟''

''ایک عدد لاش...'' شامی نے ایک جھاڑی ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''مل گئی۔''

جوجی اچھل پڑا۔ ''لاش...؟''

''نہیں برخوردار... نعش۔'' شامی نے ملائمت سے کہا اور تیمور کو آواز دی۔ ''دوسری لاش یہاں ہے۔''

تیمور بھاگا ہوا آیا۔ جوجی منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ ''مجھ میں ایک دن میں دو لاشیں دیکھنے کی ہمت نہیں ہے۔''

''تم اپنے ابا جی اور سسر کا نام ڈبوؤ گے۔'' تیمور نے اسے گھورا اور جھاڑیوں میں جھانکا۔ وہاں وہی شخص اوندھے منہ پڑا تھا۔ گولی ٹھیک دل پر لگی تھی اس لیے اسے مرنے میں چند سیکنڈ سے زیادہ کا وقت نہیں لگا ہوگا اور اسی وجہ سے خون بھی بہت کم نکلا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ اس کے پاس ہی ایک دور مار سائلنسر لگی رائفل پڑی تھی۔ شامی نے جوجی سے کہا۔

''ہوشیار رہنا، قاتل لڑکی آس پاس کہیں ہو سکتی ہے۔''

''میں ہوشیار ہوں جی۔'' جوجی نے رائفل کو مزید مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ''ویسے دوسری بھی لاش ہے یا ابھی زندہ ہے؟''

''لاش ہے۔'' تیمور نے کہا اور ہاتھ لگائے بغیر جھک کر رائفل کی نال سونگھی پھر ہاتھ کی پشت نال سے لگائی۔ ''اس سے ابھی فائر ہوا ہے۔''

شامی نے سر ہلایا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ شخص اسی رائفل کا نشانہ بنا ہے۔ زاویہ ایسا ہی بن رہا ہے۔''

تیمور نے غور کیا تو واقعی مرنے والا ٹھیک اس رخ پر لیٹا ہوا تھا جہاں انہیں پہلی لاش نظر آئی تھی۔ ''یعنی اس شخص نے سکے والے کو گولی ماری اور لڑکی نے اسے شوٹ کر دیا؟''

''لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔'' شامی نے لاش کی تلاشی شروع کی۔ اس کی سامنے والی جیب سے ایک بٹوا نکلا۔ اس میں کچھ رقم کے ساتھ ایک عدد شناختی کارڈ بھی تھا۔ شناختی کارڈ پر مقتول کی تصویر تھی۔ نام حسیب خان لکھا تھا۔ پتا مردان کے کسی گاؤں کا تھا۔ مستقل پتا بھی وہیں کا تھا لیکن وہ خود اسلام آباد کے نواح میں مقتول پڑا تھا۔ لباس اوسط درجے کا تھا۔ بٹوے میں چند ہزار کی رقم تھی۔ اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ شامی نے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر کے پرس واپس رکھ دیا اور تیمور سے کہا۔ ''پولیس کو اطلاع دینی ہوگی۔''

''ظاہر ہے۔'' تیمور نے منہ بنایا۔ ''اس کا مطلب ہے شکار کا خاتمہ؟''

''شکار پھر کھیلیں گے۔'' شامی نے اسے تسلی دی۔

''بلکہ کل آ جائیں گے۔''

''کل یہاں پولیس تفتیش کر رہی ہوگی۔''

''اسے تفتیش کرنے دیں گے۔'' شامی نے کہا۔ ''ہم شکار کریں گے۔ ہمارے پاس اسلحے کا لائسنس ہے اور یہاں شکار کھیلنے کے لیے کسی پرمٹ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

تیمور نے سوچا اور قائل ہو گیا۔ ''بجا ارشاد فرمایا آپ نے... اب روانگی اختیار کی جائے، اس سے پہلے کہ پولیس آ جائے۔''

''اسے کیا الہام ہوگا؟''

''آپ بھول رہے ہیں، یہاں ایک عدد خاتون بھی تھیں جواب نہیں ہیں... اور ممکن ہے وہ بھی پولیس کو اطلاع کر دیں اور جب پولیس آئے تو دو مقتولوں کے ساتھ ہمیں پا کر خوش ہو۔''

''ان سے زیادہ خوش دادا جان ہمیں حوالات میں دیکھ کر ہوں گے۔'' شامی نے سرد آہ بھری، تیمور نے اس کی تائید کی۔

''پولیس کی تحویل سے نکل کر ہم ان کی تحویل میں آ جائیں گے۔''

''اور ہمارے آنے والے کئی ہفتے خراب گزریں گے اس لیے ہمیں فوری طور پر یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔'' شامی نے اس بار نہ صرف تیمور سے اتفاق کیا بلکہ وہ وہاں سے چل پڑا۔ انہیں واپسی اختیار کرتے دیکھ کر جوجی نے سکون کا سانس لیا۔ جیپ اپنی جگہ موجود تھی۔ تیمور نے اس کا جائزہ لیا اور سب ٹھیک پا کر وہاں سے روانگی اختیار کی۔ شامی نے پوچھا۔

''تم کیا دیکھ رہے تھے؟''

''جیپ خاصی نمایاں جگہ کھڑی تھی۔ ممکن ہے اس لڑکی یا اس کے کسی اور ساتھی نے جیپ دیکھ لی ہو۔''

''ہاں یہ ممکن ہے۔'' شامی فکرمند ہو گیا۔ ''انہوں نے جیپ کے نمبر ضرور دیکھ لیے ہوں گے۔''

''تیرا مطلب ہے اگر بعد میں انہیں کوئی خطرہ محسوس ہوا تو وہ ہمارا سراغ بھی لگا سکتے ہیں؟''

''ہو سکتا ہے۔'' شامی بولا، وہ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ جوجی فکرمند ہو گیا۔

''وہ آپ کا سراغ کیوں لگائیں گے جی؟''

''ان کی فکر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ اگر تمہارے ابا جی نے پوچھا کہ شکار سے اتنی جلدی کیوں واپس آ گئے تو کیا جواب دو گے؟''

''یہی کہ آپ کی گاڑی خراب ہو گئی تھی اس لیے ہمیں واپس آنا پڑا۔''

''لیکن کل کے اخبارات اور ٹی وی چینل والے ان دو لاشوں کی خبر نشر کریں گے اور جگہ کا ذکر بھی آئے گا۔ تب تمہارے ابا جی ذرا سختی سے پوچھیں گے۔''

''کوئی بات نہیں جی۔'' جوجی نے بہادری سے کہا۔ ''تب بھی میں یہی کہوں گا۔''

''گڈ! اپنی بات پر قائم رہنا ورنہ تم ہی پھنسو گے۔'' جوجی کو اس کے گھر پر اتار کر شامی اور تیمور روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

لڑکی ایک چھوٹی لیکن طاقتور انجن والی کار میں تھی۔ جیپ نہ ہوتے ہوئے بھی یہ پہاڑی راستوں کے لیے بہترین گاڑی تھی۔ وہ مناسب فاصلے سے شامی اور تیمور کی جیپ کا تعاقب کر رہی تھی۔ وہ سڑک کے پاس ہی جھاڑیوں میں ان کی منتظر تھی اور جیسے ہی جیپ گزری، وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔ اس کی پیشانی پر سلوٹ تھی اور وہ بہت سنجیدگی سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ ڈرائیونگ کے دوران وہ بار بار اپنا موبائل دیکھ رہی تھی۔ اس پر سگنل نہیں تھے پھر جیسے ہی موبائل پر سگنل نمودار ہوئے، اس نے ایک نمبر ملایا۔ کال ملتے ہی اس نے کہا۔ ''کام ہو گیا ہے لیکن گولڈن آئی نہیں ملی۔''

''یہ بہت بُرا ہوا۔'' دوسری طرف سے کسی مرد نے کہا۔ ''اصل کام تو اس کی واپسی ہے۔''

''یہاں اچانک ہی کچھ اور لوگ آ گئے تھے اور انہوں نے دونوں لاشوں کو بھی پاس سے دیکھا تھا۔ مجھے ساگر کے پاس سے گولڈن آئی نہیں ملی، اس لیے مجھے شبہ ہے کہ وہ ان کے پاس ہے۔ میں ان کا تعاقب کر رہی ہوں۔''

''مجھے یقین ہے، گولڈن آئی انہی کے پاس ہے۔'' مرد نے کہا۔ ''تم تعاقب جاری رکھو، میں راول چوک پر ملوں گا۔''

کچھ دیر بعد راول چوک کے پاس سڑک کے کنارے ایک ہونق اور کسی قدر پاگل نظر آنے والے شخص نے ہاتھ اوپر کر کے اشارہ کیا تو لڑکی نے گاڑی روک دی اور اس کے بیٹھتے ہی آگے بڑھا دی۔ ''وہ آگے نیلے رنگ اور سفید لائنوں والی جیپ میں ہیں۔''

''کتنے افراد ہیں... اور کیسے لگ رہے ہیں؟''

''تینوں لڑکے ہیں اور عام شکاری لگ رہے تھے۔''

''یعنی ان کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے؟'' ہونق آدمی نے سکون کا سانس لیا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے لیکن گولڈن آئی کی واپسی ضروری ہے۔''

ہونق نظر آنے والا شخص پھر سے تشویش زدہ ہو گیا۔ ''یہ تو ہے... اس کے بغیر ہمارا مشن ادھورا ہے۔''

لڑکی نے آدمی کی طرف دیکھا۔ ''مشن جاری رہے گا۔ یہ مشن کا صرف ایک حصہ ہے۔''

''لیکن اس کی کامیابی کے بغیر مشن آگے نہیں بڑھ سکتا۔ گولڈن آئی لیے بغیر ہم واپس بھی نہیں جا سکتے۔''

''یہ کام تو ہم جان دے کر بھی پورا کریں گے۔'' لڑکی نے ایک عزم سے کہا۔ جیپ معمول کی رفتار سے چل رہی تھی۔ پہلے وہ پنڈی کے ایک پرانے علاقے میں رکی اور جیپ سے ایک نوجوان لڑکا اتر کر ایک گھر میں چلا گیا۔ لڑکی نے ہونق آدمی سے کہا۔ ''ماجی! تم دیکھو یہ لڑکا اس گھر میں کیوں گیا ہے...؟ میں ان کے پیچھے جاتی ہوں۔''

ماجی بے چون و چرا کیے وہیں اتر گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے لڑکی اس کی باس ہو۔ اس کے اترتے ہی لڑکی نے گاڑی چلا دی کیونکہ جیپ تنگ گلی سے نکل کر باہر جا چکی تھی۔ ہائی وے پر آتے ہوئے لڑکی نے دوبارہ اسے آ لیا اور بیس منٹ بعد اس نے جیپ کو وقار ولا میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے کئی گھنٹوں بعد لڑکی، ماجی اور ایک نوجوان ایک کیبن میں موجود تھے۔ کیبن جی ٹی روڈ سے ذرا دور ایک ویران جگہ پر تھا اور یہاں بجلی بھی نہیں تھی۔ ایک طرف آتش دان میں آگ بھڑک رہی تھی اور دیوار پر تیل سے جلنے والا لیمپ لگا ہوا تھا۔ ماجی نے لڑکی اور نوجوان کو جوجی کے بارے میں بتایا۔

''اس کا باپ شہر کا نامی گرامی بدمعاش ہے لیکن لڑکا بہت سیدھا ہے۔ وہ ان دونوں کے ساتھ شکار پر گیا تھا۔''

''دونوں نوجوان شامیر اور تیمور ہیں۔'' لڑکی نے اپنی معلومات ظاہر کیں۔ ''اسٹوڈنٹ ہیں لیکن دوسرے کاموں میں بھی ٹانگ اڑاتے رہتے ہیں اور ان کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''پھر بھی گولڈن آئی ان کے پاس ہے اور اس کا کسی غیر متعلقہ آدمی کے پاس ہونا ٹھیک نہیں ہے۔'' ماجی نے پریشانی سے کہا۔ ''شاکیلا! ہمیں ہر صورت میں گولڈن آئی واپس حاصل کرنا ہے۔''

''شکیلہ۔'' لڑکی نے تصحیح کی اور نوجوان کی طرف دیکھا۔ ''تم کیا کہتے ہو شاہ جی؟''

نوجوان بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں ان کے گھر میں گھس کر گولڈن آئی نکال لینا چاہیے۔''

شکیلہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ عام گھر نہیں ہے، کسی نواب کی محل نما کوٹھی ہے۔ اس کے حفاظتی انتظامات سخت ہیں۔''

ماجی جھنجلانے لگا۔ ''تمہیں یہ کام کرنے کے لیے وہی جھیل ملی تھی؟''

''تو اور کہاں کرتی؟'' شکیلہ تیز لہجے میں بولی۔ ''تم نہیں جانتے کہ میں نے کتنی مشکل سے یہ کام کیا ہے۔ اگر حسیب خان کو ذرا بھی شک ہو جاتا کہ میں اس کے ہاتھ سے کسی کو مروانے جا رہی ہوں تو وہ مجھے مار دیتا۔ وہ نشانے باز تھا۔ میں یا تم میں سے کوئی یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ اور ساگر کے بارے میں جانتے ہو کتنا خطرناک آدمی تھا؟ اس کے پاس جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اسے دور سے بے خبری میں مارا جا سکتا تھا اور میں نے اسی لیے حسیب خان کو پھانسا تھا۔''

''چلو ٹھیک ہے، تم نے دونوں کا کانٹا نکال دیا لیکن گولڈن آئی بدستور غائب ہے۔'' ماجی نے کہا۔

''ہمارے پاس صرف ایک ہفتہ اور رہ گیا ہے۔'' شاہ جی نے یاد دلایا۔ ''اس کے بعد ہمیں لازمی واپس جانا ہے۔''

شکیلہ فکرمند ہو گئی پھر اس نے شانے جھٹک کر پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''تم لوگ فکر مت کرو، ہم گولڈن آئی واپس لے کر ہی جائیں گے۔''

☆☆☆

عین اس وقت پنڈی کی ایک پرانی آبادی میں ایک کھولی نما گھر میں تین آدمی موجود تھے۔ اس عمارت میں بے شمار چھوٹے چھوٹے کھولی نما فلیٹ تھے۔ ان میں زیادہ تر نچلے طبقے کے مزدور پیشہ لوگ بستے تھے جو صبح سے شام تک محنت مزدوری کرتے تھے اور شام کو آ کر ان کھولیوں میں پڑ جاتے تھے۔ ایک کھولی میں عام طور سے تین سے چار افراد رہتے تھے اور یہاں عورتوں بچوں والے گھر نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہاں پڑوسی کو پڑوسی کے بارے میں معلوم نہیں تھا کہ اس کے آس پاس کون رہتا ہے۔ ان تین افراد کے بارے میں بھی یہاں کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ کون ہیں اور کبھی کبھی یہاں کیوں جمع ہوتے ہیں۔ آج بھی وہ یہاں آئے تھے۔ کھولی میں زمین پر صرف ایک قالین تھا، وہ اسی پر بیٹھے تھے۔

''ساگر اور حسیب خان کی لاشیں اس وقت اسپتال میں ہیں۔'' ان میں سے ایک کسی قدر موٹے آدمی نے کہا تو باقی دو چونک گئے۔

''ساگر مارا گیا؟'' ان میں سے ایک بولا۔ اس کے لہجے میں صدمہ تھا۔ اس نے نیلی اونی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔

''حسیب خان کی لاش کہاں سے ملی؟'' تیسرے آدمی نے پوچھا۔ اس نے سفید جیکٹ پہن رکھی تھی۔

موٹے آدمی نے انہیں کسی قدر تفصیل سے بتایا کہ ان دونوں کی لاشیں ایک نامعلوم کال پر پولیس نے راول جھیل سے اوپر ایک چھوٹی جھیل سے تلاش کی ہیں۔ ''ساگر کے جسم سے جو گولی نکلی ہے، وہ حسیب خان کے پاس پڑی ہوئی رائفل سے چلائی گئی تھی اور رائفل پر حسیب خان کی انگلیوں کے نشانات تھے۔ البتہ اس کے دل سے نکلنے والی گولی کسی نامعلوم پستول سے چلائی گئی تھی۔ موت کا وقت تقریباً یکساں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ادھر حسیب خان نے ساگر پر گولی چلائی اور فوراً ہی کسی نے اسے اسی حالت میں پشت سے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔'' نیلی ٹوپی والا فکرمند ہو گیا۔

''تمہیں معلوم ہے، حسیب خان آج کل اس عورت کے ساتھ دیکھا جا رہا تھا جس کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ اس کا تعلق مخالف گروپ سے ہے اور وہی ہمارے کئی ساتھیوں کے قتل میں ملوث ہے۔''

''کوئی مقامی ایجنسی ہے؟'' موٹے آدمی نے پوچھا۔

''نہیں، میرا خیال ہے اس عورت کا تعلق ہمالیہ کے پار سے ہے۔'' نیلی ٹوپی والا بولا۔ موٹے آدمی کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''یہی وجہ ہے دو مہینے میں یہاں ہمارے گروپ کا صفایا ہو گیا ہے۔ کیا سرحد پار والوں کو علم ہے کہ اب ہم تین ہی بچے ہیں؟''

''بالکل علم ہے... اور میں بتا رہا ہوں جلد ہمیں واپسی کا حکم مل جائے گا۔'' اس بار سفید جیکٹ والا بولا۔

''نہیں، جب انہیں معلوم ہو گا کہ ساگر کسی خاص مشن پر تھا تو ہمیں واپس نہیں بلایا جائے گا۔'' نیلی ٹوپی والے نے یقین سے کہا۔ ''اس لیے ہمیں ابھی سے اس ٹاسک پر کام شروع کر دینا چاہیے کہ ساگر کس مشن پر تھا اور کیوں مارا گیا۔''

''یہ بات ہم کس طرح معلوم کر سکتے ہیں؟''

''اس عورت کو تلاش کر کے۔'' سفید جیکٹ والا بولا۔

موٹا آدمی سوچ رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ''دیکھو، یہ ٹھیک ہے کہ ہمارا پورا گروپ مارا جا چکا ہے لیکن ہم نے بھی مخالف گروپ کو ٹھیک ٹھاک نقصان پہنچایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے پاس بھی زیادہ لوگ نہیں رہ گئے ہیں۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دونوں گروپس کے بیشتر لوگ مارے جا چکے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ساگر کس مشن پر کام کر رہا تھا اور یہ مارا ماری اسی مشن کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس لیے ہمیں ساری توجہ ساگر کے مشن پر مرکوز کرنی چاہیے۔ ہم اپنی دھرتی ماتا کے لیے کام کرتے ہیں۔''

نیلی ٹوپی والے کی بات نے باقی دو کو بھی قائل کر لیا۔ سفید جیکٹ والا بولا۔ ''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہم نے اپنی جان اسی وقت قربان کر دی تھی جب سرحد پار آئے تھے اس لیے زندگی و موت کی پروا کیے بغیر اپنا کام کرنا چاہیے۔''

''تب ہمیں اس عورت کو تلاش کرنا چاہیے جس نے حسیب خان کے ہاتھوں ساگر کو مروایا ہے۔'' موٹا آدمی بولا۔

''کیا حسیب خان نے ساگر کو پہچانا نہیں ہو گا؟'' نیلی ٹوپی والے نے پوچھا۔

''نہیں، وہ اس سے نہیں ملا تھا۔'' موٹے آدمی نے کہا۔

''ویسے ساگر کو دور مار رائفل سے شوٹ کیا گیا ہے۔ بس طے ہے کہ پہلے عورت کو تلاش کیا جائے۔'' نیلی ٹوپی والا بولا۔ ''اس کے بعد ہی کام آگے بڑھے گا۔''

''مگر ساتھ ہی سرحد پار اطلاع کرنا ضروری ہے۔'' موٹے آدمی نے کہا۔ ''میں آج ہی رپورٹ بھیجتا ہوں۔''

☆☆☆

تیمور غور سے اس سنہری سکے کو دیکھ رہا تھا جس پر آنکھ بنی ہوئی تھی۔ شامی کرسی پر دراز اسے جھولا دے رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''سکہ سونے کا ہے؟''

''میرا خیال ہے یہ سونے کا نہیں ہے بلکہ مختلف دھاتوں کو ملا کر بنایا گیا ہے۔''

''ممکن ہے یہ کسی جرائم پیشہ تنظیم کا خفیہ نشان ہو۔''

''برخوردار! یہ پاکستان ہے یورپ یا امریکا نہیں جہاں مافیا ٹائپ کی تنظیموں کے کارکن اس قسم کے شناختی نشانات اپنے پاس رکھتے ہیں۔ لگتا ہے آج کل تم جاسوسی ناول پڑھ رہے ہو؟''

شامی نے سر ہلایا۔ ''جان گریشم کے... ظالم کیسے کیسے آئیڈیاز لاتا ہے کہ پڑھنے والا ہل کر رہ جاتا ہے۔''

''اسی لیے میں نہیں پڑھتا۔'' تیمور نے تائید کی۔ ''مجھے ہلنے کا شوق نہیں ہے۔''

''جناب کی طبع کہولت کے لیے شرلاک ہومز نہایت موزوں ہے جو سارا کیس کرسی پر بیٹھے بیٹھے حل کر لیا کرتا تھا۔''

تیمور نے منہ بنایا۔ ''مجھے جاسوسی سے کوئی شغف نہیں ہے۔''

''تب سکہ ہاتھ میں لیے کیا سوچ رہے ہو؟''

''یہ کہ اگر یہ سونے کا ہے تو کچھ دن ہم نہایت عیش سے گزار سکتے ہیں۔''

''اگر ایسا ہے تو تم اسے کسی جیولر کو دکھا سکتے ہو۔'' شامی نے کہا۔ ''مگر آپ یہ بھول رہے ہیں کہ یہ ایک مقتول کی جیب سے نکلا تھا اور اسے مقتول کرنے والا بھی مقتول پایا گیا تھا۔''

''نہیں، مجھے یاد ہے لیکن اگر یاد بھی ہو تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''اگر اسے کسی طرح پولیس تک پہنچا دیا جائے تو ممکن ہے وہ اس سے کوئی سراغ لگا سکے۔''

اتوار کا دن تھا۔ وہ نہایت آرام سے اٹھے اور سستی و کاہلی کے ساتھ ناشتا نمٹایا اور اس وقت بھی سستانے کے موڈ میں تھے۔ شکار کا ارادہ ملتوی کر دیا گیا تھا۔ بے شک وہ اگلے دن جاتے لیکن اس کا بھی امکان تھا کہ پولیس کو کوئی ایسا فرد مل جاتا جس نے انہیں ایک دن پہلے بھی اس جگہ دیکھا ہو اور وہ چکر میں آ جائیں۔ اس لیے انہوں نے شکار آنے والے ویک اینڈ تک کے لیے ملتوی کر دیا تھا۔ شامی کی بات سن کر تیمور ہنسا۔ ''بھائی صاحب ایک بار پھر بھول رہے ہیں کہ یہ پاکستان ہے امریکا یا یورپ نہیں ہے جہاں پولیس کسی ایک معمولی سے کلیو کی مدد سے پیچیدہ نظر آنے والا کیس حل کر لیتی ہے۔ اس لیے سکہ پولیس تک پہنچانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔''

شامی پر اس طنز کا اثر نہیں ہوا۔ وہ سوچ میں پڑا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''یار! مجھے یہ کوئی عام جرم نہیں لگ رہا ہے۔''

''اس لیے کہ جناب جان گریشم کے ناول پڑھ رہے ہیں۔''

شامی جھنجلا گیا۔ ''اگر میں نہ بھی پڑھ رہا ہوں، تب بھی ذاتی عقل رکھتا ہوں۔ اور تو بھول رہا ہے، ہمیں آئے دن اس قسم کے معاملات سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں، یہ معاملہ مجھے مختلف لگ رہا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"چل مان لیا یہ معاملہ مختلف ہے... پھر؟"

"اگر یہ معاملہ مختلف ہے تو ہمیں اتنے اطمینان سے نہیں بیٹھنا چاہیے کہ کوئی ہمارے بارے میں نہیں جانتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" تیمور چونک کر سیدھا ہو گیا۔

"مطلب یہ کہ ان دونوں افراد کو مقتول کرنے والے اس جگہ موجود تھے اور ہماری جیپ سامنے کھڑی تھی۔ اس کی مدد سے ہمارا اسراغ لگانا زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔"

"لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارا اسراغ کیوں لگایا جائے گا؟"

شامی نے سکے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے لیے جسے جناب مقتول کی جیب سے نکال لائے ہیں۔"

☆☆☆

وقار ولا سے تقریباً سو گز دور پارک کے ساتھ کھڑی اس لگژری گاڑی کے سیاہ شیشوں کے پیچھے شکیلہ اور شاہ جی موجود تھے۔ وہ وقار ولا پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ سیاہ شیشوں کی وجہ سے کوئی جیپ میں ان کی موجودگی کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ سرد موسم کی وجہ سے انہیں بند شیشوں کے ساتھ بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ شاہ جی نے شکیلہ سے کہا۔ "تمہیں یقین ہے کہ سکہ ان دونوں کے پاس ہے؟"

"ننانوے فیصد یقین ہے۔" شکیلہ ایک چھوٹی سے دور بین آنکھوں سے لگائے وقار ولا کا معائنہ کر رہی تھی۔ "تم جانتے ہو، ہمارے لیے ایک فیصد شک بھی کافی ہوتا ہے۔"

اسی لمحے ڈیش بورڈ پر رکھے ہوئے واکی ٹاکی سیٹ سے کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ ماجی کی آواز آئی۔ "کوئی پروگریس؟"

"کوئی نہیں۔" شکیلہ نے جواب دیا۔ "دونوں میں سے کوئی باہر نہیں نکلا ہے۔"

"اگر وہ دونوں باہر نہ نکلے تو گولڈن آئی کیسے حاصل کی جائے گی؟"

"ہمیں صبر سے کام لینا ہوگا۔" شکیلہ بولی۔ "بے صبری کام بگاڑ دے گی۔"

"لیکن اگر وہ گولڈن آئی کے بارے میں جان..."

"وہ عام لوگ ہیں اور اس کے بارے میں تو بہت خاص لوگ بھی نہیں جانتے۔" شکیلہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "اور واکی ٹاکی پر اس کے بارے میں گفتگو محفوظ نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ماجی مرے ہوئے انداز میں بولا۔

"تم کہاں ہو؟"

"میں اسی جگہ ہوں جہاں تم نے مجھے متعین کیا ہے۔ میں آس پاس نظر رکھے ہوئے ہوں۔" ماجی بولا اور واکی ٹاکی بند کر دیا۔ شکیلہ نے دوبارہ دور بین آنکھوں سے لگا لی۔

☆☆☆

شکیلہ اور اس کے ساتھی بے خبر تھے کہ ان کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ وقار ولا جس سڑک پر تھا، اس سے کچھ آگے ایک پارک تھا جو چاروں طرف سے کوٹھیوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس پارک کے ایک طرف شکیلہ اور شاہ جی کی گاڑی کھڑی تھی اور دوسری طرف ایک سیاہ وین کھڑی تھی۔ درمیانی فاصلہ مشکل سے سو گز تھا۔ وین کی فرنٹ سیٹ پر موجود نیلی ٹوپی والا دور بین آنکھوں سے لگائے شکیلہ اور شاہ جی کی گاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اس نے سیاہ ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اس وین کے شیشے بھی سیاہ تھے اس لیے باہر سے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ اس نے وین کے عقبی حصے میں جھانکا جہاں سفید جیکٹ والا موجود تھا لیکن آج اس نے سرمئی سویٹر پہن رکھا تھا۔ وہ کانوں سے ہیڈ فون چڑھائے کچھ سن رہا تھا۔

"کوئی ایکٹیوٹی؟" سیاہ ٹوپی والے نے پوچھا۔

سویٹر والے نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ سیاہ ٹوپی والا جلدی سے وین کے پچھلے حصے میں آ گیا۔ یہاں جدید قسم کے مواصلاتی آلات موجود تھے۔ ایک طرف کمپیوٹرائزڈ اسکرین لگی تھی جس پر مختلف زاویوں سے وین کے باہر کے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ سویٹر والے نے کچھ دیر بعد ہیڈ فون اتارا اور کسی قدر پُرجوش لہجے میں بولا۔ "میرا خیال ہے ہم ٹھیک ٹریک پر جا رہے ہیں۔"

"کیا ہوا؟"

سویٹر والا اس گفتگو کے بارے میں بتانے لگا جو شکیلہ اور اس کے ساتھی کے درمیان ہوئی تھی۔ سیاہ ٹوپی والا بھی... پُرجوش ہو گیا۔ "اس کا مطلب ہے، اس گھر میں رہنے والوں کے پاس وہ چیز ہے جس کے پیچھے ساگر تھا۔ اسے یہ گولڈن آئی کہتے ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے اور اس سے پہلے کہ یہ ان سے گولڈن آئی حاصل کریں، یہ کام ہمیں کرنا چاہیے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ساگر کا مشن شاید اسی چیز کے بارے میں تھا۔ اس نے کسی طرح یہ چیز ان سے حاصل کر لی تھی اور اس عورت نے اسے واپس حاصل کرنے کے لیے

ساگر کو حسیب خان کے ہاتھوں مروا دیا۔"

سیاہ ٹوپی والے نے سرد آہ بھری۔ "ساگر ہمارا اہم ترین آدمی تھا۔ کاش، حسیب خان کو علم ہوتا کہ وہ کسے شوٹ کرنے جا رہا ہے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حسیب خان ایک زمانے میں ہمارا معمولی سا آدمی تھا جسے ہمارے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا اس لیے ہم اس سے وفاداری کی توقع بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ممکن ہے اسے ساگر کے بارے میں علم ہو اور اسی نے ان لوگوں کو ساگر کے بارے میں بتایا ہو۔"

"انہیں بھول جاؤ، اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ گولڈن آئی کس طرح حاصل کریں۔"

"صرف اسے حاصل نہیں کرنا ہے بلکہ اس کے پیچھے موجود حقائق کا پتا بھی چلانا ہے۔" سویٹر والے نے کہا تو سیاہ ٹوپی والا سر ہلاتا ہوا واپس فرنٹ سیٹ کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

نواب صاحب کسی جاننے والے کے پاس ان کی ساس کی وفات پر تعزیت کے لیے گئے تھے۔ شامی نے موقع غنیمت سمجھا اور باہر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ لیکن ابھی وہ تیار ہو رہا تھا کہ نوشی نازل ہو گئی۔ اس نے مشکوک نظروں سے شامی کو گھورا۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

"جہنم میں۔" اس نے جل کر کہا۔

"وہ تو تم جاؤ گے اپنے اعمال کی وجہ سے۔" نوشی نے آرام سے کہا۔ "میں پوچھ رہی ہوں، ابھی کہاں جا رہے ہو؟"

"بتایا تو ہے... تم چلو گی؟"

"کیوں نہیں، میں اسی لیے تو آئی ہوں۔ بور ہو رہی تھی، سوچا تمہارے ساتھ کہیں باہر جاتی ہوں۔"

کیونکہ شامی کا کوئی خاص پروگرام نہیں تھا اس لیے اسے نوشی کے ساتھ جانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا مگر وہ عادت سے مجبور تھا اس لیے چھیڑ کر رہا تھا۔ نوشی تیار ہو کر آئی تھی اور اچھی لگ رہی تھی۔ شامی نے کار نکالی۔

"کہاں چلیں؟"

"آج سردی ذرا کم ہوئی ہے، کیوں نہ مارگلہ کے اوپر چلیں؟"

شامی نے دامنِ کوہ کا انتخاب کیا۔ نوشی خوش ہو گئی۔ "پیر سوہاوا چلتے ہیں۔"

"سوری، اس میں اتنے چکر آتے ہیں کہ اوپر جاتے جاتے مجھے چکر آنے لگتے ہیں۔" شامی نے انکار کر دیا۔

"میں ڈرائیونگ کر لوں گی۔"

"تب ٹھیک ہے۔"

ایک گھنٹے بعد وہ پیر سوہاوا پر تھے۔ اسلام آباد کے عین اوپر یہ جگہ کوئی ساڑھے چار ہزار فٹ بلند ہے اور یہاں گرمیوں میں بھی موسم خوش گوار ہوتا ہے۔ اس وقت خاصی سردی تھی اور اسی وجہ سے وہاں زیادہ رونق نہیں تھی۔ وہ ایک ریستوران میں چلے آئے۔ شامی نے نوٹ نہیں کیا تھا کہ اس سفر کے دوران ایک گاڑی ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس گاڑی میں پیچھا کرنے والے دو افراد اس وقت بھی ریستوران کے باہر گاڑی میں موجود تھے۔ انہوں نے کافی اور سینڈوچز منگوائے۔ نوشی نے کہا۔ "کل تم دونوں خاموشی سے شکار پر چلے گئے اور مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"ہاں، پروگرام اچانک بنا تھا۔" شامی نے بہانہ بنایا۔

"جھوٹ مت بولو۔ تم مجھے لے جانا ہی نہیں چاہتے تھے۔"

"تو شکار پر تمہارا کیا کام؟"

"میرا نشانہ تم سے اچھا ہے۔" وہ چیلنج کرتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے، آئندہ جب بھی شکار کا پروگرام بنا، تمہیں لے جائیں گے اور تم اپنا نشانہ آزما لینا۔"

"آئندہ کیوں؟ کل ہی چلتے ہیں۔" نوشی نے تجویز پیش کی۔ "ورنہ چند دن بعد شکار کا سیزن ہی ختم ہو جائے گا۔"

خود شامی کا دل بھی شکار کے لیے تڑپ رہا تھا۔ اسے کل کا واقعہ اب تک کھل رہا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے، میں تیمور سے بات کرتا ہوں۔"

"اس سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم اس سے چلنے کو کہو۔"

"نہیں، پہلے اس کی مصروفیت معلوم ہو گی، تب ہی پروگرام بن سکتا ہے۔" شامی نے بات ختم کر دی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ گئے۔ نوشی خوش تھی، اس نے واپسی میں شامی سے کہا۔

"کتنے دن بعد ہم اس طرح سے تفریح پر نکلے ہیں۔"

"سپر مارکیٹ کی چاٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" شامی نے اسے مزید خوش کرتے ہوئے کہا۔ انہوں نے سپر مارکیٹ سے چاٹ کھائی پھر کچھ شاپنگ کی۔ شامی نے نوشی کو پرفیوم گفٹ کیا اور نوشی نے اس کے لیے شرٹ لی۔ واپسی پر وہ بہت خوش تھے۔ شامی نے اس بار بھی نوٹ نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا کہ اس کی گاڑی کے پیچھے ایک نہیں دو گاڑیاں ہیں۔

☆☆☆

شکیلہ اور شاہ جی، شامی کی بے خبری میں اس کی کار کے تعاقب میں تھے اور وہ خود بے خبر تھے کہ ان کے پیچھے بھی ایک گاڑی ہے۔ جس وقت شامی اور نوشی ریستوران میں بیٹھ کر بات کر رہے تھے تو شاہ جی ان کی میز کے پاس ہی موجود تھا۔ اس نے ان دونوں کی تمام گفتگو سنی تھی۔ واپسی پر اس نے شکیلہ کو رپورٹ دی۔ اس نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ”اس کا مطلب ہے، یہ دوبارہ اسی جگہ شکار کھیلنے جائیں گے۔“

شاہ جی نے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ ان کو گھیرنے کا اچھا موقع ہوگا۔“

”لیکن شکار کا پروگرام نہ بنا تو...؟“

”تب کچھ اور سوچیں گے۔“ شاہ جی نے جواب دیا۔ ”اب ہمیں ان پر مکمل نظر رکھنی ہوگی۔“

شکیلہ اور اس کا ساتھی بے خبر تھے کہ نہ صرف ان کا تعاقب کیا جا رہا تھا بلکہ ان کی گاڑی بھی ”بگ“ کر دی گئی تھی۔ چھوٹے سے بٹن کے سائز کا یہ ”بگ“ ایک بار لگانے کے بعد بارہ گھنٹے تک کام کرتا تھا اور ان کی گفتگو کا ایک ایک لفظ نشر ہو رہا تھا۔

☆☆☆

سیاہ ٹوپی والے اور اس کے ساتھی نے ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ غور سے سنا۔ گفتگو کے اختتام پر انہوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ ”شکارگاہ والا پروگرام ٹھیک رہے گا؟“ سیاہ ٹوپی والا بولا۔

”اس کے مقابلے میں ان کو کام کرنے دو، جب یہ اپنا کام کر جائیں تو ہم حرکت میں آجائیں گے۔ اس وقت ان سے بھی نمٹ لیں گے اور گولڈن آئی بھی حاصل کر لیں گے۔“

سیاہ ٹوپی والے کو یہ آئیڈیا پسند آیا کیونکہ اس طرح وہ گولڈن آئی تو حاصل کرتے ہی ساتھ ہی وہ یہ بھی جان سکتے تھے کہ گولڈن آئی کیا چیز ہے اور اس کے پیچھے مقصد کیا تھا۔ وہ اسی میدان کے کھلاڑی تھے اور اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اصل چیز مقصد ہے نہ کہ گولڈن آئی جیسی کوئی چیز۔ یہ صرف مقصد کی طرف اشارہ تھا۔ اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، ہم ان کے پیچھے رہیں گے اور جیسے ہی موقع آئے گا، ہم حرکت میں آجائیں گے۔“

☆☆☆

تیمور، نوشی کی شمولیت کا سن کر بدک گیا۔ ”اس کا جانا ضروری ہے؟“

”بالکل ضروری ہے۔“ شامی نے کہا تو تیمور نے شک سے اسے دیکھا۔

”تیرا دماغی توازن درست ہے؟ تُو کل نوشی کے ساتھ باہر گیا تھا... کیا اس نے کچھ کھلا دیا ہے؟“

”نہیں کھلایا تو میں نے تھا... اور میرا دماغی توازن بالکل درست ہے۔“

تیمور دنگ رہ گیا۔ ”تُو نے کھلایا اور تُو پھر بھی کہتا ہے کہ تیرا دماغی توازن درست ہے؟“

”یار! وہ باقاعدہ نہ سہی میری بے قاعدہ گرل فرینڈ ہے۔“ شامی نے دفاعی انداز میں کہا۔ ”اس کا حق بنتا ہے۔“

”اور یہ حق تجھے کل یاد آیا... اس سے پہلے یاد نہیں آیا تھا؟“ تیمور نے طنز کیا۔

”ہاں کیونکہ کل وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی اور اس نے کوئی جلی کٹی بات بھی نہیں کی۔“

تیمور نے گہری سانس لی۔ ”ایک بار پھر ثابت ہو گیا کہ عورت چاہے تو کسی کو بھی سدھار سکتی ہے، چاہے وہ تُو ہی کیوں نہ ہو... لیکن یہ شکار پر اسے لے جانے کی کیا تُک ہے؟“

”نوشی کا دعویٰ ہے کہ اس کا نشانہ مجھ سے بہتر ہے اس لیے ہم فیصلہ کریں گے کہ کس کا نشانہ بہتر ہے۔“

”اس کے لیے اتنی دور جانے کی تکلیف کیوں کر رہے ہو؟ میں تم دونوں کو یہیں رائفل وغیرہ دے دیتا ہوں، اپنا نشانہ آزما لو۔ بچنے والا جیت جائے گا۔“

شامی نے کھا جانے والی نظروں سے تیمور کو دیکھا۔

”تیری باری میں جوتیاں چل رہی ہوں گی اور جو زیادہ مارے گا، وہ جیت جائے گا۔“

”چل جوتیاں ہی سہی لیکن نوشی کو لے جانا ممکن نہیں ہے۔“

”نوشی جائے گی ورنہ شکار نہیں ہوگا۔“ شامی نے اعلان کیا۔

اس پر دونوں میں مختصر سی جھڑپ ہوئی۔ تیمور نے واک آؤٹ کیا اور شامی نے فیصلہ کیا کہ وہ نوشی اور جوجی کو لے کر جائے گا۔ اس نے نوشی کو کال کی۔ ”ویک اینڈ پر شکار پر چلنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”اچھا خیال ہے لیکن کیا تیمور کل یونیورسٹی نہیں جائے گا؟“

”کیوں نہیں جائے گا۔“ شامی نے کہا۔

”یعنی وہ ہمارے ساتھ نہیں جائے گا؟“

”ہاں۔“ شامی نے سرسری انداز میں کہا۔ ”تم تیار رہنا... اور ہاں، رائفل ہے یا میں تیمور کی رائفل ساتھ لے لوں؟“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ پاپا نے دو سال پہلے مجھے ونچسٹر پوائنٹ ٹو ایٹ منگوا کر دی ہے۔ شکار کے لیے بہترین چیز ہے۔“ نوشی بولی اور پھر کسی قدر ہچکچا کر پوچھا۔ ”بس ہم دونوں ہی ہوں گے؟“

شامی کسی قدر بھنا گیا۔ ”میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گا۔ ویسے جوجی بھی ساتھ ہوگا۔“

نوشی نے خوش ہو کر کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے، جوجی مجھے بہت پسند ہے۔ کتنا کیوٹ ہے۔“

”لیکن بچہ نہیں ہے۔“ شامی نے اسے خبردار کیا۔ ”برخوردار لڑکی کے چکر میں گھر سے بھاگ چکے ہیں۔“

”تو کیا ہوا... آج کل تو بچے پیدا ہوتے ہی گھر سے بھاگنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔“

”کہیں یہ شکار میرا بیڑا غرق نہ کر دے۔“ شامی نے مُردہ لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔ تیمور باہر سے آیا تو شامی نے اسے مطلع کیا۔ ”آنے والے ویک اینڈ پر ہم شکار کے لیے جا رہے ہیں۔“

”میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔“ تیمور سنجیدگی سے بولا۔ وہ شامی کا خدشہ دہرا رہا تھا۔ ”ہم ایک معاملے میں ملوث ہیں اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کچھ لوگ ہماری تاک میں ہوں۔“

”بات پرانی ہو چکی ہے۔“ اب شامی بے پروا تھا۔ ”اگر ہمارے پیچھے کوئی ہوتا تو اب تک سامنے آچکا ہوتا۔“

”ممکن ہے اسے ابھی تک موقع نہ ملا ہو کیونکہ ہم زیادہ تر گھر میں اور پھر شہر میں رہے ہیں۔ لیکن وہ جگہ ویران ہے۔ وہاں وہ کھل کر کارروائی کر سکتے ہیں۔“

”بس بھائی میں ڈر گیا۔“ شامی نے استہزائیہ انداز میں کہا تو تیمور بھنا کر پھر واک آؤٹ کر گیا۔

”ٹھیک ہے مرو اور جب پھنس جاؤ تو مزے کرنا۔ وہ لڑکی بھی تو ہوگی ان میں۔“

”تو بھول رہا ہے میرے ساتھ نوشی بھی جائے گی۔“ شامی نے پیچھے سے چلا کر کہا لیکن تیمور جا چکا تھا۔ شامی ویسے تو اس کا مذاق اڑا رہا تھا مگر اس کے جانے کے بعد وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ محتاط رہے گا۔ پھر اس نے جوجی کو کال کی۔ ”آنے والے ویک اینڈ پر ہم پھر شکار پر جا رہے ہیں۔“

”مجھے تو معاف رکھیں۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”ایک بار اللہ نے بچا لیا، بار بار بچت نہیں ہوتی۔“

”بچت ہو یا نہ ہو، تمہیں چلنا تو پڑے گا۔“ شامی نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

”میں نہیں جاؤں گا۔“ جوجی نے صاف انکار کر دیا۔

”ٹھیک ہے، میں تمہارے اباجی سے بات کرتا ہوں۔“ شامی نے چالاکی سے کہا۔ جوجی فکرمند ہو گیا۔

”اباجی سے کیوں؟“

”تمہارے بارے میں بہت ساری باتوں کا انہیں علم نہیں ہے اور میرے خیال میں یہ علم ہو جانا چاہیے۔“

جوجی بلبلا گیا۔ ”آپ مجھے بلیک میل کر رہے ہیں؟“

”یہ تمہاری خوش قسمتی ہے برخوردار... ہم ہر کسی کو بلیک میل نہیں کرتے۔“ شامی نے شاہانہ انداز میں کہا۔

”آپ اباجی سے بات نہ کریں۔“ وہ رو دینے والے انداز میں بولا۔ ”میں چلنے کے لیے تیار ہوں لیکن یہ آپ اچھا نہیں کر رہے ہیں۔ میں آپ سے بدلہ ضرور لوں گا۔“

”تمہیں اجازت ہوگی۔“ شامی نے فراخ دلی سے کہا۔ ”کیونکہ نوشی بھی ساتھ جا رہی ہے اس لیے صرف دن کا پروگرام ہے۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے وہاں پہنچنا ہوگا۔ چھ بجے تک تیار ملنا۔“

”نوشی جی بھی جا رہی ہیں؟“ جوجی ذرا خوش ہوا۔

”تم اتنا خوش کیوں ہو رہے ہو؟“ شامی نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

”میں تو سمجھ رہا تھا کہ بس آپ کی اور تیمور صاحب کی شکلیں دیکھنا پڑیں گی۔“

”ہماری شکلیں اتنی بُری بھی نہیں ہیں... اور تیمور نہیں جا رہا۔“

”تب ٹھیک ہے، آپ شکار کیجیے گا اور میں نوشی جی کا دل بہلاؤں گا۔“

”یہ سچ مچ بدمعاش ہے۔“ شامی نے فون بند کر کے خود سے کہا۔ ”ذرا بچ کر رہنا ہوگا۔“

☆☆☆

نوشی نے اپنا بیگ منی پجیرو کے پچھلے حصے میں ڈالا جہاں شامی کا سامان پہلے ہی رکھا ہوا تھا۔ شامی نے کہا۔ ”تم نے کل کم سے کم دو درجن شاٹ مارے ہوں گے اپنے لان پر۔“

”ہاں، پریکٹس کر رہی تھی۔ بہت دنوں سے آؤٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آف پریکٹس ہوں۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''تم نے تو پریکٹس کی ہوئی ہے۔''

''نہیں، اس دن ایک ہی شاٹ چلایا تھا کہ مسئلہ ہو گیا۔''

''کیسا مسئلہ؟''

شامی نے اسے تفصیل سے بتایا کہ اس دن ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ نوشی حیرت اور دلچسپی سے سن رہی تھی۔ آخر میں اس نے شکوہ کیا۔ ''تم نے مجھے نہیں بتایا؟''

''خیال نہیں رہا۔''

''تم نے پولیس کو کیسے اطلاع دی؟''

''ایک ایسے نمبر سے جو میرے نام پر نہیں ہے۔'' شامی ہنسا۔

''وہ سکہ کیسا ہے؟''

''واپسی پر دکھاؤں گا، تیمور کے پاس ہے۔ ویسے مجھے خاص نہیں لگ رہا ہے۔ شروع میں ایسا لگا تھا جیسے کوئی زیرو زیرو سیون ٹائپ کی جاسوسی کا معاملہ ہو۔''

''ممکن ہے سچ ہو۔''

''تم تو تیمور والی بات کر رہی ہو۔ پہلے وہ مان نہیں رہا تھا اور بعد میں اسے فکر لگ گئی کہ ہم وہیں جا رہے ہیں جہاں یہ سارا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ وہ لوگ جو ان دونوں مرڈر کے ذمے دار تھے، وہاں ہمارے منتظر ہوں گے۔''

''یہ ہو سکتا ہے کہ وہ منتظر ہوں۔''

شامی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''وہ کوئی جادوگر ہیں جو پہلے سے جانتے ہیں کہ ہم وہاں آ رہے ہیں؟''

''نہیں، فرض کرو اگر معاملہ سچ مچ زیرو زیرو سیون والا ہوا تو ان کے پاس ایسے ذرائع ہوتے ہیں... اور ہمارا ملک ویسے ہی آج کل بین الاقوامی خفیہ تنظیموں کا اکھاڑا بنا ہوا ہے۔'' نوشی کے لہجے میں سنجیدگی تھی، شامی بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

''تمہارا مطلب ہے ہمیں وہاں نہیں جانا چاہیے؟''

''نہیں، جانا تو چاہیے لیکن ہمیں محتاط بھی رہنا چاہیے۔''

شامی نے سر ہلایا۔ وہ جوجی کے گھر کے پاس پہنچ گئے تھے۔ ابھی تاریکی تھی اور سورج طلوع ہونے میں بھی وقت تھا۔ جوجی ان کو دروازے پر تیار ملا۔ اس کا باپ رشید بلا بھی آیا تھا۔ شاید وہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ جوجی شامی کے ساتھ ہی جا رہا ہے۔ وہ شامی سے گرم جوشی سے ملا اور اس کی میزبانی پر آمادہ تھا۔ شامی نے بمشکل اسے ٹالا کہ انہیں سورج نکلنے سے پہلے شکار گاہ تک پہنچنا ہے۔ جوجی کو لے کر وہ روانہ ہوئے۔ اتنی صبح سڑکیں صاف تھیں اس لیے شامی بے فکری سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ نوشی اس کے برابر میں تھی اور جوجی پیچھے تھا۔ اچانک نوشی نے کہا۔

''ایک سیاہ گاڑی بہت دیر سے ہمارے پیچھے ہے۔''

''میں دیکھ رہا ہوں لیکن یہ مری ہائی وے ہے اور یہاں گاڑیاں چلتی رہتی ہیں۔''

وہ راول چوک سے مڑے تو گاڑی سیدھی نکل گئی۔ شامی نے گہرا سانس لیا۔ ''دیکھا، یہ عام سی گاڑی تھی۔''

نوشی بھی مطمئن ہو گئی۔ جب وہ جھیل کے پاس پہنچے تو صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ نوشی ناشتا بنوا کر لائی تھی لیکن شامی نے کہا۔ ''پہلے ہم شکار کے لیے جگہ تلاش کریں گے اور اس کے بعد ناشتا کریں گے۔''

وہ جگہ خالی تھی جہاں انہوں نے ایک ہفتہ پہلے شکار کرنے کی کوشش کی تھی اور فوراً ہی لاش والا واقعہ ہو گیا تھا۔ جوجی پریشان تھا۔ اس نے شامی سے کہا۔ ''جناب! اس بار دیکھ کر گولی چلایئے گا۔''

''بکومت۔'' شامی کا موڈ خراب ہو گیا۔ ''تمہارے خیال میں وہ میری گولی سے مرا تھا؟ تم نے دوسرا مرا ہوا آدمی نہیں دیکھا اور پولیس رپورٹ نہیں دیکھی۔''

''جی دیکھی ہے لیکن احتیاط پھر بھی اچھی چیز ہے۔'' جوجی بولا۔

شامی نے جیپ ایک جگہ روکی۔ وہ نیچے اتر آئے۔ شامی اور نوشی نے اپنی رائفلیں نکال لی تھیں۔ وہ جھیل کے ساتھ ساتھ سرکنڈوں اور گھاس میں چل پھر کر شکار کے لیے موزوں جگہ تلاش کرنے لگے۔ پانی بہت ساری جگہوں سے نظر آ رہا تھا لیکن یہ شکار کے لیے موزوں جگہ نہیں تھی کیونکہ مارے جانے والے پرندے پانی سے کون لاتا۔ انہیں ایسی جگہ کی تلاش تھی جو خشکی کے پاس ہو اور شکار کیا ہوا پرندہ انہیں آسانی سے مل جائے۔ روشنی ہوتے ہی پرندوں کی ڈاریں پرواز کرنے لگیں۔ لیکن ایک ہفتے پہلے کے مقابلے میں پرندے کم تھے۔ نوشی نے کہا۔ ''ان کے لیے تو چھرے والے کارتوس اور شاٹ گن لانی چاہیے تھی۔''

''میں شکار کا قائل ہوں... قتلِ عام کا نہیں۔'' شامی نے جواب دیا۔ ''چھرے والے کارتوس سے بیک وقت درجن پرندے مارے جاتے ہیں لیکن شکار کا مزہ نہیں آتا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، شکار کا مزہ سنگل شاٹ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔"

"میرے خیال میں تو چھرّے والا ٹھیک ہے، اس میں بندہ نہیں مرتا بس زخمی ہو جاتا ہے۔" جوجی بولا تو شامی بھنا گیا۔

"تم اپنی چونچ بند رکھو۔"

"ہاں، تم چپ رہو۔" نوشی نے اسے چکارا۔ "تمہیں شکار کا پتا نہیں ہے۔"

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" جوجی نے منمنا کر کہا۔

"بس کوئی جگہ تلاش کر لیں تو واپس جا کر.... ناشتا کرتے ہیں۔"

☆☆☆

شکیلہ اور ماجی جھیل سے ذرا دور ایک ٹیلے پر اُگی ہوئی جھاڑیوں میں روپوش تھے اور دوربین سے شامی اینڈ پارٹی کا جائزہ لے رہے تھے۔ شکیلہ کے ہاتھ میں ایک واکی ٹاکی تھا۔ اس نے شاہ جی سے پوچھا۔ "تمہیں یقین ہے، ان تینوں کے سوا اور کوئی نہیں ہے؟"

"میں گھر سے ان کے پیچھے رہا ہوں اس لیے یقین سے کہہ سکتا ہوں۔" واکی ٹاکی پر موجود شاہ جی نے جواب دیا۔ "آگے کا کیا پروگرام ہے؟"

"ہم انہیں پوائنٹ گیارہ لے جائیں گے اور وہاں ان سے گولڈن آئی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"اگر وہ ان کے پاس نہ ہوئی تو....؟"

"تب جہاں ہوگی، وہاں سے منگوا کر دیں گے۔" شکیلہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ "ہمیں بہرصورت وہ واپس لینی ہے۔"

شکیلہ نے واکی ٹاکی رکھ دیا۔

"مجھے ایک شبہ ہو رہا ہے۔" ماجی نے کچھ دیر بعد کہا۔

"کیسا شبہ؟"

"مجھے لگ رہا ہے، ہماری نگرانی کی جا رہی ہے۔ راستے میں کبھی کبھی ایک وین دکھائی دیتی تھی۔ اس کے علاوہ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ کچھ لوگ ہماری تاک میں ہیں۔"

"مقامی ایجنسی کے لوگ؟" شکیلہ بولی

"نہیں، ان کا یہ انداز نہیں ہوتا۔ مجھے سرحد پار والوں پر شبہ ہو رہا ہے۔"

"ان کا گروپ تو ہم نے ختم کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ساگر آخری فیلڈ ورکر تھا۔"

"ہو سکتا ہے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے، ان میں سے کچھ باقی ہوں اور وہ ہماری تاک میں ہوں۔ اس لڑائی میں ہمارا گروپ بھی تو تقریباً ختم ہو گیا ہے۔"

"بس ہم تین باقی ہیں۔" شکیلہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اسی طرح ان کے بھی دو تین آدمی باقی ہو سکتے ہیں۔"

"ہماری جیسی آرگنائزیشن میں آخری آدمی بھی اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی جدوجہد کرتا ہے۔" ماجی نے کہا۔ "جیسے ہم کوشش کر رہے ہیں۔ اسی طرح ہمارے مخالف بھی کوشش کر رہے ہوں گے۔"

شکیلہ اب دوربین سے نیچے دیکھ رہی تھی۔ شامی، نوشی اور جوجی جھیل کے کنارے چل رہے تھے۔ ان کے پاس رائفلیں تھیں اور وہ یقیناً شکار کے لیے موزوں جگہ تلاش کر رہے تھے۔ ماجی بولا۔ "انہیں قابو کیسے کرنا ہے؟ یہ مسلح ہیں، مزاحمت کر سکتے ہیں۔"

"ریڈ آرٹونٹی استعمال کریں گے۔"

"وہ کیسے؟" ماجی بولا۔ "بے شک یہ بہت زود اثر گیس ہے لیکن کھلی فضا میں کیسے کام کرے گی؟"

"کرے گی۔" شکیلہ نے کہا اور اپنی جیکٹ سے ایک چھوٹی سیاہ ٹیبل ٹینس کے سائز کی گیند نکالی۔ "یہ تین سیکنڈ میں سو مربع فٹ جگہ میں اتنی گیس پھیلا سکتی ہے کہ اس جگہ موجود ہر انسان دس سیکنڈ میں بے ہوش ہو جائے۔"

"اب کام آسان ہو گیا، اس کا ریموٹ ہے؟" ماجی خوش ہو گیا۔

"بالکل... اس کے بغیر کیسے کام کرے گا۔" شکیلہ نے جیب سے انگلی کے برابر ایک چھوٹا سا ٹارچ نما آلہ نکالا۔ "اسے ان کی گاڑی کے پاس پہنچا دو۔"

ماجی نے سر ہلایا اور اس سے گیند لے کر ٹیلے سے نیچے اتر گیا۔

☆☆☆

اس ٹیلے سے تقریباً دو سو گز دور ایک بلند پہاڑی کے اوپر سرحد پار والی ٹیم کے دو ارا کین موجود تھے۔ یہ پہاڑی جھیل کی طرف آنے والے راستے کے ساتھ تھی اور اس کی جھاڑیوں میں ان کی گاڑی چھپی ہوئی تھی۔ ان میں سیاہ ٹوپی والے کا نام اگرکار تھا۔ سفید جیکٹ والا جوان سے دور اپنی وین میں تھا، اس کا نام ارون تھا اور اگرکار کے ساتھ موجود شخص نوشاد تھا۔ ارون سے ان کا واکی ٹاکی پر رابطہ تھا۔ ارون اپنی وین میں شکیلہ کے گروپ کی گفتگو بھی سن رہا تھا۔ پوائنٹ گیارہ کا ذکر سن کر نوشاد چونک گیا۔

"ہم اس جگہ سے واقف ہیں؟"

اگرکار نے سر ہلایا۔ "ہاں، ہم ایک سال پہلے یہاں ریڈ کر چکے ہیں۔"

"ہماری ہمالیہ والوں سے لڑائی اس کے بعد ہی شروع ہوئی تھی؟"

"ہاں، یہاں ان کے گروپ کا سرغنہ موجود تھا لیکن وہ ہاتھ نہیں آیا۔"

"مارے جانے والوں میں بھی وہ شامل نہیں ہے؟"

"شاید اپنے ساتھیوں کی ہلاکت پر اسے واپس بلا لیا گیا ہو اور اب سربراہ کوئی اور ہو۔"

"ہمالیہ والے یہاں چھپ کر کیا کر رہے ہیں؟" نوشاد پُرخیال انداز میں بولا۔ "اس ملک سے ان کے انتہائی دوستانہ تعلقات ہیں۔"

"ہاں لیکن تم بھول رہے ہو کہ واحد سپر پاور کا یہاں بہت اثر رسوخ ہے اور ہمالیہ والے اس اثر رسوخ کی نگرانی کرتے ہیں کیونکہ اس کا اثر براہِ راست ان پر پڑتا ہے۔"

"بات سمجھ میں آتی ہے۔" نوشاد نے سر ہلایا۔ "لیکن انہوں نے ہمارے معاملے میں مقامی ایجنسیوں سے مدد لینے کی کوشش نہیں کی؟"

"اس قسم کے معاملات دوستوں سے بھی پوشیدہ رکھے جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے، یہ ہماری طرح چھپ کر رہتے ہوں گے۔"

"اسی وجہ سے ہمیں ان کا صفایا کرنے میں آسانی رہی۔"

اگرکار نے نفی میں سر ہلایا۔ "لیکن ہمارا بھی صفایا ہو گیا۔ میرا خیال ہے، اس مشن کے بعد ہمیں واپس بلا لیا جائے گا۔"

"کوئی دوسرا گروپ بھیجا جائے گا؟"

اگرکار نے دوربین آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ "دوسرا... تیسرا اور نامعلوم تعداد میں گروپس یہاں پہلے سے موجود ہیں۔ اوپر والے کسی ایک پر تکیہ کر کے نہیں بیٹھتے۔ ہمارے ذمے جو کام تھے، اب وہ دوسروں کو دیے جا چکے ہوں گے۔"

ان تینوں کے حلیوں اور بات چیت سے قطعی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ ان کا تعلق سرحد پار سے ہے۔ وہ یہیں کے شہری لگتے تھے۔ ان کی تربیت یقیناً بڑی محنت سے کی گئی تھی۔ اگرکار دوربین سے نیچے موجود دونوں گروپس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ نوشاد نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ "یہ انہیں قابو کیسے کریں گے؟"

"دیکھتے ہیں، ان کے پاس کوئی نہ کوئی لائحہ عمل تو ہو گا۔"

کچھ دیر بعد لڑکی نے اپنے ساتھی کو کوئی چیز دی اور وہ اسے لے کر ٹیلے سے نیچے اترا اور چھپ کر اس طرف جانے لگا جہاں منی پجیرو کھڑی تھی۔ اگرکار غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نوشاد بھی متوجہ تھا۔ اگرکار اسے بتا رہا تھا۔ "وہ جیپ کی طرف جا رہا ہے... اوہ... اس نے کوئی چھوٹی سی گیند نما چیز جیپ کے نیچے رکھی ہے۔"

"یہ گیس بم ہوگا۔" نوشاد نے تبصرہ کیا۔

"میرا خیال ہے، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ انہیں گیس سے بے بس کرنے جا رہے ہیں۔" اگرکار نے دوربین سے دیکھنا جاری رکھا۔ "وہ واپس نہیں گیا ہے۔ وہیں ایک جگہ جھاڑی میں دبک گیا ہے۔"

"یہ حملہ کرنے جا رہے ہیں۔" نوشاد نے کہا اور واکی ٹاکی اٹھا کر ارون سے رابطہ کیا۔ "میرا خیال ہے، وہ حرکت میں آنے والے ہیں۔ اگر انہیں لے جانے کی کوشش کی گئی تو تم نے پیچھا کرنا ہے۔"

"تم لوگ بھی پیچھے رہو۔ ویسے میں نے ان کی گاڑی بھی دیکھ لی ہے۔ اس جگہ کچھ دور درختوں کے درمیان کھڑی ہے۔ اس میں ان کا ایک آدمی ہے۔"

"گویا تین کے مقابلے میں تین ہیں۔" نوشاد ہنسا۔

"لیکن ان میں ایک خوب صورت لڑکی ہے۔" ارون کا لہجہ معنی خیز تھا۔ "اسے ان میں سے مائنس کر دو۔"

نوشاد سنجیدہ ہو گیا۔ "اس کی خوب صورتی پر مت جاؤ۔ یہ کسی ناگن کی طرح خوب صورت ہے جس میں موت بھرا زہر ہوتا ہے۔"

"دیکھیں گے۔" ارون بولا۔ "میں ہوشیار ہوں۔ جیسے ہی یہ روانہ ہونے لگیں، مجھے بتا دینا۔"

نوشاد کو خیال آیا۔ "سنو، کسی طرح ان کی گاڑی میں انڈی کیٹر لگ سکتا ہے؟"

"رسکی ہے لیکن میں کوشش کر سکتا ہوں۔"

"خطرہ مول لیے بغیر کوشش کرو۔" نوشاد نے کہا۔ "اگر ذرا بھی خطرہ محسوس کرو تو پیچھے ہٹ جانا۔ تمہارے پاس دس منٹ سے زیادہ کا وقت نہیں ہے، اس کا بھی خیال رکھنا۔"

ارون چلا گیا۔ اگرکار نے اس کی طرف دیکھا۔ "اس موقع پر یہ مناسب ہوگا؟"

"تبھی میں نے اسے دس منٹ کا وقت دیا ہے۔ اتنا وقت تو یہاں کسی کارروائی میں گزر جائے گا اور اس کے بعد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی ان کو روانہ ہوتے ہوتے پانچ چھ منٹ ضرور لگیں گے۔"
اگرکار نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر انہوں نے اسی جیپ میں روانگی اختیار کی تو ایک منٹ بھی نہیں لگے گا۔"
"یہ تو میرے ذہن میں آیا ہی نہیں۔" نوشاد بولا اور تیزی سے واکی ٹاکی اٹھا کر ارون سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ شاید واکی ٹاکی اپنی گاڑی میں چھوڑ گیا تھا۔ اس ناکامی پر وہ دونوں ہی فکر مند ہو گئے۔

☆☆☆

شامی نے ایک جگہ منتخب کر لی تھی اور نوشی نے بھی اس سے اتفاق کیا جس پر زیادہ خوشی جوجی کو ہوئی تھی کیونکہ اس کا بھوک سے بُرا حال تھا۔ صبح سویرے اتنی پریڈ کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ جیپ کی طرف واپس جاتے ہوئے وہ آگے آگے تھا۔ نوشی ہاٹ پاٹ میں پراٹھے اور خاگینہ بنوا کر لائی تھی۔ اس کے ساتھ ہنی کیک اور پھر گرما گرم چائے اور کافی سے بھرے تھرماس تھے۔ شامی نے پوچھا۔ "ناشتا کہاں کریں گے؟"
"میں پلاسٹک کا بڑا سا دستر خوان لائی ہوں، زمین پر بچھا کر اس پر ناشتا کریں گے۔"
نوشی نے جیپ کے پچھلے حصے سے دستر خوان نکالا۔ جوجی بقیہ چیزیں نکالنے جا رہا تھا، اسی لمحے شامی ان کے قریب آیا اور فوراً ہی ایسی تیز سیٹی نما آواز آئی جیسے کہیں پریشر سے ہوا خارج ہو رہی ہو۔ شامی چونکا اور پھر وہ کچھ کہنے والا ہی تھا کہ اس کا سر چکرا گیا۔ وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن تیز بو دماغ پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ نیچے گرنے سے پہلے اس نے دیکھا جوجی اور نوشی پہلے ہی گر چکے تھے۔ جوجی کے ہاتھ سے ناشتے کا سامان بھی گر گیا تھا۔ پھر شامی کو ہوش نہیں رہا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے وہ ہوش و حواس کو خیر باد کہہ چکے تھے۔ کچھ دیر بعد نزدیکی جھاڑیوں سے ماجی برآمد ہوا اور اس نے ان تینوں کا معائنہ کر کے واکی ٹاکی پر شکیلہ کو رپورٹ دی۔ اس نے کہا۔ "میں آ رہی ہوں۔ شاہ جی سے کہو ہمیں روانہ ہونا ہے۔ ان کو جیپ میں لے جائیں گے اور راستے میں انہیں اپنی گاڑی میں منتقل کریں گے۔"
جب تک شکیلہ نیچے آئی، ماجی نے شاہ جی کو مطلع کر دیا تھا اور وہ روانگی کے لیے تیار تھا۔ شکیلہ نے ان کے پاس آ کر تینوں کا الگ الگ معائنہ کیا اور مطمئن ہو کر بولی۔ "انہیں چار گھنٹے سے پہلے ہوش نہیں آئے گا۔"
"اتنا وقت کافی ہے انہیں پوائنٹ گیارہ منتقل کرنے کے لیے۔" ماجی نے کہا۔ "لیکن پوائنٹ گیارہ کا استعمال مناسب ہوگا؟ یہ جگہ دشمن کی نظر میں آ چکی ہے اور اس پر حملے کے بعد ہی میک غائب ہوا تھا۔"
میک ان کا سربراہ تھا جس کے بارے میں فرض کر لیا گیا تھا کہ وہ دشمنوں کے ہاتھ لگ گیا ہے اور اسی سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں دشمنوں نے ان کے گروپ کا صفایا کر دیا تھا۔ اس بات کو ایک سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ تب سے وہ مسلسل کشمکش میں تھے۔ اب یہ کشمکش اپنے آخری مرحلے میں تھی۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ کون اس مرحلے سے گزر کر زندہ اپنے وطن واپس جائے گا اور کون ہمیشہ کے لیے یہیں کہیں دفن ہو جائے گا۔ ماجی نے نہایت پھرتی سے ان تینوں کو جیپ کے عقبی حصے میں ڈالا۔ یہاں گنجائش کم تھی اس لیے وہ تینوں ایک دوسرے کے اوپر آ گئے تھے۔ نوشی کو لڑکی ہونے کی وجہ سے رعایت ملی تھی۔ اسے سب سے اوپر رکھا گیا تھا۔ اس کے نیچے جوجی تھا اور شامی سب سے نیچے تھا۔ لیکن انہیں سچویشن کا ہوش ہی کہاں تھا۔ شکیلہ فرنٹ سیٹ پر آئی اور ماجی نے ڈرائیونگ سنبھالی۔ چابیاں اسے شامی کے پاس سے مل گئیں۔ ان کی رائفلیں بھی اس نے جیپ میں ڈال لی تھیں۔ روانگی سے پہلے ماجی نے کہا۔ "ہماری گاڑی کا کیا ہوگا؟"
"تم مجھے اتار دینا، میں لے کر آؤں گی۔"
وہ دونوں جس گاڑی میں یہاں پہنچے تھے، وہ کچھ ہی دور جھاڑیوں میں موجود تھی۔ یہ چھوٹی اور نیچی چھت والی جیپ تھی۔ اس کا گہرا سبز رنگ آرام سے جھاڑیوں کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ وہ بالکل پاس جا کر ہی نظر آتی۔ ماجی نے جیپ روکی تو شکیلہ اتر گئی۔ اس نے کہا۔ "میں آگے چلوں گی اور جیسے ہی ہم اپنی گاڑی تک پہنچیں گے، انہیں اس میں منتقل کر دینا۔ یہ کام اسی جگہ بہتر رہے گا۔"
ماجی نے سر ہلایا۔ یہ جگہ ویران تھی اور اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ کوئی انہیں دیکھ لے۔ آگے سڑکوں پر دیکھ لیے جانے کا خدشہ تھا۔ شکیلہ اپنی جیپ لے کر آگے روانہ ہوئی اور ماجی نے اس کی پیروی کی۔ دس منٹ بعد وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں شاہ جی بڑی گاڑی لیے موجود تھا۔ ماجی اور اس نے مل کر تیزی سے ان تینوں کو گاڑی کے عقبی حصے میں منتقل کیا، یہاں جگہ کھلی تھی۔ پھر ان پر ترپال ڈال دی۔ اس دوران میں شکیلہ نے شامی کی جیپ کو راستے سے ہٹا کر جھاڑیوں میں لاک کر کے کھڑا کر دیا اور چابیاں اندر ہی لگی رہنے دیں۔ جب تک کوئی جھاڑیوں میں آ کر نہ دیکھتا، اسے پتا بھی نہیں چلتا کہ یہاں کوئی گاڑی کھڑی ہے۔

دو منٹ کے اندر یہ سارا کام نمٹا کر وہ دوبارہ آگے روانہ ہو گئے۔ شکیلہ اپنی گاڑی میں تھی اور وہ دونوں بڑی گاڑی میں اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ ان کا رخ مری ہائی وے کی طرف تھا۔ لیکن ہائی وے تک پہنچنے سے پہلے وہ بائیں طرف ایک ذیلی سڑک پر مڑ گئے اور پھر دوبارہ پیچھے کی طرف سفر کرنے لگے۔ اس بار ان کا رخ شمال مشرق کی طرف تھا۔ یہ سارا علاقہ اونچے نیچے ٹیلوں اور کہیں کہیں نیچی پہاڑیوں پر مشتمل تھا۔ کسی زمانے میں یہاں چھوٹے چھوٹے گاؤں ہوتے تھے جن میں چرواہے رہتے تھے۔ انہی ٹیلوں میں کہیں کہیں پرانے طرز کی حویلیاں بنی ہوئی تھیں۔ انگریزوں نے یہاں زمین اپنے وفاداروں کو دی تھی لیکن زراعت کے لیے... نامناسب ہونے کی وجہ سے یہاں زیادہ آبادی نہیں ہو سکی اور بس کچھ چرواہے آباد ہوئے تھے۔ شہروں کی وجہ سے یہاں کی دیہی آبادی سکڑ گئی تھی اور کئی گاؤں تو ویران ہی ہو گئے تھے۔ ان میں یا تو کتے بلیاں لوٹتے تھے یا جرائم پیشہ افراد چھپتے تھے۔
کوئی ایک گھنٹے بعد گاڑیاں ایک کچے راستے پر مڑ گئیں اور یہ راستہ دو کلومیٹرز کے بعد ایک ٹیلے پر بنی انگریزی انداز کی عمارت کے سامنے رکا۔ یہ دو منزلہ سرخ اینٹوں سے بنی عمارت شاید انگریزوں کے دور کی تھی۔ اس کے اوپر سرخ کھپریل کی چھت تھی جو اب جگہ جگہ سے ادھڑ رہی تھی۔ مسلسل بارشوں اور موسموں کا مقابلہ کرتے ہوئے اینٹوں کا رنگ تقریباً سیاہ ہو چلا تھا۔ اوپر نیچے یکساں انداز کی کھڑکیاں اور ان پر لوہے کی سلاخیں تھیں۔ اندر لکڑی کے بنے ہوئے پٹ تھے جو اب تک برقرار تھے۔ سامنے سے داخلی دروازہ مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا اس لیے اب تک روزِ اوّل کی طرح تھا۔ لیکن انہوں نے گاڑیاں مکان کے سامنے نہیں روکیں بلکہ وہ انہیں صحن سے گھما کر پچھلی طرف لے گئے۔ صحن میں درختوں سے جھڑے پتوں کا ڈھیر تھا۔
"انہیں اندر لے چلو۔" شکیلہ نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔ اس نے آس پاس کا معائنہ کیا اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ وہاں انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں ہے تو اس نے عقبی دیوار کے پاس جا کر اس کی خستہ حال اینٹوں میں سے ایک اینٹ کو اندر کی طرف دبایا پھر اس سے ذرا دور دوسری اینٹ کو دبایا۔ پھر مخالف سمت کی تیسری اینٹ کو دباتے ہی دیوار کا ایک حصہ پٹ کی طرح کھل گیا اور اندر جانے کے لیے راستہ نظر آنے لگا۔ شاہ جی اور ماجی باری باری ان تینوں کو اٹھا کر اندر لے گئے۔ باہر سے خستہ حال نظر آنے والی عمارت کا یہ حصہ بہترین اور جدید انداز میں بنایا گیا تھا۔ یہاں رہائش کی تمام سہولتیں تھیں۔ وہ ان تینوں کو ایک چھوٹے کمرے میں لائے جس میں فرش پر سوائے ایک قالین کے اور کچھ نہیں تھا۔ انہیں اندر ڈال کر کمرا باہر سے بند کر دیا گیا۔ شکیلہ اور ماجی لاؤنج میں آئے جبکہ شاہ جی گاڑیاں چھپانے چلا گیا۔
ماجی نے ایک طرف کیبنٹ سے ایک بوتل نکالی اور شراب گلاس میں ڈالتے ہوئے بولا۔ "شکیلہ! تمہیں یقین ہے، دشمن اب اس عمارت کی طرف متوجہ نہیں ہیں؟"
وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ ماجی کے سوال پر وہ چونکی۔ "ممکن ہے کہ وہ اب بھی اس کی نگرانی کر رہے ہوں لیکن تم بتاؤ ان لوگوں کو رکھنے کے لیے اس جگہ کے سوا ہمارے پاس اور کون سا ٹھکانا باقی رہا ہے۔ پھر یہ سال بھر سے خالی پڑا ہے اور یہاں ایسے آثار بھی نہیں ہیں کہ دشمن اس خفیہ جگہ کو تلاش کر سکے۔ انہوں نے صرف ظاہری عمارت پر حملہ کیا تھا۔"
"اگر میک ان کے ہاتھ لگ گیا تھا تو کیا وہ اس حصے کو راز رکھ سکا ہوگا؟"
"وہ اس کی زبان سے کچھ نہیں اگلوا سکے ہوں گے۔" شکیلہ نے یقین سے کہا۔ "وہ ہمارا سربراہ تھا اور ہم میں سب سے مضبوط تھا۔ اگر ہم میں سے کوئی دشمن کے ہاتھ آ جائے تو کیا وہ ہماری زبان کھلوا سکتے ہیں؟"
ماجی نے سوچا اور نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں... لیکن آج کل زبان کھلوانے کے طریقے اتنے جدید اور سائنٹیفک ہو چکے ہیں کہ کسی مضبوط ترین آدمی کی قوتِ ارادی کو بھی شکست دے سکتے ہیں۔"
"تمہارا مطلب ہے دواؤں کی مدد سے...؟"
"ہاں، تم جانتی ہو ہم قدیم زمانے سے اس تکنیک میں سب سے آگے ہیں۔ میں خود دیکھ چکا ہوں کہ ہمارے ماہرین آدمی کو انگلی لگائے بغیر کس طرح اس سے سب اگلوا لیتے ہیں۔"
شکیلہ ایک لمحے کے لیے فکر مند ہوئی پھر اس نے کہا۔ "اس جگہ کی حالت سے نہیں لگتا کہ یہاں کوئی آیا ہے۔"
ماجی گلاس خالی کر کے کھڑا ہو گیا۔ "پھر بھی ہمیں اطمینان کر لینا چاہیے۔"
شکیلہ نے اس سے اتفاق کیا اور وہ باہر نکل آئے۔ شاہ جی پہلے ہی گاڑیاں چھپا رہا تھا۔ وہ جاننے کی کوشش کرنے لگے کہ دشمن کا آس پاس کوئی نام و نشان ہے یا نہیں۔

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سب سے پہلے شامی کو ہوش آیا۔ نوشی اس کے شانے پر سر رکھے غافل تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد ایک لمحے کے لیے شامی بوکھلا گیا مگر جلد اسے یاد آ گیا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ نوشی بے ہوش تھی۔ اس نے آہستگی سے اس کا سر زمین پر ٹکایا اور اٹھ بیٹھا۔ اسے یاد تھا کہ ایک سنسناتی آواز آئی تھی اور پھر وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ جوجی اور نوشی اس سے پہلے گر چکے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ کیا معما ہے؟ پھر اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور اٹھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ باہر سے بند تھا۔ گویا وہ کسی کے قیدی تھے لیکن کس کے قیدی تھے؟ قدرتی طور پر شامی کو ان لوگوں کا خیال آیا جو جھیل پر دو قتل کرنے میں ملوث تھے۔ تو کیا وہ انہیں اغوا کر کے لے آئے تھے؟ اور کیوں لائے تھے؟ اس سوال کا جواب شاید وہ سکہ تھا جو تیمور نے لاش کی جیب سے نکالا تھا۔ وہ یقیناً ان سے وہ سکہ واپس حاصل کرنا چاہتے تھے۔

ایک سوال اور شامی کے ذہن میں آیا کہ جو لوگ انہیں اس طرح آسانی سے اغوا کر کے لا سکتے ہیں وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے یا کامیاب بھی ہو گئے، تب بھی وہ ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ وہ انہیں چھوڑ دیں گے یا مار کر کہیں پھینک دیں گے؟ چند سیکنڈ میں یہ ساری باتیں شامی کے ذہن میں گھوم کر رہ گئیں اور اس نے فوری فیصلہ کیا کہ اگر انہوں نے سکے کی بات کی تو وہ اس سے مکر جائے گا۔ لیکن وہ تشدد پر اتر آئے تو...؟ وہ خود کون سا بہت دلیر تھا۔ باہمت تھا، تکلیفیں برداشت کر سکتا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ براہِ راست تشدد بھی جھیل جاتا۔ پھر اس کے ساتھ نوشی بھی تھی، وہ اس کے ساتھ کوئی غلط سلوک کرتے تو شامی کیسے برداشت کر سکتا تھا؟

وہ واپس نوشی اور جوجی کے پاس آیا اور باری باری انہیں ہلا کر ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ ذرا دیر بعد نوشی ہوش میں آ گئی۔ شامی کی طرح اس کی طبیعت بھی ٹھیک تھی۔ شامی کو لگ رہا تھا جیسے وہ گہری نیند لے کر اٹھا ہو۔ نہ سر چکرا رہا تھا اور نہ طبیعت خراب تھی۔ نوشی اٹھی تو وہ جوجی کو ہلانے لگا لیکن اس نے کروٹ لی اور بولا۔ ”سونے دو اماں۔“

”بیٹے اٹھ جاؤ، میں تمہاری اماں نہیں ہوں۔“ شامی نے اسے پھر جھنجوڑا۔ نوشی نے سر تھاما ہوا تھا۔ اس نے شامی کو گھورا۔

”سونے دو نا... کیوں اٹھا رہے ہو؟“

”تم بھی پوری طرح ہوش میں آ جاؤ، ہم نامعلوم افراد کے قبضے میں کسی نامعلوم جگہ ہیں۔ اس کمرے کا دروازہ باہر سے بند ہے۔“

یہ سن کر نوشی کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ کسی قدر سہم گئی۔

”کون لوگ ہیں یہ؟“

”مجھے کیا معلوم؟“ شامی نے شانے اچکائے۔ ”تم کہو تو دروازہ پیٹ کر معلوم کروں؟“

”نن... نہیں... پتا نہیں کیسے لوگ ہوں اور انہیں غصہ آ جائے۔“

شامی سوچ رہا تھا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے شبہ ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو دو افراد کے قتل میں ملوث ہیں۔ ممکن ہے یہ ہم سے سکے کے بارے میں معلوم کرنا چاہیں۔ تم اس بارے میں زبان بند رکھنا۔“

”ممکن ہے ہمیں تاوان کے لیے اغوا کیا گیا ہو؟“ نوشی نے بھی آہستہ سے کہا۔

”نہیں، ہمارے ملک میں لوگ اس طرح کے جدید ہتھیار استعمال نہیں کرتے۔ انہوں نے ہمیں گیس کی مدد سے بے ہوش کیا تھا۔ تمہیں یاد ہے، بے ہوش ہونے سے پہلے تم نے سنسناتی ہوئی آواز سنی تھی؟“

نوشی نے یاد کیا۔ ”ہاں، کچھ ایسا یاد تو ہے۔“

”وہ گیس کی ڈیوائس سے گیس نکلنے کی آواز ہوگی اور یہ اتنی زود اثر تھی کہ اس نے ہمیں فوراً بے ہوش کر دیا۔“

نوشی گھبرا گئی۔ ”یہ اتنے خطرناک لوگ ہیں... ہمارا کیا ہوگا؟“

”جو خدا کو منظور۔“ شامی نے سرد آہ بھری اور پھر غصے سے جوجی کی طرف دیکھا۔ ”اس لاٹ صاحب کے بچے کو تو دیکھو، پڑا سو رہا ہے۔“

”بے ہوش ہے۔“

”نہیں، گیس کا اثر ختم ہو گیا ہے۔“ شامی نے اسے پھر جھنجوڑا۔ ”یہ اب سو رہا ہے۔“

جوجی بچ مچ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ”اماں جی... میں کہاں ہوں؟“ اس نے آس پاس دیکھ کر کہا۔

”جہاں ہم ہیں۔“ شامی نے مطلع کیا۔

”آپ کہاں ہیں جی؟“

”جہاں تم ہو۔“ شامی بھنا گیا۔

”جوجی! ہم نامعلوم لوگوں کی قید میں ہیں۔“ نوشی نے رسانیت سے کہا۔ ”انہوں نے ہمیں بے ہوش کر دیا تھا۔“

”بے ہوش کیسے جی؟ میں تو ناشتے کا سامان نکالنے جا رہا تھا۔“ جوجی نے یاد کر کے کہا۔

”تمہیں سنسناتی آواز نہیں آئی تھی؟“

”پتا نہیں... آئی ہوگی لیکن میں تو اسے چائے کھولنے کی آواز سمجھا ہوں گا۔ میرا بھوک سے بُرا حال تھا اور اب بھی ہے۔“ اس نے پیٹ پر ہاتھ مار کر فریادی لہجے میں کہا۔ اس پر شامی کو یاد آیا کہ وہ بھی بھوکا ہے۔

”کھایا تو ہم نے بھی کچھ نہیں ہے برخوردار... لیکن دیکھو یہاں کھانے کو کیا ملتا ہے... مار یا گولی۔“

”گولی۔“ جوجی گھبرا گیا۔ ”وہ کیوں جی... میں نے کیا کیا ہے؟“

”تم نے کچھ نہیں کیا ہے لیکن تم ہمارے ساتھ ہو۔“ شامی نے اسے مزید ڈرایا۔ ”تم نے سنا ہوگا، گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے... تو تم گھن ہو۔“

جوجی نے ٹھنڈی سانس لی اور رو دینے والے لہجے میں بولا۔ ”مجھے پہلے ہی پتا تھا آپ کے ساتھ آیا تو پھر کوئی نہ کوئی مصیبت آئے گی۔“

”ابھی کہاں آئی ہے برخوردار... ابھی آئے گی۔“

”لیکن جی، انہوں نے گیس چھوڑی کیسے؟... آس پاس تو کوئی نہیں تھا۔“ جوجی نے سوال کیا۔

”میرا خیال ہے گیس کا بم مارا ہوگا۔“

جوجی اچھل پڑا۔ ”بم... پر کوئی آواز نہیں آئی تھی؟“

”احمق، گیس کا بم دھماکے سے نہیں پھٹتا۔ اس کی چابی نکل جائے تو گیس خارج ہوتی ہے اور بس سنسناتی آواز آتی ہے۔“

”پر یہ ہمیں کیوں اغوا کر کے لائے ہیں؟“

نوشی نے اسے گھورا۔ ”مجرم عام لوگوں کو کیوں اغوا کرتے ہیں؟“

”تاوان کے لیے۔“ جوجی نے فوراً کہا۔

”بس تو ہمارا تاوان مانگ سکتے ہیں۔“ شامی بولا۔ ”ویسے تمہارے ابا جی تمہیں چھڑانے کے لیے کتنا تاوان دے سکتے ہیں؟“

جوجی نے منہ بنایا۔ ”ابا جی تو ایک روپیا بھی نہ دیں لیکن اماں سب دے دیں گی۔“

”سنو...“ نوشی کچھ کہنے جا رہی تھی کہ شامی نے اسے اشارے سے چپ رہنے کو کہا۔ اسے خیال آیا جو لوگ بے ہوش کرنے کے لیے اتنا جدید طریقہ استعمال کر سکتے تھے، ان کے لیے اس کمرے کو بگ کرنا کون سا مشکل کام تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پین تلاش کرنا چاہا تو اس کا ہاتھ جیکٹ میں موجود پستول پر گیا۔ پستول موجود تھا اور وہ اسے تلاش نہیں کر سکے تھے۔ شامی خوش ہو گیا۔ انہیں لانے والے بہت ہوشیار تھے لیکن انہوں نے صرف رائفلیں سمیٹنے کو کافی سمجھا ہوگا اور انہیں خیال ہی نہیں آیا ہوگا کہ شامی کے پاس کوئی چھوٹا ہتھیار بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بہت چھوٹا پستول تھا اس لیے وہ جیکٹ میں اس کی موجودگی بھی محسوس نہیں کر سکے تھے۔ ورنہ اس کی بے ہوشی کے دوران وہ لازمی نکال لیتے۔ شامی نے پین تلاش کر کے اپنی ہتھیلی پر لکھا۔

”غیر ضروری بات نہ کرنا، یہ جگہ بگڈ ہو سکتی ہے۔“

نوشی اور جوجی نے سر ہلایا، اسی لمحے دروازہ کھلا۔

☆☆☆

اگرکار کا اندازہ درست نکلا، جب لڑکی اور اس کے ساتھی نے بے ہوش ہونے والے تینوں افراد کو ان کی جیپ میں ڈالنا شروع کیا۔ نوشاد نے ایک بار پھر ارون سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی طرف سے اس بار بھی جواب نہیں آیا۔ نوشاد نے مایوسی سے کہا۔ ”وہ ان کی گاڑی کو بگ کرنے کے چکر میں کہیں ان کا سراغ ہی نہ کھو دے۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ اگرکار نے اعتماد سے کہا۔ ”ہمیں معلوم ہے کہ یہ کہاں جا رہے ہیں۔ ان کا سراغ کھو دینے کی صورت میں ہم سیدھے وہیں جائیں گے۔“

نوشاد خفت سے ہنسا۔ ”میں تو بھول ہی گیا تھا۔“

وہ اپنا سامان سمیٹ کر نیچے گاڑی کی طرف روانہ ہوئے۔ جب تک وہ گاڑی تک پہنچے، دوسری پارٹی اپنے شکار سمیٹ کر وہاں سے جا چکی تھی۔ وہ دونوں عجلت میں گاڑی اسٹارٹ کر کے پکی سڑک تک لائے مگر اتنی دیر میں آگے والی گاڑی غائب ہو چکی تھی۔ نوشاد نے دوبارہ ارون سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، اس بار اسے کامیابی ملی۔ ارون واپس آ گیا تھا۔ نوشاد نے تیز لہجے میں کہا۔ ”تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟“

”میں نے گاڑی میں بگ لگانے کی کوشش کی لیکن وہ بہت ہوشیار تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ مجھے دیکھ نہ لے اس لیے میں کچھ دیر انتظار کے بعد واپس آ گیا۔“

”تم نے ٹھیک کیا، ورنہ معاملہ خراب بھی ہو سکتا تھا۔“ نوشاد نے کہا۔ ”وہ یہاں سے نکل گئے ہیں۔ اب ان کا تعاقب کرنا ہے لیکن بہت محتاط رہ کر۔“

”میں ہوشیار رہوں گا۔“ ارون نے کہا۔ نوشاد نے واکی ٹاکی رکھ کر اگرکار کی طرف دیکھا۔ ”ہماری کامیابی اسی میں ہے کہ ہم نے دوسری پارٹی کو بے خبر رکھا ہے۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرف بڑھا تو اس نے ہاتھ اوپر کیا۔

''تم میری تلاشی نہیں لے سکتے۔''

شاہ جی نے سوالیہ نظروں سے شکیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے، تم اسے کور کرو میں تلاشی لیتی ہوں۔''

شاہ جی نے اپنا پستول نکال لیا اور شکیلہ نوشی کی طرف آئی۔ شاہ جی نے جوجی اور شامی کی اس طرح تلاشی لی تھی کہ ان کے پاس سکہ ہوتا تو برآمد ہو جاتا۔ شکیلہ نے نوشی کی بھی اسی طرح باریک بینی سے تلاشی لی۔ نوشی کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ ان لوگوں نے اتنا بھی بہت کر لیا تھا کہ عورت نے نوشی کی تلاشی لی تھی۔ اس کے پاس بھی جو کچھ تھا، وہ انہوں نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ لباس میں سے کچھ برآمد نہیں ہوا تھا۔ اس پر انہوں نے ان تینوں کے جوتے بھی اتروا کر دیکھے۔ انہوں نے مجبوراً جوتے بھی اتار دیے۔ آخر میں شامی نے کہا۔ ''بس ہمارا ایکسرے باقی رہ گیا ہے... اپنی تسلی کے لیے وہ بھی کروا لو۔''

''ہمارے شریفانہ رویّے سے دھوکا مت کھاؤ۔'' ماجی غرا کر بولا۔ ''وہ چیز ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ اگر وہ نہ ملی تو تم تینوں کی زندگی محفوظ نہیں رہے گی۔''

''جس چیز کے بارے میں ہم کچھ.... جانتے ہی نہیں، اس کے ہونے یا نہ ہونے کی ذمے داری ہم پر نہیں آتی۔''

''وہ تم میں سے کسی نے غائب کی ہے اس لیے ذمے داری بھی تم پر آتی ہے۔'' ماجی بولا۔

''اس بار تمہارا کزن کیوں نہیں آیا؟'' شکیلہ نے پوچھا۔

''اس کا موڈ نہیں تھا۔'' شامی نے جواب دیا۔ ''تم خود سوچو اگر ہم میں سے کسی نے سکّہ لیا ہوتا اور وہ جانتا کہ سکہ تم جیسے خطرناک مجرموں کا ہے... ''

''ہم مجرم نہیں ہیں۔'' ماجی غرایا۔

''بالکل... ان ہتھیاروں کے ساتھ تم ہمیں گیس کی مدد سے بے ہوش کر کے یہاں دعوت کرنے کے لیے لائے ہو۔'' شامی نے طنز کیا۔ ''میں کہہ رہا تھا اگر ہمیں پتا ہوتا تو کیا ہم دوبارہ یہاں آنے کی حماقت کرتے؟''

''تم دلیل اچھی دے رہے ہو۔'' شکیلہ نے کہا۔ ''لیکن جس وقت یہ واقعہ ہوا، وہاں صرف تم تین افراد تھے اور تم نے لاشوں کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھا تھا۔''

شامی چونک گیا۔ ''یہ بات صرف وہی عورت جان سکتی ہے جو دوسرے آدمی کے ساتھ تھی۔''

اس بار شکیلہ چونک گئی۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا کہ دوسرے آدمی کے ساتھ کوئی عورت بھی تھی؟''

شامی کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اسے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ اگر یہ وہی عورت تھی تو یہ بات ان کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ کسی ایسے آدمی کو کہاں چھوڑتی جو اسے ایک شخص کو قتل کرتے دیکھ چکا تھا۔ شامی ہکلایا۔ ''وہ میرا اندازہ ہے۔''

''بکو مت... تم نے یقیناً اس عورت کو دیکھا تھا۔'' ماجی بولا اور شکیلہ کی طرف دیکھا۔ ''اس نے یقیناً اسے دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھا ہو گا کہ وہ کیا کر رہی تھی۔''

ماجی کا اشارہ واضح تھا۔ شامی شکیلہ کو حسیب خان پر گولی چلاتے دیکھ چکا تھا اور وہ اس قتل کا عینی شاہد تھا مگر شکیلہ نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس نے شامی سے کہا۔ ''سکّہ تمہارے پاس نہیں ہے... یعنی تمہارے کزن تیمور کے پاس ہے؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ویسے وہ اتنا بے پروا بھی نہیں تھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ عورت کو دیکھ لینے کی بات کر کے اس نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے خطرہ بڑھا لیا ہے۔

''تمہارا کزن تم سے باتیں چھپاتا ہے؟''

''ہو سکتا ہے۔'' شامی نے اس بار مختصر جواب دیا۔

شکیلہ اس کے موبائل کی فون بک کا جائزہ لے رہی تھی۔ یہ جدید آئی فون تھا۔ شامی اس پر پاس ورڈ نہیں رکھتا تھا اس لیے وہ آرام سے فون بک تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے تیمور کا نمبر نکال لیا۔ اس نے نمبر بتا کر تصدیق چاہی۔ ''تمہارے کزن کا نمبر یہی ہے؟''

''ہاں یہی نمبر ہے۔'' شامی نے مجبوراً سر ہلایا۔ اسے جوجی پر حیرت تھی۔ ویسے وہ بہت ڈرپوک تھا لیکن اس وقت اس نے خود پر قابو رکھا ہوا تھا ورنہ شامی کا خیال تھا کہ وہ کہیں بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ البتہ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ شامی کی دھمکی میں آ کر یہاں آنے پر دل کھول کر پچھتا رہا ہے۔ شکیلہ نے اپنے ساتھیوں کو باہر چلنے کا اشارہ کیا اور ان سے بولی۔ ''اب تمہاری زندگیوں کا انحصار اس پر ہے کہ تیمور وہ سکّہ ہمارے حوالے کر دے۔''

''فرض کرو وہ سکّہ تیمور کے پاس ہوا اور اس نے تمہارے حوالے کر دیا، تب بھی اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم ہمیں جانے دو گے؟''

''تم اس وقت کوئی ضمانت لینے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔'' ماجی بولا۔ ''تمہیں ہماری زبان پر اعتبار کرنا ہو گا۔''

''اس بارے میں غالب نے کہا ہے... خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا۔''

لیکن ان تینوں کو شاید غالب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ باہر چلے گئے اور دروازہ بند کر دیا۔ اپنی نقابیں اتار کر انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ماجی بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ اس شخص نے تمہیں حسیب خان پر گولی چلاتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''اس کا زندہ رہنا خطرناک ہو گا۔'' شاہ جی نے تائید کی۔

''اتنی جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ابھی ہمارے قبضے میں ہے اور سب سے پہلے ہمیں گولڈن آئی حاصل کرنی ہے۔ اس کے بعد سوچیں گے کہ ان کا کیا کرنا ہے۔''

شکیلہ کے الفاظ بتا رہے تھے کہ انہیں فیصلہ ایک کے بارے میں نہیں، تینوں کے بارے میں کرنا ہے اور فیصلہ بھی ایک ہی کرنا ہے۔ شکیلہ نے آئی فون شاہ جی کی طرف بڑھایا۔ ''تیمور سے رابطہ کرو۔ گولڈن آئی اسی کے پاس ہو گی۔''

''اگر وہ انکار کرے تو...؟''

''تمہیں معلوم نہیں ہے کہ کس قسم کی صورتِ حال میں کیا کرنا چاہیے؟'' شکیلہ کا لہجہ کسی قدر سخت ہو گیا۔

''میں سمجھ گیا۔'' شاہ جی جلدی سے بولا اور آئی فون لے کر باہر نکل گیا۔ ابھی صبح کے دس بجے تھے۔ شکیلہ اس کے جانے کے بعد بولی۔

''ہمیں بہت محتاط رہنا ہو گا۔''

☆☆☆

تیمور یونیورسٹی میں تھا۔ کلاس سے نکل کر اس نے کینٹین کا رخ کیا کیونکہ صبح آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ شامی منہ اندھیرے چلا گیا تھا ورنہ وہی اسے اٹھاتا تھا۔ وہ جلدی میں ناشتا بھی نہیں کر سکا تھا اور اس وقت بھوک سے فوت ہونے کے قریب تھا۔ اسے صبح بھاری ناشتا کرنے کی عادت تھی۔ آخری لیکچر تو سر سے گزر گیا تھا۔ اس نے کینٹین میں جاتے ہی سینڈوچز اور چیز برگر کا آرڈر دیا۔ پانچ منٹ میں دونوں چیزیں اس کے سامنے تھیں اور اس نے ناشتا شروع ہی کیا تھا کہ موبائل کی بیل بجی۔ نمبر اجنبی تھا اس لیے نہایت اطمینان سے کال منقطع کر کے دوبارہ کھانے لگا۔ لیکن فوراً ہی دوبارہ بیل بجی اور اس بار شامی کا نمبر تھا۔ تیمور کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ شامی شکار پر گیا تھا اور وہ جہاں گیا تھا، وہاں موبائل سگنل کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ شامی کا اتنی جلدی واپسی کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ کوئی چکر تھا، اس نے کال ریسیو کی۔

''ہیلو مسٹر تیمور؟'' دوسری طرف سے ایک اجنبی آواز نے پوچھا۔

''ظاہر ہے، جب میرے نمبر پر کال کرو گے تو میں ہی ہوں گا۔'' تیمور نے کہا۔ ''بائی دی وے یہ میرے کزن کا نمبر ہے، تمہارے پاس کہاں سے آ گیا؟''

''کیونکہ تمہارا کزن ہمارے پاس ہے۔''

تیمور کو اس کے الفاظ ذرا دیر سے سمجھ میں آئے۔ ''تمہارے پاس ہے؟'' اس نے کہا۔ ''کیا تم نے اسے اپنے قبضے میں کر رکھا ہے... اسے اغوا کر لیا ہے؟''

''تم چاہو تو ایسا بھی سمجھ سکتے ہو۔'' اجنبی نے کہا۔ وہ صاف لہجے میں اردو بول رہا تھا لیکن تیمور نے محسوس کیا کہ اردو اس کی مادری زبان نہیں ہے۔

''کیا مطلب، میں ایسا سمجھ سکتا ہوں؟ مسٹر! تم جو کوئی بھی ہو صاف بات کرو۔'' تیمور نے اپنے موبائل میں وائس ریکارڈر آن کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تم صاف سننا چاہتے تو سنو... تمہارا کزن اور اس کے ساتھ ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہمارے پاس ہیں اور ہمیں وہ سنہری سکہ چاہیے جو تم نے جھیل والی شکار گاہ میں لاش کی جیب سے نکالا تھا۔''

''کیسا سکّہ؟'' تیمور نے سادگی سے کہا۔ ''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی...''

''مسٹر تیمور!'' بولنے والے کا لہجہ سفاک ہو گیا۔ ''جھوٹ بول کر اپنے کزن سمیت تین افراد کی جان سے مت کھیلو۔ تمہارے پاس صرف دس منٹ ہیں۔ میں دس منٹ بعد دوبارہ کال کروں گا اور تمہارا جواب ہاں یا نہ میں ہونا چاہیے۔''

''میری بات...'' تیمور نے کہنا چاہا لیکن کال منقطع ہو گئی۔ اس نے فوراً شامی کا نمبر ملایا لیکن کال کرنے والے نے فون بھی آف کر دیا تھا۔ اب وہ اسے دس منٹ بعد ہی آن کرتا۔ تیمور نے فوراً نوشی کا نمبر ملایا لیکن وہ بند جا رہا تھا اور اسی طرح جوجی کا نمبر بھی بند جا رہا تھا۔ اگر شامی اس سے کسی قسم کا مذاق کر رہا تھا تو اس نے پورا بندوبست کر رکھا ہو گا کہ اسے نوشی اور جوجی کے موبائل بھی بند ہی ملتے۔ لیکن نہ جانے کیوں تیمور کو لگا، وہ شخص مذاق نہیں کر رہا تھا۔ وہ سوچتا رہا اور کھاتا رہا۔ بھوک ختم ہو گئی تھی، وہ وقت گزاری کے لیے کھا رہا تھا۔ موبائل اس کے سامنے رکھا تھا۔ ادھر اس نے کھانا ختم کیا اور ادھر بیل بجی، جیسے وہ شخص یہیں کہیں آس پاس بیٹھا اسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھ رہا ہو۔ کال ریسیو کرنے سے پہلے تیمور نے ایک بار دائیں بائیں دیکھا بھی لیکن اتفاق سے اسے کوئی بھی شخص موبائل کے ساتھ مصروف نظر نہیں آیا۔ سب کھانے پینے یا گپ شپ میں مصروف تھے۔ تیمور نے کال ریسیو کی۔

”تم نے سوچ لیا؟“

”اگر میں کہوں کہ سکہ میرے پاس نہیں ہے تو۔۔۔؟“

”اس صورت میں تمہارے تینوں ساتھی زندہ نہیں رہیں گے۔ ان کو کہیں دفنا کر ہم تمہارے پیچھے آئیں گے اور جب تک تم سے سکہ واپس نہیں مل جاتا، تمہارے پیچھے رہیں گے۔ تم اور تمہارے باقی گھر والے محفوظ نہیں رہیں گے۔“

”کیا تم لوگ کوئی مافیا ہو؟“

اس کا لہجہ پھر سے سخت ہو گیا۔ ”فضول باتوں سے گریز کرو اور جواب دو سکہ دے رہے ہو یا نہیں؟“

تیمور نے دل ہی دل میں صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ سکہ بے شک سونے کا کیوں نہ ہو، اس کے لیے بیکار تھا اور شامی، نوشی اور جوجی کی زندگی کے مقابلے میں تو اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ اگر یہ شامی کا مذاق نہیں تھا اور واقعی ان لوگوں نے ان تینوں کو اپنے قبضے میں کر رکھا تھا تو سکہ واپس کرنا ضروری تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی تیمور کے لیے ضروری تھا کہ وہ ان کی زندگی کی ضمانت لے۔ اس نے سوچ کر کہا۔ ”ٹھیک ہے، میں سکے کے معاملے پر تم سے بات کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

”بات نہیں، ہمیں سکہ چاہیے۔“

”دیکھو، سکہ میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن لگتا ہے کہ تم لوگوں کے لیے یہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ میرے لیے اہمیت اپنے ساتھیوں کی زندگی کی ہے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ سکہ لے کر تم انہیں چھوڑ دو گے؟“

”ہم سکہ لے کر انہیں چھوڑ دیں گے لیکن ضمانت کوئی نہیں ہے۔“

”معاف کرنا دوست! اگر تم نے مجھے دیکھا ہے تو میں صرف شکل سے بیوقوف لگتا ہوں۔ میں سکہ تمہارے حوالے کر دوں اور تم میرے ساتھیوں کو بھی نہ چھوڑو تو میں سچ مچ احمق بن جاؤں گا۔“

بولنے والا شاید سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں چاہتا ہوں، تم ایک ہاتھ سے سکہ لو اور دوسرے ہاتھ سے میرے ساتھیوں کو چھوڑ دو۔ اور یہ تبادلہ کسی مصروف جگہ ہو گا۔“

”میں تمہیں کچھ دیر بعد بتاتا ہوں۔“ اجنبی نے کہا اور فون بند کر دیا۔ تیمور اٹھا، اس نے بل کی رقم پہلے ہی میز پر رکھ دی تھی۔ وہ باہر پارکنگ کی طرف لپکا اور ایک منٹ بعد اس کی ہیوی بائیک طوفانی رفتار سے وقار ولا کی طرف جا رہی تھی۔ سکہ اس کے پاس تھا لیکن وہ گھر چھوڑ آیا تھا۔ مگر گھر آنے کا مقصد مسئلہ نواب صاحب کے علم میں لانا تھا۔ تیمور محسوس کر رہا تھا کہ وہ اکیلا اس سے نمٹ تو سکتا تھا لیکن اگر کوئی اور مسئلہ سامنے آ جاتا تو وہ اکیلا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ نواب صاحب زیادہ تجربہ کار اور زمانہ شناس تھے۔ ان کے علم میں آنے سے گوشمالی کا پورا امکان تھا لیکن ساتھ ہی وہ معاملہ خود سنبھال لیتے۔ نواب صاحب اسٹڈی میں تھے اور تیمور نظام دین کو بائی پاس کر کے اندر گھسا تو وہ اسے دیکھتے ہی بھانپ گئے کہ کچھ گڑبڑ ہے۔

☆☆☆

شاہ جی اتنی دور گیا تھا جہاں اسے موبائل سگنل مل سکیں۔ اسے تقریباً آدھ گھنٹے کی ڈرائیو کرنا پڑی تھی، تب کہیں جا کر موبائل سگنل ملے تھے۔ اس نے تیمور سے بات کی تھی اور اب اسے شکیلہ اور ماجی سے مشورے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ واپس آ گیا۔ اس نے انہیں تازہ صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بولا۔ ”وہ چاہتا ہے کہ ان کا تبادلہ کیا جائے اور کسی مصروف جگہ کیا جائے۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ ماجی بولا۔ ”تم سختی سے بات کرتے۔“

شاہ جی نے منہ بنایا۔ ”تب تم خود جا کر کر لو۔“

”سختی مناسب نہیں ہو گی۔“ شکیلہ نے مداخلت کی۔ ”ایک تو یہ مقامی لوگوں کے لیے ہماری پالیسی کے خلاف ہے، دوسرے ان کا تعلق ایک بڑے خاندان سے ہے بلکہ تینوں کا تعلق اہم گھرانوں سے ہے۔ اس لڑکی کا باپ اعلیٰ بیوروکریٹ ہے۔ ہمیں بہت احتیاط سے معاملے کو ڈیل کرنا ہو گا۔ اس نے تسلیم کر لیا ہے، گولڈن آئی اسی کے پاس ہے۔“

”تب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”میں خود جا کر بات کرتی ہوں۔“ شکیلہ نے کہا۔

”جیسے تم مناسب سمجھو۔“ ماجی بے دلی سے بولا۔ وہ شاید شکیلہ کی نرم پالیسی سے متفق نہیں تھا۔ شکیلہ کھڑی ہو گئی۔

”میں جاتی ہوں اور تم دونوں ہوشیار رہنا۔“

”ان کا کیا کرنا ہے؟“ ماجی بولا۔ ”بھوک کا شور مچا رہے تھے۔“

”یہاں کھانے کو کچھ نہیں ہے، شاید کچھ چاکلیٹس پڑی ہوں وہ دے دو۔“

شکیلہ چھوٹی گاڑی میں روانہ ہوئی۔ سڑک پر آنے کے بعد ٹریفک کی وجہ سے اسے اندازہ نہیں ہوا کہ ایک گاڑی اس کا تعاقب کر رہی ہے۔

☆☆☆

نواب صاحب سکون سے تیمور کی بات سنتے رہے۔ انہوں نے ایک بار بھی اس کی بات نہیں کاٹی اور نہ کوئی سوال کیا۔ جب تیمور نے بات مکمل کر لی، تب بھی وہ خاموشی سے سوچتے رہے۔ تیمور کے نزدیک ان کا رویہ عجیب تھا۔ اسے شبہ ہوا کہ شاید داداجان نے اس کی بات غور سے سنی ہی نہیں۔ اس نے پھر کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے اسے ہاتھ اٹھا کر چپ رہنے کا اشارہ کیا اور کچھ دیر بعد بولے۔ ”وہ سکہ کہاں ہے؟“

تیمور اسٹڈی میں آتے ہوئے سکہ لیتا آیا تھا، وہ اس نے نواب صاحب کو پیش کر دیا۔ نواب صاحب نے سکے کو دیکھا۔ ان کا انداز بہت غور والا نہیں تھا۔ پھر انہوں نے سکہ میز پر رکھ دیا اور اٹھ کر اپنی تجوری کھولی۔ یہ بیک وقت تین قسم کے تالوں والی تجوری تھی۔ انہوں نے تجوری سے ایک بھاری بھرکم البم نکالی۔ تیمور کو حیرت ہوئی کیونکہ اس نے پہلے کبھی یہ البم نہیں دیکھی تھی۔ مگر جب نواب صاحب نے اسے میز پر رکھا اور کھولا تو تیمور کی حیرت رفع ہو گئی۔ یہ تصویروں کی البم نہیں تھی بلکہ سکوں کی البم تھی۔ اس میں اعلیٰ درجے کے شفاف پلاسٹک کے بنے صفحے تھے جن میں چھوٹے چھوٹے خانوں میں سکے رکھنے کی جگہ تھی اور اس سے نیچے سفید جگہ پر سکے سے متعلق کوئی بات لکھی جا سکتی تھی۔

تیمور نے دلچسپی سے البم دیکھی۔ ”مجھے تو پتا ہی نہیں تھا داداجان کہ آپ کے پاس ایسی کوئی چیز بھی ہے۔“

”برخوردار! تمہیں ابھی بہت ساری چیزوں کا پتا ہی نہیں ہے۔“ نواب صاحب نے سکہ ایک میز...... پر رکھا اور خود البم کے صفحے الٹنے لگے۔ انہوں نے وہ حصہ نکالا جس میں ایسے سکے تھے جو درمیان سے سوراخ والے ہوں۔

”لیکن یہ کسی ملک کا سکہ نہیں ہے۔“ تیمور نے دبے لفظوں میں کہا۔

”ہاں لیکن اسے دیکھ کر ہمیں کچھ یاد آ گیا۔“ نواب صاحب نے ورق گردانی جاری رکھی۔ ”یہ بہت پرانی بات ہے، جنگِ عظیم دوم میں ہم برما اور تبت کے محاذ پر بھی رہے تھے۔ تبت میں جنگ تو نہیں ہو رہی تھی لیکن وہاں سے جاپان کے خلاف چینی مزاحمت کاروں کو مدد دی جاتی تھی۔ وہیں میں نے پہلی بار اس قسم کے سکے دیکھے تھے اور کچھ سکے لے کر بھی آیا تھا۔“

نواب صاحب صفحے الٹتے رہے پھر ایک صفحے پر رک گئے۔ ”برخوردار ذرا دیکھنا، یہی سکہ ہے نا؟“

تیمور نے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ واقعی یہ بالکل اسی قسم کا سکہ تھا اور البم میں جو سکہ لگا تھا، اس پر بھی کسی قسم کا کوئی نشان یا عبارت نہیں تھی۔ صرف ایک آنکھ بنی تھی جس کی پتلی کی جگہ سوراخ تھا۔ نیچے سفید کاغذ پر لکھا تھا۔

”چینی حکومتوں کے درمیان زرِ مبادلہ کا ذریعہ۔“

”کیا یہ سچ مچ کا سکہ تھا؟“ تیمور نے بے یقینی سے پوچھا۔

نواب صاحب نے سر ہلایا۔ ”کئی سو سال پہلے چین متعدد سلطنتوں میں بٹا ہوا تھا اور یہ سب آپس میں خانہ جنگی کرتی تھیں۔ چینی تاجر قوم ہے۔ حکومتوں کے اختلاف کی وجہ سے ان کی آپس کی علاقائی تجارت مشکل ہو گئی تھی کیونکہ ایک ملک کی کرنسی دوسرے ملک میں قبول نہیں کی جاتی تھی۔ اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے متمول چینی تاجروں نے ایک خفیہ تنظیم بنائی اور اس کا نام ”ایک چین“ رکھا۔ انہوں نے اپنے طور پر یہ سکہ تیار کرایا۔ چینی حکومتوں کے درمیان تجارت میں اسے زرِ مبادلہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ سکہ تجارتی ایمان داری اور چینی قوم کی ہمت کا منہ بولتا ثبوت تھا کیونکہ حکومتوں کی پشت پناہی کے بغیر اس قسم کے کام ناممکن سمجھے جاتے ہیں۔ سو سال سے بھی زیادہ عرصے تک یہ نظام کامیابی سے کام کرتا رہا۔ یہ سکے سونے، چاندی اور بعض دھاتوں کی آمیزش سے اس طرح تیار کیے جاتے تھے کہ ایک بار بنانے کے بعد انہیں دوبارہ پگھلانا ناممکن تھا کیونکہ یہ سخت ترین درجۂ حرارت برداشت کر لیتے ہیں میرے پاس جو سکے ہیں، میں نے خود ان پر تجربہ کر کے دیکھا ہے۔ ایک لیب میں انہیں چار ہزار ڈگری سینٹی گریڈ کا درجۂ حرارت دیا گیا لیکن تم دیکھ رہے ہو، ان کی ساخت میں کوئی فرق نہیں آیا۔“

”حیرت انگیز۔“ تیمور بولا۔

”حیرت انگیز بات تو تم نے سنی ہی نہیں ہے۔ جس طرح ایک چین کی تحریک سامنے آئی تھی، اسی طرح ایک ایشیا کی تحریک بھی سامنے آ رہی ہے اور اس کا مقصد پورے ایشیا میں مبادلہ کرنسی کا ایک نظام قائم کرنا ہے تاکہ ہمیں اس معاملے میں مغرب کی محتاجی سے نجات ملے۔“

”اس تحریک کے پیچھے کون ہے؟“ تیمور نے سوال کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نواب صاحب مسکرائے۔ ''اگر تمہیں بین الاقوامی سیاست سے ذرا بھی دلچسپی ہے تو تمہیں یہ سوال کرنا ہی نہیں چاہیے۔''

''گویا آپ میرے اندازے کی تصدیق کر رہے ہیں۔'' تیمور بولا۔ ''لیکن یہ سکّہ یہاں کیسے آ گیا؟ مارے جانے والے کون تھے اور یہ لوگ کون ہیں جنہوں نے شامی، نوشی اور جوجی کو پکڑ رکھا ہے؟''

نواب صاحب کا موڈ خراب ہو گیا۔ ''تم لوگ ہو اسی قابل... کیا ضرورت تھی لاشوں والی بات چھپانے کی اور پھر دوبارہ اس طرف جانے کی؟ تم نوجوانوں کو پتا ہی نہیں ہے اس خطے میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے اور ہمارا ملک اس وقت بڑی طاقتوں کا اکھاڑا بنا ہوا ہے۔''

تیمور نے نواب صاحب کی بات پر غور کیا۔ ''گویا آپ جانتے ہیں؟''

''ہاں، اتفاق سے ہمیں پتا چلا ہے کہ جھیل کے پاس ملنے والی دونوں لاشیں نہایت مشکوک افراد کی ہیں۔ ایک تو غیر مسلم نکلا اور رپورٹ ہے کہ اس کا تعلق پڑوسی ملک سے ہے۔''

''یہ وہ شخص ہے جس کی جیب سے سکّہ نکلا تھا؟''

''ہمیں یہ نہیں معلوم... اس نے سرمئی شکاری جیکٹ پہن رکھی تھی۔''

''وہی ہے۔''

''دوسرا مقامی ہے لیکن اس پر شبہ ہے کہ یہ غیر ملکی ایجنٹوں کے لیے کام کرتا تھا اور اس کے مغربی سرحد کے دوسری طرف روابط بھی تھے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کی گولی سے غیر مسلم مارا گیا۔''

''میرا خیال ہے، کھیل کچھ زیادہ ہی بڑا ہے۔'' تیمور نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ہمارا مسئلہ شامی اور باقی دو کی بحفاظت واپسی ہے۔''

''اگر ہمارا اندازہ غلط نہیں ہے تو یہ اتنا مشکل نہیں ہو گا۔ انہیں سکّے سے مطلب ہے اور وہ مقامی طور پر تشدد میں اسی وقت ملوث ہوتے ہیں جب ان کے سامنے ان کا کھلا دشمن ہو۔ مقامی لوگوں کو یہ حلیف شمار کرتے ہیں۔''

''آپ کا مطلب ہے، جھیل پر مارے جانے والے دونوں افراد ان کے کھلے دشمن تھے؟''

''ہمارا خیال یہی ہے۔''

''اگر آپ کا اندازہ درست نہ نکلا تو یہ معاملہ اتنی آسانی سے حل نہیں ہو گا۔'' تیمور نے کہا۔ ''کیا نوشی کے ڈیڈی اور جوجی کے اباجی کو اس بارے میں بتا دیا جائے؟''

''ابھی نہیں۔'' نواب صاحب سوچ کر بولے۔ ''فی الحال دیکھو دوبارہ رابطہ کرنے پر کیا بات سامنے آتی ہے۔ یہ تم نے اچھا کیا کہ اپنی شرط سامنے رکھ دی اور اس طرح کچھ مہلت اور مل گئی۔''

نواب صاحب نے مزید تصدیق کے لیے ایک سکّہ البم سے نکالا اور دونوں سکّوں کو طاقت ور خردبین کے نیچے رکھ کر دیکھا۔ وہ ساخت اور دھاتوں کے لحاظ سے ایک جیسے لگ رہے تھے۔ انہوں نے سکّہ واپس البم میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''دونوں بالکل ایک جیسے ہیں۔''

''دادا حضور! کیا اس سکّے کا مقصد ایشیا کو معاشی لحاظ سے دنیا کے دوسرے خطوں کی غلامی سے نجات دلانا ہے؟''

''بالکل... کیونکہ ایشیا صنعتی، معاشی اور مالیاتی لحاظ سے تقریباً یورپ اور امریکا کے گروپ کے ہم پلّہ ہو گیا ہے جبکہ اس کے وسائل اور افرادی قوت ان دونوں خطوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ اگر ہم معاشی لحاظ سے ہی اتحاد کر لیں تو مغرب کے استحصال سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے ایشیا کثیر الاقوامی، لسانی اور مذہبی بنیادوں پر تقسیم ہے اور سب کے آپس میں شدید اختلافات ہیں۔ خاص طور سے مذہبی تقسیم بہت زیادہ ہے۔ یہ ایشیا کے اتحاد میں رکاوٹیں ہیں۔ اب کوشش کی جا رہی ہے کہ ایشیا معاشی لحاظ سے ایک ہو جائے اور اس کا آغاز زرِ مبادلہ کے اپنے نظام سے ہو سکتا ہے۔''

''لیکن اسی خطے میں کچھ ممالک ایسے بھی ہیں جو ایشیا کے اتحاد سے زیادہ آس پاس کے ممالک پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے اگر انہیں مغرب کی غلامی کرنا پڑے تو وہ اس کے لیے بھی تیار ہیں۔''

''میرا خیال ہے، یہ اسی ملک کے ایجنٹ ہو سکتے ہیں۔'' نواب صاحب نے جھیل پر مارے جانے والوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''صرف یہی نہیں، گزشتہ ایک سال میں ایسے کوئی پچاس کے قریب افراد مارے جا چکے ہیں جن کا تعلق دونوں گروپوں سے بنتا ہے، اس لیے امکان ہے، ان میں فنا و بقا کی جنگ جاری ہے۔''

''ہمارے ملک میں؟''

نواب صاحب نے گہری سانس لی۔ ''برخوردار! جب ملک کے حکمران ملک سے زیادہ اپنی فکر میں لگ جائیں تو ملک لاوارث کی جائداد بن جاتا ہے۔ شاید آنے والا وقت کچھ بہتری لے کر آئے ورنہ جو لوگ اس وقت بیٹھے ہیں، ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے تو کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔“

تیمور اپنا موبائل ساتھ لے آیا تھا۔ اسے بے چینی سے اس شخص کی کال کا انتظار تھا اس لیے جب بیل بجی اور شامی کا نمبر آیا تو اس نے بے تابی سے کال ریسیو کی۔ لیکن خلافِ توقع دوسری طرف سے کسی عورت کی آواز آئی۔ ”مسٹر تیمور...؟“

”بات کر رہا ہوں۔“ تیمور نے وائس ریکارڈر اور لاؤڈ اسپیکر کے بٹن پہلے ہی دبا دیے تھے۔

”کچھ دیر پہلے میرے ساتھی نے تم سے بات کی تھی۔ کیا تم سکہ واپس کرنے کے لیے تیار ہو؟“

”ہاں لیکن اس کے لیے تمہیں موقع پر سکے اور ان تینوں کا تبادلہ کرنا ہوگا۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“

”تب اسے ممکن بناؤ ورنہ میں تم پر کیسے اعتماد کر سکتا ہوں کہ تم سکہ لے کر میرے ساتھیوں کو چھوڑ دو گی؟“

”تمہیں اعتماد رکھنا چاہیے۔ ہم نے ان کا اچار تو نہیں ڈالنا ہے۔“

نواب صاحب غور سے سن رہے تھے۔ انہوں نے اشارے سے تیمور سے کہا کہ وہ بات کرنا چاہتے ہیں۔ تیمور نے اس سے کہا۔ ”اصل بات یہ ہے کہ میں خود اس قسم کا کوئی فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔ تم میرے دادا نواب وقار الملک سے بات کرو۔“

نواب صاحب نے موبائل لیا۔ ”لڑکی! تم جو کوئی بھی ہو، اگر ہمارا اندازہ غلط نہیں ہے تو بہ حیثیت قوم ہم ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہیں؟“

”آپ کا اندازہ درست ہے نواب صاحب۔“ شکیلہ نے شائستگی سے کہا۔ ”بد قسمتی سے آپ کے پوتے صاحبان ہمارے ایسے ایک معاملے میں مداخلت کر بیٹھے ہیں جس کا انہیں کوئی فائدہ نہیں ہے اور آپ کے ملک کو کوئی نقصان نہیں ہے۔ ہم صرف اپنی چیز کی واپسی چاہتے ہیں اور آپ کے تینوں آدمیوں کو بہ حفاظت چھوڑ دیں گے۔ اس وقت بھی وہ محفوظ ہیں۔“

”ہم تمہیں ضمانت دیتے ہیں کہ تمہاری چیز تمہیں مل جائے گی اور تبادلے کے دوران اور اس کے بعد بھی کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔“

شکیلہ ہنسی۔ ”نواب صاحب! یہی ضمانت ہماری طرف سے ہے۔“

”لڑکی! ضمانت اس کی مانی جاتی ہے جو ازالہ کرنے کے لیے حاضر اور دستیاب ہو۔“ نواب صاحب خفگی سے بولے۔ ”ہم حاضر اور دستیاب ہیں۔ اگر کوئی مسئلہ ہوتا ہے تو ہم سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا یہی بات تم اپنے بارے میں کہہ سکتی ہو؟“

شکیلہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی۔ پھر اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ ٹھیک فرما رہے ہیں نواب صاحب... لیکن اس وقت آپ مجبور ہیں کیونکہ ایک بے جان سکے کے مقابلے میں تین انسانی جانیں ہیں۔ کیا آپ سکہ ہماری مرضی سے دینے سے انکار کر سکتے ہیں؟“

”تمہارا رویہ ہمیں مشکوک کر رہا ہے۔ شاید تم وہ نہیں ہو جو خود کو ظاہر کر رہی ہو۔ اس صورت میں ہم سکے سمیت اعلیٰ حکام سے رابطہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اور ممکن ہے دفترِ خارجہ بھی اس میں ملوث ہو جائے۔ بات اوپر تک جائے گی۔“

”کیا آپ دھمکی دے رہے ہیں نواب صاحب؟“

”جوابی دھمکی۔“ انہوں نے تصحیح کی۔ ”تم جانتی ہو، ہمارے ملک میں کس کا اثر رسوخ زیادہ ہے۔ اوپر تک بات جانے کی صورت میں یہ معاملہ لازمی ان کے علم میں بھی آئے گا جو اس وقت تمہارے ملک کو سپر پاور بننے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ یہ بات تمہارے ملک کے لیے کسی صورت بہتر نہیں ہوگی۔ اگر تم ہماری بات کا یقین کرو تو ہم خود اس چیز کے حامی ہیں۔ ہم سکے کے حوالے سے بات کر رہے ہیں کیونکہ ہم اس کی تاریخ سے بھی واقف ہیں اور ہمارے پاس ایسے کئی سکے موجود ہیں۔“

نواب صاحب کی بات سن کر شکیلہ کو چپ لگ گئی پھر اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگر ایسی بات ہے تو یہ ہماری خوش نصیبی ہے۔ لیکن نواب صاحب! آپ جانتے ہیں ہم ایک مخصوص طریقۂ کار کے تحت کام کرتے ہیں اور کسی بھی حالت میں اس سے انحراف نہیں کر سکتے۔ اس لیے ایک بات میں آپ کی مانتی ہوں، تبادلہ ایک ساتھ ہوگا... لیکن ایک بات آپ ہماری مانیں، تبادلہ ہماری مرضی کی جگہ ہوگا۔“

نواب صاحب نے سوچا اور پھر بات مان لی۔ ”ہمیں منظور ہے۔“

”تبادلے کے لیے صرف آپ اور تیمور آسکتے ہیں... کوئی تیسرا فرد نہیں آئے گا۔“

”ہمیں یہ بھی منظور ہے۔“

”ٹھیک ہے، آپ ایک گھنٹے بعد راول چوک پر ڈیم

کی طرف جانے والی سڑک کے دوسرے میل پر پہنچ جائیں۔ باقی ہدایات آپ کو وہیں ملیں گی۔“ شکیلہ نے کہا اور کال منقطع کر دی۔

☆☆☆

ارون، شکیلہ اور اس سے پہلے شاہ جی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس کے جانے کے بعد اگر کار نے نوشاد سے کہا۔ ”اگر ہم مکان پر قبضہ کر لیں تو کیسا رہے گا؟ میرا خیال ہے عورت اب سکہ لے کر یا اس کی واپسی کا بندوبست کر کے واپس آئے گی اس لیے صورتِ حال پر ہمارا کنٹرول ہونا لازمی ہے۔“

”مکان پر کیسے قبضہ کریں گے؟“

”ایک راستہ ہے جس سے ہم اندر جا سکتے ہیں۔ میں یہ نہیں جانتا کہ یہ لوگ اس کے بارے میں جانتے ہیں یا نہیں۔“

”تمہیں اس راستے کا علم کیسے ہوا؟“ نوشاد نے حیرانی سے کہا۔ ”تم نے آج تک مجھے نہیں بتایا۔“

”ساگر کے علم میں تھا۔“ اگر کار نے جواب دیا۔ ”میں اس وقت ان کے سربراہ کے پیچھے تھا اور اس کی نگرانی کے دوران یہ راستہ میرے علم میں آیا تھا اور اسی کی مدد سے ہم اندر گھسنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ورنہ یہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ ہم سامنے سے گھسے تھے۔ اس وقت ہم نے تاثر بھی یہی دیا تھا کہ ہم اس راستے سے ناواقف ہیں۔ اس امید پر کہ بعد میں یہ چیز شاید ہمارے کام آئے۔“

نوشاد مسکرایا۔ ”اب یہ چیز ہمارے کام آئے گی۔ اگر عورت سکہ واپس حاصل کرنے میں ناکام رہی، تب بھی کوئی بات نہیں، ہم ان پر قابو پا کر سب معلوم کر سکتے ہیں۔“

”بس تو چلو، ارون کے لیے پیغام چھوڑ دو کہ وہ یہیں رک کر ہماری کال کا انتظار کرے۔“

نوشاد نے مخصوص کوڈز میں ایک تحریر لکھ کر دین میں چھوڑ دی۔ اس کے بعد وہ دونوں جنگل کی طرف بڑھے۔ اگر کار آگے تھا۔ جھاڑیوں کے درمیان راستہ بناتے ہوئے وہ ایک نالے میں اتر گئے۔ نالا مکان کے پیچھے سے گزر رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اگر کار نے ایک طرف اُگی ہوئی بڑی جھاڑیاں ہٹائیں تو ان کے پیچھے سے سرنگ نما راستہ نکلا۔ بظاہر یہ سیوریج کی لائن تھی۔ تقریباً چار فٹ قطر کا پائپ تھا جو آگے جا رہا تھا۔ اگر کار نے ٹارچ نکالی اور پائپ میں گھس گیا۔ نوشاد پیچھے تھا۔ کوئی سو گز کے بعد پائپ اوپر کی طرف مڑا اور اب فولادی سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ وہ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ان کے آخر میں ایک فولادی ڈھکن لگا تھا۔ اگر کار نے اس کا ہینڈل گھما کر اسے کھول لیا اور وہ ایک فرش سے برآمد ہوئے۔ اندر آتے ہی بدبو کے شدید بھبکے نے ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے بے ساختہ ناک پر رومال رکھ لیے۔ بدبو کی وجہ ان کے سامنے تھی۔ ایک ڈھانچا جس نے شاید گاؤن پہن رکھا تھا، وہاں دراز تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک کتاب دبی ہوئی تھی۔ نوشاد نے ڈھانچے کو دیکھا۔

”یہ کون ہے؟“

”یہ ہمالیہ پار والے گروپ کا سربراہ میک ہے۔ افسوس کہ اس نے قابو میں آنے سے پہلے خودکشی کر لی تھی۔“

”اسی حالت میں؟“

”ہاں، اس نے ہماری مداخلت محسوس کرتے ہی اپنے گلے میں لاکٹ کی شکل کا کیپسول چبا کر نگل لیا اور پھر اسی طرح مر گیا۔“

”یہ کتاب...؟“ نوشاد نے دلچسپی سے کتاب کی طرف دیکھا، یہ خاصی موٹی سی کتاب تھی۔

”جب ہم اندر آئے تو یہ اسی طرح کتاب ہاتھ میں پکڑے دم توڑ رہا تھا۔ شاید اس وقت یہ کتاب پڑھ رہا تھا۔“

”یعنی کسی نے نہیں دیکھا کہ کتاب میں کیا ہے؟“

”اس کا تو کسی کو خیال ہی نہیں آیا تھا۔“ اگر کار نے اعتراف کیا۔

”تو اب دیکھ لیتے ہیں۔“ نوشاد آگے بڑھا تھا کہ اگر کار نے اسے روک لیا۔ اس نے کہا۔

”نہیں، پہلے اوپر والوں کو قابو کرنا ہوگا۔“

وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ یہ بھی فولادی سیڑھیاں تھیں جو چھت تک جا رہی تھیں۔ ”ویسے اس جگہ کی حالت سے لگ رہا ہے کہ یہاں سال بھر سے کوئی نہیں آیا ہے۔“ نوشاد نے کہا۔

اگر کار نے سائلنسر لگا پستول نکال لیا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ یہاں ایک بٹن تھا۔ جیسے ہی اس نے بٹن دبایا چھت کا یہ حصہ ایک طرف سرک گیا۔ اس نے باہر جھانکا، یہ اسٹور روم جیسی کوئی جگہ تھی۔ وہ باہر آیا، اس کے پیچھے نوشاد تھا۔ اگر کار نے دروازہ کھول کر باہر لاؤنج میں جھانکا۔ وہاں ماجی موجود تھا۔ شاہ جی اس وقت باہر تھا۔ اگر کار اچانک پستول تان کر باہر نکلا۔ ماجی اسے دیکھ کر اچھل پڑا اور پھر اس نے دیوانوں کی طرح پستول نکالا تھا کہ اگر کار نے اسے شوٹ کر دیا۔ گولی اس کی پیشانی پر لگی اور وہ بغیر آواز نکالے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے توکوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔"

تیمور اپنا موبائل ساتھ لے آیا تھا۔ اسے بے چینی سے اس شخص کی کال کا انتظار تھا اس لیے جب بیل بجی اور شامی کا نمبر آیا تو اس نے بے تابی سے کال ریسیو کی۔ لیکن خلافِ توقع دوسری طرف سے کسی عورت کی آواز آئی۔ "مسٹر تیمور...؟"

"بات کر رہا ہوں۔" تیمور نے وائس ریکارڈر اور لاؤڈ اسپیکر کے بٹن پہلے ہی دبا دیے تھے۔

"کچھ دیر پہلے میرے ساتھی نے تم سے بات کی تھی۔ کیا تم سکّہ واپس کرنے کے لیے تیار ہو؟"

"ہاں لیکن اس کے لیے تمہیں موقع پر سکّے اور ان تینوں کا تبادلہ کرنا ہوگا۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔"

"تب اسے ممکن بناؤ ورنہ میں تم پر کیسے اعتماد کر سکتا ہوں کہ تم سکّہ لے کر میرے ساتھیوں کو چھوڑ دو گی؟"

"تمہیں اعتماد رکھنا چاہیے۔ ہم نے ان کا اچار تو نہیں ڈالنا ہے۔"

نواب صاحب غور سے سن رہے تھے۔ انہوں نے اشارے سے تیمور سے کہا کہ وہ بات کرنا چاہتے ہیں۔ تیمور نے اس سے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ میں خود اس قسم کا کوئی فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔ تم میرے دادا نواب وقار الملک سے بات کرو۔"

نواب صاحب نے موبائل لیا۔ "لڑکی! تم جو کوئی بھی ہو، اگر ہمارا اندازہ غلط نہیں ہے تو بہ حیثیت قوم ہم ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہیں؟"

"آپ کا اندازہ درست ہے نواب صاحب۔" شکیلہ نے شائستگی سے کہا۔ "بدقسمتی سے آپ کے پوتے صاحبان ہمارے ایسے ایک معاملے میں مداخلت کر بیٹھے ہیں جس کا انہیں کوئی فائدہ نہیں ہے اور آپ کے ملک کو کوئی نقصان نہیں ہے۔ ہم صرف اپنی چیز کی واپسی چاہتے ہیں اور آپ کے تینوں آدمیوں کو بہ حفاظت چھوڑ دیں گے۔ اس وقت بھی وہ محفوظ ہیں۔"

"ہم تمہیں ضمانت دیتے ہیں کہ تمہاری چیز تمہیں مل جائے گی اور تبادلے کے دوران اور اس کے بعد بھی کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔"

شکیلہ ہنسی۔ "نواب صاحب! یہی ضمانت ہماری طرف سے ہے۔"

"لڑکی! ضمانت اس کی مانی جاتی ہے جو ازالہ کرنے کے لیے حاضر اور دستیاب ہو۔" نواب صاحب خفگی سے بولے۔ "ہم حاضر اور دستیاب ہیں۔ اگر کوئی مسئلہ ہوتا ہے تو ہم سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا یہی بات تم اپنے بارے میں کہہ سکتی ہو؟"

شکیلہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی۔ پھر اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ ٹھیک فرما رہے ہیں نواب صاحب... لیکن اس وقت آپ مجبور ہیں کیونکہ ایک بے جان سکّے کے مقابلے میں تین انسانی جانیں ہیں۔ کیا آپ سکّہ ہماری مرضی سے دینے سے انکار کر سکتے ہیں؟"

"تمہارا رویّہ ہمیں مشکوک کر رہا ہے۔ شاید تم وہ نہیں ہو جو خود کو ظاہر کر رہی ہو۔ اس صورت میں ہم سکّے سمیت اعلیٰ حکام سے رابطہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اور ممکن ہے دفترِ خارجہ بھی اس میں ملوث ہو جائے۔ بات اوپر تک جائے گی۔"

"کیا آپ دھمکی دے رہے ہیں نواب صاحب؟"

"جوابی دھمکی۔" انہوں نے تصحیح کی۔ "تم جانتی ہو، ہمارے ملک میں کس کا اثر رسوخ زیادہ ہے۔ اوپر تک بات جانے کی صورت میں یہ معاملہ لازمی ان کے علم میں بھی آئے گا جو اس وقت تمہارے ملک کو سپر پاور بننے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ یہ بات تمہارے ملک کے لیے کسی صورت بہتر نہیں ہوگی۔ اگر تم ہماری بات کا یقین کرو تو ہم خود اس چیز کے حامی ہیں۔ ہم سکّے کے حوالے سے بات کر رہے ہیں کیونکہ ہم اس کی تاریخ سے بھی واقف ہیں اور ہمارے پاس ایسے کئی سکّے موجود ہیں۔"

نواب صاحب کی بات سن کر شکیلہ کو چپ لگ گئی پھر اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر ایسی بات ہے تو یہ ہماری خوش نصیبی ہے۔ لیکن نواب صاحب! آپ جانتے ہیں ہم ایک مخصوص طریقۂ کار کے تحت کام کرتے ہیں اور کسی بھی حالت میں اس سے انحراف نہیں کر سکتے۔ اس لیے ایک بات میں آپ کی مانتی ہوں، تبادلہ ایک ساتھ ہوگا... لیکن ایک بات آپ ہماری مانیں، تبادلہ ہماری مرضی کی جگہ ہوگا۔"

نواب صاحب نے سوچا اور پھر بات مان لی۔ "ہمیں منظور ہے۔"

"تبادلے کے لیے صرف آپ اور تیمور آسکتے ہیں... کوئی تیسرا فرد نہیں آئے گا۔"

"ہمیں یہ بھی منظور ہے۔"

"ٹھیک ہے، آپ ایک گھنٹے بعد راول چوک پر ڈیم کی طرف جانے والی سڑک کے دوسرے میل پر پہنچ جائیں۔ باقی ہدایات آپ کو وہیں ملیں گی۔" شکیلہ نے کہا اور کال منقطع کر دی۔

☆☆☆

ارون، شکیلہ اور اس سے پہلے شاہ جی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس کے جانے کے بعد اگر کار نے نوشاد سے کہا۔ "اگر ہم مکان پر قبضہ کر لیں تو کیسا رہے گا؟ میرا خیال ہے عورت اب سکّہ لے کر یا اس کی واپسی کا بندوبست کر کے واپس آئے گی اس لیے صورتِ حال پر ہمارا کنٹرول ہونا لازمی ہے۔"

"مکان پر کیسے قبضہ کریں گے؟"

"ایک راستہ ہے جس سے ہم اندر جا سکتے ہیں۔ میں یہ نہیں جانتا کہ یہ لوگ اس کے بارے میں جانتے ہیں یا نہیں۔"

"تمہیں اس راستے کا علم کیسے ہوا؟" نوشاد نے حیرانی سے کہا۔ "تم نے آج تک مجھے نہیں بتایا۔"

"ساگر کے علم میں تھا۔" اگر کار نے جواب دیا۔ "میں اس وقت ان کے سربراہ کے پیچھے تھا اور اس کی نگرانی کے دوران یہ راستہ میرے علم میں آیا تھا اور اسی کی مدد سے ہم اندر گھسنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ورنہ یہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ ہم سامنے سے گھسے تھے۔ اس وقت ہم نے تاثر بھی یہی دیا تھا کہ ہم اس راستے سے ناواقف ہیں۔ اس امید پر کہ بعد میں یہ چیز شاید ہمارے کام آئے۔"

نوشاد مسکرایا۔ "اب یہ چیز ہمارے کام آئے گی۔ اگر عورت سکّہ واپس حاصل کرنے میں ناکام رہی، تب بھی کوئی بات نہیں، ہم ان پر قابو پا کر سب معلوم کر سکتے ہیں۔"

"بس تو چلو، ارون کے لیے پیغام چھوڑ دو کہ وہ یہیں رک کر ہماری کال کا انتظار کرے۔"

نوشاد نے مخصوص کوڈز میں ایک تحریر لکھ کر ڈین میں چھوڑ دی۔ اس کے بعد وہ دونوں جنگل کی طرف بڑھے۔ اگر کار آگے تھا۔ جھاڑیوں کے درمیان راستہ بناتے ہوئے وہ ایک نالے میں اتر گئے۔ نالا مکان کے پیچھے سے گزر رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اگر کار نے ایک طرف اُگی ہوئی بڑی جھاڑیاں ہٹائیں تو ان کے پیچھے سے سرنگ نما راستہ نکلا۔ بظاہر یہ سیوریج کی لائن تھی۔ تقریباً چار فٹ قطر کا پائپ تھا جو آگے جا رہا تھا۔ اگر کار نے ٹارچ نکالی اور پائپ میں گھس گیا۔ نوشاد پیچھے تھا۔ کوئی سو گز کے بعد پائپ اوپر کی طرف مڑا اور اب فولادی سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ وہ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ان کے آخر میں ایک فولادی ڈھکن لگا تھا۔ اگر کار نے اس کا ہینڈل گھما کر اسے کھول لیا اور وہ ایک فرش سے برآمد ہوئے۔ اندر آتے ہی بدبو کے شدید بھبکے نے ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے بے ساختہ ناک پر رومال رکھ لیے۔ بدبو کی وجہ ان کے سامنے تھی۔ ایک ڈھانچا جس نے شاید گاؤن پہن رکھا تھا، وہاں دراز تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک کتاب دبی ہوئی تھی۔ نوشاد نے ڈھانچے کو دیکھا۔

"یہ کون ہے؟"

"یہ ہمالیہ پار والے گروپ کا سربراہ میک ہے۔ افسوس کہ اس نے قابو میں آنے سے پہلے خودکشی کر لی تھی۔"

"اسی حالت میں؟"

"ہاں، اس نے ہماری مداخلت محسوس کرتے ہی اپنے گلے میں لاکٹ کی شکل کا کیپسول چبا کر نگل لیا اور پھر اسی طرح مر گیا۔"

"یہ کتاب...؟" نوشاد نے دلچسپی سے کتاب کی طرف دیکھا، یہ خاصی موٹی سی کتاب تھی۔

"جب ہم اندر آئے تو یہ اسی طرح کتاب ہاتھ میں پکڑے دم توڑ رہا تھا۔ شاید اس وقت یہ کتاب پڑھ رہا تھا۔"

"یعنی کسی نے نہیں دیکھا کہ کتاب میں کیا ہے؟"

"اس کا تو کسی کو خیال ہی نہیں آیا تھا۔" اگر کار نے اعتراف کیا۔

"تو اب دیکھ لیتے ہیں۔" نوشاد آگے بڑھا تھا کہ اگر کار نے اسے روک لیا۔ اس نے کہا۔

"نہیں، پہلے اوپر والوں کو قابو کرنا ہوگا۔"

وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ یہ بھی فولادی سیڑھیاں تھیں جو چھت تک جا رہی تھیں۔ "ویسے اس جگہ کی حالت سے لگ رہا ہے کہ یہاں سال بھر سے کوئی نہیں آیا ہے۔" نوشاد نے کہا۔

اگر کار نے سائلنسر لگا پستول نکال لیا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ یہاں ایک بٹن تھا۔ جیسے ہی اس نے بٹن دبایا چھت کا یہ حصہ ایک طرف سرک گیا۔ اس نے باہر جھانکا، یہ اسٹور روم جیسی کوئی جگہ تھی۔ وہ باہر آیا، اس کے پیچھے نوشاد تھا۔ اگر کار نے دروازہ کھول کر باہر لاؤنج میں جھانکا۔ وہاں ماجی موجود تھا۔ شاہ جی اس وقت باہر تھا۔ اگر کار اچانک پستول تان کر باہر نکلا۔ ماجی اسے دیکھ کر اچھل پڑا اور پھر اس نے دیوانوں کی طرح پستول نکالا تھا کہ اگر کار نے اسے شوٹ کر دیا۔ گولی اس کی پیشانی پر لگی اور وہ بغیر آواز نکالے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اگرکار نے پھرتی سے آگے بڑھ کر باہر جھانکا۔ یہاں گیلری تھی اور شاہ جی شاید ماجی کے گرنے کی آواز سن کر آرہا تھا۔ اگرکار نے آڑ سے کہا۔ ''خبردار! ہاتھ اٹھالو۔''

لیکن اس کی آواز سنتے ہی شاہ جی نے پستول نکال لیا۔ اگرکار کو مجبوراً گولی چلانی پڑی جو اس کے شانے پر لگی، وہ جھٹکے سے نیچے گرا اور اس سے پہلے اپنا گرا ہوا پستول دوبارہ اٹھاتا، اگرکار نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ضرب لگائی۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اگرکار کو خطرہ تھا کہ خود کو بے بس محسوس کر کے وہ خودکشی نہ کرلے۔ نوشاد پیچھے سے آیا اور شاہ جی کو کھینچ کر اندر لے گیا۔ اس نے تیزی سے اس کی تلاشی لی اور تمام چیزیں نکال لیں۔ اس کے گلے میں بھی لاکٹ تھا۔ نوشاد نے وہ بھی اتار لیا لیکن اس نے شاہ جی کے شانے سے بہنے والے خون کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ دومنٹ کے اندر وہ صورتِ حال پر قابو پاچکے تھے۔ مزید پانچ منٹ میں ان کو معلوم ہو گیا کہ تینوں مغوی کہاں ہیں۔ اگرکار نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اب ہمیں لڑکی کی واپسی کا انتظار کرنا ہے۔''

''لڑکی!'' نوشاد نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ''یہاں ایک لڑکی اور بھی ہے۔''

''فی الحال اپنی توجہ کام پر رکھو۔'' اگرکار کا لہجہ سخت تھا۔ ''بعد میں دیکھا جائے گا۔''

☆☆☆

نواب صاحب اور تیمور مرسیڈیز میں راول چوک سے دو میل آگے موجود تھے۔ دونوں مسلح تھے اور موبائل کی مدد سے نظام دین سے مسلسل رابطے میں تھے جو آدھ میل دور فولاد خان کے ساتھ موجود تھا۔ تیمور، نظام دین کو ساتھ لانے کے لیے تیار نہیں تھا مگر نواب صاحب نے کہا تو وہ مجبور ہو گیا۔ ویسے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ نظام دین اس معاملے میں کیا کرے گا۔ نواب صاحب نے فرمایا۔ ''تم ابھی نظام دین کے بارے میں جانتے نہیں ہو۔''

نظام دین عمر میں نواب صاحب سے کچھ ہی چھوٹا یا بڑا ہو گا۔ انہیں یہاں آئے ہوئے ایک گھنٹا ہونے کو آیا تھا۔ نواب صاحب نے گھڑی دیکھی۔ ''ابھی تک اس نے رابطہ نہیں کیا۔''

''دادا جان! میرا خیال ہے وہ اپنا اطمینان کر رہی ہو گی کہ ہم اکیلے ہیں اور اس کے لیے کوئی ٹریپ نہیں لائے ہیں۔''

''برخوردار! ٹریپ کے لیے اردو زبان میں لفظ پھندا موجود ہے۔'' نواب صاحب نے توجہ دلائی۔ نظام دین اور فولاد خان ان سے بالکل الگ روانہ ہوئے تھے اور ان کی گاڑی بھی سڑک سے ذرا ہٹ کر کھڑی تھی۔ انہیں امید تھی کہ وہ سڑک سے نظر نہیں آئے گی۔ موبائل فون کی مدد سے وہ رابطے میں تھے اور حالات میں کسی قسم کی تبدیلی کی صورت میں وہ حرکت میں آجاتے۔ تیمور کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے نواب صاحب سے کہا۔

''اگر ہمیں کہیں جانا پڑا جہاں موبائل کے سگنل نہ ہوئے تو فولاد خان سے رابطہ کیسے رہے گا؟''

''تم بےفکر رہو برخوردار! اس گاڑی میں ایک نشان دہی کرنے والا آلہ لگا ہے اور اس کی نشان دہی وصول کرنے والا آلہ نظام دین کے پاس ہے۔ ہم بہر صورت ان کی نظر میں رہیں گے۔''

تیمور گفتگو کے دوران میں آگے پیچھے نظر رکھے ہوئے تھا۔ ایک چھوٹی گاڑی دور سے آتی دکھائی دی۔ اس سڑک پر ٹریفک کم ہوتا تھا۔ ایک منٹ میں مشکل سے ایک گاڑی گزرتی تھی۔ گاڑی مرسیڈیز کے پاس رکی اور اس سے وہی لڑکی اتری جسے تیمور نے جھیل پر دوربین سے دیکھا تھا۔ وہ اسے پہچان گیا لیکن جب وہ پاس آئی تو انجان بن کر بولا۔

''مے آئی ہیلپ یو؟''

نواب صاحب نے تیمور کے تابع دارانہ انداز سے زیادہ اس کی انگریزی کا بُرا منایا۔ شکیلہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''مسٹر تیمور! زیادہ انجان مت بنو۔ تم مجھے پہچان چکے ہو۔ میرے پیچھے آؤ۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹ کر کار کی طرف چلی گئی۔ تیمور نے سرد آہ بھری اور بولا۔

''دادا جان! کیا زمانہ آگیا ہے، لڑکیاں اپنے پیچھے آنے کو کہتی ہیں۔''

''برخوردار! یہ زمانہ تو ہمیشہ سے تھا۔ اب فرق یہ آیا ہے کہ لڑکے چل بھی پڑتے ہیں۔''

تیمور کھسیا گیا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور لڑکی کی گاڑی کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ اسے لڑکی کے انداز پر حیرت تھی۔ اس نے سکے کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ بس ان سے پیچھے آنے کا کہہ کر چل پڑی، جیسے اسے پورا یقین ہو کہ وہ کوئی دھوکا نہیں کریں گے اور پیچھے آئیں گے۔ کچھ دیر بعد اس کی گاڑی ایک ایسے راستے پر مڑ گئی جس پر آگے جا کر ویرانہ تھا۔ تیمور کو تشویش ہونے لگی جبکہ نواب صاحب اطمینان سے سگار پی رہے تھے۔ نظام دین اور فولاد

خان ان کے پیچھے آرہے تھے۔ کچھ دیر بعد نظام دین نے نواب صاحب کو اطلاع دی۔

''آپ کے پیچھے اور ہمارے آگے ایک گاڑی اور ہے۔''

''مشکوک لگ رہی ہے؟''

''اس کا انداز مشکوک ہے جناب... وہ ایک مخصوص فاصلے سے آپ کی کار کے پیچھے ہے۔''

''ٹھیک ہے، اسے بھی نظر میں رکھنا۔'' نواب صاحب بولے۔ وہ موبائل کا اسپیکر فون استعمال کر رہے تھے اس لیے بات کرنے کے لیے موبائل کان سے لگانا ضروری نہیں تھا۔ آگے پیچھے کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کسی سے موبائل پر بات کر رہے ہیں۔ جیسے ہی موبائل سگنل کی حد ختم ہوئی، انہوں نے موبائل رکھا اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی چابی والا بٹن دبایا اور دوسری بار دبانے پر اس سے نظام دین کی دھیمی آواز آئی۔ وہ رابطے کی تصدیق کر رہا تھا۔ تیمور حیران تھا کیونکہ اس نے آج تک نواب صاحب کے پاس اس قسم کی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی۔ اس نے تعاقب جاری رکھا اور آدھ گھنٹے بعد لڑکی کی گاڑی ایک کچے راستے پر مڑ گئی۔ تیمور نے نواب صاحب سے پوچھا تو انہوں نے چلتے رہنے کا حکم دیا۔ تیمور خطرہ محسوس کر رہا تھا لیکن نواب صاحب کا حکم تھا اس نے مجبوراً گاڑی اس طرف موڑ دی۔ نظام دین نے اطلاع دی کہ تعاقب کرنے والی گاڑی بھی اسی طرف مڑ گئی ہے۔

''میرا خیال ہے کہ اس میں اسی لڑکی کا کوئی ساتھی ہے۔''

''ممکن ہے۔'' نواب صاحب بولے۔ ''تم مسلح ہو؟''

''جی، پستول ہے میرے پاس۔''

''وہ تو اس گدھے کے پاس بھی تھا۔'' نواب صاحب نے برہمی سے کہا۔ ''اس کے باوجود کتنے آرام سے ان لوگوں کے ہاتھ آگیا۔''

تیمور سوچ رہا تھا کہ شامی اتنے آرام سے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ ان لوگوں نے کچھ چکر چلایا ہو گا۔ شاید وہ نوشی اور جو جی کی وجہ سے مجبور ہوا ہو۔ اچانک آگے والی کار ایک ٹیلے پر چڑھنے لگی۔ تیمور نے تقلید جاری رکھی۔ ٹیلے پر پرانی طرز کی عمارت بنی ہوئی تھی۔ شکیلہ نے گاڑی عمارت کے سامنے روک دی اور نیچے اتر آئی۔ نواب صاحب نے واکی ٹاکی بھی شیروانی کی جیب میں رکھ لیا۔ اب نظام دین اور فولاد خان ان کی باتیں سن سکتے تھے۔ شکیلہ نے ان کی طرف دیکھا۔ ''نواب صاحب اور مسٹر تیمور! اگر آپ کے پاس ہتھیار ہیں تو گاڑی میں چھوڑ دیں۔''

''ہمارے ہتھیار لباس میں رہیں گے جب تک ان کی ضرورت نہ پڑے۔'' نواب صاحب نے کہا تو شکیلہ نے سر ہلایا۔

''میں آپ کے وعدے پر اعتبار کرتی ہوں... میرے ساتھ آئیے۔''

شکیلہ انہیں لے کر عمارت کے عقبی حصے میں واقع خفیہ دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور نیچے اتر گئی۔ تیمور تیار نہیں تھا لیکن نواب صاحب کے اشارے پر اسے بادل ناخواستہ اس چوہے دان میں قدم رکھنا پڑا۔ اس کے خیال میں یہ جگہ چوہے دان ہی تھا ان کے لیے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نظام دین اور فولاد خان بہ وقتِ ضرورت ان کا پتا کیسے لگائیں گے؟ لیکن نواب صاحب کی خاموشی دیکھتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گیا۔ نواب صاحب سب سے پیچھے تھے۔ ان کے اندر آتے ہی شکیلہ نے دروازہ بند کر دیا اور اسی لمحے اس نے فرش پر خون کی ہلکی سی جھلک دیکھ لی۔ اگرچہ فرش اچھی طرح صاف کیا گیا تھا مگر کچھ خون رہ گیا تھا۔ اس نے اپنا پستول نکال لیا۔ نواب صاحب ٹھٹکے۔

''لڑکی! کیا تمہارا بدعہدی کا ارادہ ہے؟''

شکیلہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور لاؤنج کے دروازے کی طرف بڑھی تھی کہ آواز آئی۔ ''تم نشانے پر ہو، ہتھیار پھینک دو۔''

شکیلہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ آواز اجنبی تھی لیکن لہجہ بتا رہا تھا کہ بولنے والے کا تعلق کہاں سے ہے۔ یعنی اس کے ساتھی پکڑے گئے تھے یا مارے گئے تھے۔ اس نے سوچا اور پستول کا رخ اپنے سر کی طرف کیا تھا کہ عقب سے تیمور نے ہاتھ مار کر پستول گرا دیا۔ شکیلہ بھوکی شیرنی کی طرح پلٹی لیکن تیمور نے اس کے ہاتھ تھام لیے اور آہستہ سے بولا۔ ''یہ کیا ہے... اندر کون ہے؟''

''دشمن... وہ اندر آگئے ہیں۔''

اسی لمحے اگرکار اور نوشاد اندر سے نکل آئے۔ ذرا دیر بعد وہ سب لاؤنج میں تھے۔ تلاشی لے کر نواب صاحب اور تیمور کا اسلحہ بھی لیا جا چکا تھا۔ یہ صورتِ حال اتنی غیر متوقع تھی کہ وہ کوئی مزاحمت نہیں کر سکے تھے۔ تلاشی لینے والوں نے ہر چیز لے لی تھی لیکن نواب صاحب کی گھڑی بچ گئی۔ ایک منٹ بعد خفیہ دروازے سے ارون بھی اندر آگیا۔ شکیلہ نے زخمی شاہ جی کو صرف ایک نظر دیکھا اور اب انہیں گھور رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''تم لوگ اندر کیسے آئے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہاں آنے کا ایک راستہ اور بھی ہے۔'' اگرکار بولا۔ ''تم لوگ اس سے بے خبر ہو۔''

''اورتم اس سے واقف ہو؟'' شکیلہ نے طنز کیا۔

''شاید تم اسے بلف سمجھ رہی ہو لیکن جلد تم جان جاؤ گی۔'' اگرکار نے کہا۔ ''اب کام کی بات ہو جائے... گولڈن آئی کہاں ہے؟''

شکیلہ چونکی پھر انجان بن کر بولی۔ ''یہ کیا چیز ہے؟''

''میرا خیال ہے نواب صاحب بتائیں گے، سکہ ان کے پاس ہے۔'' اگرکار نے ان کی طرف دیکھا۔ ''برائے مہربانی سکہ خود دے دیں ورنہ...''

نواب صاحب نے سکہ نکال کر اس کے سامنے پھینک دیا۔ اگرکار نے سکہ اٹھایا اور شکیلہ کے سامنے کر دیا۔ ''یہ ہے گولڈن آئی۔ اور اب تم بتاؤ گی کہ یہ کیا چیز ہے؟''

''تم مجھ سے نہیں معلوم کر سکتے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

''تم بتاؤ گی۔'' اگرکار بولا اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ نواب صاحب اور تیمور کو بھی وہیں بند کر دیں جہاں شامی، نوشی اور جوجی بند تھے۔ وہ ان کو لے گئے۔ شکیلہ نے شاہ جی کی طرف دیکھا۔ اس کے شانے سے خون بہنا بند ہو گیا تھا لیکن وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ نوشاد اور ارون اپنا کام کر کے آئے۔ شکیلہ نے کہا۔

''میرا ایک ساتھی اور بھی تھا؟''

''وہ اب نہیں ہے، اس نے خودکشی کر لی۔''

شکیلہ نے سر ہلایا۔ ''میں بھی تمہارے ہاتھ زندہ نہ آتی اگر یہ لڑکا حماقت نہ کرتا۔''

اگرکار آگے آیا اور اس نے اچانک شکیلہ کے گلے پر ہاتھ مار کر لاکٹ کھینچ لیا۔ شکیلہ نے مزاحمت کرنا چاہی لیکن وہ اسے روک نہیں سکی۔ صرف تلملا کر رہ گئی۔ اگرکار نے لاکٹ کی طرف دیکھا اور معنی خیز انداز میں کہا۔

''زہر ہے اس میں... تمہارے سربراہ میک نے بھی ایسے ہی لاکٹ کی مدد سے خودکشی کر لی تھی۔''

شکیلہ چونکی۔ ''میک نے خودکشی...؟''

''ہاں، اسی مکان میں ایک خفیہ جگہ ہے اور ہم وہیں سے آئے تھے۔ اس نے ہماری آمد محسوس کرتے ہی زہر کھا لیا اور مر گیا۔ اس کی لاش بھی وہیں پڑی ہے... دیکھو گی؟''

کچھ دیر بعد وہ تہ خانے میں اتر رہے تھے۔ اسٹور روم میں ماجی کی لاش پڑی تھی۔ نیچے ڈھانچا اسی طرح کتاب ہاتھ میں لیے پڑا تھا۔ شکیلہ کتاب دیکھ کر چونکی اور پھر اس کے تاثرات سے ایسا لگا جیسے وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اگرکار اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اس کتاب میں کیا ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔'' شکیلہ بولی۔

''جلد تم جان جاؤ گی۔'' نوشاد سفاک انداز میں بولا اور اس کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

جیسے ہی نواب صاحب اور تیمور کمرے میں آئے، شامی اور باقی سب اچھل پڑے۔ شامی نے بوکھلا کر کہا۔ ''دادا جان! آپ بھی...''

''جی، آپ کی حماقتوں سے یہاں پہنچے ہیں۔'' نواب صاحب نے کڑے تیوروں کے ساتھ کہا۔ ''خیر، آپ سے بعد میں نمٹیں گے۔''

نواب صاحب نے گھڑی منہ کے پاس لا کر آہستہ سے کہا۔ ''نظام دین...!''

''جی نواب صاحب؟'' نظام دین کی مستعد آواز آئی۔

''تم دونوں مکان تک آ گئے ہو؟''

''جی، ہم مکان کے احاطے کے ساتھ ہیں۔''

''اندر ہمیں لانے والوں کے دشمن ہیں۔ ان کی تعداد تین ہے اور وہ پوری طرح مسلح ہیں۔ تم فولاد خان سے کہو، مشین گن نکال لے۔''

''وہ مشین گن لایا ہے۔''

''مکان کے دائیں طرف آؤ۔ دوسری کھڑکی کے آگے دیوار میں لگی اینٹوں میں دائیں کھڑکی سے اور زمین سے تیسری اور بارھویں پھر پانچویں اور دسویں اور آخر میں ساتویں اور چھٹی اینٹ دباؤ گے تو خفیہ راستہ کھل جائے گا۔ آگے راہداری ہے۔ دروازہ ایک لاؤنج میں کھلتا ہے۔ لاؤنج کے دائیں طرف ایک راہداری میں آمنے سامنے دو کمرے ہیں۔ دائیں طرف کے آخری کمرے میں ہم سب بند ہیں۔ باقی تمہیں اور فولاد خان کو خود دیکھنا ہو گا... سمجھ گئے نا؟''

''جی نواب صاحب!'' نظام دین نے جواب دیا۔

شامی نے سرگوشی میں تیمور سے کہا۔ ''اس وقت تو دادا جان جیمز بانڈ کا رائل ایڈیشن لگ رہے ہیں۔''

''بیٹے، یہاں سے زندہ سلامت واپسی ہوئی تو تم دادا جان کا جلالی ایڈیشن بھی دیکھ لو گے۔'' تیمور نے جوابی سرگوشی کی۔

''یہ کون سی نئی بات ہے۔'' شامی نے سرد آہ بھری۔ ''بچپن سے اب تک یہ ایڈیشن تو دیکھ رہے ہیں۔''

''یہ آپ کس ایڈیشن کی بات کر رہے ہیں جی۔'' جوجی کھسک کر ان کے قریب آ گیا۔

''اپنے کام سے کام رکھو برخوردار۔'' شامی نے منہ بنا کر کہا۔

نواب صاحب نے انہیں گھورا۔ ''مہربانی کر کے آپ سب چپ رہیں اور کسی بھی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہیں۔''

☆☆☆

فولاد خان اس وقت پشتو فلموں کا جنگجو ہیرو بننے کے لیے بے تاب تھا اور اگر اس کی لگام نظام دین جیسے تجربہ کار آدمی کے ہاتھ میں نہ ہوتی تو وہ اس مکان میں گھس کر دشمنوں کے کشتوں کے پشتے لگا چکا ہوتا۔ نظام دین نے کہا۔ ''فولاد خان! اندر دشمن نامعلوم ہیں اور نواب صاحب سمیت سب کی جان خطرے میں ہے۔ اس لیے جیسا میں کہوں ویسا کرنا ہے۔''

اس لیے فولاد خان مجبور ہو گیا۔ نظام دین نواب صاحب کی راہنمائی سے راستہ جان گیا تھا۔ وہ اور فولاد خان خاموشی سے مکان کے دائیں طرف پہنچے اور نظام دین نے بتائی ہوئی اینٹوں کو دبایا تو خفیہ راستہ کھل گیا۔ فولاد خان چوکنا تھا۔ اس نے مشین گن سامنے کر لی اور کسی خطرے کی صورت میں وہ گولیاں چلانے کے لیے بالکل تیار تھا۔ وہ دونوں دبے قدموں اندر آئے۔ نظام دین نے بھی پستول نکال لیا تھا اور اس نے جس طرح پکڑ رکھا تھا، ایسا لگتا تھا وہ اس کے استعمال پر قادر ہے۔ اندر آ کر اس نے فولاد خان کو ایک ایسی جگہ کھڑا کیا جہاں سے وہ ہر طرف نظر رکھ سکتا تھا اور خود راہداری کی طرف بڑھا۔ دائیں طرف کا آخری کمرا باہر سے بند تھا اور صرف مضبوط قسم کی کنڈی لگی تھی۔ نظام دین نے کنڈی کھولی اور اندر دیکھ کر نواب صاحب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ سر ہلا کر باہر آ گئے اور آہستہ سے پوچھا۔

''ان میں سے کوئی نظر نہیں آیا؟''

اسی لمحے بائیں طرف کے کمرے سے شکیلہ کے چلّانے کی آواز آئی۔ نظام دین نے اس کمرے کو باہر سے کنڈی لگا دی اور سرگوشی میں بولا۔ ''یہاں سے نکل چلیں نواب صاحب۔''

''تم ان بچوں کو لے کر جاؤ۔ فولاد خان کہاں ہے؟''

''وہ پاس ہی ہے۔''

لیکن تیمور اور شامی نے نواب صاحب کی تجویز ماننے سے انکار کر دیا۔ ''آپ ان کے ساتھ گاڑی میں جائیں۔ میں، شامی اور فولاد خان یہاں کے معاملات دیکھتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ ہم پولیس کو مطلع کرتے ہیں۔'' نواب صاحب تذبذب سے بولے۔ خطرے سے نکلنے کے بعد وہ یہاں رکنا نہیں چاہتے تھے۔

''دادا جان! وہ لڑکی ان کے قبضے میں ہے اور وہ نہ جانے اس سے کیا سلوک کریں۔'' تیمور نے کہا۔ ''میں اسے ان لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔''

مجبوراً نواب صاحب نے نظام دین، جوجی اور نوشی کے ساتھ باہر کا رخ کیا۔ نظام دین کا پستول تیمور نے لے لیا تھا جبکہ شامی کو فولاد خان کا ریوالور مل گیا۔ یہ طے تھا کہ وہ سب بائیں طرف کے آخری کمرے میں تھے اور انہیں ابھی تک خبر نہیں تھی کہ ان کے قیدی آزاد ہو گئے ہیں۔

☆☆☆

انہوں نے شکیلہ کو بے بس کر کے ایک کرسی پر باندھ دیا تھا اور اچانک ہی ان کے تاثرات حیوانی ہو گئے تھے۔ خاص طور سے نوشاد کی باقاعدہ رال ٹپک رہی تھی لیکن شکیلہ ذرا بھی خوف زدہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''تم کسی صورت مجھ سے گولڈن آئی کے بارے میں معلوم نہیں کر سکتے۔''

''ہمیں معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' نوشاد آگے آیا۔ ''ہم یہ سکہ اپنے اوپر والوں کو بھیج دیں گے اور وہ خود اس کے بارے میں معلوم کر لیں گے۔'' اس نے کہتے ہوئے اچانک شکیلہ کی شرٹ کھینچی تو اس کے سامنے کے بٹن ٹوٹ گئے۔ اس نے نوشاد کے منہ پر تھوک دیا۔ جواب میں نوشاد نے اسے تھپڑ مارا تو شکیلہ چلّائی۔ اگرکار ڈھانچے اور اس کے ہاتھ میں دبی کتاب کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے نوشاد اور ارون سے کہا۔

''جو کرنا ہے جلدی کرو۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے اور ان سب کو ٹھکانے لگانا ہے۔''

''ایسا کرو، تم اوپر چلے جاؤ۔'' ارون بولا۔ ''کہیں زخمی ہوش میں نہ آ جائے۔''

اگرکار نے سوچا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے، بعد میں سب کو اسی جگہ چھوڑ کر یہاں آگ لگا دیں گے۔''

اگرکار کے جاتے ہی وہ درندوں کی طرح شکیلہ پر ٹوٹ پڑے اور وہ چیخنے چلّانے لگی۔ لیکن اس سے پہلے وہ ایک حد سے آگے بڑھتے، اچانک اگرکار واپس آیا۔ اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیز لہجے میں کہا۔ ’’خطرہ ہے، کسی نے اسٹور روم کے دروازے کو باہر سے بند کر دیا ہے۔‘‘

وہ شکیلہ کو چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اروِن نے کہا۔ ’’ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔‘‘

’’اس کا خاتمہ کر دو۔‘‘ اگرکار نے ڈھانچے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا تو نوشاد نے سرد آہ بھر کر شکیلہ کی طرف دیکھا جو اوپری لباس سے تقریباً محروم ہو چکی تھی۔ پھر اس نے اس کی گردن دبوچ لی، وہ اسے مارنے جا رہا تھا مگر شکیلہ کی نظریں اگرکار پر لگی تھیں۔ جیسے ہی اس نے ڈھانچے کے ہاتھ سے کتاب کھینچنے کی کوشش کی، شکیلہ نے خود کو اس طرح کرسی سمیت جھٹکا دیا کہ وہ نوشاد کی اوٹ میں آ گئی اور فوراً ہی خوفناک ..... دھماکا ہوا۔ چاروں طرف آگ، دھواں اور گوشت کے پرواز کرتے ٹکڑے تھے۔ نوشاد دھماکے کے زور سے اس سے ٹکرایا اور پھر نہ جانے کہاں گیا۔ شکیلہ محفوظ رہی تھی۔ اسے چوٹیں آئی تھیں لیکن کوئی جان لیوا زخم نہیں لگا تھا۔ اوپر سے چھت کا کچھ حصہ گرا تھا لیکن وہ دور ہونے کی وجہ سے محفوظ رہی تھی مگر اب چاروں طرف شعلے بھڑک رہے تھے اور وہ بندھی پڑی تھی۔ کچھ دیر کی بات تھی، شعلے اور دھواں اس کی زندگی ختم کر دیتے۔ جان بچنے کی کوئی صورت نہیں دکھائی دے رہی تھی اور جب اس نے خود کو مرنے کے لیے تیار کر لیا تو چھت کا ایک خفیہ خانہ کھلا اور کوئی سیڑھیوں سے نیچے آیا۔ اس نے شکیلہ کے ہاتھ کھولے اور اسے سہارا دے کر اوپر لایا۔ یہ تیمور تھا۔ شامی اوپر تھا۔ شکیلہ پر نظر پڑتے ہی اس نے گڑبڑا کر رخ دوسری طرف کر لیا۔

☆☆☆

اس واقعے کے چھ گھنٹے بعد وقار ولا میں شکیلہ، شاہ جی، نواب صاحب، شامی اور تیمور کے ساتھ موجود تھے۔ ان کی مرہم پٹی ہو گئی تھی۔ ایک ڈاکٹر نے شاہ جی کے شانے سے گولی نکال کر ڈریسنگ کر دی تھی۔ دواؤں اور خوراک کے بعد اس کی حالت بہتر تھی۔ شکیلہ کو دوسرا لباس مل گیا تھا اور صاف ستھری ہو کر وہ پہلے سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ’’نواب صاحب! میں اور میرا ملک آپ کا شکر گزار ہیں۔‘‘

’’اس کی ضرورت نہیں ہے... کیونکہ ہم آپس میں دوست ہیں اور دوستوں کے لیے وقت پڑنے پر کام آیا جاتا ہے، یہی ان کا فرض ہوتا ہے۔‘‘

شکیلہ نے سر ہلایا۔ ’’آپ بلاشبہ ہمارے کام آئے ہیں۔‘‘

نواب صاحب نے سنہری سکہ شکیلہ کی طرف بڑھایا۔

’’یہ آپ کی امانت!‘‘

شکیلہ نے سکہ لیا اور پھر دوبارہ نواب صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ ’’اسے آپ میری طرف سے حقیر سا تحفہ سمجھ لیں۔ مجھے معلوم ہے، یہ اور اس سے وابستہ راز آپ کے پاس بھی اتنا ہی محفوظ رہے گا جتنا کہ ہمارے پاس ہو سکتا ہے۔‘‘

نواب صاحب نے سکہ لے لیا اور پھر نظام دین کو ہدایت کی کہ ان کو جہاں یہ کہیں، چھوڑ دیا جائے۔ وہ باہر آئے تو شامی نے شکیلہ سے پوچھا۔ ’’تمہارے ساتھی کے خدوخال غیر ملکی ہیں لیکن تمہارے...‘‘

’’میرا باپ ایک پاکستانی تھا جو وہیں جا کر بس گیا تھا۔ اس لیے میں کہہ سکتی ہوں کہ یہ بھی میرا ملک ہے۔ بچپن سے اب تک کئی بار یہاں آ چکی ہوں اسی لیے مجھے یہاں بھیجا گیا تھا۔‘‘

’’اس خفیہ کمرے میں کیا ہوا تھا؟‘‘ تیمور نے سوال کیا۔ وہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ وہاں دھماکا کیسے ہوا؟

’’وہاں ہمارا سربراہ تھا۔ اس خفیہ کمرے کے بارے میں بس وہی جانتا تھا اور جب دشمنوں نے اس جگہ کا سراغ لگا لیا تو ان کے ہاتھ لگنے سے پہلے اس نے خودکشی کر لی اور مرنے سے پہلے کتاب کی صورت کا ایک بم ایکٹی ویٹ کر کے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ جیسے ہی کوئی اس کتاب کو اس کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کرتا، وہ ایک دھماکے سے پھٹ جاتی اور ایسا ہی ہوا۔‘‘

شامی نے جھرجھری لی۔ ’’تمہارا بچ جانا معجزے سے کم نہیں ہے۔ ان تینوں کا تو حشر ہو گیا تھا۔‘‘

پورچ میں ڈرائیور گاڑی سمیت ان کا منتظر تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے شکیلہ نے ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کیا اور بولی۔ ’’امید ہے آج جو کچھ ہوا، آپ میں سے کوئی اس کا ذکر کہیں نہیں کرے گا۔‘‘

’’میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ یہ راز ہمیشہ کے لیے ہمارے سینے میں دفن ہو گیا ہے۔‘‘ تیمور نے ٹھوس لہجے میں کہا تو شکیلہ مسکرائی۔ اس نے اور شاہ جی نے سب سے ہاتھ ملایا اور گاڑی میں بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔ تیمور نے گہری سانس لی اور بولا۔ ’’ایسے ہوتے ہیں زندہ قوموں کے زندہ لوگ۔‘‘

’’اور ہم کیا ہیں؟‘‘ شامی نے پوچھا۔

’’یہ آپ کو نواب صاحب بتائیں گے۔‘‘ نظام دین نے مداخلت کی۔ ’’آج ڈنر کے بعد اسٹڈی میں آپ کی طلبی ہے۔‘‘

یہ سن کر شامی کا منہ لٹک گیا اور نظام دین مسکراتا ہوا اندر چلا گیا۔

دوسری کہانی

آثارِ جنوں

سلیم فاروقی

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

زندگی کے اسرار و رموز سمجھنے کے لیے ایک عمر بیتانی پڑتی ہے... لیکن کچھ لوگ اسے کرکٹ کا ون ڈے سمجھتے ہوئے... ہر طرح کا شاٹس کھیل جاتے ہیں... جبکہ زندگی کی اننگز صبر آزما... بردباری اور تحمل جیسے شاٹس کی متقاضی ہوتی ہے... ایک جلد باز... تیز رفتار نوجوان کا ماجرا جو ہر قدم اٹھانے کے بعد سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا...

دشتِ حیات میں جذبات و جنوں کا نہ تھمنے والا طوفان

بلاخیز سرورق کی دلچسپ داستان

میں اور واحد خان سردی سے کانپتے ہوئے اونچے نیچے پہاڑی راستوں پر چل رہے تھے۔ ہم دونوں اسکول جا رہے تھے۔ ہمارا اسکول گاؤں سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھا۔ مجھے اسکول جانے کا قطعی شوق نہیں تھا لیکن بابا کی خواہش تھی کہ میں پڑھ لکھ کر اس کا اور قبیلے کا نام روشن کروں۔

میرے بابا بہادر خان قبیلے کے سردار تھے۔ ہمارا قبیلہ علاقے کے تمام قبائل میں سب سے بڑا اور طاقتور تھا۔ ہمارے پاس دولت کی کمی بھی نہ تھی لیکن بابا کو نہ جانے کب اور کہاں سے تعلیم کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ وہ خود تو پڑھ نہیں سکے تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں۔

میرے ماموں افغانستان میں رہتے تھے۔ وہ بھی اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ ان کا بیٹا نادر خان اعلیٰ تعلیم کے لیے روس گیا تھا۔

بابا چاہتے تھے کہ نادر خان کی طرح میں بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولایت جاؤں۔

گرمیوں میں تو اسکول جانے میں اتنی تکلیف نہیں ہوتی تھی لیکن سردیاں میرے لیے عذاب سے کم نہیں ہوتی تھیں۔

گھر میں دو دو جیپیں موجود تھیں لیکن اسکول کا راستہ ایسا تھا کہ وہاں جیپ تو درکنار، سائیکل بھی نہیں جا سکتی تھی۔

ہمارے گاؤں سے ایک دوسرا راستہ بھی اسکول جاتا تھا۔ وہ راستہ خاصا طویل تھا اور سڑک پہاڑوں میں بل کھاتی ہوئی چلی گئی تھی۔ میں اگر اس راستے سے اسکول جاتا تو کم سے کم ڈیڑھ گھنٹا لگتا۔ پھر اسی سڑک پر ہمارے دشمن قبیلے کا گاؤں بھی تھا۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا تھا اس لیے بابا اور اماں کو ہر دم یہ خوف رہتا تھا کہ کوئی دشمن مجھے نقصان نہ پہنچا دے یا مخالف قبیلے کا کوئی آدمی مجھے اغوا نہ کر لے۔

☆☆☆

میں نے پانچویں کلاس تو پاس کر لی۔ اب مجھے سیکنڈری اسکول میں پڑھنے کے لیے مزید دو میل دور جانا تھا۔ وہاں تک باقاعدہ کوئی سڑک تو نہیں جاتی تھی لیکن لوگ خچروں اور گھوڑوں پر وہاں تک سفر کیا کرتے تھے۔ واحد خان میرے ساتھ پہلی جماعت سے پڑھتا آیا تھا۔ اس کا باپ کچھ پڑھا لکھا تھا اس لیے وہ بابا کے ٹرک اور بسوں کا حساب کتاب رکھتا تھا۔ بابا نے واحد خان کو بھی میرے ساتھ چھٹی کلاس میں داخلہ دلا دیا۔ اب سب سے بڑا مسئلہ اسکول جانے کا تھا۔ گھوڑے کی سواری مجھے آتی تھی لیکن بابا ابھی مجھے گھوڑا دینا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے ہمارے لیے دو خچروں کا

سرورق کی کہانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انتظام کر دیا۔ پہاڑی علاقوں میں گھوڑوں سے زیادہ خچر کارآمد ہوتے ہیں۔ یوں ہم دونوں خچر پر اسکول جانے لگے۔ وہ راستہ محفوظ تھا اس لیے بابا جان اب میری طرف سے اتنے فکر مند بھی نہیں ہوتے تھے۔

میں نے مارے باندھے آٹھویں تک پڑھا پھر پڑھائی سے میرا دل اچاٹ ہو گیا۔ شاید میں آٹھویں جماعت بھی پاس کر لیتا لیکن عین امتحان کے دنوں میں مجھے شدید بخار نے آلیا۔ یوں میں آٹھویں کا امتحان نہ دے سکا۔ واحد خان البتہ بہت محنت سے پڑھ رہا تھا۔

جب نئی کلاسیں شروع ہوئیں تو میں نے اسکول جانے سے انکار کر دیا۔ بابا نے مجھے بہت سمجھایا، قبیلے کے دوسرے لوگوں نے حتیٰ کہ واحد خان نے بھی مجھے سمجھایا لیکن اب پڑھائی سے میرا دل بھر گیا تھا۔

صبح ہوتے ہی میں اپنی رائفل لے کر نکل جاتا اور گھوڑے پر اس علاقے میں دور تک چلا جاتا جہاں گھنے درختوں کے جھنڈ ہوتے تھے۔ وہاں چھوٹے موٹے جانوروں کا شکار کرتا، بعض اوقات کوئی چیتا یا بھیڑیا بھی مار گراتا۔ اس شکار کے نتیجے میں میرا نشانہ اتنا بہترین ہو گیا تھا کہ میں اڑتے ہوئے پرندے کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ اڑتا ہوا پرندہ تو پھر بھی آسان ہدف ہوتا ہے۔ میں نے نشانے بازی کے لیے ایک چٹان منتخب کر لی تھی۔ میں اس پر چاک سے نشان لگاتا اور کافی فاصلے سے عین اسی نشان کو ہدف بناتا۔ اس سے میرا نشانہ مزید بہتر ہو گیا۔

ایک دن میں نے اسی طرح کا کامیاب نشانہ لگایا اور دوسرے نشان پر فائر کرنے ہی والا تھا کہ عقب میں مجھے آہٹ سنائی دی۔

میں بجلی کی سی تیزی سے گھوما۔ وہاں ایک لمبا تڑنگا آدمی کھڑا تھا۔ اس نے شلوار قمیص پر کمانڈو جیکٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر بڑے بڑے بال تھے اور پیروں میں ربر سول کے لانگ بوٹ تھے۔

"کون ہو تم؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"گھبراؤ مت۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "تم سردار بہادر خان کے بیٹے ہو؟"

"ہاں، میں ان کا بیٹا ہوں لیکن تم کون ہو؟"

"میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔" وہ ہنس کر بولا۔ "میرا نام اکبر خان ہے۔ میں تمہارے ہی قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں لیکن اپنے کام کے سلسلے میں افغانستان میں رہتا ہوں۔ میں یہاں اپنے ایک دوست سے ملنے آیا تھا اور اب واپس جا رہا تھا کہ فائرنگ کی آواز سن کر ادھر آ گیا۔"

"میں یہاں نشانے بازی کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ہاں، میں نے دیکھا ہے تمہارا نشانہ۔" اس نے کہا۔

"کیسا نشانہ ہے میرا؟" میں نے فخریہ انداز میں پوچھا۔

"بس ٹھیک ہے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "رائفل سے ایسا نشانہ تو بچے بھی لگا لیتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "ایسا ہی نشانہ اگر پسٹل یا ریوالور سے لگا کر دکھاؤ تو میں واقعی سمجھوں گا کہ تمہارا نشانہ اچھا ہے۔"

میں اس کی بات پر بھنا گیا۔ میرے نشانے کی تعریف تو واحد خان بھی کرتا تھا اور شیر دل خان بھی جو فوج سے ریٹائر ہو کر آیا تھا اور خود بھی نشانے بازی میں ماہر تھا۔

"میرے پاس اس وقت ریوالور یا پستول نہیں ہے ورنہ..."

"میرے پاس ہے۔" اس نے میری بات کاٹ دی اور ایک ریوالور میری طرف اچھال دیا۔ میں ریوالور بھی چلانا جانتا تھا۔ میں نے ریوالور اٹھا لیا۔ وہ اعشاریہ چار پانچ کا بھاری بھر کم ریوالور تھا۔ میں نے اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور اپنے لگائے ہوئے نشانات میں سے ایک کو ہدف بنا کر نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔

میرے ہاتھ کو زبردست جھٹکا لگا اور گولی ہدف سے کئی انچ اوپر جا کر لگی۔

اکبر خان نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ تم ابھی کچے نشانے باز ہو۔"

"ریوالور کے جھٹکے کی وجہ سے میرا نشانہ چوک گیا۔" میں نے خفیف سا ہو کر کہا۔

"چلو ایک دفعہ پھر کوشش کرو۔" اس نے گویا مجھے چڑایا۔

میں نے دوبارہ کوشش کی لیکن اس کا بھی وہی انجام ہوا۔

"دیکھو، میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ریوالور سے نشانہ کیسے لیا جاتا ہے۔" اس نے کہا۔ "اپنے دائیں ہاتھ کو کلائی کے پاس سے پکڑ لو۔ پھر نشانہ لگانے کی کوشش کرو۔"

میں نے بائیں ہاتھ سے ریوالور والی کلائی تھامی اور نشانہ لے کر فائر کر دیا لیکن یہ گولی بھی ہدف سے دور تھی۔

"تھوڑی سی پریکٹس کرو گے تو نشانہ لگا لو گے۔" اس نے کہا پھر ریوالور مجھ سے لے کر بولا۔ "یہ دیکھو۔" اس نے لگاتار دو فائر کیے۔ دونوں فائر میرے...... لگائے ہوئے

نشان کے اندر تھے۔

مجھے اس کے ہاتھوں میں دو ریوالور نظر آئے۔

"یہ سب پریکٹس سے آتا ہے۔ تم بھی پریکٹس کرو گے تو سیکھ جاؤ گے۔" پھر وہ بولا۔ "تم کچھ کھانے پینے کو بھی لاتے ہو یا بھوکے پیاسے پھرتے رہتے ہو؟"

"میں کھانا اور پانی وغیرہ لے کر آتا ہوں۔" میں نے کہا اور اس طرف بڑھ گیا جہاں میں نے کھانے پینے کا سامان رکھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بھوکا ہے۔

میں نے بیگ سے کھانے کا ڈبا نکالا۔ ایک کپڑے میں پراٹھے بھی تھے اور پانی کی دو بوتلوں کے علاوہ اس میں رائفل کی گولیاں بھی بھری ہوئی تھیں۔ میں نے کھانا اس کے سامنے رکھ دیا اور بولا ۔ "تم کھانا کھا لو لگتا ہے تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

"آ جاؤ، تم بھی کھا لو۔" اس نے کہا۔ "ورنہ بھوکے رہ جاؤ گے۔"

ہم دونوں کھانے میں مشغول ہو گئے۔ میں نے اس سے کہا۔ "اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو مجھے ریوالور سے نشانہ لگانا سکھا دو۔"

"نشانے بازی تو مشق سے آتی ہے سرفراز بیٹا۔" اس نے کہا۔

"تم... میرا نام بھی جانتے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"سردار بہادر خان کے بیٹے کو کون نہیں جانتا۔" وہ ہنس کر بولا۔ "لیکن نشانے بازی کے لیے تمہیں کم سے کم ایک مہینے تک پریکٹس کرنا ہو گی۔"

"میں ایک ہفتے میں کر کے دکھاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "بس تم مجھے سکھا دو کہ دونوں ہاتھوں سے نشانہ کیسے لگایا جاتا ہے؟"

"میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "مجھے ابھی بہت دور جانا ہے۔ تم رائفل سے اتنا اچھا نشانہ لے سکتے ہو تو ریوالور اور پستول سے بھی نشانہ لینے میں ماہر ہو جاؤ گے۔ بس پریکٹس کرتے رہو۔ تمہیں ایک دو دنوں میں خود بھی اندازہ ہو جائے گا کہ ریوالور کے جھٹکے کی نوعیت کیا ہے۔ جس دن تمہیں اندازہ ہو جائے گا، تم درست نشانہ لینے لگو گے۔" پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے ابھی بہت دور جانا ہے۔ ہاں، اگر کچھ عرصے بعد میں واپس آیا تو تم سے ضرور ملاقات ہو گی۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت تک تم بہترین نشانے باز بن چکے ہو گے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے گلے لگایا اور تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔

میں نے دوسرے ہی دن پوائنٹ فور فائیو کے دو ریوالور اور ان کے بہت سے راؤنڈز لیے اور اس علاقے میں پہنچ گیا جہاں میں نشانے بازی کی مشق کیا کرتا تھا۔

شروع شروع میں مجھے کچھ دقت ہوئی پھر آہستہ آہستہ میں مشاق ہو گیا اور صرف ایک ہفتے میں ہدف کو نشانہ بنانے لگا۔ بائیں ہاتھ سے فائر کرنے میں مجھے دقت ہوئی لیکن ایک ماہ بعد میں دونوں ہاتھوں سے اسی مشاقی سے فائر کرنے لگا۔

اب مجھے اکبر خان کا انتظار تھا لیکن اس دن کے بعد مجھے اکبر خان پھر کبھی نظر نہیں آیا۔

دن یوں ہی گزرتے رہے۔ اس دوران میں واحد خان نے میٹرک کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ اس کے باپ نے اسے مزید تعلیم کے لیے پشاور بھیج دیا۔

اب میں جیپ لے کر اکثر پشاور بھی جانے لگا تھا۔ میں وہاں گھومتا پھرتا، اپنے لیے قیمتی کپڑوں اور جوتوں کی خریداری کرتا۔ ایک رات واحد خان کے ساتھ گزارتا اور دوسرے دن گاؤں لوٹ آتا۔

میرے مزاج میں ایک شدت پسندی سی تھی۔ نشانے بازی کی طرح میں ڈرائیونگ میں بھی ماہر تھا اور ان بل کھاتی سڑکوں پر بھی گاڑی یوں دوڑاتا تھا جیسے موٹروے پر سفر کر رہا ہوں۔

میرے ساتھ جیپ میں جو ایک دفعہ بیٹھ جاتا، وہ پھر کبھی نہیں بیٹھتا تھا۔ وہ لوگ میری خوفناک ڈرائیونگ سے خوف زدہ ہو جاتے تھے۔

اس دن حسبِ معمول میں واحد خان سے مل کر واپس آ رہا تھا۔ میں نے ضد کر کے نئی لینڈ کروزر خریدی تھی۔ نئی گاڑی میں ڈرائیونگ کا مزہ ہی اور ہے۔ میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر گولی کی رفتار سے جا رہا تھا۔

اچانک میرے راستے میں کھٹارا سی ایک جیپ آ گئی۔ مجبوراً مجھے رفتار کم کرنا پڑی۔ میں نے راستہ دینے کے لیے جیپ والے کو کئی بار ہارن دیے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ سڑک اتنی تنگ نہیں تھی کہ اس سے دو جیپیں ایک ساتھ نہ گزر سکتیں۔

کئی دفعہ ہارن دینے کے بعد بھی جب ڈرائیور نے مجھے راستہ نہیں دیا تو میں بری طرح جھنجلا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے چڑا رہا ہو۔ وہ عقب نما آئینے میں مجھے دیکھ رہا تھا لیکن راستہ نہیں دے رہا تھا۔

اس کی وجہ سے میں بھی چیونٹی کی رفتار سے چلنے پر مجبور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کی جیپ کو پیچھے سے زوردار ٹکر ماروں اور کسی کھائی میں گرا دوں۔

میں جانتا تھا کہ کچھ دور کے بعد یہ سڑک چوڑی ہو جاتی ہے۔ میں نے اس جگہ سے اسے اوورٹیک کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اس کی گاڑی کے عین عقب میں چلتا رہا۔

دور سے سڑک کا وہ حصہ نظر آیا تو میں مستعد ہو گیا۔ ہماری گاڑیاں جونہی اس جگہ پہنچیں، میں نے اچانک رفتار بڑھائی اور انتہائی خوف ناک انداز میں جیپ کو اوورٹیک کر لیا۔ یہ بہت ہی خوف ناک کوشش تھی۔ میں اگر چند انچ مزید دائیں طرف چلا جاتا تو کسی گہری کھائی میں جا گرتا۔ دوسری جیپ بھی بس چند انچ کے فاصلے سے بچ گئی۔

اسے اوورٹیک کر کے میں آگے نکلا اور اتنا بھنّایا ہوا تھا کہ اپنی گاڑی ایک دم روک دی۔

دوسری جیپ والا بھی بہت اچھا ڈرائیور تھا۔ اس نے بہت مہارت سے جیپ روک لی ورنہ شاید تصادم ہو جاتا۔

میں بھنّا کر نیچے اترا تو دوسری جیپ سے بھی تین آدمی باہر نکل آئے۔ ان میں سے ایک شخص اپنے حلیے اور چال ڈھال سے خاصا معزز اور باوقار لگ رہا تھا۔ اس نے ڈپٹ کر پوچھا۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟“

”یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟“ میں نے بھی درشت لہجے میں کہا۔ ”اپنے اس اناڑی ڈرائیور سے پوچھیں کہ وہ مجھے راستہ کیوں نہیں دے رہا تھا۔“

”تمیز سے بات کرو لڑکے۔“ وہ بپھر کر بولا۔ ”میں خان شہزاد ہوں۔“

میں نے اس کا نام سن رکھا تھا۔ وہ بھی ایک قبیلے کا سردار تھا۔ اس قبیلے سے ہماری کوئی دشمنی بھی نہیں تھی۔

”آپ بھی شاید مجھے نہیں جانتے۔ میں...“

”سردار بہادر خان کے بیٹے ہو تم۔“ اس نے کہا۔ ”میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”تو پھر آپ بھی مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے کے بجائے اپنے ڈرائیور کو ڈرائیونگ سکھائیں۔“

”تم ہوش میں تو ہو؟“ خان شہزاد ایک دم بپھر گیا۔ ”کیا تمہیں راستہ دینے کے لیے میں خود کسی کھڈ میں گر جاتا۔ پھر تمہیں ایسی بھی کیا جلدی تھی؟“

”سڑک پر بہت جگہ تھی۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کے ڈرائیور نے جان بوجھ کر مجھے راستہ نہیں دیا۔“

”اور تم نے میرا راستہ روک لیا، خان شہزاد کا راستہ روک لیا۔ ہٹاؤ اپنی گاڑی کو۔“ وہ گرج کر بولا۔

”اپنے ڈرائیور سے کہیں پہلے وہ مجھ سے معافی مانگے۔“ میں نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

”ورنہ... کیا کرو گے تم؟“ وہ بپھر کر بولا۔ ”کیا یونہی میرا راستہ روک کر کھڑے رہو گے؟“

”یہی سمجھ لیں۔“ میں نے بھی درشت لہجے میں کہا۔

”سرفراز خان! تمہاری اتنی ہمت۔“ وہ غضب ناک ہو کر بولا۔ ”تمہاری جگہ اگر کسی اور نے خان شہزاد کا راستہ روکنے کی کوشش کی ہوتی تو اب تک یہاں اس کی لاش پڑی ہوتی۔“

”آپ کی جگہ بھی اگر کوئی اور ہوتا تو وہ بھی اب بولنے کے قابل نہ ہوتا۔“

خان شہزاد نے ایک دم بغلی ہولسٹر سے پستول نکال لیا۔ اس کے دونوں آدمیوں نے بھی برق رفتاری سے اپنی رائفلیں مجھ پر تان لیں۔

صورتِ حال اچانک ہی سنگین ہو گئی۔ میں نے بھی بہت سرعت سے اپنے دونوں ریوالور نکال لیے۔

”تمہاری اتنی جرأت؟“ خان شہزاد گویا غصے میں پاگل ہو گیا۔ ”تم مجھ پر ہتھیار اٹھاؤ گے۔“ یہ کہہ کر اس نے اچانک فائر کر دیا۔

گولی میرے پاؤں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے خان سے پہلے اس کے دونوں آدمیوں کو نشانہ بنایا اور فوراً ہی تیسرا فائر خان شہزاد پر کر دیا جو اس کی پیشانی پر لگا۔ وہ لوگ وہیں ڈھیر ہو گئے۔

میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اسی وقت مجھے ایک چرواہا نظر آیا جو شاید یہ سارا واقعہ دیکھ رہا تھا اور اب تیزی سے نشیب میں دوڑ رہا تھا۔

وہ موقع کا گواہ تھا۔ میں نے اس پر بھی فائر کیا لیکن وہ چٹان کے پیچھے غائب ہو گیا۔

میں گاڑی میں بیٹھا اور برق رفتاری سے گاڑی دوڑاتا ہوا گاؤں پہنچا۔

بابا جان اس وقت اپنے حجرے میں تھے۔ میں سیدھا اماں کے پاس پہنچا۔

وہ مجھے بوکھلایا ہوا دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گئیں اور بولیں۔ ”کیا بات ہے سرفراز خان! تو اتنا پریشان کیوں ہے؟“

”اماں! میرے ہاتھ سے قتل ہو گئے ہیں۔“ میں نے پُرتفکر انداز میں کہا۔

”تو اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟“ اماں نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ قصور تیرا نہیں ہو گا۔ کیا تجھے حمزہ خان کے آدمیوں نے گھیر لیا تھا؟“ اماں نے پوچھا۔

حمزہ خان اس قبیلے کا سردار تھا جس سے ہماری دیرینہ دشمنی اور عداوت تھی۔

”نہیں اماں۔“ میں نے کہا۔ ”اگر بات حمزہ خان یا اس کے آدمیوں کی ہوتی تو مجھے پریشانی کے بجائے خوشی ہوتی لیکن...“

”لیکن کیا بیٹا؟“ اماں نے جلدی سے پوچھا۔

”میرے ہاتھ سے خان شہزاد اور اس کے دو آدمی مارے گئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

اماں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ بمشکل بولیں۔ ”خان شہزاد تو ہمارے قبیلے کا دوست اور بہت طاقتور سردار تھا۔ وہ تجھ سے کہاں ٹکرا گیا؟“

میں نے انہیں تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ اس واقعے کا ایک چشم دید گواہ بھی ہے۔

اماں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”سرفراز بیٹا! خان شہزاد کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اب جرگہ بیٹھے گا اور یقیناً تیرے بابا ہی جرگے کے سردار بھی ہوں گے۔ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کتنے اصول پرست انسان ہیں۔ وہ اپنے اصولوں کی خاطر تجھے بھی قربان کر دیں گے بیٹا! وہ تجھے خان شہزاد کے بھائیوں اور بیٹوں کے حوالے کر دیں گے۔ جرگے میں شامل دوسرے سردار بھی تجھے ہی قصوروار ٹھہرائیں گے... تُو... ایسا کر... ابھی اور اسی وقت... یہاں سے بھاگ جا... بھاگ جا بیٹا۔“ اماں کے آنسو پھر بہنے لگے۔

”اماں! میں بھاگ کر جاؤں گا کہاں اور...“

”خدا کی اتنی بڑی دنیا ہے۔“ اماں نے کہا۔ ”تُو کہیں بھی چلا جا۔“ اماں نے سسکتے ہوئے کہا۔ پھر اپنی الماری میں سے بہت سے نوٹ نکالے اور مجھے دے دیے۔ ”لے بیٹا! یہ رکھ لے۔ تجھے پیسوں کی ضرورت پڑے گی۔“

دس بارہ ہزار اس وقت میری جیب میں تھے۔ اماں کی دی ہوئی رقم بھی اچھی خاصی تھی جو میں نے بغیر گنے جیبوں میں ٹھونس لی۔

پھر اماں نے بہت عجلت میں ایک بیگ میں میرے چند جوڑے اور ضرورت کا دوسرا سامان رکھ دیا اور میرے ماتھے پر بوسہ دے کر بولیں۔ ”جا بیٹا! اللہ کے حوالے۔ اللہ کو منظور ہوا تو تجھ سے پھر ملاقات ہو گی۔ بس اب تو دیر مت کر۔ ہاں، اپنی گاڑی لے کر مت جانا ورنہ تیرے بابا کا اتنا اثر رسوخ ہے کہ وہ تجھے پشاور کیا، لاہور سے بھی پکڑ لیں گے۔“

اسی وقت قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں اس آہٹ کو پہچانتا تھا۔ یہ بابا جان کے قدموں کی آہٹ تھی۔ میں جلدی سے دوسرے کمرے میں چھپ گیا۔

”سرفراز خان کہاں ہے؟“ بابا نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”سرفراز... باہر ہی ہو گا۔“ اماں نے کہا۔ ”وہ تو شاید پشاور گیا تھا؟“

”وہ پشاور سے لوٹ آیا ہے۔“ بابا گرج کر بولے۔ ”اس کی گاڑی باہر موجود ہے۔“

”تو پھر وہ... حجرے میں ہو گا۔“ اماں نے کہا۔ ”خیر تو ہے۔ آپ اتنے غصے میں کیوں ہیں خان جی؟“ اماں نے پوچھا۔ ”کیا سرفراز خان نے پھر گاڑی کہیں مار دی ہے یا...“

”اس نے پورے علاقے میں میری ناک کٹوا دی ہے۔ اس نے خان شہزاد کے قبیلے سے ایک نئی دشمنی کا آغاز کر دیا ہے۔“

”کیا کر دیا ہے اس نے؟“ اماں گھبرا کر بولیں۔

”اس نے خان شہزاد کو قتل کر دیا ہے۔ امیر گل اس قتل کا چشم دید گواہ ہے۔ وہ اس وقت اپنی بکریوں اور بھیڑوں کا ریوڑ لے کر گاؤں کی طرف آ رہا تھا۔ خان کے ساتھ ساتھ اس نے خان کے دو محافظوں کو بھی قتل کر دیا ہے۔ بات اگر محافظوں کی ہوتی تو شاید ان کے وارثین کو خون بہا دے کر اس کی جان بچ جاتی لیکن خان شہزاد کے بھائی اور بیٹے کسی بھی قیمت پر نہیں مانیں گے۔“

”اب کیا ہو گا خان جی؟“ اماں نے تشویش سے پوچھا۔

”اب اس کے لیے جرگہ بیٹھے گا۔“ بابا جان نے کہا۔ ”سرفراز خان گھر میں آئے تو اسے فوراً میرے پاس حجرے میں بھیجو۔“ بابا جان یہ کہہ کر چلے گئے۔

میں سوچ رہا تھا کہ گاڑی لے کر خاموشی سے نکل جاؤں گا لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا۔ گاڑی تو میں کہیں بھی فروخت کر سکتا تھا۔ اماں کا خدشہ اپنی جگہ لیکن گاڑی کے بغیر میرا وہاں سے فرار ہونا بھی بہت مشکل تھا۔

اماں ایک مرتبہ پھر کمرے میں آئیں اور بولیں۔ ”سرفراز! تُو نے سن لیا تیرے بابا کیا کہہ رہے تھے؟ تُو یہاں سے فوراً نکل جا۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اماں، میں پیدل کتنی دور تک جا سکتا ہوں؟'' میں نے کہا۔ ''ابھی تو دن کا اجالا ہے۔ ذرا اندھیرا ہو جائے تو نکلتا ہوں۔''

میں اسی وقت اپنے کمرے میں چلا گیا۔ حویلی کے کسی ملازم کی جرأت نہیں تھی کہ وہ میرے کمرے میں بغیر اجازت یا میری غیر موجودگی میں داخل ہو سکے۔ میں نے اپنی مزید کچھ ضروری چیزیں بیگ میں رکھیں۔ ان میں میرے دونوں مشین پسٹل اور ان کے بہت سے میگزین تھے۔ میں تو رائفل بھی لے جانا چاہتا تھا لیکن پھر کچھ سوچ کر اسے وہیں رکھ دیا۔ میں نے بیگ میں دو تین جدید فیشن کے کپڑے بھی رکھ لیے۔

اب مجھے اندھیرا پھیلنے کا انتظار تھا۔ اس کے باوجود مجھے یہ پریشانی تھی کہ میں اگر پیدل فرار بھی ہوا تو بابا جان کے آدمی میرا تعاقب کر کے فوراً ہی مجھے پکڑ لیں گے۔ میری طرح وہ لوگ بھی ہر اس راستے سے واقف تھے جو میرے علم میں تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک تدبیر آ گئی۔ میرا ملازمِ خاص عبدالرحمٰن مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس نے مجھے گودوں میں کھلایا تھا۔ میں نے اماں سے کہا کہ عبدالرحمٰن کو میرے کمرے میں بھیج دیں۔

''لیکن بیٹا! وہ...''

''وہ کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ میں پیدل یہاں سے فرار نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی گاڑی لے کر جاؤں گا۔''

''لیکن بیٹا...''

''آپ پریشان نہ ہوں اماں! وہ گاڑی میں پشاور پہنچتے ہی فروخت کر دوں گا۔ وہاں سے پھر لاہور یا پنجاب کے کسی دوسرے علاقے میں نکل جاؤں گا۔''

عبدالرحمٰن فوراً ہی آ گیا۔ میں اسے خان بابا کہتا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا اور بولا۔ ''چھوٹے خان! آپ یہاں بیٹھے ہیں اور بڑے خان کے لوگ آپ کو پورے گاؤں میں تلاش کر رہے ہیں۔''

''میں اس وقت بہت مصیبت میں ہوں خان بابا!'' میں نے کہا۔ ''اگر کر سکتے ہو تو میرا ایک کام کر دو۔''

''حکم کریں سرکار! آپ کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔''

''میری گاڑی حجرے کے نزدیک کھڑی ہے۔ تم اسے لے کر گاؤں کے سرے پر پہنچا دو۔''

''یہ کام تو بہت مشکل ہے۔'' عبدالرحمٰن نے کہا۔ ''لیکن میں اپنی جان پر کھیل کے گاڑی وہاں سے نکال لوں گا۔''

میں نے اسے گاڑی کی چابی دی اور خود چھپتا چھپاتا گاؤں سے باہر جانے والی سڑک پر پہنچ گیا۔ وہاں ایک چٹان کی آڑ میں رک کر میں عبدالرحمٰن کا انتظار کرنے لگا۔

وہ تقریباً دس منٹ بعد پہنچا۔

''کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں چھوٹے خان! وہاں علاقے کے کئی سرداروں اور خانوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں نے بہت خاموشی سے آپ کی گاڑی نکالی اور یہاں آ گیا۔''

''بہت شکریہ خان بابا!'' میں نے کہا۔ ''میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔''

اس نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اشارے سے اسے روک دیا اور اس سے گلے مل کر اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔

گاڑی کا فیول گیج بتا رہا تھا کہ اس کی ٹنکی آدھی سے زیادہ بھری ہوئی ہے۔ میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

پھر میں انتہائی تیز رفتاری سے گاڑی دوڑاتا ہوا پشاور پہنچ گیا۔

میں نے وہ گاڑی ایک ایسے ڈپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے پارک کر دی جہاں اس سے پہلے کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں نے اس میں سے اپنا بیگ نکالا اور گاڑی پر کور چڑھا کر واحد خان کے ہاسٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ مجھے رات کے اس پہر دیکھ کر گھبرا گیا اور بولا۔ ''خیریت ہے سرفراز! تم اس وقت یہاں... تم تو...''

''واپس گاؤں چلا گیا تھا۔'' میں نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔ پھر اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

میری باتیں سن کر وہ بھی کچھ دیر کے لیے گم صم ہو کر رہ گیا پھر آہستہ سے بولا۔ ''سرفراز! یہاں تو تم بالکل غیر محفوظ ہو۔ بڑے خان سب سے پہلے یہیں پہنچیں گے پھر وہ یہاں کے تمام ہوٹل دیکھیں گے۔ تم ایسا کرو کہ فوری طور پر لاہور کی طرف نکل جاؤ۔ وہاں کسی چھوٹے سے ہوٹل میں ٹھہر جانا۔ وہاں تمہاری گاڑی کی بھی اچھی قیمت مل جائے گی۔'' پھر وہ آہستہ سے بولا۔ ''یہ مت سمجھنا سرفراز کہ میں تم سے جان چھڑا رہا ہوں۔ تمہارے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے لیکن میرا مشورہ یہی ہے کہ پشاور میں رکنا تمہارے لیے مناسب نہیں۔''

اس کا مشورہ معقول تھا۔ وہ مجھے چھوڑنے گاڑی تک آیا۔ میرے سامان کا بھاری بھرکم بیگ بھی اس نے اٹھا لیا تھا۔

جب میں روانہ ہونے لگا تو وہ والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

اس وقت تک پاکستان میں سیل فون اتنے عام نہیں ہوئے تھے۔ مجھے بھی کبھی اس کی ضرورت نہیں پڑی تھی اس لیے سیل فون میرے پاس بھی نہیں تھا۔

اس سے رخصت ہو کر میں جی ٹی روڈ پر آ گیا اور تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑتا ہوا لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ راستے میں اگر کوئی پولیس موبائل وین آ گئی تو میری تیز رفتاری کی وجہ سے پولیس والے شبہے میں مبتلا ہو سکتے تھے۔

میں راولپنڈی پہنچا تو تھکن سے نڈھال تھا لیکن میں وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔

پنڈی پہنچتے پہنچتے اچھا خاصا دن نکل آیا تھا۔ میں نے گزشتہ دوپہر کو واحد خان کے ساتھ ہلکا پھلکا لنچ کیا تھا۔ اس کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

ایک ہوٹل کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے گاڑی روک دی۔ ہوٹل کے باہر تلے جانے والے پراٹھوں کی اشتہا انگیز مہک سے میری بھوک چمک اٹھی تھی۔ میں نے وہاں رک کر خوب سیر ہو کے ناشتا کیا، پھر دو کپ چائے پی گیا۔ کھانے سے میرے جسم میں ایک نئی توانائی آ گئی تھی۔

ہوٹل کے سامنے ہی گاڑیوں کا ایک شوروم تھا اور شوروم کے ملازمین اس کے شٹر ہٹا رہے تھے۔ پھر وہ صفائی میں مصروف ہو گئے۔ ان میں سے ایک لڑکا وہاں کھڑی ہوئی گاڑیوں کو جھاڑنے پونچھنے اور چمکانے میں مصروف ہو گیا۔

اچانک میں نے سوچا کہ میں اپنی گاڑی سے یہیں پیچھا چھڑا لوں۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں شوروم پر پہنچ گیا۔

میرے وہاں آتے ہی ایک لڑکا میری طرف لپکا اور بولا۔ ''صاحب! کیا گاڑی میں نئے وہیل کیپ لگوانے ہیں یا اس کی سروس کرانا ہے؟ پیچھے کی طرف ہمارا سروس اسٹیشن بھی ہے۔''

''مجھے یہ گاڑی بیچنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ کو گاڑی بیچنا ہے؟'' وہ حیرت سے بولا۔ ''لیکن صاحب! یہ تو بالکل نئی گاڑی ہے، اسی سال کا ماڈل ہے۔ کیا اس کے انجن میں کوئی گڑبڑ ہے؟''

''کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بس اس گاڑی سے میرا دل بھر گیا ہے۔ میں اسے بیچ کر پراڈو خریدنا چاہتا ہوں۔''

''آپ اندر آ جائیں صاحب۔'' لڑکا خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ ''سیٹھ صاحب ابھی تک آئے نہیں ہیں۔ آپ بیٹھیں۔ میں انہیں ٹیلی فون کرتا ہوں۔''

''سیٹھ صاحب کتنی دیر میں آ جائیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بس دس منٹ میں آ جائیں گے۔'' لڑکے نے کہا۔ ''آپ چائے پئیں گے؟''

''نہیں، میں نے ابھی ابھی چائے پی ہے۔'' میں نے کہا۔

سردیاں شروع ہو چکی تھیں اس لیے لڑکے نے ہیٹر چلا دیا اور ٹیلی فون پر کسی کو اطلاع دینے لگا۔ ''کوئی خان صاحب اپنی لینڈ کروزر بیچ کر پراڈو خریدنا چاہتے ہیں... اے ون کنڈیشن میں ہے سیٹھ صاحب... ہاں، اسی سال کا ماڈل ہے اور بہت کم چلی ہوئی ہے... ٹھیک ہے۔ میں نے انہیں بٹھا لیا ہے۔'' وہ ریسیور کریڈل پر رکھ کر بولا۔ ''سیٹھ صاحب دس پندرہ منٹ میں یہاں پہنچ جائیں گے۔''

تھوڑی دیر بعد سیٹھ صاحب بھی آ گئے۔ وہ سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کے ہاتھ میں سیل فون بھی تھا۔ وہ اندر آنے سے پہلے ہی گاڑی کا جائزہ لے چکا تھا۔ وہ مجھ سے یوں... گرم جوشی سے ملا جیسے برسوں سے جانتا ہو پھر اس نے مجھ پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی کہ میں اتنی قیمتی گاڑی کا مالک ہو بھی سکتا ہوں یا وہ گاڑی کہیں سے چرا کر لایا ہوں۔ میرے قیمتی کپڑے، جوتے اور بیش قیمت گھڑی سے زیادہ میری شخصیت دیکھ کر اسے یقین آ گیا کہ گاڑی میری ہی ہے۔

''کیا ڈیمانڈ ہے آپ کی؟'' اس نے خالص کاروباری لہجے میں پوچھا۔

''میری ڈیمانڈ کو چھوڑیں، آپ تو اتنا بڑا شوروم چلا رہے ہیں۔ آپ خود ہی قیمت لگائیں۔''

''آپ کی گاڑی بہت بہترین کنڈیشن میں ہے۔ بہترین کیا بلکہ نئی ہے لیکن ایک پرابلم ہے۔''

''کیسی پرابلم؟'' میں نے کہا۔

''اکتوبر کا مہینا بھی آدھے سے زیادہ گزر چکا ہے۔ دو ڈھائی مہینے میں نیا ماڈل مارکیٹ میں آ جائے گا۔ پھر اس کی اتنی ویلیو نہیں رہے گی۔''

''میں سب کچھ جانتا ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''بارہ سال کی عمر سے گاڑی چلا رہا ہوں۔ اس کی اصل قیمت سے میں صرف پانچ لاکھ کم کر سکتا ہوں۔''

''نہیں سر!'' وہ کاروباری لہجے میں بولا۔ ''آپ کو اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گاڑی کے اتنے نہیں ملیں گے۔"

"تو پھر میں نہیں بیچوں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اوہو... آپ تو ناراض ہو گئے۔ کیا نام بتایا تھا آپ نے؟"

"میں نے ابھی اپنا نام نہیں بتایا ہے۔" میں نے کہا پھر سوچا کہ اسے کوئی فرضی نام بتا دوں لیکن گاڑی بیچنے کے لیے اسے اپنا درست نام بتانا ضروری تھا۔ میں نے کہا۔ "میرا نام سرفراز خان ہے۔"

"مجھے اورنگ زیب کہتے ہیں۔" وہ ہنس کر بولا۔ "ہاں تو خان صاحب! آپ یہ بتائیے، آپ کو کس ماڈل کی پراڈو چاہیے؟"

"زیرو میٹر۔" میں نے کہا۔ "اسی سال کی۔"

"فی الحال میرے پاس کوئی پراڈو موجود نہیں ہے لیکن میں آپ کے لیے منگوالوں گا۔ آپ کو کم سے کم دو دن انتظار کرنا ہوگا۔"

"پراڈو کی بات تو بعد میں ہوگی، پہلے آپ اس گاڑی کی بات کریں۔"

"میں اس کی اصل قیمت سے دس لاکھ کم دے سکتا ہوں۔" اورنگ زیب نے کہا۔ "دیکھیے گاڑی ایک دفعہ شوروم سے باہر آجائے تو فوری طور پر قیمت میں کمی ہو جاتی ہے۔"

آخر بہت بحث مباحثے کے بعد میں اصل قیمت سے سات لاکھ کم لینے پر راضی ہو گیا۔

"لیکن رقم مجھے ابھی چاہیے... کیش میں۔" میں نے کہا۔

"فوری طور پر اتنے کیش کا بندوبست کرنے میں کم سے کم آدھ گھنٹا تو لگے گا۔" اس نے کہا۔ "پراڈو کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟"

"مجھے فی الحال ایک ضروری کام سے فیصل آباد جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہاں سے واپسی پر ہی میں پراڈو کے بارے میں کچھ کہہ سکوں گا... لیکن میں گاڑی آپ ہی سے لوں گا۔" میں نے اسے فوری طور پر ٹال دیا۔

اس کا ایک ملازم لڑکا مجھ سے گاڑی کی چابیاں لے گیا اور گاڑی سے میرا بیگ اتار لایا۔

ابھی اس نے بیگ لا کر رکھا ہی تھا کہ وہاں دو ڈبل کیبن پک اپ آکر رکیں۔ شوروم کا دروازہ شیشے کا تھا۔ اس شیشے میں سے باہر کا منظر تو دکھائی دیتا تھا لیکن باہر والے کچھ نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ایک پک اپ سے بابا جان کے گارڈز کود کر اترے تو میں جھپٹ کر کھڑا ہو گیا۔

میرے اس طرح کھڑے ہونے پر اورنگ زیب بھی بُری طرح بوکھلا گیا۔ "کک... کیا ہوا خان صاحب؟" وہ ہکلا کر بولا۔

"یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ بھی ہے؟" میں نے یہ کہتے ہوئے اپنے بغلی ہولسٹرز سے دونوں پسٹل نکال لیے۔

"لیکن بات کیا ہے خان صاحب؟" اورنگ زیب نے گھبرا کر پوچھا۔

"میرے پاس وقت نہیں ہے۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "میرے دشمن یہاں آپہنچے ہیں۔ باہر نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ ہے یا نہیں؟" میں نے اپنا بیگ کندھے پر لٹکا لیا۔

"یہاں سے باہر جانے کا راستہ..." اس کا جملہ ادھورا رہ گیا اور کئی آدمی شیشے کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئے۔

میں اچھل کر وہاں کھڑی ہوئی ایک کرولا کے پیچھے چلا گیا۔

اندر داخل ہونے والوں میں تین بابا جان کے بہترین گارڈز تھے، بقیہ تین آدمی میرے لیے اجنبی تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ خان شہزاد کے آدمی ہوں گے۔

"باہر آجاؤ سرفراز خان۔" بابا جان کا گارڈ شہباز خان بلند لہجے میں بولا۔ "میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔"

میں نے جواب میں اس پر فائر کر دیا لیکن اس کا نشانہ نہیں لیا۔ گولی اس کے سر پر سے گزرتی ہوئی شوروم کا شیشے کا دروازہ توڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں ان لوگوں کو بتانا چاہتا تھا کہ میں غیر مسلح نہیں ہوں۔

اس سے فوری طور پر یہ فائدہ ہوا کہ ان کی پیش قدمی رک گئی اور وہ سب زمین پر گر گئے۔

میں وہاں سے کھسک کر دوسری گاڑی کی آڑ میں چلا گیا کیونکہ وہاں سے وہ لوگ مجھے دیکھ سکتے تھے۔

"دیکھو سرفراز خان!" ایک اجنبی اور کرخت آواز سنائی دی۔ "سردار دلیر خان نے کہا ہے کہ تمہیں زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کی جائے... لیکن اگر تم نے خود کو ہمارے حوالے نہیں کیا تو ہم تمہیں سردہ بھی سردار کے پاس لے جا سکتے ہیں۔" وہ یقیناً خان شہزاد کا آدمی تھا۔

میں خاموش رہا۔

"خان صاحب!" شہباز خان نے کہا۔ "مجھے سرفراز خان سے بات کرنے دیں۔"

"تو کیا میں سارا دن یہیں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہوں گا؟" کرخت آواز والا درشت لہجے میں بولا۔

"میں بات کر رہا ہوں نا خان!" شہباز خان نے کہا۔ "آپ کو سرفراز خان چاہیے، وہ آج شام تک آپ کو مل جائے گا۔"

"تم مجھ سے اس لہجے میں بات مت کرو۔" خان بھنّا کر بولا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "سرفراز خان! میں پانچ تک گنتی گنوں گا، پھر اس پورے شوروم کو ملبے کا ڈھیر بنا دوں گا۔"

میری طرف سے پہلا فائر ہونے کے بعد مکمل خاموشی تھی۔

کرخت لہجے والے خان کی آواز آئی۔ "وہ خانہ خراب، ادھر ہے بھی یا یہاں سے نکل گیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ساتھی بھی کھڑے ہو گئے۔ اب مجھے ان کی ٹانگیں نظر آرہی تھیں۔

"شمس خان!" خان شہزاد کے بھائی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے لگتا ہے، وہ خانہ خراب پیچھے کے کسی دروازے سے نکل گیا ہے۔ تم اسے ان گاڑیوں کے پیچھے ڈھونڈو۔"

میں نے گاڑی کے نیچے سے کسی کو آگے بڑھتے دیکھا تو میں نے سوچا، یہ اگر اچانک میرے سر پر آگیا تو وہ بہت آسانی سے مجھے نشانہ بنا لے گا۔

میں نے گاڑی کے نیچے سے نہ صرف اس کے پیر پر فائر کیا بلکہ برقی سرعت سے کروٹ لے کر ٹویوٹا کی آڑ سے باہر آگیا۔ لمبا تڑنگا اور پگڑی والا ایک خوں خوار نوجوان میرے سامنے تھا۔ اس نے اپنی رائفل سیدھی کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس سے پہلے ہی بہ یک وقت دو فائر کیے۔ ایک گولی کرخت چہرے والے اس شخص کی پیشانی پر لگی اور دوسری گولی اس کے ساتھ کھڑے ہوئے دوسرے آدمی کے شانے میں پیوست ہو گئی۔ فائروں کے دھماکوں کے ساتھ ہی دو کربناک چیخیں بھی سنائی دیں۔

"یہ کیا کر رہے ہو سرفراز خان؟" شہباز خان چیخ کر بولا۔ "تم نے اپنے جرائم میں مزید اضافہ کر لیا ہے۔"

اس وقت اورنگ زیب کا ایک ملازم گاڑیوں کی اوٹ میں سہما ہوا میری طرف آیا اور آہستہ سے بولا۔ "آئیے، میں آپ کو پیچھے کے دروازے سے نکال دوں۔ سیٹھ صاحب نے پولیس کو بلا لیا ہے اور وہ یہاں مزید خون خرابا نہیں چاہتے۔ ان کا تو کاروبار تباہ ہو جائے گا۔"

"چلو، کہاں ہے راستہ؟" میں نے کہا اور اس کے پیچھے پیچھے زمین سے چپکا ہوا پیچھے کی طرف بڑھا۔

اس طرف شوروم کا چھوٹا سا کچن تھا۔ وہیں مجھے ایک دروازہ نظر آیا۔ لڑکے نے اس دروازے کی طرف اشارہ کر دیا۔

میں نے دروازہ کھول کر محتاط انداز میں باہر جھانکا پھر تیزی سے باہر آگیا۔ وہ راستہ ایک تنگ گلی میں نکلتا تھا۔

میرے باہر نکلتے ہی لڑکے نے اس دروازے کو بند کر کے اس میں تالا ڈال دیا اور بولا۔ "میرے پیچھے آئیں۔"

وہ مجھے اس گلی سے ایک سروس اسٹیشن میں لے گیا۔ وہاں کئی گاڑیوں کی سروس ہو رہی تھی لیکن وہاں کام کرنے والے شاید وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ البتہ اورنگ زیب وہاں موجود تھا۔

"آپ یہاں سے سیدھے نکل جائیں تو دوسری سڑک پر پہنچ جائیں گے۔" اس نے کہا۔ "وہاں آپ کو ٹیکسی بہت آسانی سے مل جائے گی۔ آپ کی گاڑی میرے پاس امانت ہے۔ آپ جب چاہیں گے، میں رقم آپ کو ادا کر دوں گا۔"

میں تیزی سے گلی میں نکلا اور پانچ منٹ بعد مین روڈ پر پہنچ گیا۔ فوراً ہی مجھے ایک ٹیکسی بھی مل گئی۔ میں فی الحال یہاں سے فرار بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ٹیکسی والا ظاہر ہے مجھے لاہور یا گجرات تو نہیں پہنچاتا۔ میں نے ٹیکسی میں بیٹھ کر کہا۔ "اسلام آباد ہوٹل چلو۔"

ٹیکسی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ زمین پر گرنے کی وجہ سے میرے کپڑوں میں مٹی لگ گئی تھی۔ وہ تو غنیمت ہے کہ تیل کا کوئی دھبا نہیں پڑا۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر اپنے کپڑوں سے گرد جھاڑی، جیب سے کنگھا نکال کر بال سنوارے اور کسی حد تک معقول حلیے میں آگیا۔

اسلام آباد ہوٹل جانے کے لیے ہمیں اسی سڑک سے گزرنا تھا جس پر مخالف سمت میں اورنگ زیب کا شوروم تھا۔

ہم اس روڈ پر پہنچے تو پولیس کی ایک گاڑی تیزی سے مخالف سمت میں جاتی دکھائی دی۔

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ٹیکسی سے باہر کے مناظر یوں دیکھنے لگا جیسے میں ان سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ حالانکہ میں اس وقت شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ بابا جان اور خان شہزاد کے آدمی اتنی جلدی مجھ تک پہنچ جائیں گے۔ اس میں قصور میرا ہی تھا۔ اگر میں وہاں ناشتا کرنے اور گاڑی کا سودا کرنے نہ رکتا تو وہ لوگ میری گرد کو بھی نہیں پا سکتے تھے۔

میں نے بہت اطمینان سے ناشتا کیا تھا پھر ایک گھنٹے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے زیادہ اورنگ زیب کے شوروم میں گزارا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے جلد ہی مجھے اسلام آباد ہوٹل پہنچا دیا۔

وہاں مجھے آسانی سے کمرا بھی مل گیا ورنہ میرا خیال تھا کہ مجھے یہاں سے کہیں اور جانا پڑے گا۔

میں نے ہوٹل کے رجسٹر میں اپنا نام ایس ڈی خان لکھوایا۔ ان دنوں ملک کے حالات بہت خراب تھے۔ ہوٹل میں بغیر آئی ڈی کارڈ کے کمرا نہیں ملتا تھا۔ شناختی کارڈ میں میرا نام سرفراز خان تھا۔ میں نے اس کو ایس ڈی خان کر دیا تھا۔

ہوٹل کے کلرک نے اصل نام لکھنے پر اصرار کیا لیکن میں نے کہا کہ میرا اکاؤنٹ ایس ڈی خان کے نام سے ہے۔ میں نے اگر کریڈٹ کارڈ یا چیک کے ذریعے ادائیگی کی تو آپ ہی لوگوں کو پریشانی ہوگی۔

کاؤنٹر سے کچھ فاصلے پر پبلک ٹیلی فون بوتھ بھی بنے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا جب تک استقبالیہ کلرک رجسٹر میں اندراج کر رہا ہے، میں واحد خان کو ٹیلی فون کر کے صورتِ حال معلوم کروں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ واحد خان کے پاس ضرور آ گئے ہوں گے۔

میں نے اپنے بیگ سے ڈائری نکالی اور ایک فون بوتھ کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے واحد خان کو پہلے ہاسٹل کے نمبر پر فون کیا۔ وہ اس وقت کالج میں تھا۔ میرے پاس اس کے کالج کا ٹیلی فون نمبر بھی تھا۔ میں نے وہاں ٹیلی فون کیا تو کسی نے بہت شائستہ انداز میں کہا۔ ''ہیلو!''

''سر! مجھے واحد خان سے بات کرنا ہے۔ وہ فرسٹ ایئر کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو انہیں بلا دیں۔ میں اس کے گاؤں سے آیا ہوں اور اس سے بہت ضروری بات کرنا ہے۔''

''آپ ہولڈ کریں۔'' اس نے کہا اور ریسیور ایک طرف رکھ کر کسی سے کہا کہ واحد خان کو بلا لاؤ۔

تقریباً پانچ منٹ بعد مجھے واحد خان کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو۔''

''واحد! میں سرفراز بول رہا ہوں۔''

''تم کہاں ہو، خیریت سے تو ہو؟ تمہارے بابا کے آدمیوں کے ساتھ خان شہزاد کے آدمی بھی میرے پاس آئے تھے۔ یہ تمہارے وہاں سے نکلنے کے دو گھنٹے بعد کی بات ہے۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ سرفراز خان کل دوپہر کو مجھ سے رخصت ہو کر گاؤں گیا تھا۔ اب تک تو وہ گاؤں پہنچ گیا ہو گا۔

''ان لوگوں نے بتایا کہ سرفراز خان نے خان شہزادہ اور اس کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا ہے اور گاؤں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ چاہیں تو ہاسٹل کی تلاشی لے لیں۔ وہ خود تو کہیں چھپ سکتا ہے لیکن اپنی گاڑی کو کہیں نہیں چھپا سکتا۔ انہیں شاید میری بات پر یقین آ گیا ورنہ اگر وہ ہاسٹل جا کر وہاں کے چوکیدار سے معلوم کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ رات گئے کوئی مجھ سے ملنے آیا تھا۔''

''یار! میں نے ابھی تک سیل فون نہیں لیا ہے۔ سیل فون لیتے ہی میں اس کا نمبر تجھے بتا دوں گا پھر اطمینان سے بات ہو گی۔ وہ لوگ مجھ تک پہنچ گئے تھے لیکن میں بال بال بچا ہوں۔ اس چکر میں میری گاڑی وہاں رہ گئی ہے۔ اب میں پیدل ہوں۔''

''تم اس وقت ٹھہرے کہاں ہو؟''

میں نے اسے ہوٹل کا نام بتایا تو وہ مضطرب ہو کر بولا۔ ''تم پیدل نہیں بلکہ عقل سے بھی پیدل ہو۔ یار! اس معروف ہوٹل میں ٹھہرنے کی کیا ضرورت ہے؟ شہباز خان جانتا ہے کہ بڑے خان اور تم جب بھی اسلام آباد جاتے ہو، اسی ہوٹل میں قیام کرتے ہو۔ تم ایسا کرو، وہاں ٹھہرنے کے بجائے کسی بھی پرائیویٹ ٹیکسی میں لاہور کی طرف نکل جاؤ۔''

''ٹھیک ہے، میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کیا اور کاؤنٹر پر آ گیا۔

کاؤنٹر پر اس کلرک کی جگہ ایک شعلہ جوالہ بیٹھی تھی۔ اس کے خوب صورت ہونٹوں پر کاروباری مسکراہٹ تھی۔

''مسٹر ایس ڈی خان!'' اس نے کہا۔ ''میں نے رجسٹر میں اندراج کر لیا ہے۔ کمرا نمبر چار سو ایک۔ آپ پلیز یہاں سائن کر دیں۔'' اس نے ایک کھلا ہوا رجسٹر میری طرف بڑھا دیا۔

''سوری!'' میں نے کہا۔ ''ابھی ابھی ٹیلی فون پر میں نے اپنے منیجر سے بات کی ہے۔ فیصل آباد میں میری ٹیکسٹائل مل ہے۔ میرا وہاں فوری پہنچنا ضروری ہے۔''

''نو پرابلم سر!'' اس نے کہا۔ ''میں آپ کی انٹری کینسل کر دیتی ہوں۔''

''تھینک یو۔'' میں نے پانچ سو کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ آپ کی اس محنت کا معاوضہ ہے جو آپ نے رجسٹر میں انٹری کر کے کی ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے کچھ تذبذب کے بعد نوٹ لے لیا۔

میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''میڈم! مجھے فوری طور پر فیصل آباد پہنچنا ہے۔ کیا مجھے وہاں تک کے لیے ٹیکسی مل سکتی ہے؟ میری گاڑی اس وقت ورک شاپ میں ہے۔ میرا خیال تھا کہ کل تک گاڑی مجھے مل جائے گی۔''

''نو پرابلم سر!'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''ہماری لسٹ پر کئی ایسے پرائیویٹ ٹیکسی ڈرائیورز ہیں جو یہاں سے لاہور بلکہ ملتان تک بھی جاتے ہیں۔ اکثر ٹورسٹ بائی روڈ سفر کرنا چاہتے ہیں۔''

☆☆☆

ٹیکسی ڈرائیور ضرورت سے کچھ زیادہ ہی باتونی تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے فوری طور پر فیصل آباد کے بجائے لاہور جانا ہے۔ تم مجھے کتنی دیر میں لاہور پہنچا سکتے ہو؟

''میں اتنی تیز رفتاری سے چلوں گا کہ پھر آپ ہی مجھے رفتار کم کرنے کو کہیں گے۔ میں آپ کو کم سے کم وقت میں لاہور پہنچا سکتا ہوں۔''

''چلو، پھر تمہاری اسپیڈ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اگر تم نے بروقت مجھے لاہور پہنچا دیا تو میں کرائے کے علاوہ تمہیں ہزار روپے انعام بھی دوں گا۔''

ڈرائیور واقعی ماہر تھا۔ اس کی گاڑی بھی بہترین حالت میں تھی۔ اس کی باتوں میں مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔

لاہور پہنچ کر میں نے اس سے ائرپورٹ چلنے کو کہا۔ پھر میں نے بیگ کھول کر اپنے پاس موجود رقم کا جائزہ لیا۔ اماں کی دی ہوئی رقم ایک لاکھ کے قریب تھی۔ میں نے سوچا، مجھے اب اس شاہ خرچی سے پرہیز کرنا چاہیے ورنہ میں جلد ہی فاقے کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔

لاہور سے کراچی جانے والی فلائٹ تیار تھی۔ یہ بھی میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے فوراً ایک سیٹ بھی مل گئی۔

میں بہ خیر و عافیت کراچی پہنچ گیا۔

اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں جاؤں اور کیا کروں؟ میں تو زیادہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا کہ مجھے چھوٹی موٹی کوئی ملازمت مل جاتی۔ نہ میں اپنی قوم کے دوسرے لوگوں کی طرح محنت مزدوری کر سکتا تھا۔

فوری طور پر تو مجھے سر چھپانے کا ٹھکانا درکار تھا، اس کے بعد ہی میں کچھ سوچ سکتا تھا۔

میں زندگی میں پہلی دفعہ کراچی آیا تھا۔ میں نے......

.....کراچی کے کچھ علاقوں صدر اور ایم اے جناح روڈ کا نام سن رکھا تھا۔ میں نے ٹیکسی والے سے صدر چلنے کو کہا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے وہاں کوئی سستا اور اچھا ہوٹل مل جائے گا جہاں فوری طور پر میں رہ سکوں۔ یہ بھی مجھے پشاور میں ایک دفعہ واحد خان کے ایک دوست نے بتایا تھا۔ وہ اکثر کراچی آتا رہتا تھا۔

کراچی شہر کیا تھا، انسانوں کا ایک جنگل تھا۔ صدر کی ہر سڑک، ہر گلی، ہر کوچے میں انسانوں کی بھیڑ تھی۔ نہ جانے وہ لوگ کہاں سے آئے تھے اور کہاں جا رہے تھے۔

ٹیکسی سے اتر کے میں پیدل ہی ایک طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں تو پیدل چلنا بھی دوبھر تھا۔

میری نظر اچانک موبائل فون کی دکانوں پر پڑی۔ میں تو اچھی طرح اردو بھی نہیں بول سکتا تھا۔ مجھے بس اتنی ہی اردو آتی تھی جو میں نے آٹھویں تک کتابوں میں پڑھی تھی۔

میں موبائل مارکیٹ میں داخل ہوا تو وہاں بھی اتنا ہی رش تھا۔ ایک دکان دار کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ اس کا تعلق بھی میرے ہی صوبے سے ہے۔ اس کا حلیہ اور رنگ روپ اس کی چغلی کھا رہا تھا۔

میں نے اس سے پشتو میں کہا۔ ''مجھے کوئی معقول رقم کا سیل فون چاہیے۔''

''آپ پشاور سے آئے ہیں؟'' اس نے نہایت اپنایت سے پوچھا۔ ''اچھا ہوا آپ میرے پاس آ گئے ورنہ یہاں تو کوئی آپ کو دو نمبر مال دے کر اس کی دگنی قیمت وصول کر لیتا۔'' اس نے کہا پھر اس نے مجھے معقول رقم کا ایک سیل فون دیا اور بولا۔ ''یہ سیٹ صرف تین ہزار روپے کا ہے لیکن اصلی ہے اور بہت پائیدار ہے۔'' اس نے اپنے پاس سے ایک سم کارڈ بھی اس میں ڈال دیا اور مجھے اس کے استعمال کا طریقہ بتانے لگا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سیل فون لے کر دکان سے باہر آ گیا۔ میں کچھ آگے بڑھا تو مجھے صاف ستھرا ایک ہوٹل نظر آیا۔ میں نے وہیں قیام کا فیصلہ کر لیا۔

ہوٹل کا استقبالیہ کلرک مجھ سے اردو میں کچھ بولا لیکن نہ جانے اس نے کیا کہا، میں حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔ پھر اس نے انگلش میں کچھ کہا۔ میری سمجھ میں اتنا آیا کہ وہ مجھ سے ڈبل روم اور سنگل روم کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

میں نے ہنس کر کہا۔ ''سنگل روم۔''

اس نے مجھ سے شناختی کارڈ لیا تو حیرت سے بولا۔ ''آپ پاکستانی ہیں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے رجسٹر میں اندراج کیا اور ایک شخص کو بلا کر کہا۔ ''صاحب کو روم نمبر ایک سو پانچ میں لے جاؤ۔'' ویٹر نما وہ شخص بھی میرا ہم زبان تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے مجھ سے پشتو میں بات چیت شروع کر دی۔
کمرا بھی صاف ستھرا تھا لیکن اس کا باتھ روم بہت چھوٹا تھا۔ میں پہلے تو خوب دل بھر کے نہایا۔ میں نے کئی دن سے غسل کیا تھا نہ شیو کیا تھا۔ میں صاف ستھرے کپڑے پہن کر باہر نکلا اور اس ویٹر کو بلا لیا جو مجھے کمرے میں چھوڑ کر گیا تھا۔
وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹک گیا اور بولا۔ ''خان جی! آپ کی تو شخصیت ہی بدل کر رہ گئی ہے۔ کیا پشاور میں آپ کا کوئی کاروبار ہے؟''
''میرا کاروبار تھا لیکن میرے پارٹنر نے مجھے دھوکا دیا اور سارے کاروبار پر قبضہ جما لیا۔'' پھر میں نے ہنس کر کہا۔ ''تم پہلے کھانا لے آؤ۔''
کھانا کھانے کے بعد میں لمبی تان کر ایسا سویا کہ پھر دوسرے دن صبح ہی میری آنکھ کھلی۔
میں نے یہاں آتے ہوئے پٹھانوں کے کئی ہوٹل دیکھے تھے۔ وہاں چائے اور پراٹھے بھی بن رہے تھے۔ میں نے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر چائے اور پراٹھے کا ناشتا کیا، پھر کسی کام کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ میں نے سوچا، مجھے کسی کے گھر یا کمپنی میں ڈرائیور کی ملازمت تو مل ہی جائے گی۔
چلتے چلتے اچانک میری نظر ایک بورڈ پر پڑی۔ اوپر لکھا تھا کہ سیکیورٹی گارڈز کی ضرورت ہے۔ میں نے پشاور میں بھی ایسی ایجنسیاں دیکھی تھیں۔
میں دفتر میں داخل ہوا تو وہاں بیٹھا ہوا کلرک میرے احترام میں کھڑا ہو گیا اور بہت مؤدب انداز میں بولا۔ ''جی سر! کس سے ملنا ہے آپ کو؟''
''صاحب ہے؟'' میں نے مختصر جواب دیا۔ وہ شاید مجھے کوئی کلائنٹ سمجھ رہا تھا۔ کلائنٹ کا مطلب بھی مجھے کافی عرصے بعد معلوم ہوا۔
''آپ کا نام؟'' اس نے پوچھا۔
''سرفراز خان۔'' میں نے جواب دیا۔
وہ اندرونی کمرے کی طرف چلا گیا۔ پھر فوراً ہی واپس آ گیا اور بولا۔ ''ایس پی صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔''
''ایس پی صاحب۔'' میں نے حیرت سے کہا۔
''جی سر! وہ اس سیکیورٹی ایجنسی کے مالک ہیں۔ دو سال پہلے وہ پولیس کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔''
میں کمرے میں داخل ہوا تو ایس پی نے اٹھ کر میرا استقبال کیا اور بولا۔ ''فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ آپ کو گھر کے لیے سیکیورٹی چاہیے یا دفتر کے لیے؟''
''میں تو... ملازمت... کے لیے... آیا۔'' میں نے ٹوٹی پھوٹی جھٹکے دار اردو میں کہا۔
''ملازمت کے لیے؟'' اس کا رویہ یک لخت بدل گیا۔ ''اس سے پہلے کہاں کام کرتے تھے؟''
''کام... نہیں... کرتے تھے۔'' میں نے جواب دیا۔
''تمہارے پاس اسلحے کا لائسنس ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''میرے... پاس... لائسنس بھی... اور گن بھی۔'' میں نے جواب دیا۔
''اسلحہ چلانا بھی جانتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔
''ام... بچپن... سے اسلحہ... چلایا... صاحب۔'' میں نے کہا۔
''یہاں... کوئی جانتا ہے تمہیں؟'' اس نے پوچھا۔
''افتخار خان۔'' میں نے موبائل کی دکان والے کا نام بتا دیا۔
''تم کل آؤ... اپنے شناختی کارڈ کی کاپی، اسلحے کے لائسنس کی کاپی اور چار پاسپورٹ سائز تصویریں لے کر آنا۔''
میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک مرتبہ پھر موبائل کی اس دکان پر پہنچ گیا۔ دکان دار مجھے دوبارہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے مجھے بٹھایا اور میرے لیے چائے منگوالی۔ میں نے اسے بھی وہی کہانی سنائی کہ پشاور میں میرا اچھا خاصا کاروبار تھا لیکن میرے پارٹنر نے دھوکے سے سب کچھ ہتھیا لیا۔
''تم رہتے کہاں ہو سرفراز خان؟''
''ابھی تو ہوٹل میں ہوں لیکن نوکری ملتے ہی رہنے کا بندوبست کر لوں گا۔''
اس نے ایک گھنٹے کے اندر میری تصویریں بنوا دیں۔ اس دوران میں اس سے اچھی خاصی جان پہچان بھی ہو گئی۔ وہ نوشہرہ کا رہنے والا تھا لیکن اپنی فیملی کے ساتھ برسوں سے کراچی میں مقیم تھا۔ اس کے والد اور بڑے بھائی بھی کراچی ہی میں اسپیئر پارٹس کا کاروبار کرتے تھے۔
اب وہ میری شخصیت سے متاثر ہوا یا پھر میری گفتگو سے۔ وہ سیکیورٹی ایجنسی میں میری ضمانت لینے کو تیار ہو گیا۔ مجھے تو یہی خدشہ تھا کہ اس اجنبی شہر میں بھلا کون میری ضمانت لے گا؟
میں اپنا ڈرائیونگ لائسنس، اسلحے کا لائسنس اور تصویریں لے کر ایس پی صاحب کے پاس پہنچا تو انہوں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور یجنل کا غذات کا بہت باریک بینی سے جائزہ لیا پھر بولے۔ ”سرفراز! تم نے اپنی تعلیمی اسناد کی کوئی کاپیاں نہیں لگائیں؟“

”میں... زیادہ... پڑھا... نہیں۔“ میں نے کہا۔

”آٹھویں... کا امتحان... بیماری... کی وجہ... سے... نہیں دیا۔“

”اردو پڑھنا لکھنا تو جانتے ہو؟“ ایس پی صاحب نے پوچھا۔

”بہت... خوب... جانتا ہے... انگلش... بھی... تھوڑا... پڑھ... سکتا... سمجھ... نہیں...“

”ٹھیک ہے۔“ ایس پی نے میری بات کاٹ دی۔ ”تم کب سے ڈیوٹی جوائن کر سکتے ہو؟“ ایس پی نے کہا پھر بولا۔ ”میرا مطلب ہے کہ تم... کام کب شروع کر سکتے ہو؟“

”کام تو... ابھی... اس وقت... سے۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے، ابھی شاہ میر آئے گا تو تمہیں وردی دے دے گا۔ آج سے تم ایو پرڈ سیکیورٹی کے ملازم ہو۔ تنخواہ پانچ ہزار روپے مہینا۔“

”ٹھیک ہے صاحب!“ میں نے کہا۔

اسی وقت اس نے شاہ میر کو بلا لیا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ بھی میرا ہی ہم زبان ہے اس لیے زبان کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ایس پی صاحب نے مجھے شاہ میر کے حوالے کر دیا۔

شاہ میر نے غور سے میرے قد و قامت کا جائزہ لیا، پھر اسٹور سے میرے سائز کی ایک وردی نکال لایا۔ اس نے کہا کہ اسٹور میں جا کر جوتے بھی دیکھ لو۔ جو تمہارے پاؤں میں فٹ آئیں انہیں پہن لو۔ وہ پشتو میں ہی بات چیت کر رہا تھا۔

”شاہ میر صاحب! مجھے رہنے کے لیے کسی ٹھکانے کا بندوبست بھی کرنا پڑے گا۔“

”کیا مطلب ہے... تمہارے پاس رہنے کو جگہ بھی نہیں ہے؟“ شاہ میر نے پوچھا۔ ”ابھی تم کہاں رہتے ہو؟“

”میں کل ہی تو آیا ہوں۔ رات میں نے اسٹیشن پر گزاری ہے۔ میرا بیگ بھی وہیں رکھا ہے۔“

”جب تک تمہارے رہنے کا کوئی بندوبست نہ ہو جائے، تم میرے کمرے میں رہ سکتے ہو۔ ایک کمرے کے اس مکان کا کرایہ دو ہزار روپے ہے۔ میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔ تم میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔ آدھا کرایہ تم دے دینا۔“

میں نے فوراً ہامی بھر لی۔ یوں سر چھپانے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

☆☆☆

مجھے اس سیکیورٹی ایجنسی میں کام کرتے ہوئے چھ مہینے گزر چکے تھے۔ اس دوران میں مجھے کوئی خاص کام نہیں کرنا پڑا تھا۔ کبھی کسی ملٹی نیشنل کمپنی پر ڈیوٹی ہوتی تھی، کبھی کسی بڑے آدمی کے محل نما بنگلے پر۔ ان چھ مہینوں میں مجھے اچھی خاصی اردو آ گئی تھی اور اب میں روانی سے اردو بولنے لگا تھا۔ ہاں، ابھی تک میرا لہجہ درست نہیں ہو سکا تھا۔

اس دن میں آفس پہنچا ہی تھا کہ ایس پی صاحب نے مجھے بلوا لیا۔ میں ان کے کمرے میں پہنچا تو وہاں بھاری بھرکم جسم کے ایک صاحب بیٹھے تھے۔ وہ سوٹ میں ملبوس تھے۔ ان کی ٹائی پن سے لے کر کف لنکس تک ہر چیز میں ہیرے جڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں وہی گھڑی تھی جو اس وقت میرے پاس تھی۔ انہوں نے توصیفی نظروں سے مجھے دیکھا اور مسکرائے۔

”غزنوی صاحب! یہ سرفراز خان ہے، میرے بہترین گارڈز میں سے ایک ہے۔“ ایس پی صاحب نے کہا پھر وہ مجھ سے بولے۔ ”غزنوی صاحب کا نام تو تم نے سنا ہوگا؟“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ حالانکہ میں نے اس سے پہلے کبھی ان کا نام نہیں سنا تھا۔ ”یہ ملک کے بڑے ایکسپورٹر اور امپورٹرز میں سے ایک ہیں۔ انہیں ایک مستعد باڈی گارڈ کی ضرورت ہے۔ ویسے تو ان کے بنگلے پر ہماری کمپنی کے دو گارڈز کی ڈیوٹی ہے لیکن انہیں اپنے ذاتی تحفظ کے لیے ایک باڈی گارڈ کی ضرورت ہے۔“

”اوکے سر!“ میں نے مؤدب انداز میں جواب دیا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ اپنی جان سے زیادہ ان کی حفاظت کروں۔“

”یوں سمجھ لو سرفراز خان کہ اب تم چند ماہ تک انہی کے ساتھ رہو گے۔ تمہاری تنخواہ اور دیگر اخراجات بھی یہی ادا کریں گے۔ ہاں، اب تمہیں ایجنسی کا یونیفارم پہننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“

”سر! کیا آپ مجھے ملازمت سے نکال رہے ہیں؟“

”ارے نہیں۔“ ایس پی صاحب بولے۔ ”تم جیسے کام کے آدمی کو تو میں نکالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بس عارضی طور پر تمہیں غزنوی صاحب کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔“

”سرفراز! تم بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ خاصے باذوق بھی ہو۔“ غزنوی صاحب نے کہا۔ ”اب یہی دیکھو، تمہاری کلائی میں رولیکس کی گھڑی ہے۔“

”یہ تو میرے بابا نے مجھے دی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”بابا کا پھلوں کا بزنس تھا لیکن ایک پرانی دشمنی کی بنا پر دشمنوں نے انہیں قتل کر دیا۔ پھر میں نے ایک دوست کی پارٹنرشپ میں کام کیا لیکن بہت بُری طرح دھوکا کھایا۔“

”سرفراز خان!“ ایس پی صاحب نے کہا۔ ”تم یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں ملازمت سے نکال رہا ہوں۔ تم اب بھی ڈیوٹی پر ہو۔ تمہیں یہاں سے تنخواہ بھی ملتی رہے گی۔ غزنوی صاحب کی طرف سے جو کچھ تمہیں ملے گا، وہ ایک طرح سے تمہارا اوور ٹائم ہوگا۔ پھر تمہیں یہ آسانی بھی ہوگی کہ تم وردی نہیں پہنو گے۔“

”مجھے یہ ڈیوٹی کب تک کرنا ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”فی الحال چھ ماہ کے لیے۔“ ایس پی صاحب نے کہا۔ ”اس کے بعد غزنوی صاحب کو ضرورت پڑی تو وہ ایگریمنٹ بڑھا بھی سکتے ہیں۔“

”یہ میرا کارڈ ہے۔“ غزنوی صاحب نے اپنا تعارفی کارڈ نکال کر مجھے دیا اور بولے۔ ”تم آج شام ہی سے ڈیوٹی پر آ جاؤ۔ کارڈ پر میرا ایڈریس بھی موجود ہے۔“

”اوکے سر!“ میں نے کہا۔ میں وہاں رہ کر انگریزی کے اتنے الفاظ تو سیکھ ہی گیا تھا۔

غزنوی صاحب کے جانے کے بعد ایس پی صاحب نے کارڈ پڑھ کر مجھے ان کا پتا سمجھایا۔ وہ ڈیفنس میں کہیں رہتے تھے۔

”بلکہ ایسا کرتا ہوں، میں شاہ میر سے کہتا ہوں کہ وہ تمہیں غزنوی صاحب کے بنگلے پر چھوڑ آئے۔ تم شام کو چار بجے تک یہاں آ جانا۔ ہاں، ایک بیگ میں اپنی ضرورت کی تمام چیزیں اور کپڑوں کے کچھ جوڑے بھی لیتے آنا۔ تمہیں اب غزنوی صاحب کے بنگلے پر ہی رہنا ہوگا۔“

میں حیران ہو رہا تھا کہ یہ کیسی ڈیوٹی ہے جو چوبیس گھنٹے کی ہے۔

”پریشان مت ہو سرفراز!“ ایس پی صاحب نے کہا۔ ”غزنوی صاحب سے اچھی خاصی تنخواہ، کھانا اور دوسری مراعات ملیں گی۔ تمہیں یہاں سے بھی تنخواہ ملتی رہے گی۔“

مجھے اچانک کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ مجھ میں آخر ایسی کیا خاص بات تھی کہ نہ صرف غزنوی صاحب مجھے اتنی رقم دے رہے تھے بلکہ ایس پی صاحب بھی میری تنخواہ دینے کو تیار تھے۔ پھر میں نے تمام خدشات کو ذہن سے جھٹک دیا اور گھر چلا آیا۔ میں نے شیو کیا، گرم پانی سے غسل کیا اور.......

جینز اور جیکٹ پہن کر تیار ہو گیا۔ میں ڈیوٹی پر ہمیشہ ربرسول کے لونگ بوٹ استعمال کرتا تھا۔ تیار ہو کر میں نے دونوں بغلی ہولسٹر لگائے اور اوپر سے جیکٹ پہن لی پھر میں شاہ میر کا انتظار کرنے لگا۔

شاہ میر گاڑی لے کر آیا تو بہت پُرجوش تھا۔ وہ رشک بھرے انداز میں بولا۔ ”یار سرفراز! تیری تو لاٹری نکل آئی۔ تیری بہترین نشانے بازی تیرے کام آ گئی۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن یار! مجھے غزنوی صاحب کے بنگلے پر جانا کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔“

”کیوں بھئی، ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہے... چل اب جلدی کر۔ غزنوی صاحب تیرا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ شاہ میر ایجنسی کی ایک ڈبل کیبن پک اَپ لایا تھا۔

میں راستے بھر یہی گتھی سلجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ گھر میں گارڈز کے ہوتے ہوئے غزنوی کو مزید گارڈ کی ضرورت کیوں پڑی؟

شاہ میر مجھے اس محل نما بنگلے کے گیٹ پر اتار کر چلا گیا۔ گیٹ کے ساتھ ہی پیتل کی جھلملاتی ہوئی نام کی تختی لگی تھی۔ اس پر جلی حروف میں اے کے غزنوی لکھا تھا۔

اپنی شناخت اور گارڈز سے نمٹ کر میں ایک ملازم کی راہنمائی میں اندر پہنچا۔ ملازم نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ ڈرائنگ روم اتنا آراستہ تھا کہ میں نے اب تک ایسے ڈرائنگ روم صرف فلموں یا ٹی وی ڈراموں میں دیکھے تھے۔

باہر کوریڈور میں قدموں کی آہٹ سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی خاتون ہے کیونکہ اس کے جوتوں کی ہیل سے یہی اندازہ ہو رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے کمرے میں ایک شعلہ جوالا داخل ہوئی۔ وہ خاصی پُرکشش اور متناسب جسم کی مالک تھی لیکن اس کا لباس بہت مختصر اور جسم سے تقریباً چپکا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں جو بُندے تھے، ان میں غالباً سچے موتی لگے ہوئے تھے۔ بال سیاہ تھے اور دائیں طرف سے بالوں کی ایک لٹ اس کے چہرے پر جھول رہی تھی۔

”کون ہو تم؟“ وہ مترنم آواز میں بولی۔

”میرا نام سرفراز خان ہے اور مجھے غزنوی صاحب نے بلایا ہے۔“ میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

”کیوں؟“ اس نے تیکھی نظروں سے مجھے دیکھا۔

”میں ان کا باڈی گارڈ ہوں۔“ میں نے بتایا۔ میرا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خیال تھا کہ یہ غزنوی صاحب کی بیٹی ہو سکتی ہے۔

وہ اس بات پر بے اختیار مسکرانے لگی۔ اس کے سفید موتیوں جیسے جھلملاتے ہوئے دانت بہت خوب صورت تھے لیکن اس کے ہنسنے پر مجھے غصہ آ گیا اور میں اپنے لہجے پر قابو پا کر بولا۔ ”میڈم! آپ ہنس کیوں رہی ہیں؟“

”تم اور باڈی گارڈ؟“ وہ پھر اسی انداز میں ہنسی۔ ”مجھے تو تم کسی کالج کے اسٹوڈنٹ اور دولت مند باپ کے بیٹے لگ رہے ہو۔“

میرا دل چاہا کہ میں اس سے کہوں، میں کالج کا طالب علم تو نہیں ہوں لیکن کروڑ پتی باپ کا بیٹا ہوں لیکن میں خاموش رہا۔

”تم خود اپنی حفاظت کر لیتے ہو؟“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”میں پروفیشنل گارڈ ہوں میڈم!“ میں نے پھر اپنی زبان پر قابو پایا۔

اچانک غزنوی کمرے میں داخل ہوا تو میں احتراماً اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اسے سلام کیا۔

اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے بہ غور میرا جائزہ لیا اور بولا۔ ”سرفراز! تمہاری تو پرسنالٹی ہی بدل گئی۔“

”یہ کون ہے ڈارلنگ؟“ لڑکی نے غزنوی کو مخاطب کیا تو میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔

”یہ میرا باڈی گارڈ ہے رمشا ڈارلنگ!“ غزنوی نے جواب دیا۔

”لیکن مجھے تو یہ کہیں سے بھی باڈی گارڈ نہیں لگتا۔“ رمشا منہ بنا کر بولی۔

”یہ میری بیوی رمشا ہے سرفراز!“ غزنوی نے ہنس کر کہا۔ ”اسے ابھی تمہاری صلاحیتوں کا اندازہ نہیں ہے، ورنہ ایسی باتیں نہ کرتی۔ تم اس کی باتوں کا بُرا مت ماننا۔“

رمشا اس کی بیوی۔۔۔؟ عمر میں تو وہ اس کی بیٹی سے بھی کم ہی ہوگی۔ وہ پچاس پچپن سال کا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ رمشا کی عمر میرے اندازے کے مطابق بمشکل تیئس چوبیس سال ہوگی۔

”میں کسی کی بات کا بُرا نہیں مانتا سر!“ میں نے کہا۔

غزنوی نے بیل کا بٹن دبایا۔ بیل کی آواز سنتے ہی ایک ملازم کمرے میں آ گیا۔

”نصیر! پہلے تو ہمیں چائے پلا دو، پھر مہمان کو ان کا کمرا دکھا دو۔“

ملازم نے مؤدب انداز میں سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔

”مہمان!“ رمشا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”کیا تمہیں ملک صاحب کی پارٹی میں نہیں جانا؟“ غزنوی نے کہا۔

”کیوں، کیا تمہارا ارادہ کینسل ہو گیا؟“ رمشا نے پوچھا۔

”میرا ارادہ کینسل کیوں ہوگا؟ آخر یہ ایک بزنس پارٹی ہے۔ تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں اس لیے تمہیں یاد دلا رہا تھا۔“

”ارے ہاں، مجھے تو وقت کا خیال ہی نہیں رہا۔ میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں۔“ وہ لہراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

اسی وقت ملازم چائے اور دوسرے لوازمات کی ٹرالی دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور ٹرالی ہمارے سامنے رکھ کر واپس چلا گیا۔

”مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔“ غزنوی نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میں چاہتا تھا کہ یہ بات رمشا کو معلوم نہ ہو کہ تم میرے باڈی گارڈ ہو۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مجھ سے پہلے تمہاری ملاقات رمشا سے ہو جائے گی ورنہ میں تمہیں پہلے ہی منع کر دیتا۔ تم اس کے سامنے یہی ظاہر کرنا جیسے تمہیں کچھ نہیں آتا۔ اب تم نہ صرف رمشا کو بلکہ ہر آدمی کی نظروں میں خود کو احمق ظاہر کرو گے اور یہی کہو گے کہ نہ جانے کیوں مجھے غزنوی صاحب نے اپنا باڈی گارڈ بنایا ہے۔“

اسی وقت رمشا آ گئی۔ وہ اس وقت پہلے سے بھی زیادہ حسین لگ رہی تھی۔

”اب تم بھی بتا دو مہمان صاحب کہ تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”میں تو آپ لوگوں کا ملازم ہوں۔ میرا بھلا کیا پروگرام ہوگا؟“ میں نے کہا۔

مجھے ابھی تک حیرت تھی کہ وہ نوخیز لڑکی غزنوی جیسے بڑی عمر کے شخص کی بیوی ہے۔

”سرفراز کا کیا پروگرام ہوگا؟“ غزنوی نے کہا۔ ”یہ بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔ آخر یہ میرا باڈی گارڈ ہے۔“

”وہاں مذاق بنے گا آپ کا۔“ رمشا نے کہا۔ ”باڈی گارڈ ایسے ہوتے ہیں؟“

میں پوچھنے والا تھا کہ کیا باڈی گارڈز کے سر پر سینگ ہوتے ہیں یا ان کی دُم ہوتی ہے؟ لیکن میں خاموش رہا۔

”کیوں، کیا کمی ہے سرفراز میں؟“ غزنوی صاحب نے کہا۔ ”دراز قد ہے، ہاتھ پیر کا مضبوط ہے اور گن چلانا بھی

جانتا ہے۔“

”یہ سب کچھ تو آپ کے دوسرے گارڈز بھی کر سکتے ہیں۔“ رمشا نے کہا۔ وہ نہ جانے کیوں میری مخالفت کر رہی تھی۔ شاید اسے میرا وہاں آنا پسند نہیں آیا تھا۔

غزنوی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا پھر موضوع بدل کر بولا۔ ”اب چلیں ڈارلنگ؟“

”چلو۔“ رمشا نے کہا۔

غزنوی نے گاڑی کی چابی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لو، ڈرائیونگ تم ہی کرو گے۔“

”ڈرائیونگ کر لو گے؟“ رمشا نے پھر طنز کیا۔ ”ہماری گاڑی بہت قیمتی ہے۔“

میں نے پھر ضبط کیا اور بولا۔ ”میں اس سے پہلے بی ایم ڈبلیو، مرسیڈیز اور پراڈو ڈرائیو کر چکا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں جواب سنے بغیر باہر نکل گیا۔

پورچ میں غزنوی کی گاڑی کھڑی تھی جسے شاید کسی ملازم نے ابھی ابھی چمکایا تھا۔ میں نے ریموٹ سے دروازے کا لاک کھول کر عقبی نشست کا دروازہ کھولا ور رمشا سے مخاطب ہوا۔ ”آیئے میڈم!“ مہذب گفتگو کا یہ انداز میں نے شاہ میر سے سیکھا تھا۔

رمشا کے بیٹھنے کے بعد میں نے دوسری طرف کا دروازہ کھولا اور غزنوی بھی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے بہت مہارت سے ریورس کر کے گیٹ سے باہر نکال لیا۔

مین روڈ پر آنے کے بعد میں نے پوچھا۔ ”کہاں چلنا ہے صاحب؟“

”کلفٹن کی طرف چلو۔“ غزنوی نے کہا۔

میں نے گاڑی کا رخ کلفٹن کی طرف کر دیا۔ مجھے عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ سردار بہادر خان کا بیٹا ابھی تک چوکیداری کرتا رہا تھا، اب ایک سیٹھ کی ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

تین تلوار کے پاس پہنچ کر غزنوی مجھے راستہ بتانے لگا۔ جلد ہی ہم ایک وسیع و عریض بنگلے کے سامنے جا رکے۔ گیٹ پر سیکیورٹی کے دو جوان کھڑے تھے اور دونوں ہی ہماری ایجنسی کے تھے۔ ایجنسی کا ہر گارڈ میری عزت کرنے لگا تھا۔ میں گویا غیر اعلانیہ طور پر ان کا افسر بن گیا تھا۔

گارڈ نے مجھے دیکھ کر سلام کیا اور فوراً گیٹ کھول دیا۔ ان لوگوں کو پورچ میں اتارنے کے بعد میں نے گاڑی باہر نکالی اور ان گاڑیوں کے ساتھ پارک کر دی جو بنگلے کے ساتھ ہی ایک خالی پلاٹ میں پارک تھیں۔

میں دوبارہ اندر پہنچا تو برآمدے میں کھڑے ہوئے ایک ملازم نے مؤدب انداز میں مجھے سلام کیا اور آگے بڑھ کر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔ وہ مجھے بھی شاید کوئی مہمان سمجھ رہا تھا۔

وہ ڈرائنگ روم کیا، ایک بڑا سا ہال تھا جس میں دیواروں کے ساتھ قیمتی صوفے لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف وسیع و عریض ڈائننگ ٹیبل تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک کونے میں چھوٹا سا بار تھا۔ بار میں ویٹر مہمانوں کو مشروبات پیش کر رہے تھے۔

مجھے جلد ہی غزنوی اور رمشا نظر آ گئے۔ وہ ادھیڑ عمر کے ایک آدمی سے مصروفِ گفتگو تھے۔ اس کی پشت پر کچھ فاصلے پر دو آدمی کھڑے تھے۔ وہ اپنی حرکات و سکنات اور چہروں ہی سے گارڈز لگ رہے تھے۔ میں بھی غزنوی کی پشت پر اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا اور بہت غور سے اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔

وہاں چند افراد کے ساتھ ہی گارڈز تھے۔ باقی مہمان آزادانہ ادھر سے اُدھر گھوم رہے تھے۔

میری نظریں ہر طرف تھیں۔ اچانک ہال میں خوش پوش اور خوش شکل ایک شخص داخل ہوا۔ اس نے وہیں کھڑے ہو کر مہمانوں کا جائزہ لیا پھر غزنوی پر نظر پڑتے ہی وہ تیزی سے اس کی طرف جھپٹا۔ اس کی جانب غزنوی اور رمشا کی پشت تھی۔ غزنوی کے نزدیک پہنچ کر اس نے اچانک اپنے کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں بجلی کی سی تیزی سے لپکا اور اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ جیب سے باہر آتا، میں نے اس کے چہرے پر زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ وہ الٹ کر فرش پر گرا تو میں نے ایک دم اپنا پسٹل نکال لیا اور غرا کر بولا۔ ”اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو اور ہلنے کی کوشش مت کرنا۔“

جب میں اس شخص کی طرف جھپٹا تھا تو وہ دونوں آدمی بھی لپک کر آگے آ گئے جو غزنوی کی پشت پر کھڑے تھے۔ ان دونوں نے بھی اپنے ریوالور نکال کر اس شخص پر تان لیے۔

ہال میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ غزنوی اور رمشا نے بھی پلٹ کر فرش پر پڑے ہوئے شخص کی طرف دیکھا پھر رمشا چیخ کر بولی۔ ”او مائی گاڈ! احسن۔۔۔ تم یہاں کیسے اور۔۔۔ یہ۔۔۔“

”اس نے غزنوی صاحب پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔“ ایک گارڈ نے کہا۔ ”اگر یہ اسے بروقت نہ روکتے تو شاید۔۔۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”یہ احسن صاحب ہیں احمق!“ غزنوی کے ساتھ کھڑے ہوئے ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ اس کا نام اعجاز تھا۔

میں نے فوراً اپنا پسٹل جیب میں رکھ لیا...۔ احسن بمشکل تمام اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے بائیں جبڑے پر تھا اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔

”تم پہلے واش روم میں جا کر اپنا حلیہ درست کرو۔“ غزنوی نے کہا۔ اس کے رویّے میں بیزاری تھی۔

احسن واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ اسی وقت رمشا میری طرف مڑی اور تیز لہجے میں بولی۔ ”تمہاری جرأت کیسے ہوئی احسن پر ہاتھ اٹھانے کی؟“

”سوری میڈم! میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہیں۔ غزنوی صاحب کی طرف اس طرح جو بھی بڑھے گا، میں اسے روکوں گا۔“

”رمشا! کیا کر رہی ہو؟“ غزنوی نے ناگواری سے کہا۔ ”سرفراز کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ ہمارا شناسا ہے؟“

”تو یہ ہر اس آدمی کو مار گرائے گا جو آپ کی طرف بڑھے گا؟“ رمشا نے ناگواری سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”میں ان پر کبھی حملہ نہ کرتا لیکن انہوں نے اچانک جیب میں ہاتھ ڈالا تو مجھے کچھ شبہ ہوا۔ پھر میں مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا۔“

”یہ صاحب کون ہیں غزنوی؟“ اعجاز نے پوچھا۔ ”تم نے ان کا تعارف نہیں کرایا۔“

”یہ میرا باڈی گارڈ سرفراز ہے۔“ غزنوی نے یوں فخریہ انداز میں بتایا جیسے میں ان کا باڈی گارڈ نہیں بلکہ بیٹا ہوں۔

”ویری نائس۔“ اعجاز نے کہا۔ ”میں تمہاری چوائس کی داد دیتا ہوں۔ چہرے سے تو یہ کوئی کھلنڈرا سا نوجوان لگ رہا ہے۔“

اسی وقت احسن واش روم سے واپس آیا۔ اس کا جبڑا سوج گیا تھا اور ہونٹوں پر بھی سوجن تھی۔ وہ رومال سے بار بار اپنے ہونٹ صاف کر رہا تھا۔

”تم اس وقت یہاں کیسے آئے؟“ اعجاز نے احسن سے پوچھا۔ ”تم اس پارٹی میں مدعو تو نہیں تھے۔“

”میں غزنوی صاحب کے بنگلے پر گیا تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ غزنوی صاحب یہاں ہیں۔ میں غزنوی صاحب کا جنرل منیجر ہوں، یہی سوچ کر یہاں آ گیا کہ میری موجودگی بھی ضروری ہے۔“

”تم سے کس نے کہا کہ تمہاری موجودگی یہاں ضروری ہے؟“ غزنوی نے سرد لہجے میں کہا۔

”مجھے خود اپنی ذمے داری کا احساس ہے سر۔“ احسن نے کہا۔ ”آپ یہاں کوئی بزنس ڈیل کرنا چاہ رہے ہیں۔ میں...“

”کسی بزنس ڈیل کے سلسلے میں اب مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت پڑے گی؟“ غزنوی نے ناگواری سے کہا۔

”سوری سر... میں تو...“

”تم پہلے کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔“ اعجاز نے کہا۔ ”کہیں تمہارا جبڑا ہی فریکچر نہ ہو گیا ہو یا پھر ممکن ہے زخم اندر کی طرف آیا ہو۔“

”یہ جنگلی کون ہے؟“ اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ناگواری سے پوچھا۔

”احسن!“ رمشا نے تیز لہجے میں کہا۔ ”بی ہیو یور سیلف! یہ سرفراز ہے، غزنوی کا باڈی گارڈ۔“

”جاؤ، کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔“ غزنوی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

احسن مجھے قہر آلود نظروں سے گھورتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں پھر غزنوی سے چند قدم کے فاصلے پر چلا گیا۔ وہاں وقتی طور پر کچھ لوگ جمع ہو گئے تھے لیکن وہ فوراً ہی دوبارہ اپنی مصروفیات میں مگن ہو گئے۔ میں شراب تو پیتا نہیں تھا اس لیے اورنج جوس پیتا رہا اور بور ہوتا رہا لیکن اس کے باوجود میں چوکس تھا اور میری نظر غزنوی اور اردگرد کے لوگوں پر تھی۔

بقول غزنوی کے، وہ بہت خاص پارٹی تھی اور اس میں منتخب افراد کو مدعو کیا گیا تھا۔ احسن شاید غزنوی ...... کے منیجر ہونے کے ناتے اندر آنے میں کامیاب ہوا ہوگا۔

اس کے بعد کھانے کا دور چلا۔ میرا خیال تھا کہ کھانے کے بعد غزنوی بھی وہاں سے رخصت ہو جائے گا لیکن پارٹی میں ہلکے پھلکے ورائٹی پروگرام کا بھی اہتمام تھا لیکن غزنوی اور اعجاز وہاں نہیں بیٹھے.... بلکہ ہال سے نکل کر ایک طرف روانہ ہو گئے تھے۔

میں نے بھی غزنوی کے پیچھے جانا چاہا تو غزنوی نے کہا۔ ”سرفراز! تم ہال میں میرا انتظار کرو۔“

میں دوبارہ ہال میں آ گیا۔ غزنوی اور اعجاز شاید کسی اہم کاروباری بات چیت کے لیے ایک علیحدہ کمرے میں چلے گئے تھے۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اس میٹنگ میں رمشا

بھی شریک نہیں تھی۔ وہ ہال میں موجود تھی اور جب میں ہال میں داخل ہوا تو وہ سیل فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ میں اس کی پشت پر پہنچا تو وہ کہہ رہی تھی۔ ”تم فکر مت کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب کل تم سے تفصیلی ملاقات ہوگی تو بات ہوگی۔“ یہ کہہ کر اس نے سیل فون کا سلسلہ منقطع کیا اور ایک جوڑے کو دیکھ کر ان کی طرف بڑھ گئی۔

میں چند لمحے وہیں کھڑا رہا، پھر ٹہلتا ہوا ایک صوفے پر جا بیٹھا۔ اسٹیج پر کوئی معروف گلوکار اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

اچانک ایک لڑکی ٹہلنے والے انداز میں میری طرف آئی اور بولی۔ ”اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں یہاں بیٹھ جاؤں؟“

”تشریف رکھیے۔“ میں نے کہا۔

وہ بھی خاصی پُرکشش اور الٹرا ماڈرن لڑکی تھی۔ اس کا لباس بھی مختصر تھا۔

اس نے بیٹھتے ہوئے ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے بہت رازداری سے کاغذ کا ایک تہ کیا ہوا ٹکڑا میری طرف بڑھا دیا اور خود مجھ سے خاصے فاصلے پر بیٹھ گئی۔

میں بوکھلا کر رہ گیا۔ آخر وہ لڑکی کون تھی اور مجھ سے کیا چاہتی تھی؟

میں کاغذ کا وہ ٹکڑا مٹھی میں دبائے اردگرد کا جائزہ لیتا رہا کہ کسی نے لڑکی کی اس حرکت کو دیکھا تو نہیں؟ لیکن وہاں ہر فرد اپنے آپ میں مگن تھا۔ چند منٹ بیٹھنے کے بعد وہ لڑکی بھی وہاں سے اٹھ گئی۔

میں بھی اٹھ کر ٹہلتا ہوا واش روم کی طرف چلا گیا اور دروازہ اندر سے لاک کر کے میں نے اس کاغذ کی تہیں کھولیں۔ اس میں صرف اتنا لکھا ہوا تھا۔ ”مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ میرے سیل نمبر پر کال کر لو... فوراً۔“ نیچے والی لائن میں اس کا سیل نمبر لکھا ہوا تھا۔

میں نے سوچا کہ اس لڑکی کو وہیں سے کال کر لوں لیکن پھر یہ سوچ کر اپنا ارادہ بدل... دیا کہ ممکن ہے دائیں بائیں کے ٹوائلٹ میں کوئی موجود ہو اور وہ میری گفتگو سن لے۔

میں وہاں سے باہر نکل کر دوبارہ ہال میں آ گیا۔ میں نے اس لڑکی کی تلاش میں ہال پر نظر ڈالی لیکن وہ مجھے نظر نہیں آئی۔

رمشا البتہ اب بھی وہاں موجود تھی اور کسی نوجوان جوڑے سے گپ شپ میں مصروف تھی۔ میں ٹہلتا ہوا ہال سے باہر نکل گیا۔ پورچ میں تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہاں سے کافی فاصلے پر بنگلے کا گیٹ تھا۔ دائیں جانب اور سامنے کی طرف خاصا کشادہ لان تھا۔ میں ٹہلنے والے انداز میں لان کی طرف چلا گیا۔ وہاں دو تین بلند و بالا پام کے درخت تھے۔ اردگرد کوئی نہیں تھا۔ میں نے اپنا سیل فون نکالا اور اسکرین کی روشنی میں لڑکی کا لکھا ہوا نمبر پڑھ کر ڈائل کر دیا۔

دوسری طرف دو تین گھنٹیاں بجیں پھر کال ریسیو کر لی گئی۔ ”ہیلو!“ مجھے لڑکی کی مترنم آواز سنائی دی۔

”ہیلو!“ میں نے جواب میں کہا۔ ”فرمایئے، آپ کو مجھ سے کیا ضروری کام ہے؟“

”کون بول رہا ہے؟“ لڑکی محتاط انداز میں بولی۔

”وہی جسے ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے اپنا نمبر دیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اچھا، آپ ہیں۔“ لڑکی نے گویا سکون کا سانس لیا۔ ”میں صرف آپ کو یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ آپ واپسی میں اس راستے سے مت جایئے گا جس سے آئے ہیں۔“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”واپسی میں غزنوی صاحب کے دشمنوں نے ان کی جان لینے کا منصوبہ بنایا ہے۔“

”لیکن آپ ہیں کون اور آپ یہ سب کچھ کیسے جانتی ہیں؟“

”میں غزنوی صاحب کی اور ان سے زیادہ آپ کی خیر خواہ ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتی کہ اس حملے میں ان کے ساتھ آپ کی جان بھی جائے۔“

”میں آپ کی بات کا کیسے یقین کر لوں؟“ میں نے کہا۔

”یقین کرنا یا نہ کرنا تو آپ کے اختیار میں ہے۔“ لڑکی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے تو صرف آپ کو اطلاع دی ہے۔“

”لیکن میں اپنی مرضی سے تو راستہ نہیں بدل سکتا نا؟“ میں نے کہا۔ ”آپ شاید جانتی نہیں کہ...“

”آپ غزنوی صاحب کے باڈی گارڈ ہیں۔“ وہ ہنس کر بولی۔ ”میں تو یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ نے آج ہی ڈیوٹی جوائن کی ہے۔“ پھر وہ بولی۔ ”آپ غزنوی صاحب سے کوئی بھی بہانہ بنا سکتے ہیں کہ آگے سڑک بند ہے۔ وہاں کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے یا پولیس اور ڈاکوؤں میں مقابلہ ہو رہا ہے۔ میرا کام تھا بتانا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔“

”آپ یہ اطلاع براہِ راست غزنوی صاحب کو کیوں نہیں دے دیتیں؟“ میں نے کہا۔

”اگر انہیں بتا سکتی تو آپ کو زحمت نہ دیتی۔“ یہ کہہ کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے سیل فون جیب میں ڈالا اور واپسی کا ارادہ کیا ہی تھا کہ برآمدے میں مجھے اعجاز صاحب کے ملازم نظر آئے۔ میں انہیں دیکھ کر رک گیا کہ وہ لوگ چلے جائیں تو میں اندر جاؤں۔

جہاں میں کھڑا تھا، وہاں خاصی اونچی باڑ تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وسیع و عریض لان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

وہاں سے گزرتے ہوئے مجھے باڑ کی دوسری طرف سے کسی کی سرگوشی سنائی دی۔ ”میں نے اسے بتا تو دیا ہے لیکن وہ مجھے بہت کائیاں لگ رہا تھا۔ غزنوی نے یونہی اسے اپنا باڈی گارڈ منتخب نہیں کیا ہے۔“

”لیکن اس سے فائدہ کیا ہوگا؟“ اس مرتبہ کسی مرد کی آواز سنائی دی۔

”فائدہ یہ ہوگا کہ ایسا ہی ایک ٹیلی فون غزنوی کو بھی کیا گیا ہے۔ اسے بتایا گیا ہے کہ آپ کا باڈی گارڈ دشمنوں کا آدمی ہے۔ وہ واپسی میں آپ کو دوسرے راستے سے گھر لے جانے کی کوشش کرے گا۔ اس راستے پر آپ کے دشمن گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ اب اگر اس باڈی گارڈ نے راستہ بدلنے کی بات کی تو غزنوی اسے ابھی اور اسی وقت چلتا کر دے گا۔ تم بھی اس کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہو پھر وہ خود ڈرائیونگ کرے گا اور مارا جائے گا۔“

”فرض کرو، وہ اس باڈی گارڈ کی بات مان لیتا ہے تو؟“

”اوّل تو ایسا ہوگا نہیں اور ایسا ہو بھی گیا تو دوسرے راستے پر بھی اتنا ہی خطرہ ہے۔ اس صورت میں ہمارے لیے خطرہ کچھ زیادہ ہوگا کیونکہ باڈی گارڈ بھی ہوگا اور وہ کم بخت بلا کا نشانے باز ہے۔ نہ آسانی سے خود مرے گا، نہ غزنوی کو مرنے دے گا۔“

”تمہارے باس کا ذہن بہت دور تک سوچتا ہے۔ گویا آج ہر صورت میں غزنوی کی موت یقینی ہے۔“

”ہاں، باس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آج غزنوی کو ہر قیمت پر ختم ہونا چاہیے۔“

میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ گویا ہر طرف سے موت غزنوی کے لیے جال بچھائے بیٹھی تھی۔ میں بہت آہستگی سے کسی بھی قسم کی آواز پیدا کیے بغیر وہاں سے ہٹ گیا اور برآمدے کے ایک تاریک گوشے میں کھڑا ہو کر ان دونوں کا انتظار کرنے لگا۔ لڑکی کو تو میں پہچان گیا تھا، میں مرد کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔

میں نے تقریباً دس منٹ تک ان کا انتظار کیا لیکن شاید وہ کسی دوسرے راستے سے ہال میں چلے گئے تھے یا پھر بنگلے ہی سے نکل گئے تھے۔ مہمانوں کی گاڑیاں تو باہر پارک تھیں۔

اچانک میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے جیب سے سیل فون نکالا۔ اسکرین پر غزنوی کا نام تھا۔ میں نے سیل فون جلدی سے آن کر کے کان سے لگا لیا۔ ”یس سر!“

”تم کہاں ہو سرفراز؟“ اس نے پوچھا۔ ”میں ہال میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

میں فوراً ہال کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہال میں رمشا اور غزنوی شاید میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ بیشتر مہمان جا چکے تھے لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جو ورائٹی پروگرام سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر غزنوی سیدھا میری طرف آیا۔ وہ کچھ پریشان لگ رہا تھا۔

”خیریت تو ہے سر؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، خیریت ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اعجاز سے کروڑوں روپے کی ڈیل فائنل ہوئی ہے۔ بس اب جلدی سے گاڑی لے آؤ۔“

”او کے سر!“ میں نے مؤدب انداز میں کہا اور باہر نکل گیا۔ میرا ذہن اس نئی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔

اچانک مجھے ایس پی صاحب کا خیال آیا۔ میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور ان کا نمبر ڈائل کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ابھی جاگ رہے ہوں گے۔ وہ رات گئے تک جاگنے کے عادی تھے اور اپنے تمام گارڈز سے رپورٹ لینے کے بعد ہی سوتے تھے۔

انہوں نے دوسری ہی بیل پر کال ریسیو کر لی۔

”ہاں سرفراز۔“ وہ بولے۔

”سر! غزنوی صاحب ایک پارٹی میں کلفٹن آئے تھے۔ مجھے اپنے ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ واپسی پر ان پر قاتلانہ حملہ ہوگا اور انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ اس وقت ان کے ساتھ صرف میں ہوں، ڈرائیور یا کوئی اور گارڈ نہیں ہے۔ مجھے کچھ بہترین گارڈز کی ضرورت ہے جو ہماری گاڑی کے پیچھے رہ کر ہمیں کور دے سکیں۔“

”تم مجھے ایڈریس بتاؤ اور کسی بہانے سے غزنوی کو

تھوڑی دیر کے لیے وہاں روک لو۔ میں شاہ میر کے ساتھ چار گارڈز کو بھیج رہا ہوں۔ وہ لوگ پندرہ منٹ کے اندر اندر وہاں پہنچ جائیں گے۔ وہاں پہنچ کر شاہ میر تمہیں کال کر لے گا۔“

”او کے سر! میں انہیں روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور دوبارہ ہال میں آ گیا یہاں غزنوی اور رمشا بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔

”گاڑی لے آئے؟“ غزنوی نے پوچھا۔

”سر! گاڑی کا ایک ٹائر فلیٹ ہو گیا ہے۔ اسے تبدیل کرنے میں کچھ دیر لگے گی۔ میں آپ کو یہی اطلاع دینے آیا تھا۔ میں ٹائر تبدیل کر کے گاڑی لے کر آتا ہوں۔“

”شٹ!“ غزنوی نے کہا۔ ”جا کر ٹائر بدلو اور جلدی گاڑی لے کر آؤ۔“ غزنوی نے کہا۔ ”گاڑی کا ٹائر فلیٹ کیسے ہو گیا؟“

میں اس کی بات کا جواب دیے بغیر باہر نکل گیا۔ پارکنگ میں اب بہت کم گاڑیاں تھیں۔ میں نے ڈکی سے جیک نکالا اور گاڑی کے نیچے لگا دیا کہ اگر جھنجلا کر غزنوی خود اس طرف آ نکلے تو میں اسے دکھا سکوں کہ میں واقعی ٹائر تبدیل کر رہا ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ شاہ میر کی کال ملتے ہی میں فاضل ٹائر کی ہوا نکال دوں گا تاکہ میرا یہ جھوٹ پکڑا نہ جا سکے۔

میری نظریں گھڑی پر تھیں۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد شاہ میر کی کال آئی۔ ”ہم لوگ اس بنگلے کے پاس ہیں۔ تم کس گاڑی میں ہو؟“

میں نے اسے گاڑی کا میک، ماڈل اور رجسٹریشن نمبر بتایا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے فاضل ٹائر کا والو نکال کر اس کی ہوا نکال دی اور گاڑی کو جیک سے اتار دیا کہ غزنوی جھنجلا کر خود وہاں آ گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اعجاز اور اس کے گارڈز بھی تھے اور رمشا بھی خاصی بیزار نظر آ رہی تھی۔

”ابھی تک تم سے ٹائر تبدیل نہیں ہوا؟“ غزنوی نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”ہو گیا سر!“ میں نے جیک اور پانے وغیرہ کو ڈکی میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں گاڑی لے کر آ ہی رہا تھا۔ آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیوں کی؟“

میں نے جلدی سے غزنوی کے لیے عقبی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ رمشا اتنی بیزار تھی کہ اس نے میرے دروازہ کھولنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور خود ہی دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

نئے شاعر

احسان دانش کو کسی شہر سے مشاعرے والے مدعو کرنے آئے۔ احسان دانش نے رسمی گفتگو کے بعد ہامی بھر لی۔ وہ لوگ چلے گئے تو احسان دانش کے ایک چہیتے شاگرد ایوب شاہد نسیم آ گئے۔ انہوں نے بھی ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔ احسان دانش نے منتظمین مشاعرہ کو ٹیلی گرام بھیجا۔ میرے ساتھ ایوب شاہد نسیم بھی آ رہے ہیں۔ دوسرے ہی دن منتظمین کا جوابی تار آ گیا۔ معاف کیجیے گا ہمارا بجٹ کم ہے۔ لہٰذا ہم ان تین شاعروں کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتے۔

اثر مصطفیٰ، کراچی

مالک ملازم کو ڈانٹتے ہوئے۔ ”تم یہ کام کیوں نہیں کر سکے؟“

ملازم: ”مالک! میں نے پوری کوشش کی تھی۔“

مالک: ”خاک پوری کوشش کی تھی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں ایک گدھے کو اس کام کے لیے بھیج رہا ہوں تو میں خود چلا جاتا۔“

اسلم پرویز، حیدر آباد سے

روانگی کے وقت اعجاز نے ہاتھ ہلا کر غزنوی کو الوداع کہا۔

میں گاڑی مین روڈ پر لے کر آیا تو میں نے عقبی آئینے میں شاہ میر کی ڈبل کیبن پک اَپ دیکھ لی۔

”کس راستے سے چلو گے؟“ غزنوی نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

”جس راستے سے آئے تھے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یا اگر آپ کو کہیں اور جانا ہے تو مجھے بتا دیں۔“

”نہیں، سیدھے گھر چلو۔“ غزنوی نے سکون کی سانس لی۔ گویا اس کا یہ شبہ دور ہو گیا تھا کہ میں دشمنوں کا آلۂ کار ہوں۔ وہ اب بہت نارمل انداز میں رمشا سے باتیں کر رہا تھا۔ ”ڈارلنگ! اس بڑی ڈیل کے بعد تو میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ مجھے یہی خدشہ تھا کہ یہ ڈیل دوسری پارٹی نہ کر لے۔“

”خدشہ تو اب بھی ہے۔ اگر اسے کوئی اچھی آفر ملی تو وہ ڈیل کینسل بھی کر سکتا ہے۔ آپ تو اعجاز کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہیں۔“

”یہ ڈیل زبانی نہیں ہوئی ہے بلکہ باقاعدہ قانونی طور پر ہوئی ہے۔ اب اعجاز اس سے مکر نہیں سکتا۔ میں اگر مر بھی جاؤں تو یہ کام تو ہماری کمپنی کرے گی۔ میں نے اس صورت میں تمہارا نام لکھوایا ہے۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”یہ آپ کیسی الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں؟“ رمشا نے کہا۔

رات خاصی گزر چکی تھی۔ وہاں کے راستے تو دن میں بھی اتنے بارونق نہیں ہوتے۔ ایک موڑ گھومتے ہی مجھے سڑک پر پانی کا ایک ٹینکر دکھائی دیا۔ وہ اس انداز میں سڑک پر کھڑا تھا کہ دوسری گاڑیوں کا راستہ مسدود ہو گیا تھا۔

میں نے کوشش کی کہ گاڑی کو ریورس کر کے نکال لوں لیکن اسی وقت ایک فائر ہوا اور گاڑی ایک طرف سے بیٹھ گئی۔ گویا حملہ آوروں نے پہلے ٹائر۔۔۔۔۔ کو نشانہ بنایا تھا تاکہ ہم وہاں سے فرار نہ ہو سکیں۔

”آپ لوگ نیچے جھک جائیں۔“ میں نے چشم زدن میں اپنے دونوں پسٹل نکال لیے۔ پھر گاڑی پر کئی فائر ہوئے لیکن گولیاں اس کی باڈی سے ٹکرا کر رہ گئیں۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ غزنوی کی یہ بی ایم ڈبلیو یقیناً بلٹ پروف ہے لیکن بلٹ پروف گاڑی کو بم سے تو اڑایا جا سکتا ہے۔ اگر غزنوی کے دشمنوں نے اسے ختم کرنے کا تہیہ ہی کر لیا تھا تو وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔

اچانک شاہ میر اور اس کے ساتھیوں نے جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ ہماری ایجنسی کے پاس بہترین دور مار رائفلیں تھیں۔ مشکل سے ایک منٹ میں دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مجھے فائرنگ کے شور میں کچھ انسانی چیخیں اور اذیت ناک کراہیں بھی سنائی دیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شاہ میر نے دشمنوں کے آدمیوں کو ہلاک یا زخمی بھی کیا ہے۔

فائرنگ کچھ کم ہوئی تو میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر آہستگی سے باہر نکل گیا۔ وہ لوگ اب بھی پانی کے ٹینکر کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ میں زمین پر لیٹا تھا اس لیے مجھے ان کے جسم کا نچلا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے حسبِ عادت بہ یک وقت دونوں ہاتھوں سے فائر کیے اور وہ دونوں چیخ مار کے وہیں ڈھیر ہو گئے۔

ایک آدمی ٹینکر کے کیبن سے نکل کر بھاگا، وہ تو میرے لیے بہت آسان ہدف تھا۔ میں نے ایک فائر اس کی پشت پر کر دیا۔ وہ بھاگتے بھاگتے اوندھے منہ گر پڑا۔

میں کرالنگ کرتا ہوا تیزی سے آگے بڑھا۔ سڑک کے کنارے خودرو جھاڑیوں میں کھڑی مجھے ایک گاڑی دکھائی دی۔ جھاڑیاں اتنی نہیں تھیں کہ گاڑی ان میں بالکل چھپ سکتی لیکن رات کے وقت اسے دیکھنا ذرا مشکل تھا کیونکہ گاڑی کا رنگ بھی سیاہ تھا۔

اسی وقت بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں تو میں قلابازی کھا کر سڑک کے کنارے خودرو جھاڑیوں میں چلا گیا۔

آنے والے شاہ میر اور دیگر۔۔۔ گارڈز تھے۔ انہوں نے پہلے ہماری گاڑی کا جائزہ لیا پھر شاہ میر بلند آواز میں بولا۔ ”سرفراز! تم خیریت سے تو ہو؟“

میں نے فوری طور پر جواب نہیں دیا کہ مبادا دشمنوں کا کوئی بچا کھچا آدمی وہاں چھپا بیٹھا ہو اور وہ میری آواز پر فائر کر دے۔ شاہ میر نے بھی مجھے آواز دے کر عقل مندی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ وہ شاہ میر کو بھی نشانہ بنا سکتا تھا۔ شاہ میر نے دوبارہ مجھے پکارا تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ یوں کھلے میدان میں آ کر مجھے پکارتا۔

”میں ٹھیک ہوں شاہ میر!“ میں نے جواب دیا۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب میدان صاف ہے۔ میں اٹھ کر سامنے آ گیا۔ شاہ میر مجھ سے یوں بغل گیر ہو گیا جیسے برسوں بعد ملا ہو۔

”غزنوی صاحب کی خیریت تو معلوم کرنے دو۔“ میں نے کہا۔

”وہ اور ان کی بیگم خیریت سے ہیں۔“ شاہ میر نے کہا۔ ”میں نے پہلے انہی کو دیکھا تھا۔ وہ دونوں عقبی سیٹ کے پائندان میں چھپے ہوئے ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ غزنوی صاحب کی گاڑی بلٹ پروف ہے ورنہ ممکن تھا کہ اس اندھا دھند فائرنگ میں تم لوگوں کو نقصان پہنچ جاتا۔“ پھر وہ ہنس کر بولا۔ ”لیکن میں نے انہیں زیادہ فائر کرنے کا موقع نہیں دیا۔ ان کی طرف سے پہلا فائر ہوتے ہی میں نے بھی جوابی فائر کھول دیا تھا۔“

”لیکن ہماری گاڑی پر تو بہت سے فائر ہوئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”تمہاری گاڑی پر صرف تین فائر ہوئے ہیں۔“ شاہ میر نے کہا۔ ”وہ بھی ان لوگوں نے کیے ہیں جو ٹینکر کے اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ جوابی فائرنگ ہوتے ہی وہ ٹینکر سے اتر گئے۔ مجھے اندھیرے میں وہ نظر نہیں آئے ورنہ انہیں تو وہیں مار گراتا۔“

”ٹینکر والے تینوں آدمیوں کو میں نے نشانہ بنا لیا ہے۔ ان میں سے ایک تو یقینی طور پر مر چکا ہوگا۔ بقیہ دو بھی یا تو مر چکے ہوں گے یا شدید زخمی ہوں گے۔“ پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔ ”یار! غزنوی صاحب کی گاڑی تو اب چلنے کے قابل نہیں رہی۔ اس کا ایک ٹائر تو گولی لگنے سے برسٹ ہو چکا ہے

اور فاضل ٹائر بھی ناکارہ ہے۔“

”تو ان لوگوں کو ہماری گاڑی میں گھر لے جاؤ۔ ان کی گاڑی بعد میں ہمارا کوئی آدمی پہنچا دے گا یا ان کا ڈرائیور لے جائے گا۔“

میں گاڑی کی طرف آیا اور دروازہ کھول کر بولا۔ ”غزنوی صاحب! اب پلیز گاڑی سے باہر آ جائیں۔۔۔ خطرہ ٹل چکا ہے۔“

غزنوی پریشان حال گاڑی سے باہر آ گیا۔ رمشا کی حالت بہت زیادہ خراب تھی۔

”خطرہ ٹل چکا ہے تو گھر کیوں نہیں چلتے؟“ غزنوی نے جھنجلا کر کہا۔

”فائرنگ میں آپ کی گاڑی کا ایک ٹائر ناکارہ ہو گیا ہے۔ ابھی ایک منٹ میں دوسری گاڑی یہاں آ جائے گی۔“

اسی وقت کسی گاڑی کی ہیڈ لیمپس روشن ہوئیں اور وہ ہماری گاڑی کے نزدیک آ کر ٹھہر گئی۔ وہ ہماری ایجنسی کی ڈبل کیبن پک اَپ تھی۔

”آیئے سر!“ میں نے کہا۔ ”فی الحال تو اسی گاڑی میں آپ کو گھر چلنا پڑے گا۔“

”گاڑی کوئی بھی ہو، یہاں سے نکلو۔“ رمشا نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔

میں نے ان دونوں کو پک اَپ کے پچھلے کیبن میں بٹھایا اور خود شاہ میر کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بقیہ گارڈز پک اَپ کے کھلے ہوئے حصے میں سوار ہو گئے۔

شاہ میر نے گاڑی ریورس کی اور تیز رفتاری سے روانہ ہو گیا۔ غزنوی اس دھچکے سے فوراً ہی سنبھل گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خاصا جی دار آدمی ہے۔ اس نے اپنے سیل فون پر پولیس اسٹیشن کا نمبر ملایا اور اس واقعے کی رپورٹ دینے لگا۔

”جائے واردات پر سیکیورٹی ایجنسی کا کوئی آدمی موجود ہے؟“ غزنوی نے مجھ سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ شاہ میر نے جواب دیا۔ ”وہاں میں نے اپنا ایک بہترین گارڈ چھوڑ دیا ہے۔ وہ آرمی کا سابق کمانڈو ہے۔“ میں سمجھ گیا کہ وہ عبدالقادر کی بات کر رہا ہے۔ عبدالقادر واقعی بہترین اور ذہین گارڈ تھا۔

”جی ہاں، جائے واردات پر سیکیورٹی کا ایک آدمی موجود ہے۔“ غزنوی پھر بولنے لگا۔۔۔ ”میں۔۔۔ میں تو اس وقت گھر جا رہا ہوں۔ میرا یا میرے گارڈ کا بیان چاہیے تو میرے گھر آ جانا۔“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

گھر پہنچ کر رمشا تو سیدھی بیڈروم میں چلی گئی۔ غزنوی ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ اس نے ملازم سے کافی بنانے کو کہا اور پولیس کا انتظار کرنے لگا۔ شاہ میر ہمیں وہاں چھوڑ کر جا چکا تھا اور کہہ گیا تھا کہ پولیس اگر میرا بیان لینا چاہے گی تو میں آ جاؤں گا۔

اس کے جانے کے بعد غزنوی چند لمحوں تک مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر اچانک اس نے مجھے سینے سے لگا لیا اور بُری طرح رونے لگا۔

”سر پلیز۔۔۔ ایسا نہ کریں۔۔۔ اب تو آپ محفوظ ہیں۔۔۔ بس۔۔۔“

”مجھے معاف کر دینا بیٹا!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں تمہاری طرف سے بدگمانی کا شکار ہو گیا تھا۔ مجھے ٹیلی فون پر کسی نے اطلاع دی تھی کہ آپ کا گارڈ آپ کو ڈبل کراس کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ آپ کو جان بوجھ کر کسی دوسرے راستے پر لے جائے گا۔ وہاں دشمن آپ کی گھات میں بیٹھے ہوں گے۔ دشمن جونہی آپ کو روکیں گے، گارڈ آپ دونوں کو خود ہی گولی مار دے گا۔ اس کے بعد آپ کی گاڑی پر فائرنگ کی جائے گی۔ ممکن ہے، گارڈ کو بھی معمولی سا زخمی کر دیا جائے۔ اگر وہ آپ سے راستہ بدل کر چلنے کا کہے تو سمجھ جایئے گا کہ وہ آپ کو موت کے منہ میں لے جا رہا ہے۔“

”ایسا ہی ایک ٹیلی فون مجھے بھی موصول ہوا تھا۔“ میں نے کہا تو غزنوی اچھل پڑا۔

پھر میں نے اسے تفصیل سے لڑکی کے بارے میں بتایا اور میں نے جو باتیں سنی تھیں، ان کے بارے میں بھی بتایا تو وہ حیرت سے میری شکل دیکھنے لگا۔

”میں نے اس کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا کہ اپنی مدد کے لیے ایجنسی کے دوسرے گارڈز کو بلا لوں۔ اس وقت تک آپ کو روکنے کے لیے میں نے ٹائر پنکچر ہونے کا بہانہ کیا۔“

”لیکن اس کا فاضل ٹائر تو واقعی پنکچر تھا؟“ غزنوی نے کہا۔

”میں نے خود ہی اس کی ہوا نکال دی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ دیر ہو گی تو آپ جھنجلا کر خود ہی پارکنگ میں آ جائیں گے۔ میں نے گاڑی کے نیچے جیک بھی دکھاوے کے لیے لگایا تھا۔ جس وقت آپ آئے، مجھے اپنے آدمیوں کی طرف سے اطلاع مل چکی تھی کہ وہ پہنچ گئے ہیں۔“

”مجھے معاف کر دینا بیٹا!“ غزنوی نے پھر کہا۔

”سر پلیز! مجھے شرمندہ نہ کریں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کی حفاظت کرنا تو میرا فرض ہے۔ مجھے تو تنخواہ اسی بات کی ملتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔"

"اس کے باوجود کون موت کے منہ میں چھلانگ لگاتا ہے؟" اس نے کہا۔ "تم نے یہ جانتے بوجھتے کہ ہر طرف جان جانے کا خطرہ ہے، موت کے منہ میں چھلانگ لگا دی۔ تم کوئی بھی بہانہ کر سکتے تھے کہ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے یا مجھ سے ڈرائیونگ نہیں ہوگی۔ اعجاز صاحب کا ڈرائیور آپ کو چھوڑ دے گا... کچھ بھی کہہ سکتے تھے۔"

"لیکن میں کیوں کہتا؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں جب ایک دفعہ کوئی وعدہ کر لیتا ہوں تو پھر اس سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ ہماری زندگی تو ہر وقت داؤ پر لگی رہتی ہے سر۔" میں نے ہنس کر کہا۔

اسی وقت ایس پی صاحب اور پولیس ساتھ وہاں پہنچی۔

"جائے واردات سے ہمیں دو زخمی اور دو لاشیں ملی ہیں۔ میں نے زخمیوں کو فوری طور پر اسپتال بھجوا دیا ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "اور لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا ہے۔ وہاں سے پانی کا ایک ٹینکر، ایک ٹویوٹا کرولا اور ایک بی ایم ڈبلیو ملی ہے۔"

پھر انسپکٹر نے میرا اور غزنوی کا بیان لیا۔ غزنوی نے پولیس انسپکٹر کو بتایا کہ یوں تو میرے کئی کاروباری حریف ہیں لیکن ان میں ایسا کوئی نہیں ہے جس کا نام میں شبہے میں لے سکوں۔

پھر پولیس انسپکٹر نے میرا بیان لیا۔ میں نے بھی اسے وہی کچھ بتایا جو پیش آیا تھا۔

"دراصل ہم اپنے کلائنٹ کی طرف سے کبھی غافل نہیں ہوتے، خاص طور پر غزنوی صاحب جیسے معروف بزنس مین کو ہم ہر طرح سے سیکیورٹی فراہم کرتے ہیں۔ یہ لوگ گھر سے نکلے تو ہماری ایک گاڑی ان کے پیچھے پیچھے تھی۔ اس بات کا علم سرفراز کو بھی نہیں ہوگا۔" ایس پی صاحب نے اپنی کارکردگی بتانے کی کوشش کی۔

پولیس والوں کے جانے کے بعد ایس پی صاحب نے مجھ سے کہا۔ "سرفراز! مجھے تمہاری ذہانت اور بہادری پر فخر ہے۔ میں اس کارکردگی پر نہ صرف تمہاری تنخواہ میں پانچ ہزار روپے کا اضافہ کر رہا ہوں بلکہ پچاس ہزار نقد انعام بھی دے رہا ہوں۔" انہوں نے جیب سے چیک بک نکالی اور چیک لکھ کر مجھے دے دیا۔

ان کے جانے کے بعد غزنوی نے مجھ سے کہا۔ "میں تمہیں ایسا انعام دوں گا کہ تم نے اس کا تصور بھی نہ کیا ہوگا۔"

"مجھے انعام و اکرام کی ضرورت نہیں ہے سر... مجھے آپ سے جو تنخواہ مل رہی ہے، وہی اتنی زیادہ ہے کہ آج کل اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی اتنے پیسے نہیں کما پاتے۔"

غزنوی میری بات پر مسکرانے لگا، پھر وہ موضوع بدل کر بولا۔ "رات کافی ہوگئی ہے بلکہ اب تو تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی ہے۔ تم جا کر آرام کرو اور صبح جلدی اٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بھی کل آرام کروں گا اور مارننگ واک پر نہیں جاؤں گا۔"

میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ میں بچپن سے علی الصباح اٹھنے اور نمازِ فجر پڑھنے کا عادی تھا۔ کراچی آنے کے بعد بھی میرے ان معمولات میں فرق نہیں آیا تھا۔ میں نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی تو صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ ان دنوں ساڑھے پانچ بجے تک فجر کی اذان ہو جاتی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر اب میں سو گیا تو نماز کے لیے نہیں اٹھ سکوں گا۔ وقت گزارنے کے لیے میرے ہاتھ کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا۔ میں اتنا پڑھا لکھا تو تھا نہیں کہ کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتا۔ ٹی وی دیکھنے سے بھی مجھے کوئی رغبت نہیں تھی۔

میں نے سوچا، یہ وقت میں ایکسرسائز کر کے ہی گزار لوں۔ آدھ گھنٹے تک ایکسرسائز کرنے کے بعد میرے چہرے سے پسینا بہنے لگا اور شدید پیاس کا احساس ہوا۔ پانی کا جگ بالکل خالی تھا۔ میں پانی پینے کے لیے کچن کی طرف بڑھا۔ کچن کوریڈور کے آخری سرے پر تھا۔ میں کوریڈور سے گزرا تو مجھے اسٹڈی روم سے کسی کے بولنے کی آواز سنائی دی۔

میں چونک اٹھا کہ اس وقت کون، کس سے باتیں کر رہا ہے۔

اچانک اپنا نام سن کر میں چونک اٹھا۔ پھر میں بولنے والے کی آواز بھی پہچان گیا۔ وہ رمشا تھی اور کہہ رہی تھی۔ "وہ تو سرفراز کی حاضر دماغی سے ہم لوگوں کی جان بچ گئی ورنہ ہم میں سے کوئی زندہ نہ بچتا۔ ارے نہیں بھئی، وہ اتنا بُرا نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو... وہ انتہائی مخلص، ایمان دار اور کھرا آدمی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت جی دار بھی ہے... میں اس کے گن نہیں گا رہی بلکہ حقیقت بتا رہی ہوں... ہاں، وہ تو ہے... اس کی پرسنالٹی واقعی بہت ڈیشنگ ہے... باڈی گارڈ تو وہ لگتا ہی نہیں ہے... اچھا تمہارے جبڑے کا کیا حال ہے؟... گال کے اندر کی طرف تین ٹانکے آئے ہیں؟... شکر کرو کہ تمہارا جبڑا سلامت ہے... خوشی... ہاں، مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ تمہارا جبڑا بچ گیا... اچھا اب

بس کرو۔ اذان ہونے والی ہے... میں بھی بیڈ روم میں جا رہی ہوں... اپنا خیال رکھنا... شب بخیر... بلکہ صبح بخیر..."

میں تیزی سے آگے بڑھ گیا کیونکہ اب رمشا باہر نکلنے والی تھی۔ میرے دل میں پہلی دفعہ اس سے نفرت پیدا ہوگی۔ وہ کیسی بیوی تھی کہ شوہر کے اعتماد کا خون کر رہی تھی... میں نے کچن سے جھانک کر دیکھا، رمشا اپنے بیڈ روم میں داخل ہو رہی تھی۔ موبائل فون اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے پانی پیا اور اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ اس دن میں نے کمرے ہی میں نماز پڑھ لی۔ تھکن کی وجہ سے مسجد جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ یوں بھی مسجد وہاں سے دور تھی۔

نماز سے فارغ ہو کر میں نے اپنے کمرے کی کھڑکیوں پر پردے ڈالے اور دروازہ اندر سے بولٹ کر کے سونے کے لیے لیٹ گیا۔

دوسرے دن میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی میں سوا ایک بج رہا تھا۔ میں نے کھڑکیوں کے پردے ہٹائے تو روشنی اور دھوپ کی کرنیں اندر داخل ہوئیں۔

میں تیار ہو کر باہر نکلا تو غزنوی اور رمشا لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

"اوہ بھئی، تم تو خوب باڈی گارڈ ہو۔" رمشا نے ہنس کر کہا۔ "ایسے گھوڑے بیچ کر سوئے کہ آدھا دن گزرنے کے بعد اٹھے ہو۔"

"سرفراز کل ساڑھے چار بجے تو سویا تھا۔" غزنوی نے کہا۔

"سر! میں ساڑھے چار بجے بھی نہیں سویا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں فجر کے بعد سویا تھا۔"

"ویسے آج تو میں گھر پر ہوں۔ تم چاہو تو تم بھی چھٹی کر لو۔" غزنوی مسکرا کر بولا۔ "میرا مطلب ہے کہ جب تک میں گھر پر ہوں، تمہاری ڈیوٹی بھی آف ہے۔ یہاں تو میرے ذاتی گارڈز بھی ہیں اور تمہاری سیکیورٹی ایجنسی کے گارڈز بھی ہیں۔ یہاں مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کل میں نے موت کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور میرا یقین اس بات پر پختہ ہو گیا ہے کہ اگر آپ کی زندگی ہے تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت آپ کو نہیں مار سکتی۔"

"لیکن سر! کسی حادثے میں انسان معذور بھی تو ہو سکتا ہے۔ زندگی کے دن تو وہ پورے کرے گا لیکن دوسروں کا محتاج بن کر... اسی لیے اپنی حفاظت کرنا فرض ہے ورنہ میرے بابا تو کہتے تھے کہ زندگی کی حفاظت تو خود موت کرتی ہے۔"

"اوہو، آج تو بہت فلسفہ بول رہے ہو۔" رمشا چہک کر بولی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ کل کے واقعے کے بعد اس کے رویّے میں بھی خوش گوار تبدیلی آئی تھی لیکن رات اس کی گفتگو سننے کے بعد میری نظروں میں اس کی وہ عزت اور احترام نہیں رہا تھا۔

میں ناشتا بلکہ کھانا کھانے کے بعد اپنے دفتر کی طرف نکل گیا۔

ایس پی صاحب بہت گرم جوشی سے ملے اور بولے۔ "سرفراز! کل تم نے نہ صرف میری بلکہ ایجنسی کی عزت بھی بچا لی۔ تم نے ٹی وی پر خبریں سنی ہیں؟"

"نہیں سر!" میں نے کہا۔ "میں آج فجر کے بعد تو سویا تھا، پھر یہاں آگیا۔ مجھے ٹی وی دیکھنے کا موقع کب ملا ہے؟"

"تو اب دیکھو۔" انہوں نے اپنے دفتر میں رکھے ہوئے ٹی وی کی طرف اشارہ کیا۔

ٹی وی سے خبروں کا بلیٹن شروع ہوا تو معروف صنعت کار اے کے غزنوی پر قاتلانہ حملے کی خبر نمایاں تھی۔ نیوز کاسٹر کہہ رہی تھی کہ غزنوی صاحب کے باڈی گارڈ سرفراز نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے اپنی جان پر کھیل کر غزنوی صاحب اور بیگم غزنوی پر ہونے والا قاتلانہ حملہ ناکام بنا دیا۔ واضح رہے کہ اسی سے پہلے سرفراز خان نے بینک ڈکیتی کی ایک بڑی واردات بھی اپنی جان پر کھیل کر ناکام بنائی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کئی مواقع پر سرفراز خان نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے کئی زندگیاں بچائی ہیں۔ کئی گھروں میں ہونے والی ڈکیتی کی وارداتوں کو نہ صرف ناکام بنایا ہے بلکہ ڈاکوؤں کو پولیس کے حوالے بھی کیا ہے۔

"سن لیا تم نے؟" ایس پی صاحب مسکرا کر بولے۔ "تمہارے لیے ایک خوش خبری اور ہے۔ آئی جی صاحب تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم پولیس فورس جوائن کر لو۔"

"میں آئی جی صاحب سے ضرور ملوں گا سر... لیکن میں یہیں ٹھیک ہوں۔ پولیس والوں کو لوگ اچھا نہیں سمجھتے۔"

"جب تم جیسا پولیس والا ہوگا تو لوگ پولیس کو بُرا کیوں کہیں گے؟ پھر علاقے کے جرائم پیشہ عناصر کوئی جرم کرنے سے پہلے کئی بار سوچیں گے۔" پھر وہ مسکرا کر بولے۔ "ویسے میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم میری ایجنسی نہ چھوڑو۔ اسے تم میری خود غرضی کہہ لو لیکن میں تم جیسے آدمی سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”میں ذرا شاہ میر سے مل لوں۔“

شاہ میر بے اختیار میرے گلے لگ گیا اور بولا۔ ”سرفراز! تیری وجہ سے تو ہم بھی ہیرو بن گئے۔ پتا ہے، غزنوی صاحب نے ہم لوگوں کو کتنا انعام دیا ہے؟ پچاس پچاس ہزار روپے... اور ایس پی صاحب نے فوری طور پر ہماری تنخواہوں میں ایک ایک ہزار روپے کا اضافہ کر دیا ہے۔“ پھر وہ ہنس کر بولا۔ ”غزنوی صاحب نے تجھے تو انعام میں کئی لاکھ روپے دیے ہوں گے؟“

”انہوں نے مجھے ابھی تک کچھ بھی نہیں دیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اچھا!“ اس نے غیر یقینی سے کہا پھر وہ چونک کر بولا۔ ”تیرے لیے پشاور سے ایک ٹیلی فون آیا تھا۔“

”پشاور سے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔ ”کس کا ٹیلی فون تھا؟“

”کوئی واحد خان تھا۔ وہ تیرا اصل نمبر مانگ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ اپنا نمبر دے دیں، وہ نمبر میں سرفراز کو دے دوں گا۔ وہ چاہے گا تو آپ کو خود کال کرلے گا۔“

”لاؤ نمبر مجھے دو۔“ میں نے بے چینی سے کہا۔ ”یار! تم اسے میرا نمبر دے دیتے۔ واحد خان میرا بچپن کا دوست ہے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ اسکول جانا شروع کیا تھا۔“

”اچھا!“ شاہ میر نے کہا۔ ”مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں نمبر اسے ضرور دے دیتا۔“ اس نے اپنی جیب سے چھوٹی سی ایک ڈائری نکالی اور مجھے واحد خان کا نمبر لکھوا دیا۔

وہ سیل نمبر تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ واحد نے بھی سیل فون لے لیا ہے۔ مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ میں نے اسی وقت واحد کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے کال ریسیو نہ کی۔ میں مایوس ہو کر لائن کاٹنے ہی والا تھا کہ دوسری طرف سے اچانک آواز آئی۔ ”ہیلو!“

اس آواز کو میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ واحد کی آواز تھی۔

”ہیلو واحد! میں...“

”سرفراز! تو کہاں ہے؟ تُو نے تو پھر مجھ سے رابطہ ہی نہیں کیا۔ کل ٹی وی پر میں نے خبریں دیکھیں تو معلوم ہوا کہ تو کراچی میں ہے اور کسی سیکیورٹی ایجنسی میں ملازمت کر رہا ہے۔ میں نے انکوائری سے ایجنسی کا نمبر لیا اور تجھے ٹیلی فون کر دیا۔“

”تُو بتا، سب خیریت ہے... گاؤں میں سب ٹھیک ہیں؟ بابا اور ماں کیسے ہیں اور اب وہاں کے کیا حالات ہیں؟“

”یار! تو نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات کر ڈالے۔“ واحد ہنس کر بولا۔ ”سب خیریت ہے۔ میں کچھ دن بعد کراچی آرہا ہوں پھر تجھ سے تفصیلی بات ہوگی۔“

”کراچی آرہا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”تجھے یہاں کوئی کام ہے؟“

”یار! وہاں کی انجینئرنگ یونیورسٹی میں میرا داخلہ ہوا ہے۔“ واحد خان نے بتایا۔ ”میرا تو ارادہ تھا کہ انجینئرنگ پشاور ہی سے کروں لیکن بابا اور چاچا نے کہا کہ کراچی چلے جاؤ۔ وہاں کی ڈگری کی اہمیت زیادہ ہے پھر پشاور میں یونیورسٹیوں میں پڑھائی کم اور سیاست زیادہ ہوتی ہے۔“

”تو پھر تُو کب آرہا ہے کراچی؟“ میں نے پوچھا۔

”دیکھ شاید میں تین دن بعد یہاں سے کراچی کے لیے نکلوں گا۔ تو فکر مت کر، میں تجھے فون کر دوں گا۔“

”اچھا یار! اب تجھ سے کراچی میں ملاقات ہوگی، خدا حافظ۔“ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

”سرفراز! تُو رو کیوں رہا ہے؟“ شاہ میر نے کہا۔

اس کے کہنے پر مجھے خیال آیا کہ واقعی میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”بس یار! واحد خان کی باتیں سن کر گاؤں یاد آگیا۔“ میں نے کہا۔

اس وقت ایس پی صاحب کہیں جانے کو نکلے۔ میں بھی شاہ میر سے رخصت ہو کر جارہا تھا۔

وہ مجھ سے بولے۔ ”سرفراز! کل پارٹی میں کسی سے تمہارا جھگڑا ہوگیا تھا؟“

”نہیں سر! جھگڑا تو نہیں ہوا تھا۔ بس مجھے غلط فہمی ہوگئی تھی۔ ان کا جنرل منیجر احسن ان کی طرف اس انداز میں بڑھا جیسے ان پر حملہ کرنے والا ہو۔ میں نے اسے ایک ہاتھ مار دیا۔“ پھر میں نے چونک کر پوچھا۔ ”آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”تم شاید بھول رہے ہو کہ اعجاز صاحب کے گھر پر بھی ہمارے ہی سیکیورٹی گارڈز ہیں۔ پھر احسن صاحب نے آج خود مجھ سے شکایت کی ہے۔“

”سر! میں ان سے معافی مانگ لوں گا۔ اس وقت تو موقع ہی نہیں ملا۔“

”یار! باڈی گارڈ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہر اس آدمی پر ہاتھ چھوڑ دو گے جو غزنوی صاحب کے نزدیک

جائے گا۔ پھر ہاتھ بھی ایسا مارا کہ اس بے چارے کا جبڑا ہل گیا۔“

”مجھے اس بات کا ابھی تک افسوس ہے سر۔“ میں نے کہا۔ حالانکہ مجھے بالکل افسوس نہیں تھا۔ پہلے تو واقعی مجھے افسوس ہوا تھا لیکن جب سے میں نے رمشا کی باتیں سنی تھیں، مجھے اس سے یا رمشا سے کوئی ہمدردی نہیں رہی تھی۔ میں یہ بات ایس پی صاحب کو بتانے والا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ ایس پی صاحب اس پر بھی اعتراض کریں گے کہ مجھے کسی بھی کلائنٹ کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کی کیا ضرورت ہے؟ میرا کام غزنوی صاحب کی حفاظت تھا اور بس۔

ایس پی صاحب مسکرا کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

میں وہاں سے صدر چلا گیا اور اپنے لیے کپڑے اور جوتے خرید لیے۔ پھر میں نے واحد خان کے لیے خوب صورت سی ایک گھڑی اور خاصا مہنگا سیل فون خریدا اور غزنوی کے بنگلے پر چلا گیا۔

وہاں خلافِ توقع احسن موجود تھا۔ اس کا بایاں گال ابھی تک سوجا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ کچھ زیادہ ہی سخت پڑا تھا۔

اس نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ”احسن صاحب! کل جو کچھ ہوا، وہ غلط فہمی کی وجہ سے ہوا۔ میں اس کی معافی چاہتا ہوں۔“

”یار! تمہارے معافی چاہنے سے کیا میری تکلیف کم ہو جائے گی؟“ احسن نے کہا۔

”اب اس بات کو جانے دو احسن!“ رمشا نے کہا۔ ”سرفراز معذرت تو کر رہا ہے۔“

”میں اتنی آسانی سے معاف تو نہیں کرتا ہوں لیکن غزنوی صاحب اور میڈم رمشا کہہ رہی ہیں تو معاف کر دیتا ہوں۔“

اس نے یوں کہا جیسے میری سات پشتوں پر احسان کر رہا ہو۔

میں زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھا اور اٹھ کر اپنی کمپنی کے ان سیکیورٹی گارڈز کے پاس چلا گیا جو اس وقت ڈیوٹی پر تھے۔ میں نے دیکھا، چند منٹ بعد غزنوی بھی اٹھ گیا۔ رمشا، احسن سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ میرے اندر پھر نفرت کا غبار بھر گیا اور مجھے غزنوی پر ترس آیا کہ جو عورت اس کے سامنے اس کی محبت کا دم بھرتی ہے، وہ اس کے منیجر کے ساتھ بھی محبت کی پینگیں بڑھا رہی ہے۔

”شبیر!“ میں نے ایک سیکیورٹی گارڈ کو مخاطب کیا۔ ”یہ آدمی جو میڈم کے ساتھ بیٹھا ہے، کیا روز یہاں آتا ہے؟“

”جی سرفراز صاحب!“ شبیر نے جواب دیا۔ ”یہ تو روز یہاں آتے ہیں۔ اکثر یہ رات کا کھانا بھی یہاں کھاتے ہیں۔ اصل میں بیگم صاحبہ پہلے صاحب کے آفس میں ملازمت کرتی تھیں پھر صاحب نے ان سے شادی کرلی۔ وہ اصل میں منیجر صاحب کی اسسٹنٹ تھیں۔“

”تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟“ میں نے ہنس کر پوچھا۔

”مجھے یہ سب مالی بابا اور گل خان نے بتایا ہے۔“ شبیر نے جواب دیا۔ گل خان، غزنوی کا ڈرائیور تھا اور مالی بابا بھی اس بنگلے کے پرانے ملازم تھے۔

اسی وقت گیٹ پر ایک گاڑی آکر رکی۔ چوکیدار نے جلدی سے گیٹ کھول دیا لیکن میں نے اس گاڑی والے کو روک لیا۔ ”جی... کس سے ملنا ہے آپ کو؟“

”مجھے غزنوی صاحب نے بلایا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں ان کا وکیل ہوں۔“

”سوری سر!“ میں نے کہا۔ ”گاڑی آپ باہر ہی پارک کریں۔ بُرا مت مانیے گا۔ کل رات...“

”میں جانتا ہوں۔“ وکیل صاحب نے کہا۔ ”تم شاید یہاں نئے آئے ہو؟“

”جی ہاں سر!“ میں نے کہا۔ ”میں نے دو دن پہلے ہی ڈیوٹی جوائن کی ہے۔ اگر آپ کے پاس کوئی پسٹل یا ریوالور وغیرہ ہے تو اسے یہیں چھوڑ دیں، واپسی میں آپ کو مل جائے گا۔“

”ارے بھئی، میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ تم چاہو تو تلاشی لے سکتے ہو۔“

”سوری سر!“ میں نے کہا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ آپ جا سکتے ہیں۔“

وکیل نے اپنی گاڑی باہر ہی پارک کر دی اور اپنا بریف کیس لے کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔

رمشا اسے دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔ ”ارے وکیل صاحب! آپ کیسے آئے؟“

”مجھے غزنوی صاحب نے بلایا ہے میڈم!“ وکیل نے جواب دیا اور اندر چلا گیا۔ شاید میرے رویّے کی وجہ سے اس کا موڈ خراب ہوگیا تھا اس لیے اس نے احسن سے بھی زیادہ بات نہیں کی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے جانے کے بعد میں بھی اندر کی طرف بڑھا۔ جب میں رمشا کے پاس سے گزرا تو احسن اس سے کہہ رہا تھا۔ ”یہ وکیل اس وقت یہاں کیوں آیا ہے؟“

”مجھے خود بھی حیرت ہے۔ ابھی کل ہی تو غزنوی نے دفتر میں وکیل سے ملاقات کی تھی۔ تم ہی نے تو بتایا تھا۔“

میں اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ میرے کمرے کی کھڑکی سے گیٹ اور برآمدے تک کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا۔ لان کا وہ حصہ بھی نظر آتا تھا جہاں کرسیاں پڑی تھیں اور غزنوی وہاں بیٹھ کر چائے پیتا تھا۔

مغرب کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نماز کے لیے مسجد چلا گیا۔ نماز پڑھ کر واپس آیا تو اس وقت بھی وکیل کی گاڑی کھڑی تھی لیکن احسن کی گاڑی وہاں نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ احسن جا چکا ہے۔

رمشا لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ شاید احسن سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا یا پھر غزنوی نے اسے کمرے میں آنے سے روک دیا ہوگا۔

وکیل صاحب مزید آدھ گھنٹے بعد وہاں سے نکلے اور سیدھے باہر کی طرف بڑھ گئے۔ رمشا نے انہیں مخاطب کرنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ وہاں رکے نہیں۔ شاید انہیں کہیں پہنچنے کی جلدی تھی۔

میں نے ان سے کہا۔ ”سر! میں ایک دفعہ پھر آپ سے اپنے رویّے کی معذرت چاہتا ہوں۔“

”اوہو، اسے بھول جاؤ۔ یہ تمہاری ڈیوٹی ہے۔ میں نے اس بات کا بالکل بُرا نہیں مانا۔ ہاں، اگر تم مجھ سے پوچھ گچھ نہ کرتے تو شاید مجھے حیرت ہوتی۔“

ان کی اس بات سے میں حیران رہ گیا۔ وہ مجھے حیران پریشان چھوڑ کر اپنی گاڑی میں بیٹھے اور روانہ ہو گئے۔

دوسرے دن حسبِ معمول میں فجر سے پہلے اٹھ گیا۔ میں نے مسجد میں جا کر نماز پڑھی، واپس آیا تو غزنوی ٹریک سوٹ اور جاگرز پہن کر سیر کے لیے تیار تھا۔

میں جلدی سے اپنے کمرے میں گیا اور بہت عجلت میں کپڑے بدلے اور دونوں پسٹل بغلی ہولسٹرز میں لگا کر جیکٹ پہنی اور غزنوی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

غزنوی گھر سے کچھ فاصلے پر واقع پارک میں واک کرتا تھا۔

ابھی ہم پارک سے کچھ فاصلے پر تھے کہ میرے نزدیک ایک گاڑی آ کر رکی۔ اس میں معقول سا ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”جناب! اگر زحمت نہ ہو تو مجھے یہ ایڈریس سمجھا دیں۔“ اس نے ایک کارڈ جیب سے نکالا۔

غزنوی نے وہ کارڈ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ جانتا تھا کہ مجھے انگریزی میں صرف نام پڑھنا آتے ہیں۔

اچانک میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

چکر کھا کر زمین پر گرنے سے پہلے میں نے دیکھا کہ کسی شخص نے غزنوی پر بھی پشت سے وار کیا تھا۔ میں نے اپنا پسٹل نکالنے کی کوشش کی لیکن میرا ذہن اندھیروں میں ڈوب گیا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں کسی انجانی جگہ پر تھا۔ میں نے اٹھنا چاہا تو اٹھ نہیں سکا کیونکہ میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ اٹھنے کی کوشش میں سر میں دھمک سی ہونے لگی۔ میں نڈھال ہو کر پھر گر گیا۔ گرنے سے مجھے شدید تکلیف ہوئی کیونکہ میں کسی بستر پر نہیں بلکہ فرش پر پڑا تھا۔ فضا میں عجیب سی بو تھی جیسی سمندر کے کنارے سے آتی ہے۔ پھر میرے کانوں نے لہروں کا شور بھی سنا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے......

.....کسی ساحل کے پاس قید کیا گیا ہے۔ پیاس کی شدت سے میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ لیکن وہاں سوائے سناٹے اور لہروں کے مدھم شور کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی۔

میں شاید ایک گھنٹے تک اسی طرح پڑا رہا۔

اچانک دروازہ کھلا اور میلے کپڑوں میں ملبوس ایک شخص اندر داخل ہوا۔

اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ”اڑے، تم لوگ کو ہوش آ گیا؟“

”مجھے... تھوڑا سا... پانی پلا دو۔“ میں نے نحیف آواز میں کہا۔ مجھے اپنی آواز خود اجنبی لگ رہی تھی۔

”اڑے تم پھکر مت کرو جوان۔“ اس نے کہا۔ ”ہم لوگ تم کو پانی بھی دے گا اور کھانا بھی مگر ہم لوگ کے ساتھ کوئی اڑی مت کرنا۔“

”میں تو اٹھ کر بیٹھنے کے قابل بھی نہیں ہوں بھائی... تمہارے ساتھ کیا اڑی کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”اچھا رکو، ہم لوگ تمہارے لیے پانی لے کے آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

دروازہ کھلنے سے لہروں کا شور بہت تیز ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں کسی ہٹ میں ہوں۔

وہی میلا کچیلا آدمی چند منٹ بعد پھر اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی ایک بوتل تھی۔ ”پانی پیو۔“ اس نے بوتل میرے منہ سے لگا دی۔ ”حیدر بخش کسی کے ساتھ زیادتی نئیں کرتا۔“ میں نے پانی کے کئی گھونٹ پیے تو اس نے بوتل منہ سے ہٹالی اور بولا۔ ”اڑے، تم لوگ تو بہت پیاسا ہے۔ لگتا ہے پورا سمندر پی جائے گا۔“

پانی پینے سے جسم میں خاصی توانائی آئی اور ذہن کچھ سوچنے، سمجھنے کے قابل ہوا۔ میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ میں یہاں کیسے پہنچا؟ فوراً ہی مجھے یاد آ گیا کہ میں غزنوی کے ساتھ صبح سیر کو نکلا تھا، پھر ایک صاحب نے گاڑی روک کر کوئی پتا پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد شاید کسی نے پیچھے سے میرے سر پر وار کیا تھا۔ پھر میں نے غزنوی کو گرتے دیکھا تھا اور میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

”بھائی حیدر بخش!“ میں نے کہا۔ ”کچھ کھانے کو مل جائے گا؟“

”اڑے واہ ڑے واہ۔“ وہ تمسخر آمیز انداز میں بولا۔ ”اڑے تم لوگ کیا اپنے والد صاحب کے ولیمے میں آیا ہے؟“

میں خاموش ہو گیا۔

”اڑے تمہارا نام کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میرا نام؟“ میں سوچنے لگا کہ اسے اصل نام بتاؤں یا پھر کوئی فرضی نام بتا دوں۔

”اڑے تم لوگ تو اپنا نام بھی بھول گیا۔ سر کا چوٹ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ پھر غنی کا ہاتھ تو ویسے بھی بہت سخت ہے۔“

میں نے اچانک فیصلہ کر لیا کہ اب میں اپنی یادداشت کھونے کا ڈراما کروں گا۔

”اڑے بابا بولو، تمہارا نام کیا ہے؟“

”میرا نام...“ میں نے سوچنے کی اداکاری کی... ”میرا نام کیا ہے؟“ میں نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

حیدر بخش بہت غور سے مجھے دیکھ رہا تھا پھر وہ آہستہ سے بولا۔ ”اڑے تم لوگ تو واقعی سب کچھ بھول گیا۔ تم لوگ کہاں رہتا ہے؟“

”میں... کہاں رہتا ہوں؟“ میں نے پھر ذہن پر زور دیا اور نفی میں سر ہلا دیا۔ ”میں نہیں جانتا۔“ پھر میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ”حیدر بھائی! میں کل سے بھوکا ہوں۔ مجھے کچھ کھانے کو لا دو۔“

اس نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے جیب سے سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر ملانے لگا۔ سلسلہ ملنے پر وہ بولا۔ ”صاحب! بہت گڑبڑ ہو گیا... نہیں، وہ مرا تو نہیں ہے پر اپنا نام، پتا سب کچھ بھول گیا ہے... جی صاحب... بس وہ یہی کہہ رہا ہے کہ مجھے کچھ کھانے کو دے دو... ٹھیک ہے صاحب! جیسا آپ بولو... نہیں مرے گا... آپ پھکر مت کرو۔“

پھر وہ کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں ایک شاپر تھا۔ اس نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا تو سر میں پھر دھمک ہوئی لیکن تکلیف پہلے سے کم تھی۔

”کھاؤ ڑے، عیش کرو۔ صاحب نے بولا ہے کہ تم لوگ کو کھانے پینے کا کوئی تکلیف نہیں ہو۔“ اس نے شاپر سے ایک برگر نکالا اور مجھے کھلانے لگا۔ برگر کھانے کے بعد میں نے پانی پیا تو مجھے ایسا لگا جیسے میرے مردہ تن میں جان پڑ گئی ہو۔ پھر وہ کہیں سے کوئی مرہم لے آیا اور بولا۔ ”تم تو زخمی بھی ہے... ابھی، ہم تمہارے زخم پر دوائی لگا دیتا ہے۔“

اس نے میرے سر کے پچھلے حصے پر مرہم لگایا تو مجھے بہت سکون ملا اور میری توانائی تیزی سے واپس آنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد پھر اس نے پوچھا۔ ”ابھی کچھ یاد آیا، نام کیا ہے تمہارا؟“

”میرا نام... میرا نام شاید... نہیں... میرا نام کیا ہے؟“ میں منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔

”اڑے، تم لوگ کو اپنا نام ہی یاد نہیں ہے۔“ اس نے جھنجلا کر کہا۔ ”تم کیا کام کرتا ہے؟“

”میں... کیا کام کرتا ہوں...“ میں نے پھر سوچنے کی اداکاری کی اور جھنجلا کر کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ میں کیا کرتا تھا۔ میں یہاں کیسے پہنچا؟ کیا میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا؟“

”اڑے تم لوگ کو تو کچھ بھی یاد نہیں ہے۔“ اس نے مایوسی سے کہا پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

اس دفعہ وہ ایک گھنٹے بعد آیا۔ اس دوران میں میری توانائی خاصی حد تک بحال ہو چکی تھی لیکن میں نے یہ ظاہر نہیں کیا۔ اس مرتبہ وہ میرے لیے بستر لے کر آیا تھا۔ اس نے فرش صاف کر کے اس پر بستر بچھایا اور مجھے کھینچ کر اس پر ڈال دیا۔

فرش پر لیٹے لیٹے میری کمر اکڑ گئی تھی۔ بستر پر لیٹا تو مجھے بہت سکون ملا۔ وہ اپنے ساتھ ایک تھرموس بھی لایا تھا اور سر درد دور کرنے کی گولیاں بھی تھیں۔

اس نے ایک گولی میرے منہ میں ڈال کر پانی کی بوتل میرے منہ سے لگا دی۔ پھر تھرموس سے چائے نکالی اور ایک مرتبہ پھر سہارا دے کر مجھے بٹھا دیا۔

”لو، چائے پیو۔ تم لوگ بھی کیا یاد رکھے گا کہ کسی بلوچ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے واسطہ پڑا تھا۔"

سر درد کی گولی کھانے اور گرما گرم چائے پینے کے بعد تو مجھے ایسا سکون ملا کہ میں سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو ہر طرف سناٹا تھا۔ مجھے حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ حیدر بخش کہیں نزدیک ہی ہوگا۔ میں نے اسے پکارا۔ "حیدر بخش!"

جواب میں مجھے لہروں کا شور سنائی دیا... میں نے اس مرتبہ مزید بلند آواز میں پکارا۔ "حیدر بخش... حیدر بخش..."

اچانک دروازہ کھلا اور حیدر بخش اندر داخل ہوا۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ کمرے میں البتہ ایک لالٹین جل رہی تھی۔

حیدر بخش کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ اس نے ناگواری سے پوچھا۔ "کیا ہے... کیوں شور کر رہا ہے؟"

"مجھے باتھ روم جانا ہے۔" میں نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ ہم لوگ تمہارا ہاتھ پاؤں کھول رہا ہے لیکن ہاتھ کا رسّی پورا نہیں کھولے گا۔" اس نے میرے پاؤں کھولنا شروع کر دیے۔ پھر ایک ہاتھ کی رسّی کچھ ڈھیلی کی اور رسّی کو دوسرے ہاتھ سے کچھ فاصلے پر باندھ دیا۔ اس کا ایک سرا اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ "چلو۔" اس نے مجھ سے کہا لیکن واقعی مجھ سے نہیں اٹھا گیا۔ ایک ہی زاویے پر پڑے پڑے میری کمر بھی اکڑ گئی تھی اور پیر بھی اکڑ کر رہ گئے تھے۔ اس نے سہارا دے کر مجھے اٹھایا اور ہٹ میں واقع باتھ روم کی طرف لے گیا۔ وہ ہٹ یقیناً کسی بڑے آدمی کا تھا جہاں صاف ستھرا باتھ روم بھی تھا۔ یہاں مجھے ایک کمرا اور نظر آیا جو بند تھا۔ حیدر بخش شاید باہر برآمدے میں رہتا تھا۔

اس نے سہارا دے کر مجھے باتھ روم تک پہنچایا۔ فراغت پانے کے بعد میں نے اپنے پیروں اور جسم کو حرکت دے کر اپنا دورانِ خون بحال کیا۔ پھر حیدر بخش کی آواز آئی۔ "اڑے، تم لوگ اندر سو گیا کیا؟"

"بس دو منٹ اور بھائی۔" میں نے کہا اور دوبارہ ہلکی پھلکی ایکسرسائز کرنے لگا۔

دو منٹ بعد میں حیدر بخش کو دکھانے کے لیے لڑکھڑاتا ہوا باتھ روم سے باہر نکلا اور گرنے کی اداکاری کی۔ حیدر بخش نے آگے بڑھ کر مجھے سنبھال لیا اور بولا۔ "اڑے تم تو پورا تین من کا لاش ہے۔ اتنا لمبا چوڑا جوان اور ایک چوٹ میں سب کچھ بھول گیا۔"

میں اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے لمبے سانس لینے لگا۔

حیدر بخش مجھے سہارا دے کر بستر تک لے گیا پھر اس نے میرے دونوں پاؤں باندھے اور باہر نکل گیا۔ اسے نیند کی جھونک میں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میرے ہاتھ پھر اچھی طرح ملا کر باندھ دے۔

اس کے باہر نکلنے کے بعد میں تقریباً دس منٹ تک اسی طرح لیٹا رہا پھر آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھوں کی رسّی اتنی ڈھیلی تھی کہ میں نے پیر سمیٹے تو میرے ہاتھ بہت آسانی سے پیروں تک پہنچ گئے۔ میں نے جلدی جلدی پیروں کی رسّی کھولی۔ پھر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میرے دونوں ہاتھوں میں اتنا فاصلہ تھا کہ میں بہت آسانی سے ہاتھوں کی رسّی بھی کھول سکتا تھا۔

پانچ منٹ کے اندر اندر میں نے ہاتھوں کی رسّی بھی کھول لی، اب میں آزاد تھا۔ میں نے بہت محتاط انداز میں دروازہ کھولا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ حیدر بخش برآمدے میں بستر بچھائے گہری نیند سو رہا تھا۔

میں اچانک اس کے سر پر جا پہنچا اور اس کے پہلو میں زوردار لات مارنے کے بعد کہا۔ "اٹھ جاہل آدمی... تو کیا سمجھتا تھا کہ مجھے زندگی بھر قید رکھے گا؟"

حیدر بخش ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کے سینے پر زوردار لات جما دی۔ وہ اچھل کر پیچھے گرا تو میں نے اس کی تلاشی لی۔ اس کے نیفے میں ریوالور اڑسا ہوا تھا۔ میں نے وہ ریوالور نکال لیا اور ڈپٹ کر بولا۔ "کھڑا ہو جا ورنہ یہیں ٹھنڈا کر دوں گا۔"

وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

"اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لے۔" میں نے اسے حکم دیا اور اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے سو سو روپے کے کئی نوٹ برآمد ہوئے۔ پھر احتیاطاً میں نے اس کے نیفے پر ہاتھ پھیرا تو نیفے کے اندر بھی کوئی چیز تھی۔ میں نے اس کی بوسیدہ شلوار کو کھینچا تو وہ پھٹ گئی اور نیفے سے ہزار ہزار کے مزید کئی نوٹ برآمد ہوئے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس سستی سی ایک گھڑی تھی اور ایک سیل فون تھا جو مجھے نیا لگ رہا تھا۔ کمرے سے باہر آنے والی ناکافی روشنی میں مجھے سیل فون اور نوٹ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ممکن ہے وہ ہزار کے بجائے پانچ سو روپے کے نوٹ ہوں۔ میں اُسے

دھکیل کر اندر لے گیا۔ میں نے لالٹین کی روشنی میں نوٹوں اور سیل فون کا جائزہ لیا۔ وہ ہزار ہزار کے پندرہ نوٹ تھے۔ گویا کسی نے اسے میری چوکیداری کا معاوضہ پندرہ ہزار روپے دیا تھا ورنہ اس کے پاس اتنی خطیر رقم کہاں سے آسکتی تھی۔ اس جیسے آدمی کے لیے تو وہ رقم خطیر ہی تھی۔

میں نے اسی رسّی سے اسے باندھا اور بستر پر لٹا دیا۔ اس کی گھڑی میں اس وقت چار بج رہے تھے۔ مجھے دن نکلنے کا انتظار کرنا تھا۔ اس وقت میں نہ جانے کہاں تھا؟ میں نے وقت گزاری کو اس سے پوچھا۔ "تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

"تم لوگ کو تو صاحب نے اِدر بھیجا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"غزنوی صاحب؟" میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"میں اسے نہیں جانتا۔ اسے غنی جانتا ہے۔ اسی نے تم کو اغوا بھی کیا ہے۔"

"کون غنی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ہمارا استاد ہے۔ ہم لوگ چھوٹی موٹی وارداتیں کرتے ہیں۔ غنی شاید صاحب کے لیے کام کرتا ہے۔ اس نے مجھے پندرہ ہزار روپے دیے تھے اور کہا تھا کہ یہ آدمی پندرہ دن سے پہلے یہاں سے نہیں جائے گا۔"

"میرا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم کو کیا معلوم یار! جب تم اپنا نام خود نہیں جانتا تو ہم لوگ کیا بتائے گا؟"

اس سے اِدھر اُدھر کی بے تکی گفتگو کرتے کرتے صبح ہو گئی۔ وہ ہٹ بہت اچھا تھا۔ اس میں باتھ روم میں پانی تک آ رہا تھا۔ میں نے وہیں وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔

حیدر بخش بہت غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نماز سے فارغ ہوا تو وہ بولا۔ "جب تم کو یہ یاد ہے کہ تم مسلمان ہے تو اپنا نام بھی یاد آجائے گا۔"

"ہاں، شاید یاد آجائے۔ ابھی تو میری جگہ تم آرام کرو۔" میں نے اس کے پیر کھولے اور وہاں سے نکل گیا۔ نکلنے سے پہلے میں نے اس کے سر پر ریوالور کا دستہ رسید کر دیا تاکہ وہ فوراً ہی باہر نکل کر شور نہ مچا دے۔

مجھے شاہ میر اور واحد خان کا سیل نمبر زبانی یاد تھا۔

میں نے صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے شاہ میر کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کر لی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ہیلو!"

"شاہ میر! میں سرفراز بول رہا ہوں۔"

"تم کہاں ہو؟" اس کی نیند اچانک غائب ہو گئی۔

"مجھے نہیں معلوم کہ میں کہاں ہوں۔ کچھ لوگوں نے مجھے اغوا کر لیا تھا۔ ابھی ابھی ان کے چنگل سے رہائی ملی ہے۔"

"تم فوری طور پر دفتر مت آنا، اپنے گھر بھی مت جانا اور غزنوی صاحب کی طرف بھی مت جانا۔"

"کیوں؟" میں نے الجھ کر پوچھا۔

"تم پر غزنوی صاحب کے اغوا کا الزام ہے۔ ایس پی صاحب نے بھی تمہارے خلاف بیان دیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"انہوں نے پولیس کو بتایا ہے کہ سرفراز خان جرائم پیشہ تھا۔ میں نے یہ سوچ کر اسے نوکری دی تھی کہ وہ سدھر جائے گا۔ وہ کسی حد تک سدھر بھی گیا تھا لیکن اس نے غزنوی صاحب کو اغوا کر لیا۔ اب وہ ان کے گھر والوں سے کسی لمبی چوڑی رقم کا مطالبہ کرے گا۔"

"اور پولیس نے یقین کر لیا؟" میں نے کہا۔

"پولیس کو یقین دلایا گیا کہ آخری وقت تک سرفراز ہی غزنوی صاحب کے ساتھ تھا۔ اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا تو انہیں اغوا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ سرفراز ایک شارپ شوٹر ہے۔ وہ یا تو مارتا یا مر جاتا۔ یہ اس کی خصلت تھی۔ اگر کوئی ان دونوں پر حملہ کرتا اور وہ ہلاک ہو جاتے تو ان کی لاشیں تو ملتیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ غزنوی صاحب کے اغوا میں سرفراز کا ہاتھ ہے۔ غزنوی صاحب کی بیگم کا بھی یہی خیال ہے اور ان کے بنگلے کے گارڈز کا بھی۔ پولیس تمہیں پورے شہر میں تلاش کر رہی ہے۔ غزنوی صاحب کی بیگم کو اپنے شوہر کی تلاش ہے۔ زندہ یا مُردہ۔ مُردہ ہونے کی صورت میں ان کا وصیت نامہ کھولا جائے گا جو ان کے وکیل کے پاس محفوظ ہے۔ قانون اس وقت تک کسی آدمی کو مُردہ قرار نہیں دیتا جب تک اس کی لاش دستیاب نہ ہو جائے یا وہ ایک مخصوص عرصے تک غائب رہے۔" شاہ میر نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ان کی بیگم کو غزنوی صاحب کی لاش کی زیادہ تلاش ہے کیونکہ پھر تو سب کچھ ان ہی کو ملے گا۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ وہ اب باقاعدگی سے دفتر جا رہی ہیں اور وہ جنرل منیجر احسن کے ساتھ گھومتی ہوئی بھی نظر آتی ہیں۔"

"اچھا، میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔ یہ سم تو انہی لوگوں کی ہے جنہوں نے مجھے اغوا کیا تھا۔ میں دوسری سم لے کر تم سے بات کروں گا۔"

"ہاں، تمہارے دوست واحد کا بھی ٹیلی فون آیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ آج کراچی پہنچ رہا ہے۔"

واحد کراچی آرہا ہے، یہ سن کر مجھے بہت تقویت ہوئی لیکن مجھے پریشانی یہ تھی کہ میں پولیس سے کب تک چھپ سکوں گا۔ میں اپنے گاؤں بھی نہیں جاسکتا تھا۔ میرا خود کو بے گناہ ثابت کرنا بہت ضروری تھا۔

"ایس پی صاحب اب کیا کہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ جس دن تم غائب ہوئے تھے، اسی شام ان کی گاڑی کا بہت خوفناک ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ وہ اس وقت کوما میں ہیں اور ڈاکٹر ان کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں۔"

"لیکن... وہ..." میں نے کچھ کہنا چاہا کہ اچانک لائن کٹ گئی۔

میں مزید کچھ آگے بڑھا تو مجھے یاد آگیا کہ یہ ہاکس بے کا علاقہ تھا۔ مجھے جس ہٹ میں قید رکھا گیا تھا، وہ دوسرے ہٹس سے کافی فاصلے پر تھا۔

میں نے سوچا کہ اگر میں پیدل شہر کی طرف گیا تو میرے پکڑے جانے کے امکانات زیادہ ہیں۔ حیدر بخش اب تک باہر نکل کر شور مچا چکا ہوگا یا اپنے بندھے ہوئے ہاتھ کسی سے بھی کھلوا کر میرے پیچھے آئے گا۔

وہاں ابھی سے لوگ پکنک پر آنا شروع ہو گئے تھے۔ ایک ہٹ کے سامنے مجھے تین گاڑیاں دکھائی دیں۔ میں نے ایک گاڑی کا لاک کھولا۔ اس کے لیے پہلے مجھے پیچھے والی کھڑکی کا چھوٹا شیشہ نکالنا پڑا۔

پھر میں نے ہاتھ ڈال کر عقبی دروازے کا لاک کھول لیا۔ اس کے بعد ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولنا کیا مشکل تھا۔ میں نے گاڑی کا اگنیشن ڈائریکٹ کیا اور اسے اسٹارٹ کر دیا۔ عین اسی وقت ایک لڑکی ہٹ سے باہر نکلی۔ اس نے ایک نظر اِدھر اُدھر دیکھا پھر اندر لوٹ گئی۔ اس نے اس بات پر دھیان ہی نہیں دیا کہ گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہے اور کوئی اس میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے جاتے ہی میں نے گاڑی کو مین روڈ پر ڈالا اور خاصی رفتار سے دوڑانے لگا۔

میں نے ناظم آباد پہنچ کر وہ گاڑی چھوڑ دی اور پیدل ہی ایک طرف روانہ ہوگیا۔ اپنا حلیہ بدلنے کے لیے میں نے ناظم آباد کی مارکیٹ سے ایک شلوار قمیص، پشاوری چپل اور سندھی ٹوپی خریدی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک نیا سم کارڈ بھی خرید لیا اور پرانی سم نکال کر نئی سم سیل فون میں لگا دی۔

میں پھر یہ سوچتا رہا کہ اب میں کہاں جاؤں؟

میرے ذہن میں اچانک حیدر آباد جانے کا خیال آیا اور میں رکشا لے کر سہراب گوٹھ پہنچ گیا۔ وہاں سے مجھے حیدر آباد کی بس آسانی سے مل گئی۔

حیدر آباد میں میرا ایک دوست رہتا تھا۔ وہ کبھی کبھار کراچی آتا تھا تو اس سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ میرے ساتھ تو وہ بہت مخلص تھا۔ اس سے میری ملاقات سیکیورٹی ایجنسی کے دفتر میں ہوئی تھی۔ اس کا نام معین تھا اور وہ کسی زمانے میں ایس پی صاحب کا چپراسی رہ چکا تھا۔ ایس پی صاحب تو اسے منہ نہیں لگاتے تھے لیکن میں مہمان سمجھ کر اس کی خاطر کرتا تھا۔ اسے کھانا بھی کھلاتا تھا اور اکثر اسے اپنے ساتھ ٹھہرا بھی لیتا تھا۔

وہ لطیف آباد گیارہ نمبر میں رہتا تھا۔ میں نے رکشا لیا اور گیارہ نمبر پہنچ گیا۔ اس نے گیارہ نمبر کے کسی بک ڈپو کا حوالہ دیا تھا کہ اگر کبھی حیدر آباد آؤ تو وہاں سے میرا پتا معلوم کر لینا۔

میرے ذہن سے اس بک ڈپو کا نام نکل گیا تھا لیکن وہاں گنتی کے تین بک ڈپو تھے۔ میں نے پہلے بک ڈپو سے پوچھا تو مجھے ناکامی ہوئی۔ دوسرا بک ڈپو وہاں سے کچھ فاصلے پر تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "آپ معین کو جانتے ہیں؟"

"کون معین؟" دکان دار نے پوچھا۔ "وہ جو پولیس میں تھا؟"

"ہاں وہی، مجھے اس کے گھر جانا ہے۔"

معین کا گھر نزدیک ہی تھا۔ اس نے مجھے پتا سمجھا دیا۔ میں پوچھتا ہوا وہاں تک پہنچ گیا۔

معین مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا اور بولا۔ "سرفراز صاحب! آپ کے پیچھے تو پولیس لگی ہوئی ہے۔"

"ہاں، اسی لیے تو میں تمہارے پاس آیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اگر ایسی بات ہے تو پھر اندر آجائیں۔ میں یہاں اکیلا ہی رہتا ہوں۔"

میں اس کے گھر میں داخل ہوگیا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی مالی حالت خراب ہے۔ میں نے اسے ہزار روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ "جا کر کھانے کو کچھ لے آؤ۔"

وہ بُرا مان گیا کہ آپ میرے مہمان ہیں۔ میں آپ سے پیسے نہیں لوں گا۔

میں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔

کھانے کے بعد میں نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

غنی کا نام سن کر وہ چونکا اور بولا۔ "غنی تو کراچی کا ہسٹری شیٹر ہے اور بہت خطرناک بدمعاش ہے۔ اب میں معلوم کرلوں گا کہ غنی کا رابطہ کس سے ہے اور اس نے کس کے کہنے پر آپ کو اغوا کیا تھا؟"

دوسرے دن اس نے مجھ سے کہا۔ "میں کراچی جارہا ہوں۔ آپ یہیں رہیں۔ میں دو تین دن میں لوٹ آؤں گا۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں غنی کو تلاش کرلوں گا۔ آخر میں نے بھی پولیس میں ملازمت کی ہے۔"

جانے سے پہلے میں نے اسے زبردستی پیسے دیے کہ یہ رکھ لو۔ تمہارے کام آئیں گے پھر میں نے اسے دو ہزار روپے مزید دیے کہ گھر میں کھانے پینے کا سامان رکھ جاؤ۔

اس کے جانے کے بعد اکیلے گھر میں ہولناک سناٹا طاری ہوگیا۔

پھر اسے گئے ہوئے دو دن گزرے، تین دن گزرے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہفتہ گزر گیا۔

ایک مہینے بعد معین نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ میں نے غنی کا سراغ لگا لیا ہے۔ میں اسی دن کراچی کے لیے روانہ ہوگیا اور تمام خطرات کو بالائے طاق رکھ کر شاہ میر سے ملا۔ شاہ میر نے بتایا کہ واحد خان کراچی آچکا ہے۔

میں نے واحد خان کو اسی وقت ٹیلی فون کیا۔ وہ بے چارہ بھاگا بھاگا شاہ میر کے گھر پہنچ گیا اور شکایتی انداز میں بولا۔ "تُو نے شاہ میر کو تو سب کچھ بتا دیا لیکن مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ تو کیا سمجھتا ہے کہ میں تیرا دشمن ہوں... تجھے پولیس کے حوالے کردوں گا؟"

"یار! تمہارا اسیل نمبر میرے موبائل میں تھا اور موبائل تو اغوا کرنے والوں نے میری جیب سے نکال لیا تھا۔ شاہ میر کو میں اتنی دفعہ ٹیلی فون کرتا تھا کہ مجھے اس کا نمبر زبانی یاد ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ بات نہیں ہے۔ تُو سنا، سب خیریت تو ہے؟"

"بالکل خیریت نہیں ہے سرفراز!" اس نے کہا اور بولا۔ "دیکھو، اب جو میں تجھے بتانے جارہا ہوں وہ بہت حوصلے سے سننا۔ تُو ایک قبائلی سردار کا بیٹا ہے اور قبائلیوں کے دل پہاڑوں کی طرح سخت ہوتے ہیں۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"تیرے فرار کے بعد خان شہزاد کے قبیلے والے

ہم دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں، سر!

تیرے بابا کے دشمن ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ سردار بہادر خان نے اپنے بیٹے کو خود فرار کرایا ہے۔ ان لوگوں نے تیرے بابا کو ایک دن گولیاں مار کے ہلاک کر دیا۔ قبیلے کے دو آدمی بھی ان کے ساتھ مارے گئے۔ تیری غیر موجودگی میں تیرے چچازاد کو قبیلے کا سردار بنا دیا گیا۔"

"یہ سب ہوتا رہا اور میں یہاں عیش کرتا رہا۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"دیکھ سرفراز! تُو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تو روئے گا نہیں۔"

"اور اماں... وہ کہاں ہیں؟"

"اماں وہیں گاؤں میں ہیں۔ تُو اس عذاب سے نکل جائے تو میں ان کو بھی یہاں لے آؤں۔"

اسی وقت معین نے آ کر بتایا کہ ایس پی کو چند منٹ کو ہوش آیا تھا۔ اس نے احسن سے کوئی بات کی ہے۔ اس کے بعد احسن غنی سے ملا ہے۔ میں نے غنی کے ایک قریبی ساتھی سے معلوم کیا کہ غنی اور احسن کی کیا باتیں ہوئی ہیں۔ اس نے بتایا کہ احسن نے غنی کو آج کہیں جانے کا حکم دیا ہے اور کہا ہے کہ اگر کام خوش اسلوبی سے ہوگا تو میں تمہیں مالا مال کر دوں گا۔ اب ہمیں غنی کا پیچھا کرنا ہے۔ ممکن ہے اسی کے ذریعے ہمیں کوئی سراغ مل جائے۔

☆☆☆

غنی سرجانی ٹاؤن کی آبادی کی طرف جارہا تھا۔ میں اور شاہ میر بہت احتیاط سے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔

ایس پی مرنے سے پہلے چند منٹ کے لیے ہوش میں آیا تھا۔ اس وقت اس کے پاس احسن بیٹھا تھا۔ اس نے احسن سے کچھ کہا تھا پھر اچانک اس کی حالت بگڑ گئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ ساری اطلاعات شاہ میر نے دی تھیں۔ غنی کا پیچھا کرتے ہوئے ہم سرجانی ٹاؤن کے ایک مکان میں پہنچے۔ وہ مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گئے۔

اس نے مکان کے ایک کمرے کا دروازہ کھولا تو بدبو کا شدید بھپکا آیا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا تو اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ میں نے اس سے پہلے ہی ریوالور نکال لیا اور ڈپٹ کر بولا۔ ''خبردار! ہلنے کی کوشش مت کرنا۔'' وہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔

کمرے کا منظر بہت عبرت ناک تھا۔ اندر ایک ڈھانچا پڑا ہوا تھا جس کے جسم کا تمام گوشت گل چکا تھا۔ اس کے استخوانی ہاتھ میں سرخ رنگ کی ایک ڈائری دبی ہوئی تھی۔ شاہ میر نے وہ ڈائری اٹھالی۔ میں نے ڈائری کھول کر دیکھی۔ وہ غزنوی صاحب کی تحریر تھی۔ میں ان کی تحریر پہچانتا تھا۔ اکثر انہیں لکھتے دیکھا تھا۔

☆☆☆

وہ ڈائری ہی میرے لیے نجات کا ذریعہ بن گئی۔ اس میں غزنوی صاحب نے لکھا تھا۔ ''مجھے ایس پی قمرالحسن نے اغوا کرایا ہے۔ وہ مجھ پر زور دے رہا ہے کہ میں اپنا وصیت نامہ بدل دوں اور ساری جائداد جنرل منیجر احسن یا رمشا کے نام کردوں۔ میں مرجاؤں گا لیکن ایسا نہیں کروں گا۔ وہ مجھے یہاں بند کر کے بھول گیا ہے۔ آج بغیر کچھ کھائے پیے چوتھا دن ہے۔ میرے اغوا میں ایس پی قمرالحسن اور میرے جنرل منیجر احسن کا ہاتھ ہے۔ ایس پی نے خود مجھے بتایا ہے کہ احسن اس کا بھتیجا ہے۔ میں نے اس کے کہنے پر احسن کو ملازمت دی تھی۔ جب میری شادی رمشا سے ہوئی تو احسن نے گھر میں بہت زیادہ آنا جانا شروع کردیا۔ میں رمشا پر اعتماد کرتا تھا لیکن ایک دن میں نے اپنے کانوں سے ان کی باتیں سن لیں۔ وہ دونوں مجھے ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اعجاز بھی درپردہ میرا دشمن ہے۔ اس دن پارٹی کے بعد اس کے آدمیوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا جو سرفراز کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ اعجاز کسی زمانے میں میرا پارٹنر تھا۔ اس کے پاس کچھ ایسے کاغذات تھے جن کی بنا پر وہ اپنی پارٹنرشپ اب بھی ثابت کرسکتا تھا۔ میں نے اسے ایک خطیر رقم دے کر وہ کاغذات حاصل کیے تھے۔ میں نے واضح کردیا تھا کہ اگر وہ عدالت میں جائے گا تو برسوں گزرنے کے بعد کیس کا فیصلہ ہوگا۔ ممکن ہے اس وقت تک وہ زندہ نہ رہے۔ وہ دو کروڑ روپے پر راضی ہو گیا تھا۔

میں نے دو کروڑ روپے کا چیک اسے دے دیا تھا۔ اس نے دوسرے دن کاغذات دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے چیک پر ایک ہفتے بعد کی تاریخ ڈالی تھی۔ اس نے سوچا کہ رقم بھی ہتھیالے اور مجھ سے بھی پیچھا چھڑالے۔ اس نے یہی سوچ کر مجھے ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن وہ بے چارہ خود مارا گیا۔ جو لوگ مارے گئے تھے، ان میں اعجاز خود بھی شامل تھا۔ وہ صرف اس حملے کی نگرانی کرنے آیا تھا۔ اس کے وارثوں نے پولیس کو بھاری رقم کھلا کر اس کی لاش ان سے لے لی اور بعد میں اسے ایکسیڈنٹ کا رنگ دے دیا۔

''میں اپنا وصیت نامہ لکھ چکا ہوں۔ یہاں ایک مرتبہ پھر لکھ رہا ہوں کہ میری تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائداد سرفراز خان ولد بہادر خان کو دی جائے۔ اس کے بعد ڈائری کے بہت سے صفحات سادہ تھے۔ ایک صفحے پر لکھا تھا۔ میں... شاید... مر... رہا...'' اس کے بعد خط شکستہ ہو گیا تھا۔ کیسی عبرت ناک موت تھی۔ ایک ارب پتی بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا تھا۔

☆☆☆

واحد خان اماں کو بھی گاؤں سے لے آیا تھا۔ اب میرے سینے میں انتقام کی آگ سلگ رہی تھی۔ میں خان شہزاد کے پورے خاندان کو ختم کرنا چاہتا تھا لیکن اماں نے سمجھایا کہ اس قتل و غارت گری سے کیا حاصل ہوگا؟ معاف کردینے میں ہی بڑائی ہے۔ واحد خان نے بھی مجھے سمجھایا کہ معاف کردینا اللہ کو بھی پسند ہے۔ ان کے سمجھانے پر میں راضی تو ہو گیا ہوں لیکن کبھی کبھی میرا قبائلی خون جوش مارتا ہے تو دل چاہتا ہے کہ خان شہزاد کے پورے قبیلے کو جلا کر بھسم کردوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے انتقام کی آگ سے محفوظ رکھے کیونکہ انتقام کی یہ آگ ایک دن ارمانوں کی راکھ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

میں نے رمشا کو نہ صرف گھر سے نکالا ہے بلکہ دفتر سے بھی نکال دیا ہے۔ احسن کو بھی سزا ہو چکی ہے۔ اس کے ساتھ ہی غنی بھی جیل کی ہوا کھا رہا ہے۔ ہاں، اب وہ سیکیورٹی ایجنسی شاہ میر چلا رہا ہے اور میں نے معین کو بھی وہاں رکھ لیا ہے۔

لیکن میں سوچتا ہوں کہ اس سارے کھیل میں قصور کس کا تھا؟ میرا، میرے قبائلی خون کا یا پھر ان آثار جنوں کا جن پر اگر بابا جان شروع ہی میں قابو پالیتے تو میں انتقام کی آگ میں یوں نہ سلگتا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk